

جنگی کہانیاں آپ جیتیں اور جگ جیتیں

سنگرزِ نشت گیتی

اگست 2017

معاون اعلیٰ
معراج رسول

بومِ ازل کی یاد



A contact loved ones.

ایک رابطہ اینوں سے
Aik Rabta Apno Se.



www.PakistaniPoint.Com

انفصالتِ دواں: اس کے نظریات نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا
نقشب: ایک ایسی کج بیانی جسے پڑھ کر آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے
نواب سپاہی: قیام پاکستان کے لیے زندگی وقف کر دینے والے نواب کا زندگی نامہ

پیش گو

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

43

خواجه تحسین

نواب سپاہی

غلام حسین مبین

آزادی کے ایک بے لوث
سپاہی کی حبیبوں کتھا

93

صحافت

روزنامہ پیسہ

شکیل صدیقی

وطن کی آزادی کے لیے زمین تیار
کرنے والے اخبار کار کا تذکرہ

111

سفر کہانی

شمشال ٹورنٹو

ندیم اقبال

جہاں ان کا شہر کا ایک
الگ انداز کی داستان

159

دلچسپ واقعات

باپ کے بغیر

کشمالہ حسن

اس دنیا میں کیا کچھ
نہیں ہوتا، اسی کی تحریر کی تصویر

شخصیت

16

نفسیادان

ڈاکٹر ساجد امجد

اس کے نظریات
نے پوری دنیا کو چونکا دیا

فلم نگری

59

گولڈن اسٹار

انور فرہاد

پاکستانی فلم کے ایک
بڑے اداکار کا زندگی نامہ

مناظر پاکستان

107

اونڈھنی سستی

شاہد لطیف

سندھ کے ایک عجیب
عربی گاؤں کا تذکرہ

تحریر خاص

151

حسن مزاح

نشاات

مزاح کی حسن کا زندگی
پر کیا اثر پڑتا ہے

08

گفت و شنید

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

53

معلومات

دلچسپ دریافتیں

دانیہ صدیقی

کبھی کبھی ایسی دلچسپ
دریافتیں بھی سامنے آتی ہیں

101

تحقیق

ازم

منظر امام

سوشلزم کی روز اسلاک ازم
یہ سب کیا ہیں

135

واقعات

فلم ساز

کاشف زبیر

ہالی ووڈ کے ایک معروف
ہدایت کار کا فلم ساز کی داستان

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمہ دار نہ ہوگا۔

زندگی کی جیت

فرزاتہ نکھت

وہ عورت زندگی کی
خاطر موت سے لڑتی رہی

170 معاشرت

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک معصوم نوجوان کی خون
رنگ لہو گرما دینے والی داستان

167 فن موسیقی

سر چھاگل

ایاز راہی

پاکستان کے قومی ترانے
کو سر سے نوازنے والے کا تذکرہ

165 تذکرہ

نام

عائشہ انور

ایک مشہور اداکار کے
نام کی دلچسپ کہتا

231 تیسری سچ بیانی

رانگ نمبر

ڈاکٹر ظفر احمد خان

کبھی کبھی رانگ نمبر واقعی زندگی کو
رانگ لے میں بدل دیتی ہے

221 دوسری سچ بیانی

مقتول ساتھی

زریں قمر

اس کی کوشش نے ایک
بے قصور کو پھانسی سے بچایا

210 پہلی سچ بیانی

نقب

انیلہ

اس کی سہیلی نے
اسے حیران کن دھوکا دیا

255 چھٹی سچ بیانی

سونہ ڈیل

عاطر شاہین

نوسر باز دل نے انسانی زندگی
میں زہر گھول رکھا ہے

247 پانچویں سچ بیانی

ناگن

اختر شہاب

اس کی زندگی ایک
تماشا سا بن گئی ہے

241 چوتھی سچ بیانی

بدگمان

وردہ خان

بدگمانی رشتوں کی تباہی
کا ایک ذریعہ ہے

281 نویں سچ بیانی

نجات

زویا اعجاز

ایک عجیب سی مگر
دلچسپ سچ بیانی

271 آٹھویں سچ بیانی

شریک سفر

غلام رضا جعفری

اسے ایک ایسی شریک
سفر ملی جو انوکھی فطہرت کی تھی

259 ساتویں سچ بیانی

ادھورارشتہ

وسیم اشرف

وہ اس ادھورے رشتے
پر بھی خوش ہے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

پیش گو

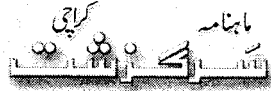
13 ستمبر 1879ء کی رات آہستہ آہستہ رومی تھی۔ قصبہ اسلام پوری طرح اندھیرے کی چادر میں لپیٹا ہوا تھا اس بڑی سی حویلی کے ایک کمرے سے نور احمد بیچے کے رونے کی تیز آواز ابھری اور کمرے کے باہر کھڑی عورتوں کے چہرے گل اٹھے۔ اندر سے لڑکائی مانی آواز دی ”مبارک ہو مالک! بیٹا ہوا ہے۔“ یہ خبر فوراً ہی مردانے میں پہنچادی گئی۔ اس گول منول بیچے کا نام شوکت علی خان رکھا گیا۔ وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تار تھا۔ اس حویلی کا اجالا تھا۔ وہ حویلی کی معمولی آدبی کی نہجی شجاعت علی خاں کی تھی اور بڑیوں خلع میں ان کے نام کا ڈنکا بجاتا تھا۔ شجاعت علی خاں خاندانی رئیس تھے۔ ان کے اجداد برسوں پہلے کاہل سے نکل مکانی کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اس زمانے میں ہند کی شہنشاہیت شاہ عالم ایسے زیرک بادشاہ کے پاس تھی۔ اس نے ان لوگوں کی خوب قدر افزائی کی اور ان کو بشارت علی خاں کو بدایوں کی گورنری کا عہدہ دے دیا۔ وہی جاگیر شجاعت علی خاں تک آئی تھی۔ شجاعت علی خاں کی آنکھوں میں حاکمیت کا خواب تھا اور یہ خواب انگریزوں کی نسل داری کے سبب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا تھا کیونکہ اب بادشاہوں کا دور نہیں تھا کہ بہادری دکھا کر باجگوار بن جاتے۔ جاگیر بھی اب تھوڑی رہ گئی تھی اس لیے کہ میرٹھ سے سپاہیوں نے جب آزادی کا پہلا ہنگل بجایا تھا اور پھر وہی آ کر بہادر شاہ ظفر کی رسم تاج پوشی ادا کی تھی اور غداروں کی وجہ سے وہ جہاد جھلکتی کہہ رہی ڈوب گیا تھا تو اس کا اثر شجاعت علی خاں کے خاندان پر بھی بڑا تھا لیکن وہ دور رس لنگھوں کے حامل تھے انہوں نے انگریزوں کی حکومت میں شامل ہوجانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور پولیس ایجنٹر کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔ اس عہدے کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ ان کے اندر کی حاکمیت کے جذبے کو تسکین ملنے لگی تھی۔ اسی دوران میں شوکت علی خاں پیدا ہوئے تو ان کی پوری توجہ بیٹے کی طرف ہو گئی۔ بڑی دھوم دھام سے شوکت علی خاں کی رسم نیم اللہ ہوئی اور پھر اسے مکتب میں بٹھایا گیا۔ مکتب میں عربی اردو فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فارسی کو اس زمانے میں دفتری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ وہ بھی دل لگا کر فارسی پڑھ رہا تھا کمراس کی پوری توجہ حافظ روی کے کلام پر مرکوز تھی۔ ابتدائی تعلیم اور پھر ثانوی تعلیم بہرہ دے میں اپنا نمایاں مقام بنا کر شوکت علی خاں نے استادوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ لیکن اب انہیں اور آگے بڑھنا تھا ہی لیے شوکت علی خاں کو کالج کی تعلیم کے لیے بریلی بھیج دیا گیا۔ بریلی کالج میں پہلے کر شوکت علی خاں کو اپنے خیالات کے اظہار کا بہتر موقع ملا اور وہ شعر گوئی کی دنیا میں قدم بھانے کی کوشش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ شوکت علی خاں کی شاعری اپنی جگہ بنانے لگی۔ ان کی شاعری کالج کی چادر یواری سے نکل کر شہر بھر میں پھیل گئی تھی۔ اس کی واحد دیوان کے اشعار میں نمایاں غم و یاس کی تصویر کشی تھی۔ انہوں نے زندگی کو غم سے عمارت سمجھا لیا تھا اور اس غم سے زندگی کا عرفان حاصل کرنے کی جستجو میں تھے۔ دراصل وہ ایک حساس دل کے مالک تھے زندگی کی رساتیوں سے محروم کر کے غم کا خوگر بنایا تھا اور وہ حصول غم کو حصول عشرت سے تعبیر کرنے لگے تھے۔ ان کا غم محفل جذباتی نہیں تھا اس میں عقل و ہوش مندی بھی تھی۔ ان کا غم صرف آنسو نہیں بہا تھا بلکہ سوچنا اور سمجھنا بھی تھا۔ تصورِ عالم ایک آواز سے کہیں بلند تھا۔ وہ زندگی کو دیوانے کا خواب ہی نہیں موت کو زندگی کا ہوش سمجھتے تھے۔ ان کا غم ایک حوصلہ مند انسان کا غم تھا ایک با شعور آدمی کا غم جس کی زندگی نزع کے عالم میں گزری لیکن وہ ان دوستوں سے بھی غافل نہیں رہے۔ ان کے ہاں اسی غم نے ایک مخصوص فضا اور مخصوص لب و لہجہ پیدا کر دیا تھا جس کی مدد سے اردو شاعروں کے لیے نیا بیجام میں بھی ان کی آواز پہچانی جاتی تھی۔ نقادوں نے انہیں سوز خواں بیوہ عالم اور مایہ ناس کا نام لہتا شروع کر دیا تھا۔ 1908ء میں انہوں نے اپیل ایل بی کی ڈگری حاصل کر لی وکالت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پریکٹس کے لیے لکھنؤ کو تھیں۔ یہ شہر پانچویں تھا اور موزوں بھی لیکن یہ شہر ان کے لیے سازگار ثابت نہ ہوا۔ وکالت چل نہ سکی۔ ٹھنکی ہوئی اس وکالت کو انہوں نے کئی سال تک سمجھا لیکن جب حالات بہت زیادہ خستہ ہو گئے تو پھر نسل مکانی کی بٹھائی۔ وہ بریلی آئے بریلی آ کر سوچا تھا کہ اب قسمت یادری کرے گی۔ مگر یہاں بھی اقبال مندی حاصل نہ ہوئی اور وہ اسی طرح غربت کے شکنجے میں جکڑے رہے۔ بریلی میں بھی جب قسمت نے ساتھ نہ دیا تو انہوں نے پھر ایک بار نسل مکانی کا ارادہ کیا۔ اس بار انہوں نے اکبر آباد کو منتخب کیا تھا لیکن اس شہر میں وہ زیادہ دن نہ ٹھہر سکے اور پھر وکالت کی جانب ہجرت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ 1926ء میں وہ حیدر آباد پہنچے مہاراجا سرکشن پرشاد نے انہیں اپنے دربار میں شامل کر لیا۔ کشن پرشاد کا تعلق تھا وہ وہ نظام حیدر آباد کی سلطنت کے صدر تھے۔ انہی دنوں ان پر گوہر ٹوٹ پڑا۔ کچھ دکھ کی ساسی ہر غم میں ساتھ بھانے والی ہمیشہ ہمیش کے لیے ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ ابھی اس غم کے گرداب سے وہ نکل بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور گردوالم ٹوٹ پڑا۔ حیدر آباد کی ادبی مفلوں کی سرپرستی فرمانے والے مہاراجا سرکشن پرشاد وفات پا گئے۔ 1940ء کا ذکر ہے۔ شام کے وقت وہ اپنے دوست قاضی عبدالغفار کے گھر پہنچے۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں۔ ”ایک دن شام کو آئے مسکراتے ہوئے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکالا کہنے لگے قاضی! اب اس ایک چیز سنانے آ یا ہوں۔ انتظار کر رہا تھا کہ کب یہ لکھی جائے گی آخر آج صبح چار مصرعے موزوں ہو گئے۔ میں نے کہا ”آج خیر ہے کیا تم صرف اس کے سنانے کے لیے گھر سے چل کر آ گئے جبکہ ہمیشہ تمہاری خوشامدیں کیا کرتے ہیں اور تم دوسرے نہیں سنا تے ہو۔“ وہ کہنے لگے ”ذرا سن تو میری قطع تاریخ وفات ہے۔“

طغیان ناز میں کہ بہ لوح مزار او

”غدا نہ داشت سے سن 1360ھ لکھا ہے) میں (قاضی عبدالغفار) نے پوچھا ”کیا کہہ دیا۔“ کہنے لگے ”بس کچھ نہ کہو! یہ بالکل صحیح تاریخ ہے۔“

”غدا نہ داشت“ سے گھر آگئے اور ”طغیان ناز“ کو نہیں دیکھتے۔ 26 اگست 1941ء کو بالآخر ان کی منتا پوری ہو گئی۔ یعنی 1360ھ میں وہ راہی ملک عدم ہو گئے۔ اس عظیم شاعر اپنی موت کی پیش گوئی کرنے والے کو ہم فانی بدایونی کے نام سے پہچانتے ہیں

☆☆☆



قارئین کرام!
السلام علیکم!

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

ایک بزرگ جن کی عمر تو بچا نوے سے کم نہ ہوگی، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خانقاہ سے کبھی باہر نکلے ہی نہیں۔ ایک دن کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور کہا۔ ”ہمیں حکمت بھری باتیں بتائیں۔“

بزرگ نے اپنی مندی مندی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اُدھر میرے منہ میں دیکھو کیا نظر آتا ہے؟“ ان میں سے ایک نے دہانے کے اندر تک نظر دوڑائی اور کہا۔ ”زبان دکھ رہی ہے۔ ایک دو دانت بھی ہیں۔“ بزرگ نے کہا۔ ”دانت اور زبان میں پہلے کون آیا؟“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ زبان بچے کے ساتھ آتی ہے اور دانت بعد میں نکلتے ہیں۔“ بزرگ نے کہا۔ ”گویا زبان زیادہ عمر کی ہوئی۔ اب یہ بتاؤ کہ ان دونوں میں نرم کون ہے اور سخت کون ہے؟“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”سیدھی سی بات ہے۔ دانت سخت اور زبان نرم ہوتی ہے۔“ بزرگ نے مسکرا کر کہا۔ ”کچھ سمجھ میں آیا؟ دانت بعد میں نکلا لیکن سخت ہونے کی وجہ سے پہلے گر گیا اور زبان نرم ہوتے ہوئے بھی ساتھ رہی۔ اس لیے یاد رکھنا سخت بنو گے تو جلد مٹ جاؤ گے اور نرم رہو گے تو آخر تک زندہ رہو گے۔“

لیکن اس وقت ہمارا معاشرہ بالکل الٹ چل رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جو نرمی، شائستگی، رواداری اور تحمل ہمارے معاشرے کی پہچان تھی وہ دم توڑنے لگی ہے۔ کیا ہم تباہی کی طرف جا رہے ہیں؟ اگر ہمارا معاشرہ نہ بدلاتو ہم بھی دانت کی مثال بن جائیں گے۔ اس لیے ہمیں نرم بننا ہوگا۔

شعبہ اشتہارات

نمبر اشتہارات: محمد ہزار خان 0333-2256789



قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زیر سالانہ 800 روپے

پبلشر و پریپر انٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیر II ایکس ٹیشن

پینس کٹرل ایریا میں کوئی روڈ

کلیں 75500

جمیل حسن

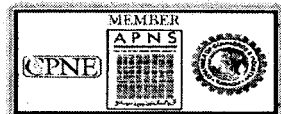
پرینٹر:

مطبوعہ: ابن جن بزنس پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خفہ کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone : 35804200 Fax : 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



معراج رسول

شہر خیال

مدیر اعلیٰ



ہمارا نام محمد شاہد کا تبصرہ پورے والا ہے۔ ”جولائی کا شمارہ عید سے قبل مل گیا تھا۔ ہم پاکستانیوں کی اجتماعی عید بھی کیا تھی۔ پہلے پانچواڑ کوئٹہ اور کراچی میں دہشت گردی کے واقعات ہوئے اور پھر احمد پور شرقیہ میں شینکر کا ہولناک واقعہ ہو گیا۔ ادارے میں معراج رسول صاحب نے جس نکتے کی طرف اشارہ کیا وہی نفسیات احمد پور شرقیہ واقعے میں نظر آتی ہے۔ جب سیاستدان لوٹ مار کی دولت سے بچ و عمرہ کریں گے تو غریب آدمی بھی جو کر سکتا ہے وہ کرے گا۔ یک ہی سرگزشت میں شیخ سعدی کی کہانی گویا کوزے میں دریا بند کر دیا۔ واقعی شیخ سعدی کی داستان و داستان نے انسانی کردار کے حوالے سے بے بہا خزانے دیئے۔ ”عصر خیال“ میں نزابت افشاں مہرورہ کرسی صدارت پر تھے۔ آپ کا مطالعہ زبردست ہے۔ مختلف شعراء کی زندگیوں کے عقلی پہلوؤں پر کوئی دلچسپ تحریر لکھیں۔ ”عصر خیال“ میں ندیم اقبال کا اسی میل پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ عبد الجبار روی آپ آج کل رابطے میں نہیں ہیں۔ ذیشان شیخ میرے ذہن میں نہیں آ رہا اگر آپ کے پاس میرا مجر تھا تو رابطہ کر لیتے۔ سعید احمد چاند مختصر تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ مثنیٰ محمد عزیز اب باقاعدگی سے آئے گا محمد سلیم قیصر ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد برائی نصیب فرمائے۔ سیف اللہ بھائی ویسے پرندے اتنی جگہ نہیں گھیرتے کہ اس کے لیے مکین پریشان ہوں۔ ہاں ان کا خیال رکھنا اور دیکھ بھال کرنا آسان

آسان بھی نہیں۔ اس دفعہ بھی ظاہر ہو کر اور سدرہ بانو ناگوری غیر حاضر تھیں۔ اس دفعہ ڈاکٹر سجاد امجد کی جگہ ضیاء نسیم بلکراہی نے بڑے دانشندانہ انداز میں ”دانشمند دیوانہ“ لکھ کر پوری کی۔ ابن البیتشم کی زندگی پر ایک بہترین سرگزشت تھی۔ آج ہمیں مثنیٰ بھی جدید ترقی نظر آ رہی ہے اس میں مسلمان سائنسدانوں کا کلیدی کردار ہے۔ زویا اعجاز ”عشق کامل“، عیسیٰ خوب صورت روحانی تحریر کے ساتھ موجود تھیں۔ حضرت اویس قرنی کی ایمان افروز زندگی تمام مسلمانوں کے لیے سرچشمہ ہدایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق تو انہیں تھا ہی ان کی اپنی والدہ سے محبت کی مثالیں بھی دی جاتی ہیں۔ واقعی جن کی منزل عشق حقیقی ہو انہیں دنیا اور دنیا کی باتوں سے کیا لیتا۔ اسلامی تاریخی ناول نگاری میں نسیم مجازی کا کوئی جانی نہیں۔ انہوں نے بہت خوب صورت ناول تحریر کیے۔ وسیم بن اشرف نے ان کی زندگی کے اہم گوشوں سے آگاہ کیا۔ خصوصاً لکھنے کے حوالے سے انہیں جن مشکلات سے گزرنا پڑا اسے پڑھ کر ان کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔ تنویر ریاض کی تحریر ”قوانی“ دلچسپ اور معلوماتی تھی۔ انہوں نے قوانی کی تاریخ اور پاکستان کے قفر یا تمام ہی معروف قوانوں کے بارے میں مختصر مختصر لکھا۔ مسرور انور اردو ادب کا ایک معتبر نام۔ راشد لطیف نے اس بڑے شاعر کی زندگی اور زبردست تحریر لکھی۔ فلمی گیتوں میں تو وہ ایک منفرد مقام رکھتے ہی تھے مگر ان کے لکھنے کی نغموں نے ایک سحر طاری کر دیا۔ سوتی دھرنی اللہ رکھے، اپنی جان نذر کروں اپنی وفا پیش کروں اور جگ جگ جیے ان کے لازوال قومی نغمے تھے۔ انور فرہاد اس دفعہ ”شہنشاہ جہان بات“، محمد علی کی زندگی کی سرگزشت لکھ لائے۔ اتنی تفصیلی اور زبردست انداز سے اس عظیم اداکار کی کہانی لکھنے پر انور فرہاد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سلمیٰ اعوان کا شمار اردو ادب کی بہترین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ خصوصاً خوب صورت سفر ناموں میں وہ الگ ہی انداز رکھتی ہیں۔ اس دفعہ نالسا کی جیسے بڑے مصنف کی بیوی کی کھانا سنا رہی تھیں۔ ندیم اقبال کا سفر نامہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ ان مصائب و مشکلات کا بھی خوب صورتی سے احاطہ کر رہا ہے جو دیار غیر میں پاکستانیوں کو پیش آتی ہیں۔ خالد قریشی کی کبوتری اقبام پر دلچسپ تحریر بھی۔ سرگزشت ایک اور خاص نمبر لا رہا ہے یہ اعلان پڑھ کر خوشی ہوئی۔“

☆ سید امتیاز حسین بخاری کی شالی سرگودھا سے آمد۔ ”کافی ماہ کے بعد آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہونے کی جرات کر رہا ہوں۔ میں ماہنامہ سرگزشت باقاعدگی کے ساتھ غور و فکر اور مدققت نظر سے پڑھتا ہوں لیکن ادبی اور صحافتی و ثقافتی مصروفیات کی وجہ سے ہر بار خط نہیں لکھ سکتا۔ سرگودھا میں سرگزشت بھی ہی لیت آتا ہے اور مقررہ تاریخ پر نہیں ملتا ہے۔ خصوصی توجہ دے کر ہماری اس شکایت کا ازالہ کریں۔ بانی ماہنامہ سرگزشت ماجا بالا اور وطنی مشرقی پنجاب کے حریت پسندوں کو تو بڑے ناخوش سے پیش کر رہا ہے لیکن چکڑا لٹل میا نوالی کے حریت پسندوں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں ماجا بالا اور چکڑا لٹل میا نوالی ہی واحد علاقے تھے جو مثنیٰ دلیر اور شجاع جنگ جو حریت پسندوں کے علاقے تھے۔ میں نے اپنے قلم برداشتہ

مضمون سرزمین چٹڑالہ کے حریت پسند میں یہ سب اجاگر کرنے کی کاوش کی ہے۔ میں اگرچہ جانتا ہوں کہ یہ مضمون ناقابل اشاعت ہے اور سرگزشت کے معیار سے ہم آہنگ نہیں ہے لیکن میں نے صرف یہ بات آپ کے مطالعہ میں لانے کی سعی نہیں کی ہے تاکہ آپ کو بخوبی علم ہو سکے کہ حریت پسند صرف ہمایا بالا میں نہیں تھے بلکہ سرزمین چٹڑالہ میں بھی تھے اور ان سے بھی زیادہ معروف تھے۔ ان کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیلی۔ برطانوی حکومت ان سے لرزہ بردار امر رہتی تھی۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ نغمہ نگار اور کہانی نویس جس قادی نے ملک طور خان اعموان پر بھی ایک لمبی کہانی لکھی تھی اور احمد راجی تویر نقوی شیر گامی نے نغمے لکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی مگر کوئی قلم ساز یہ کہانی قلمباز نے پر رضا مند نہ ہوا۔ اس کہانی میں ملک طور خان اعموان کو افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے مگر وہ حقیقت تھا افسانہ نہیں تھا۔ چراغ بالی پر ایک قلم بنائی گئی ہے جو میں نے دیکھی ہے وہ بھی افسانوی ہے اور حقیقت سے دور ہے مگر میں نے جو مضمون لکھا ہے وہ حقیقت کے قریب ہے، افسانہ نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے بزرگوں سے سنا ہے وہ یمن و عن کا دیا ہے ہماں حریت پسندوں کا ریکارڈ تھا توں میں موجود ہے مگر تاریخی کتابوں میں موجود نہیں ہے اگر ہوتا تو اس سے استفادہ کیا جاسکتا تھا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ ہجر اور احمد حریت پسند ملک محمد عالم اعموان کو میں نے 1964ء میں چٹڑالہ میں دیکھا تھا میں اس وقت جماعت ہشتم کا طالب علم تھا۔ اتنا شعور نہیں تھا جب شعور آیا تو وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ یہ 1970ء کی بات ہے اور پھر وہ چند سالوں کے بعد وفات پا گئے۔ یادداشت بوڑھا ہونے کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی وہ جبک لاشی کے سہارے چلتے تھے لیکن میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ان کے انتہائی قریبوں سے حاصل کیا ہے۔ ملک طور خان اعموان ہمارے نزدیکی گاؤں چک نمبر 37 شمالی میں ہزاروں بار آئے۔ وہ چارنٹ قد کے تھے۔ لیکن انتہائی دلیر تھے۔ محرم عرف محمد و نسیم کو تو انوار مضبوطی سے رکھتے تھے اور چوٹ قد رکھتے تھے۔ غضب کے بہادر تھے۔ رانگل اور کارنٹس بنانے کا فن جانتے تھے۔ اکثر لوہے کی کرسیاں بناتے تھے۔ لاوہ کے ایک جاگیردار کو لوہے کی کرسیاں بنا کر دیں مگر اس نے مزدوری بہت ہی کم دی اس پر ان کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے اپنے فن آہن گری سے رانگل بنائی اور جاگیردار کو جب وہ مہیا نوالی سے لاوہ گھر آ رہا تھا نکل کے پہاڑوں سے نیچے جہاں اب محل ڈیم ہے جو 1903ء میں بنایا گیا تھا وہاں اس نے گھوڑے پر سوار جاگیردار کو کئی کر دیا اور مفرد ہو گیا۔ ملک عام خان اعموان ساڑھے پانچ فٹ قد رکھتے تھے اور جسمانی طور پر تو انور مضبوط تھے مگر میں نے ان کو عام پیری میں دیکھا۔ چٹڑالہ میں اس وقت کافی تعداد میں مفرد تھے مگر یہ کسی کو بھی ساتھ نہیں لاتے تھے۔ یہ تین ہی اکٹھے اپنے ٹارگٹ اور ہدف تک آتے تھے اور کارروائی کرتے تھے۔ کارروائی سے پہلے پولیس اور متعلقہ ٹارگٹ کو ضرور بتاتے تھے۔ ماضی قریب میں چٹڑالہ سے ملک سرخرو اعموان اور ڈھرال سے محمد خان اعموان ڈاکو بنی گرامی بہادر اور شجاع گزرے ہیں جو کہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ (ڈاکو اور حریت پسندوں میں فرق ہوتا ہے)۔“

☆ منشی محمد عزیز مئے نے لڈن و ہاڑی سے لکھا ہے۔ ”ایک محلّی داستان شیخ سعدی پر تھی۔ سچ بتاؤں کہ جولائی کے شمارے کی ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک تھی اور مجھے سمجھ نہیں آتی کہ کس تحریر کو آپ پر رکھوں، بہر حال اپنی ناقص رائے کے مطابق زویا اعجاز کی ”عشق کامل“ ناپ برری اور اسے ابتدائی صفحات پر لگنا چاہیے تھا۔ ضیاء نسیم بکری بہت عرصے بعد سرگزشت میں حاضر تھیں۔ ابن اثیم واقعی بوش مند دیوانہ تھا جو کہ اپنی چالاکی کی بدولت عراق سے مصر شفٹ ہو گیا لیکن افسوس کہ اپنے خواب کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ہوائے مجاز ایک کرائم رپورٹر کے قلم سے اتنا عمدہ اور اعلیٰ مضمون ادا وہ نسیم بن اشرف۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ بہت خوب، نسیم مجازی کے یہ سب ناول میں نے اس عرصہ میں پڑھے تھے جس عرصہ میں نیچے شیشی، نازن اور عمر و دیار کی کہانی پڑھتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ میرے فیورٹ لکھاری بن چکے تھے اور ان کے حالات زندگی سے آگاہی حاصل کرنا میرا خواب تھا جو کہ سرگزشت کی بدولت شرمندہ تعبیر ہوا۔ ”قوتی“ کے عنوان سے تو پریرا میں ایک سیر حاصل مضمون لائے۔ بہت اچھا نکل قوتوں کے بارے میں جان کر لیکن مہر علی شیر علی قوتی پر اردوان کا ذکر نہیں تھا۔ شاعر خوشنوا بھی بہت اچھی یادوں پر مشتمل تحریر تھی۔ شاہد لطیف صاحب کی ”شہنشاہ جہاں بات“ انور فرہاد کے قلم کا شاہکار محمد علی واقعی مضمون میں پرچلنا ہے۔ ”شہنشاہ جہاں بات“ تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ”سلے کا دودھ“ ایک سبق آموز تحریر تھی۔ یہ ملک اللہ کی چھوٹی سی نیکی کا صلہ اس کی توقع سے بڑھ کر دیتا ہے۔ ”شیشال سے ٹورنٹو“ کے سفر نامے میں گھر بیٹہ کرین، بینن کی مکمل سیر کر لی اور ساتھ میں سرجی کی کہاوٹیں، کیا بات ہے۔ ”ناسور“ کے آخر میں سپنس پیدا ہو گیا ہے لیکن میرے خیال میں عاصمہ کے گھر سے بھاگنے والی بات غلط ہے۔ سوردق کی کہانی ”قیمت“ خود پسند اور اپارٹ لڑکیوں کے لیے سبق آموز تحریر ہے۔ ”چھتار درخت“ ایک باہمت اور پر عزم لڑکے کی داستان جس نے اپنی محنت سے منزل حاصل کر لی۔ کیریماسی کی ”دیر آئے“ فضول خرچ افراد کے لیے سبق آموز تحریر ہے۔ مفرور کا انجام خلاف توقع تھا۔ حیرت انگیز، عاجز میں شیر علی بے جا رہ سیاسی کارکن بن کر حرام موت مارا گیا۔ اعجاز احمد، مہربان کے توسط سے فراڈے اور دودھ لگوگوں سے محتاط رہنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ ”انقزام“ میں مریم میرا اپنا انتقام بنی نظر آتی جس نے اپنی ہمت اور شوہر کی مدد سے دشمنوں کو کیفر کر دیا رک پہنچا دیا۔ ”عشیر خیال“ کی صدارت نزابت افشاں کے نام تھی۔ مبارک باقبول فرمائیں۔ اعجاز حسین سخا، رانا محمد شاہد، آفتاب نصیر اشرفی اور سید محمد رضا نقوی نے بھی بھرپور تبصرہ کیا۔ میرا خط بھی شامل اشاعت تھا۔ بہت شکریہ۔ عیدم اقبال سرا آپ کے سفر نامے و نغمے بہت دلچسپ اور مزے کے ہیں جنہیں بار بار پڑھنے کو بھی جاتا ہے۔“

☆ محمد عمران خان و فیلی نامدار بکھر سے رقمطراز ہیں۔ ”بڑی کہانی میں معراج رسول صاحب نے معاشرے کو آئینہ دکھایا۔ ہر طاقت و رکزور کو اور رکزور اپنے سے کمزور کو دبانے کے چکر میں ہے۔ ہمارا معاشرہ نہ جانے کس طرف چل نکلا ہے لیکن اگر سوچیں تو ہم اچھے معاشرے کی طرف بڑھنے کا دعوے کرنے کے حقدار بھی نہیں ہیں، حالات کا رونا تکب تک روئیں۔ ”عشیر خیال“ میں اعجاز حسین سخا صاحب نے میدان مار لیا۔ اعجاز حسین سخا ہماری حاضری اب انشاء اللہ مستقل ہوگی۔ ملک ثابت شاہ، غلام حسین ضیاء، عبدالباقی روری، رانا محمد شاہد، عریضہ، آفتاب احمد نصیر اور سردار بانوان سب کے تبصرے بھی خوب تھے۔“

☆ ایشیہ کی سمندری سے گل افشانی۔ ”اس بار معمول میں بھی سی تبدیلی آئی اور ڈائجسٹ جا عمارات کو مل گیا۔ سرورق عید کے رنگوں سے سجا تھا۔ مہندی، عید مبارک کے ساتھ گھنٹوں میں سر دیئے بیٹھا تھا ساچہ شاید سب کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ عید کی خوشیوں میں اہم اکثر شوق اور محروم لوگوں کو بھول جاتے ہیں۔ ”عصیر خیال“ میں مجھے یاد رکھنے کا شکر ہے۔ سبھی احباب کے تہرے اچھے تھے۔ داستان گو میں شیخ سعدی کا ذکر پڑھ کر دل چاہا کہ ان پر تفصیلی مضمون پڑھا جائے۔ کیا نامی میں ایسا کوئی مضمون یا کہانی شائع ہوئی ہے۔ سال اور مہینا بتا دیں تو نوازش ہوگی۔ (دسمبر 1996) عنوان حکمت سعدی)۔ دانش مند یونان اچھی تحریریں لکھیں ذرا لکھی سی محسوس ہوئی۔ توخیر ریاض کی تو ابی بہت پسند آئی۔ اچھے صابری مرحوم کا ذکر ایک بار پھر افسردہ کر گیا۔ ”شہنشاہ جذبات“ پڑھ کر بھی بہت حرا آیا۔ ”صلے کا دودھ“ کا فی شاندار ہے۔ ”دکھی عورت“ نے بھی دکھی کیا۔ ”پیام بر“ سے ذرا سی بوریٹ محسوس ہوئی۔ پہلی پہچانی کا نتیجہ عورتوں کے لیے ایک بہترین آئینہ بھی فرمان خان کی ”معدود“ بھی پسند آئی۔ عاجز، مہربان، غلط راست، محسن اور انتقام بھی اچھی تھیں۔ اختتام پر تفصیلی ذکر کروں گی شمارے کی بہترین تحریروں کا ”عشق کامل“، ”جنگ بنیوں میں بہترین تحریر ہے۔ ایک ایسے عاشق رسول کی سرگزشت جو زیارت رسول کی سعادت حاصل نہ کرنے کے باوجود کمانی کا درجہ پانے میں کامیاب ہوئے۔ اسلامک ہسٹری کچ کر نہایت دل گردے کا کام ہے کیونکہ بہت اختلافات ہیں روایات میں۔ تحریر میں کہیں بھی کسی ایک مسلک یا فرقہ کے لیے جانبداری محسوس نہیں ہوئی۔ بابو یہ اور خسرو کی میزب آمد، لوہار سے لنگھوار مسجد نبوی کے مناظر کا بیان انھیں کم کر گیا۔ بہت ایمان افروز تحریر بھی۔ ”جنگ پرا نوصطیہ کیے۔“ کا قابل فراموش تجربی۔ ”ہوائے تجاز“ دوسرے نمبر پر رہی۔ شیم جازی کو کہہ رہی تھی تو قہور ابہت پڑھا ہے۔ ان کا لکھی میں سرفرا لا واقعہ ناول ”پردہ کی درخت“ میں بھی موجود تھا۔ بہت خوشگوار حیرت ہوئی۔ ”شمال سے روزن“ اچھی جا رہی ہے۔ کبیر عباسی کی دیر آید جیجائیوں میں بہترین تھی۔ عورتوں کے لیے بہت سبق آموز اور عملیہ معاملات میں نکات شاعری، شجھداری اور کپرو مائزہ کیلئے کادرس۔ عورتیں ہی گھربانی ہیں اور وہی گھربانی بھی ہیں۔ انجیل نمبر کی نوید سنی۔ انتظار بڑھ گیا ہے۔ اکثر قارئین دوسری سلسلہ وار کہانی کا ذکر کرتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ ایک اور کہانی شامل کر لی جائے۔ اگر یہ کہانی زویا اگاز یا کبیر عباسی سے لکھوائی جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔“

☆ راحت و قاراجیوت لکھتی ہیں۔ ”کہانی ار سال خدمت ہے۔ یہ کہانی کس طرح پوری ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک الگ کہانی ہے۔ شکر ہے سہل ہوئی۔ اب اللہ سے دعا ہے کہ آپ کو پسند آ جائے کوئی غلطی ہوگی ہو تو آپ درست کر لیجے گا۔ اسکول سے تو چھٹیاں ہو گئی ہیں مگر گھر کے اتنے ذمہ سارے کام ہوتے ہیں کہ وقت نکالنا ہی بہت بڑا مسئلہ ہے۔“

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی کوگر کی کراچی سے آمد۔ ”جس ملک میں کروڑوں اربوں کا فتنہ چند فیصد کی ریکوری کے بعد جائز ہو جاتے ہیں۔ جہاں جیل کی تلاشی لی جائے تو دولت مند قیدی عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہوں جس ملک میں سیاسی رہنما جو رکن اسمبلی بھی ہوں اپنی گاڑی سے ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر کو کھل دے اور سید شوک کر دیت کی آفر کر کے لو اچھین کی تحقیر کرے، وہاں ایک پولیس والا غریب پھل فروش کے ٹھیلے سے چند پھل لینے میں عداوت کیونکر محسوس کرے گا۔ آپ بھی اپنا دل نہ چلایا کریں اور نہ بے ثبات دنیا کے شکر انوں کو بے شمار ثمرات سینے پر کڑھا کریں کہ ان کا جج و عمرہ و روزہ کیونکر مقبول ہوگا۔ خدا آپ کو لمبی عمر بھی دے اور صحت بھی کہ آپ اپنے صھے کی شیخ چلا کر اپنے انسان ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ”عصیر خیال“ میں واسطے سے پہلے ”داستان گو“ کی کئی۔ کانی ستارن داستان تھی۔ شیخ سعدی کی حکایات روزانہ کی نہ کی حوالے سے نظر سے گزرتی رہتی ہیں اور ہم حکمت کے موتی چنے رہتے ہیں۔ ”عصیر خیال“ ساتھیوں کی جگہ مٹے سے قوس قزح کا منظر پیش کر رہا تھا۔ تمام نامی گرامی ستارے اپنی اپنی روشنی بکھیر رہے تھے۔ نزات افشار غیر محتاط تنقید کے باوجود سب سے نمایاں تھے۔ اچاز حسین شہار ان کے قریب ترین حریف تھے۔ پری زاد واحد خاتون رکن تھیں۔ ندیم اقبال کو اپنے درمیان پاکر ہم تو بہت فخر اور خوشی محسوس کرتے ہیں اور انھم قاروق ساطی بھی ایسی ہی خوشی دیتے ہیں۔ سبھی نامہور کے ایاز راہی بھی ہمارے اپنے تھے۔ رانا محمد شاہد کا تہرہ ہمیشہ کی طرح پرمغز تھا۔ خوشی ہوئی کہ وہ بھی ماہانہ شخصیات کی جدائی پر ہماری طرح افسردہ تھے۔ احمد خان تو حیدی نے ڈاکٹر صاحب سے جناب الیاس بیتا پوری کی سرگزشت کی فرمائش کی ہمیں بہت اچھا لگا۔ عبدالبہار روی انصاری، اولیس شیخ، ذیشان شیخ، محمد ابراہیم، م انوار اور سعید چاند کے خیالات بھی بہت بھائے۔ منشی محمد عزیز نے کی سرگزشت کے لیے بھاگ دوڑ کو سلام۔ اپنا تہرہ پڑھ کر محظوظ ہونا ہمارا حق تھا ہی سید محمد شاہ بھی خط بھجوانے کے ہتھدار لگے۔ محمد سلیم قصیر، جیل کی زندگی کو آپ نے ثبت کیا ہوا ہے اور آپ کے تہرہ میں اس کی جھلک نمایاں ہے۔ کراچی کی سینٹرل جیل کی رنجر زحلاشی کے بعد جو قصور سامنے آئی ہے اگر مٹان میں بھی وہی سب کچھ ہے تو پھر جیل جالنی جہت تو نہ ہوئی تا۔ محمد ابراہیم کو خوش آمدید۔ فقیر غلام حسین خیام شرف القہور کو شیخ علم قاروے رہے تھے اور ساتھ ہی اپنی سند بھی عطا فرما رہے تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ حنیف ادیب ساغر صدیقی کے فتن ہیں جان کر ان کی دردمندی کے قائل ہو گئے۔ امیر حزرہ اشرف کی خواہش پر ان کے دوست وارث اور شاہ زیب ”عصیر خیال“ میں حاضر ہوئے ہم سب انھیں ویکٹہ کہیں گے۔ سیف اللہ کو بھی سلام۔ ”عصیر خیال“ میں دلی دلی سرگوشیوں سے محسوس ہوا ہے کہ ایک اور سلسلے وار کہانی کی تلاش شروع ہو رہی ہے۔ اٹھائیس محرکۃ الاراء کتابوں کا مصنف ابن الہیثم اگر دریائے نیل پر عرق ریزی سے کام کر کے منصوبہ بندی نہ کرتا تو مشہور زمانہ نہر سوز ہرگز تیار نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال بعد ابن الہیثم کا منصوبہ کامیاب ہوا۔ ذہانت ہو تو ایسی ہو۔ ”عشق کامل“ حضرت اولیس قرنی کے حضور اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کامل عشق کی روح پرورد داستان تھی جو ہمارے اعمال کے لیے عبرت انگیز کہامت کی سرخروئی کے لیے ہمارے آفاقی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

قریبانی و اخلاص کی انتہا کر دی، ایک عاشق صادق کو ہماری بخشش کا امین بنا دیا اور ہم ہیں کہ آلائشوں سے گھوڑے پر تیسیم حجازی کا تذکرہ سر پر اتر تھا ایک شاعر اور مصنف کے عہد میں ہمارا اس کی تخلیق سے مستفید ہونا ہمارے لیے اعزاز سے کم نہیں۔ ”قوالی“ میں سب ہی نمایاں نام تھے جنہوں نے اپنے اپنے ادوار میں ہمیں روحانی طور پر سرشار کیا۔ ”شاعر خوش نوا“ سرور انور کے مقبول گیتوں کی فہرست نے تو حیران کر دیا۔ کیسے کیسے گیت انہوں نے لکھے۔ ”شہنشاہ جذبات“ محمد علی کی داستان حیات سرگزشت ہی کی بدولت ہمیں ازبر ہو چکی ہے۔ داستان کو کافرض ہے کہ پبلک پراپرٹی فنکاروں کی زندگی کے ہر پہلو پر بات کریں۔ محمد علی سے پہلے زیبا صاحبہ کی شادی ادا کا رسد میر سے بھی ہوئی تھی اور اپنی جس بیٹی شمیم کو انہوں نے شادی کے بعد محمد علی سے شہر کیا۔ کیا وہ ادا کا رسد میر کی بیٹی ہیں یا زیبا صاحبہ کی کسی اور سے بھی شادی ہوئی تھی؟ بلاشبہ قلم انڈسٹری کی طلی زیبا جوڑی کی خوب صورتی کی مثال دنیا بھر میں کہیں اور نہیں مل سکے گی۔ ”شمشال سے نونو“ تک حسب معمول شاعر اور جب کہ ”ناسور“ حسب توقع..... ”ہوت موت فخر“ کا شہادت سے انتظار ہے۔“

✽ امیر حمزہ اشرف کی خوش چینی کو رب نواز ملتان سے۔ ”سرگزشت گرم ترین اور جس زدہ ماحول میں ملا۔ سرور قیام عید کی مناسبت سے ٹھیک تھا۔ مجھے سرگزشت سے اسی طرح عشق ہے جس طرح بھونڈے کو پھول سے، پھول کو چاند سے اور سرور کو سوانہ سے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اگر سرگزشت میری زندگی میں نہ آتا تو زندگی کتنی بے رنگ اور بور ہوئی۔ اس بار کا ادارہ میرے تو بالکل بھی پلے نہیں پڑا، پتا نہیں انگل کیا پیغام دے رہے تھے۔ ”مغیر خیال“ میں تاکا جھانکا کرسی صدارت اس بار نزاہت افشار کے حصے میں آئی۔ مبارکال جی۔ کچھ نئے دوست حاضر تھے بری زاد جہاں، محمد ابراہیم اور ذیشان شیخ صاحبان کو تہہ دل سے خوش آئی۔ اس بار میرے ہم شہری محمد سلیم قیسر بھی اپنے پیارے سے تہرے کے ساتھ حاضر تھے۔ باقی طاہرہ گلزار اس دفعہ بھی غیر حاضر تھیں۔ خوب صورت تحریر ”عشق کامل“ پڑھی۔ مختصر مزیدیا اعجاز نے حضرت اویس قرنی سے متعلق ایمان افراد مضنون لکھ کر ہمارے علم اور حرارت ایمانی میں اضافہ کیا، اگر اسی طرح ہر ماہ سرگزشت میں کوئی نہ کوئی اسلامی تحریر شامل کی جائے تو کیا بات ہے۔ وسم اشرف کی تحریر ”ہوائے حجاز“ میں بعض مقامات پر بہت الجھاؤ تھا اس لیے تحریر کے صحیح لطف سے محروم رہے۔ پڑھنے کے بعد فطحتی باقی رہی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی کی ”ناسور“ زبردست جاری ہے۔ سچ بیانی ”غلط راستہ“ پڑھی۔ عورت بھی خدا کی عجیب تخلیق ہے کہیں انتہائی وفادار، شرم و حیا کا پیکر اور کہیں انتہائی خود غرض اور سکرو فریب کی علامت۔ رابعا ایک شاعر عورت تھی جو مردوں کو بے وقوف بنا کر پیسے ہٹاتی تھی۔ بہت عبرتناک سچ بیانی تھی۔ ”دیر آید“ بوڑھی بیوی کی بے لگام خواہشات اور شاہ خرچی نے ایک خوددار شاہر کو رشتہ جیسی لعنت لینے پر مجبور کر دیا کہانی پڑھنے کے فوراً بعد ہاتھ بے اختیار دغا کے لیے اٹھ گئے۔ اسے میرے پروردگار بندہ ناچیز کو کثر شریک حیات مہر و شاکر دینا پڑا نہ میں تو کنوارہ رہتا منظور ہے۔ باقی تحریر بھی میں زبردست تھیں۔ بھائی عمران جو ثانی، احسان سحر، ناصر حسین رند، محمد امجد رضا، باجی بشری افضل، صابر نونو آپ سب لوگ کہاں کم ہیں آپ سب کے بنائے محفل ادھوری و ادھوری سی ہے۔ پلیز اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔ آخر میں سب کو السلام علیکم۔“

✽ نونو نزاہت افشار کا خط مہرہ فتح جگ سے۔ ”فیض صاحب نے کہا تھا کہ ”جیسے دیرانے میں چپکے سے بہا کر آجائے“ عید سے ایک دن قبل سرگزشت کو پاکر ہمیں بھی یہی محسوس ہوا۔ اس بار ایک طلی سرگزشت میں بائبل شیراز شیخ سحدی کے بارے میں پڑھنے کو ملد سحدی پر ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں، جن دوستوں نے نہیں پڑھا تھا، وہی اب بھر کے مستفید ہوں گے۔ بوستان سحدی اور گلستان سحدی ہم نے ششم میں پڑھ لی تھیں۔ ادارہ سرکاری اہل کاروں کی فرعونیت کو خوب صورتی سے عیاں کر رہا تھا۔ اس بار ڈاکٹر صاحب کی بجائے تسنیم صاحب کی تحریر پڑھنے کو ملی۔ اچھی تحریر تھی۔ ابن ابیثم حیرت انگیز دماغ رکھتا تھا۔ ہم یوں کیرا انہوں ہی نے ایجاد کیا تھا۔ ان کی تعلیمات و ہدایات کی روشنی میں ہی ”راجرینکن“ نے دور بین ایجاد کی۔ راجرینکن نے اپنی تعنیفات میں جگہ جگہ ابن ابیثم کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ”عشق کامل“ میں زویا اعجاز نے نامور صحابی حضرت اویس قرنی کے حالات زندگی کو بہت ہی شاعرانہ انداز میں تحریر کیا۔ ان کی زندگی ہمیں اطاعت رسول کا درس دیتی ہے۔ ”ہوائے حجاز“ اچھی تحریر تھی لیکن نیم حجازی پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے فردن اولی کے مسلمان بیروز کا ذکر اس طرح کیا کہ ان کے ساتھ روانوی قصے کی منسوب کر دیے جنہیں بڑھ کر آدمی سوچے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ہمارے نامور ہیرو ذرا بے ہی تھے؟ اس سے ناول کی شفاخت تو برہتی ہے لیکن اعتراض بالا درست معلوم ہونے لگتا ہے۔ ”قوالی“ پر تنویر باض کی تحریر زبردست تھی۔ ”شاعر خوش نوا“ زبردست معلوماتی تحریر تھی لیکن مختصر تھی۔ ”شمشال سے نونو“ اپنے عزم پر ہے۔ باقی تحریر بھی میں ماشاء اللہ بہترین تھیں۔ ”ناسور“ واقعی میں ناسور بنی جاری ہے۔ نونو نے فہیم کی بات نہ مانی اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ”قیامت“ بہترین کہانی تھی۔ سیما صاحبہ نے والدین کی بات نہ مانی اب وہ جتنی بھی قیامت ادا کریں وہ کم ہے۔ ویسے صفدر کی فطری کاغذی اور سستی کو دیکھ کر بھی اس عقل کی اندگی کو ہوش نہ آتا ہجرت کی بات ہے۔ ”دیر آید“ زبردست تحریر تھی۔ لالچی لوگوں کے منہ پر طمانچہ تھی۔ ”مخدور“ میں نسیم صاحب نے بہت اچھا کیا اور ذیشان جیسے ٹھیک دوست بلاشبہ لعنت کے مستحق ہیں اور ساتھ میں نسیم صاحب کی بیوی بھی۔ عاجز بھی سبق آموز تحریر تھی۔ واقعی موت بہت سے بڑوں کو کال منہ بند کر دیتی ہے۔ مہران اور غلط راستہ بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ ”محسن“ اچھی تحریر تھی لیکن سلیم ناصر نے اپنے محسن کی جان لے کر خود کو قاتل محسن بنا دیا۔ سب سے بڑھ کر سبق آموز کہانی تھی ”چھتار درخت“ اس کو پڑھ کر مجھے اپنے ایک اسٹوڈنٹ جوشیہ تمبا کی یاد آئی کیونکہ آج سے سات سال قبل وہ بھی اسی طرح میرے پاس آیا تھا۔ اب تو وہ بفضل خدا اور اپنی محنت کے سبب پاک آری میں ہے اور خوش ہے۔ ”مغیر خیال“ میں خود کو صدارت پر فائز دیکھ کر بے اختیار مریاں خود بخش کا یہ شعر یاد آ گیا کہ ”میں گلیاں دارو دارو کوڑا ہل چڑا یا سائیاں“ اکبر کا شعر وہ ہے ہی درست ہے جیسے کہ میں نے لکھا ہے۔ میرے پاس نکلیات اکبر کا قدیم اور مستند ترین نسخہ

ہے۔ اعجاز حسین سٹار، منیم صاحب، احمد خان توحید، عبدالجبار روی اور امیر حمزہ یاد کرنے کا شکر ہے۔ یہی زاد جہاں فرام یا لکھو آپ میرے نام کا مطلب خود تلاش کریں۔ یاد کرنے کا شکر ہے۔ رانا بھائی میں خود تحریر لکھنا چاہتا ہوں لیکن کیا کیا جائے کم روزگار سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ فشی محمد عزیز صاحب یاد کرنے کا شکر ہے۔ لیجئے سید محمد رضا شاہ یعنی حکیم صاحب بھی موجود ہیں یعنی اب ہم ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ لکھنا بتائیں۔ ”آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟“ آخر میں ایک اہم غلطی کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ ماہ جون میں محترم ایاز راہی کی تحریر ”کتب خانے“ چھپی تھی۔ وہ صفحہ نمبر 153 سطر نمبر 3 پر لکھتے ہیں ”چشم فلک نے دکھ سے آنکھیں بچ لیں“ عرض کرتا چلوں کہ فقرہ ہذا اگر امر کی رو سے سراسر غلط ہے۔ درست فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ ”فلک نے دکھ سے آنکھیں بچ لیں۔“

☆ ایم اے حفیظ کا خلوص نامہ گوجرانوالہ سے۔ ”سرگزشت 19 جون کو ہی مل گیا۔ بڑے آرام سے مطالعہ بھی مکمل ہو گیا۔ پھر فوری طور پر خط لکھنے لگ گیا۔ ادارہ یہ ہر بار کی طرح مختصر کر رہا تھا۔ ایک صفحہ داستان کو بس ٹھیک تھی۔ ”عصر خیال“ میں سب پرانے ساتھی جلوہ گر تھے۔ دو نے تو بابدولت کا ذکر بھی کیا، شکر ہے۔ سچ بیانیاں سب اچھی تھیں تاہم ”چھتارا درخت“ کا نمبر پہلا اور ”قیامت“ کا دوسرا نمبر۔ ”معدود“ جیسی کہانی برسوں پہلے پڑھی تھی جس میں معدود شخص نے سب گھر والوں کو سولی کیس سے موت کا نشانہ بنایا تھا۔ ایک اور کہانی ”انقاسم“ حیرت انگیز تھی۔ ضیا تنسیم بگلری کا ”دانش مند دیوانہ“ اچھا رہا۔ ضیا تنسیم بگلری کے لکھنے کا اپنا انداز ہے۔ یقین کیجئے تقریباً 35 سال بعد ضیا تنسیم بگلری کی کوئی تحریر پڑھ سکا ہوں۔ آخری بار شاید 1979ء کے آس پاس فرعون پر ”خدا دغا کا باغی“ کے نام سے پڑھی تھی۔ ذویا اعجاز کا کارنامہ ”عشق کامل“ بے مثال رہا۔ ایسے مضامین لکھنا تلواری دھار پر چلنے کے برابر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مضامین میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ ”ہوائے مجاز“ نسیم بن اشرف کا تاریخی ناول نگار جناب نسیم مجاز پر مضمون بھی تاریخی ہی تھا۔ بہت زیادہ معلومات سے بھر پور بہت اعلیٰ بہت عمدہ۔ ”شاعر خوشنوا“ نامور نثر نگار جناب مسرور انور پر شاہد لطیف نے نظم اٹھایا اور کمال کر دیا۔ امید ہے شاہد لطیف صاحب آئندہ بھی سرگزشت کے قارئین کو محفوظ کرتے رہیں گے۔ محمد علی کے فن کا انور فرہانے حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ”دو بھی عورت“ نے دھجی کر دیا۔ ”شمشال سے نورنو“ میں منیم اقبال، شبہا زفری اور سر جی اچھے کردار ہیں۔ دیکھا میں نہ کہتہ تھا منیم اقبال، نسرین کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اس تعلق پر تمنا بھائی نے مختصر طریقے سے منیم اقبال کو خبردار کیا۔ اب ”ناسور“ کی بات ہو جائے۔ پچھلی قسط نے اختتام پر دل دھڑکا دیا تھا۔ نئی قسط نے حوصلہ دیا۔“

☆ سدرہ بانو ناگوری کی آمد کراچی سے۔ ”عید کا موقع ہے اور مگر اس قدر رشددیکر اہل کراچی حیران و پریشان ہیں کہ کیا ایسی یہ ماجرا کیا ہے۔ حادثات اور سانحات سے بھی انفا سوکارا و دل بھول ہے۔ لالچ، ہوس، غلط فہمیاں اور کچھ قسمت کی خرابیاں کہ ہنسنے بستے لوگوں کی ایک بڑی تعداد آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئی۔ ”عصر خیال“ میں ہمارا خط نہیں تھا یہ اس سال میں دوسری بار ہوا ہے۔ یہ یقیناً ٹکڑا ڈاک والوں کی کرم نوازی ہے۔ سلیم قیصر نے بھی حاضری لگوا کر اپنی خیریت سے آگاہ کیا، شکر ہے جی۔ رب تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں فرمائے۔ منیم اقبال آپ خود بہت ناگس ہیں، خدا ہمیں وہی دیتا ہے جس کی ہم اس سے توقع رکھتے ہیں۔ آپ نے خدا سے اچھی توقعات لکھیں تو اس نے آپ کو بہتر سے بہتر نوازا۔ جیسے کہ پسندیدگی کا شکر ہے۔ نزہت، افضال اپنے خوب صورت نام کی طرح تیرہ بھی خوب کرتے ہیں۔ رانا شاہد اور باقی کبھی ساتھیوں کے تہرے خوب تھے۔ اس بار ابتدائی صفحات پر ضیا بگلری تھیں۔ ذویا اعجاز کی ”عشق کامل“ نے ایمان کو تازہ کر دیا۔ دلوں میں ارتقی کی تحریر بہت عمدگی سے لکھی گئی ہے اس کے لیے ذویا اعجاز صاحبہ داد و تحسین کی مستحق ہیں۔ سلسلی اعموان جی بی لفظوں کے تانے بانے بننے کا گر کہاں سے سیکھا آپ نے، ابھی جب بھی لکھتی ہیں کمال کر دیتی ہیں ویلڈن۔ آپ کی نئی آنے والی کتاب کی بھی بہت بہت مبارکباد۔ منیم اقبال کی ”شمشال سے نورنو“ میں امریکا کے کچھ نئے رنگ الگ ہی انداز میں دیکھنے کو ملے۔ امریکا جو کتوں کے ہی خواہوں میں بسا اور آنکھوں میں جتنا ہے غربت اور مفلسی نے اسے بھی نہیں بخشا مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ وہاں سہولتیں اور راحتیں کتنی ہیں۔ وہاں کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی، لوگ اگر مشین کی طرح کام کریں تو اس کا صلہ بھی پورا پورا پاتے ہیں۔ وہاں تفریح کے کتنے ہی مواقع ہیں۔ یہ امریکا کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اچھے حکمران ملے، ہمارے یہاں لاکھ نعتیں سچ مگر یہاں انسان کی قدر نہیں۔ ہم لوڈ شیڈنگ، پانی، بجلی، گیس اور مہنگائی میں ایسے الجھے ہیں کہ ہمیں خود کو بچانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ چند تفریح کے مقام ہیں بھی تو ان کا حال بھی کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہے۔ انگریز چاند پوٹنج گئے اور ہم ابھی تک عید کے چاند پر ہی منتظر نہیں ہو پائے ہیں۔ ہم ٹوٹے ٹکڑے اور بھٹکے ہوئے لوگ کہ جن کا حال یہ ہے کہ اس وطن میں ہر چیز نظر آتی ہے اوکے، بہت خوش ہے یہ تو اپنا بھی کچھ ٹکڑے۔ محمد علی کہ جن کی لفظوں کے تذکرے ای اور انسانی کی زبانی بہت سے نگران پر پہلی بار پڑھا گو کہ لکھی برقرار ہے ان پر تو جتنا لکھا جائے اتنا کم ہے۔ ”ناسور“ پڑھ کر دل سرشار ہو گیا کہ ایڈووکیٹ زبیرہ حادے میں سچ لکھی ہیں۔ ”سلے کا دودھ“ اس شمارے کی سب سے عمدہ تحریر تھی۔ پہلی سچ بیانی بس پوچھی مگر اسے لائق تھی۔ پڑھی لکھی سمجھدار عورت اگر بے وقوفی پر اتارے تو اسے اس کی قیمت تو چکانی پڑتی ہے۔ بے وقت موت بمبز“ پڑھ کر چونکے۔ ارے یہ کیا اٹکل یہ کیا موضوع ہے ہم مسلمان ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اپنے مقررہ وقت پر ہم کبھی کو مرنا ہے۔“ (یہ عنوان دنیاوی نظریہ کا حال ہے۔ سرگزشت کا ہر نمبر الگ طرح کا ہوتا ہے)۔

☆ نصر اللہ خان کا خط داؤد خیل میاںوالی سے۔ ”آپ کا سفر دس سالہ سرگزشت عرصہ میں سال سے پڑھ رہا ہوں۔ کوئی اور سال پسنہ نہیں آتا

ہے لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں۔ اس ماہ کی سچ بیانی ”برادقت“ اچھی اور دل موہ لینے والی کہانی ہے۔ سٹوٹ کے اے سے کہانیاں زیادہ دیا کریں کیونکہ جب مشرقی حصے میں خنزیر کی ہوری تھی تو ان لوگوں نے اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے جان قربان کر دی۔ ”شمال سے ٹورنٹو“ نہایت خوب صورتی اور روانی سے جاری ہے۔ اچھا سلسلہ ہے۔ فلم عمری کے انور فراہمی کا کافی اچھا لکھتے ہیں۔ شکایات کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی کہانی ہر ماہ دیا کریں۔ آپ کی نوازش ہوگی۔ بانی تمام پرانے قارئین کو سلام و دعا عرض ہے۔“

☆ بہاؤ پور سے کلیم اللہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ سے رقم طراز ہیں۔ ”ماہنامہ سرگزشت کو معاشرہ کے ہر طبقے میں یکساں پذیرائی حاصل ہے۔ علم و ادب کی اشاعت، شعور آگمی کی ذہن تنک رسانی کے ساتھ پاکستان کی قومی زبان اردو کو ملک کے چاروں صوبوں، کشمیر، پاکستان سے باہر مقبول عام بنانے کی مساعی کے ساتھ اپنائیت، محبت اور اخوت کی آبیاری کے لیے سرگزشت ایک اہم اور بڑا نام ہے۔ محترمہ صاحبہ اقبال ہر ماہ شخصیات کا تعارف کرائی ہیں جو ایک مقبول سلسلہ ہے۔ ماہ جون کی شخصیات میں جماعت اسلامی کے میاں طفیل کا طویل تعارف ہے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پاکستان قومی اتحاد (ای این اے) کی تحریک کے ہر اول دستے میں میاں طفیل شامل تھے۔ یہاں تک بائبل سچ لکھا ہے مگر مضمون نگار نے انتہائی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ بھٹو سے مذاکرات کے لیے جو کمیشن بنائی گئی اس میں نواز بھٹو، نصر اللہ خان، پروفیسر غفور احمد اور میاں طفیل شامل تھے۔ سچ یہ ہے کہ مذاکراتی ٹیم میں دور دور تک میاں طفیل کا نام و نشان نہ تھا۔ بلکہ سابق وزیر اعلیٰ سرحد مفتی محمود اس مذاکراتی ٹیم کے تیسرے رکن اور سربراہ تھے۔ مضمون نگار نے غلط معلومات دے کر پاکستان اور پاکستان سے باہر ہزاروں قارئین کی دل آزاری کی ہے۔ مذاکراتی ٹیم کے اراکین کا نام بیچے بیچے کو ازبر ہے۔ چالیس سال گزرنے کے باوجود اس تحریک کو یاد کر کے لوگوں کا خون کھول اٹھتا ہے۔ نیز انصاف، توازن اور پیشہ وارانہ اخلاقیات کا تقاضا تھا کہ دھاندلی کے ذکر کے ساتھ یہ بھی لکھا جاتا کہ انتخابی دھاندلی کے نام سے چلنے والی تحریک کو نہایت چابک دستی اور عیاری سے تحریک نظام مصطفیٰ میں تبدیل کر دیا گیا۔ جب کہ صرف چار سال قبل مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد اور بڑی تعداد میں علماء 1973ء کا اسلامی جمہوریہ پاکستان کا اسلامی آئین قومی اسمبلی میں اپنی منظوری کے دستخط ثبت کر کے پاکستان بھر میں نافذ کر آئے تھے اور یہ علماء کرام اسی قومی اسمبلی میں احمدی فرقہ کو پاکستان میں کافر قرار دے چکے تھے۔ کیونکہ آئین میں نظام مصطفیٰ مکمل طور پر موجود تھا اس لیے تحریک سوائے امر کی ایک چیز آگے بڑھانے کے اور کچھ نہ تھی۔ سب کو علم ہے کہ اس تحریک کے دوران امریکا پاکستان میں امریکی ڈالروں کا اتنا بڑا سیلاب لے آیا تھا کہ مارکٹ میں ڈالر ٹکے ٹکے کا ہو گیا تھا اور بہت سارے نامور سیاسی لوگوں کے ضمیر ڈالروں کے اس سیلاب میں غرق ہو گئے تھے۔ سرگزشت ایک قومی اور تفریحی رسالہ ہے۔ ساکھ اور اعتماد ہی کسی ادارے کا سرمایہ اور قیمتی متاع ہوتی ہے۔ لوگوں کو سچ بتانا ہے تو پھر پورا باتیں اور حواج سوائے دکھ کے کچھ نہیں دیتا۔ توقع ہے کہ آپ اس خط کو قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔“

☆ محمد عارف راجہ کا نامہ بکھرے۔ ”جون 2017ء کے سرگزشت میں میری کہانی ”جیسی کرنی“ کی اشاعت اور پرچار کیت میں آنے سے پہلے معاوضہ کی ادائیگی کا ڈیرول شکریہ ہے۔ آپ نے تو ضروری مزدوری اس کا پیدائش تک ہونے سے پہلے ادا کرنے کی مثال قائم کر دی۔ شاید بلکہ بھینا مکی وجہ ہے کہ آپ ایک طویل عرصے سے ڈائجسٹوں کی دنیا کے امام چلے آ رہے ہیں اور آپ نے اس میدان میں اپنی مستقل اور مسلسل جدوجہد سے اپنے والد مرحوم کے نقش قدم کو روش ترکر دیا ہے۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے اور آپ جاسوسی ڈائجسٹ پہلی ٹیکنیکل کے قارئین کی مطالعاتی تسکین کا بدستور اہتمام کرتے رہیں۔ آخر میں ایک شکوہ کہ آپ نے میری مطبوعہ کہانی کے تعارفی خط میں میرے نام کے ساتھ شہر کا نام کو نہ لکھ دیا ہے جب کہ میرا تعلق بکھر پنجاب سے ہے چنانچہ وہ سبک تو میری اس وضاحت کو آئندہ شے میں شائع کر دیجیے تاکہ مسند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے، بہت شکریہ۔“

☆ رضا احمد اعوان، دریان خان بکھرے لکھتے ہیں۔ ”بعد از خیریت آپ کی خیریت کا طالب ہوں۔ جون کا شمار ہاتھوں میں ہے۔ میں بہت دیر تک تنگی باندھے سروں کی حسین کو دیکھتا رہا جو انکس بند کے کسی کے خیالوں میں گم تھی۔ لہذا اس کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اپنے ”عقبر خیال“ میں سدرہ بانو ناگوری آستین چڑھانے رضوان قریشی صاحبہ کو کھری تھری سنارتی تھیں۔ ”نایاب پندے“ بہت مطلوب تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب پندے نایاب ہوتے لگیں تو یہ چڑا کھری زینت بننے لگتے ہیں۔ پندے کا نکات کی خوب صورتی اور انسان کے دوست ہیں اور ایک ہم ہیں کہ موقع ملے ہی انہیں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ اسی لذت کام دہن کی وجہ سے پندوں کی مختلف اقسام کو ختم کر دیا ہے۔ لاہور کے ایک گنام ہدایت کار عزیز بگل پر بھی لکھیے جن کے کریٹ پر چند یادگار فلمیں ہیں۔ ندیم اقبال کی ”شمال سے ٹورنٹو“ واقعی ایک جدا گانہ انداز کی تحریر ہے۔ ”ناسور“ میں ایڈووکیٹ زبیرہ کا نعمان کے بارے میں پریشان ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ نعمان سے محبت کرنے لگی ہیں۔“

☆ انور عباس شاہ کی تشریف آوری دریان خان بکھرے۔ ”شمارہمیں وقت پرل تو چکا ہے لیکن شوشی قسمت مصروفیات کچھ ایسی رہیں کہ اس کا معمولی سا مطالعہ کر کے لہذا اس دفعہ کی قسم کا تہرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ کافی عرصے سے ہم مطالبہ کر رہے تھے۔ ماہ اگست میں آزاد ہی نہیں رکنا چاہیے لیکن فی الحال کامیاب نصیب نہیں ہوئی۔ ایم اے راحت بھی ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ خداوند کریم ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان کو خبر جمیل عطا فرمائے (آمین)۔ دالوں کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے والی اس سستی نے دل موہ لینے والے بہت سے ناول لکھے خاص طور پر صدیوں کا بیٹا

کا جواب ہی نہیں۔ ”عصیر خیال“ میں بھی کافی رونق چھائی ہوئی تھی۔“

☆ سعید احمد چاند کرچی سے طلوع ہیں۔ ”سورق بڑا چار تھا۔ ادارے سے محفوظ ہوتے ہوئے شیخ سعدی کے مفصل حالات سے ”داستان کو“ میں پڑھا۔ نزابت افشاں مہورہ فتح جنگ کو مہر ادارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ موصوف نے اچھے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اعجاز حسین سحر کے علاوہ جن لوگوں کے نمبر سے لکیر لگے وہ یہ ہیں۔ ندیم اقبال، عبد الجبار رومی انصاری، اویس شیخ، ذیشان شیخ، محمد ابراہیم، منشی محمد عزیز، آفتاب احمد نصیر اشرفی، ایم انور، سید محمد رضا شاہ، انجم فاروق ساحلی، امیر محرزہ اشرف، سیف اللہ ملک۔ ان قارئین اور دوسرے لوگوں کو میر اسلام، محمد سلیم قیصر، فقیر غلام حسین، حنیف ادیب۔ ”داشند دیوانہ“ ضیاء تنسیم بلکری کا۔ دسکین انشرف کا ”ہوائے حجاز“ تنویر ریاض کا ”قوانی“ راشد لطیف کا ”شاعر خوش نوا“ انور فرہاد کا ”شہنشاہ جذبات“ ندیم اقبال کا ”ششال سے ٹورنٹو“ خالد کریشی کا ”پیام بر“ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا ”ناسور“ جج چانپو میں سیماء سعدی کی ”قیمت“ زرین قرچی کی ”چستار درخت“ کبیر عباسی کا ”ورآید“ فرحان خان منڈی بہاؤ الدین کا ”مخدور“ اعجاز احمد کا ”مہربان“ ناظم بخاری کا ”غلط راستہ“ سلیم ناصر کا ”محسن“۔ ”بیت بازی“ میں سارے اشعار اچھے تھے۔ ڈاکٹر رونی بھگروالی اس دفعہ بھی غیر حاضر ہیں۔“

☆ سیف اللہ ملک وال کا تجزیہ۔ ”معراج رسول کی کہانی ایک چچی آواز ہے جس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ شیخ سعدی کے حالات سے آگاہی ہوئی“ ”داشند دیوانہ“ سے علم میں آیا کہ نہر منسو منصوبے کا خاکہ ہزار سال پہلے بن چکا تھا۔ اللہ نے کیسے کیسے تھکنہ زندگی کے ریشے میں پیدا کیے ہیں جن کی صلاحیتیں بڑھنے پر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ اب اویس قرچی کے عشق کو دیکھ لیں اور اس عشق کی انتہا کی سمجھ اگر آجائے تو پتا چل جاتا ہے کہ عشق کامل کیا ہوتا ہے۔ نیم حجازی کے تین چار ناول تو عرصہ ہوا پڑھے تھے لیکن حالات زندگی اور جدوجہد کے بارے میں پہلی دفعہ تفصیل سے پڑھا۔ دسکین کا شکر ہے۔ ”قوانی“ کے بارے میں معلومات موجود ہیں لیکن تشنہ کیونکہ بہت سے ناول حضرات کا ذکر نہیں ہو سکا یقیناً مضمون کی طوالت اور پرچے کے صفحات کی مختصر بھی دیکھنی ہوئی ہے۔ بہر حال جو بھی لکھا ہے پسند آیا۔ شاعر خوش نوا میں واقعی شاعر کی خوش نوائی واضح ہے۔ محمد علی تو شہنشاہ جذبات تھے۔ اکثر قلموں میں ان کے ادا کیے ہوئے فقرے آج بھی ضرورت کے وقت ہر آدمی استعمال کرتا ہے۔ اللہ کی مرضی اور حکمت دیکھیں کہ ایک امام مسجد کے مہنہار سپوت نے شوبز میں ترقی کی اور انتہا کی بلندی تک پہنچا۔ ذرا نیچے ہم سے شادی مرے دم تک بھائی اور ایک دوسرے کے دو قاری بن کر رہے۔“

☆ فقیر غلام حسین ضیاء کی ہنسر سے ضیاء پاشی۔ ”ہنسر شعلے کے عزیز دوستوں کے محبت نامے پڑھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم ایک جگہ کے رہنے والے کبھی ایک جگہ اکٹھے نہ ہو سکے۔ بھلا ہوسرگزشت کا ”عصیر خیال“ کے عنوان سے اپنے ادبی رسالے میں میل ملاب کے لیے خصوصی جگہ دی۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے دلوں میں ایک دوسرے کو جگہ دیں۔“ ”داشند دیوانہ“ کے عنوان سے ضیاء تنسیم بلکری نے ایک عظیم مسلمان سنس دان ابن الہیثم جو 354 ہجری میں ابوعلی محمد کے نام سے بھرے کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے جس نے سائنس کی دنیا میں بے شمار نظریے دیئے مگر ان نظریات کو عملی شکل یورپ کے سائنس دانوں نے دی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ فاطمی خلیفہ الحاکم کی سخت طبیعت اور موت کے خوف سے بڑی تکلیف دہ زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوا۔ مصر کے اسوان کا نیم کا منصوبہ مسلمان سنس دان ابن الہیثم کی ابتدائی سوچ کا نتیجہ ہے جسے عملی جامہ انگریزوں نے پہنایا۔ اس عظیم سائنس دان کو تنگ نظر خلیفہ کی بجائے اگر کوئی فراخ دل حاکم ملتا تو سائنس مزید ترقی کرتی۔ زودیا اعجاز نے حضرت خواجہ اویس قرچی کی سیرت پاک ”عشق کامل“ کے عنوان سے تحریر فرمائی۔ ”ہوائے حجاز“ محترم نیم حجازی کی داستان زندگی پر لکھی گئی ہے جنہوں نے خواہیدہ قوم کو اپنی تحریروں کے ذریعے جگایا ہے۔ نیم حجازی مرحوم کا آج کے پاکستان کے نام ایک صفحہ 65 پر تحریر ہے۔ اسے ضرور پڑھیے۔ ہندوہ نے مسلمانوں پر کیا کیا ظلم ڈھائے۔ تنویر ریاض کی تحریر ”قوانی“ شائقین کے لیے نہایت اچھی تحریر ہے۔ فلمی دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انور فرہاد نے ”شہنشاہ جذبات“ محمد علی کی زندگی پر بہت اچھی اور دلچسپ تحریر لکھی۔ ”ناسور“ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر کردہ کہانی ایک سید سادھے نوجوان کی ہے جو درعدوں کے جال میں پھنس گیا ہے پولیس افسر نے اس پر تعین الزامات کی دفعات ڈال کر کے انتقامی حربوں میں اسے الجھا دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ”ناسور“ کے خالق ہیں یا ”مرداب بلا“ کے۔ بھٹی صاحب کہانی کو بڑے عجیب موڈ پر لے آئے ہیں۔ ”قیمت“ سیماء سعدی کی تحریر کو سردور پر مزین کیا گیا۔ ”چستار درخت“ کے عنوان سے ایک بہت بڑے مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کبیر عباسی کی تحریر ”ورآید“ اچھی اور دلچسپ آموز ہے۔ ”غلط راستہ“ کے عنوان سے تحریر ناظم بخاری کا عطیہ ہے۔ جیسا کہ کہانی کا عنوان ہے ”غلط راستہ“ تو جتنا غلط راستہ اختیار کرنے کا انجام ٹھوکر کھانا ہے۔ ”محسن“ سلیم ناصر کی تحریر ہے۔ احسان نے مسند میں خود کشی کرنے والے نوجوان کو موت کے منہ سے بچایا۔ احسان صاحب توجہ کے مگر احسان کا بدلہ خوب دیا۔ ”انتقام“ مریم کی تحریر ہے۔ مظلوم کے ساتھ ظلم کا انتقام قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔“

☆ فاروق انجم ساحلی کا خط لاہور سے۔ ”ابن الہیثم اور نیم حجازی کا زندگی نامہ خوب تھا۔ یک مٹی سرگزشت بھی دلچسپ تھی۔ شیخ سعدی حکایات اور شاعری کے حوالے سے بڑی شخصیت تھے۔ مگر سرگزشت آپ بیتیوں کا انتخاب بہت اور عرق ریزی سے کرتے ہیں تاکہ کہانی فرسودہ نہ ہو اس کے علاوہ جدت اور تنوع کو مد نظر رکھتے ہوئے خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ خطوط کی محفل دلچسپی سے بھرپور تھی۔ جن احباب نے تذکرہ قلم بند کیا۔ ان کا بے حد مشکور ہوں۔ پیامبر معلومات سے بھرپور تھی۔ کائنات کے خارجی زاویے میں پندے آسمان کی زینت ہیں۔ صلے کا دودھ،

شاعر خوش نوا، دیکھی عورت متاثر کن تحریریں ہیں۔ آپ سبھیوں میں قیمت، چھنتار، غلط راستہ خوب تھیں۔“

☆ رضا احمد اعوان کی سرگزشت کی بڑی برائی، دریا خان، بھکرے۔ ”اس بارعید کے رنگ پیچھے بڑے گھمے اور ہم نے سارا دن گھر میں گزارا۔ کیونکہ ملک عزیز میں عید سے چند روز پہلے احمد پور شریف اور پارہ چٹار میں دلخراش سانحات نے غمزہ کر دیا اور دل خون کے آئیں روتا رہا۔ پہلا واقعہ ہماری قومی سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ جہاں کوئی مفت کی چیز ملے، بے خوف و خطر اٹھا لو۔ یہ تعلیم کی کمی، جہالت کی نشانی اور تربیت سے عاری قوم کی سوچ کا مظہر ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ہم لوگ کسی سانحہ سے سبق کیوں نہیں سیکھتے؟ دوسرا واقعہ پارہ چٹار کا ہے کہ معصوم لوگ عید کی خریداری کر رہے تھے کہ چانک بم بلاست ہوئے اور کئی گھرانے اپنے پیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ضیاء تنسیم بھگناری کی ”دانشندانہ دہانہ“، زویا اعجازی ”مشتعل کابل“، وسیم بن اشرف کی ”ہوائے حجاز“، تنویر ریاض کی ”قوالی“ اور راشد لطف کی ”شاعر خوش نوا“ پسندیدہ تحریریں تھیں۔ ہمارے فوریٹ ادا کار محمد علی پر انور ربادی کی تحریر ”شہنشاہ جذبات“ بے حد پسند آئی۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ اور ”ناسور“ بہت اچھی جاری ہیں۔ سچ بیانیوں میں قیمت، مہربان اور غلط راستہ بالترتیب پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہیں۔ ”عہر خیال“ میں رانا محمد شاہد، عبدالجبار روی انصاری، ادیس شیخ، شیخ محمد عزیز نے، سید محمد رضی شاہ نقوی کے تبرے پسند آئے۔“

☆ مختصر عباس مرزا کا نام اسلام آباد سے۔ ”بحیثیت ایک سینئر سٹیشن کے (قیام پاکستان کے وقت میں ڈیڑھ سال کا تھا) آپ کے قیمتی وقت سے چند منٹ لے رہا ہوں۔ ویسے تو میں ڈائجسٹ کا بھی سینئر سٹیشن ہوں۔ ڈائجسٹ سے پہلا تعارف جب میں کالج کا اسٹوڈنٹ تھا تو ریڈر ڈائجسٹ سے ہوا۔ پھر الطاف حسن کارو ڈائجسٹ آیا۔ پھر عنایت اللہ صاحب کا ساہرو ڈائجسٹ شامل مطالعہ ہوا۔ سید محسنی صاحب اور رئیس امرہوی کا عالمی ڈائجسٹ کے نام سے وہ بھی لاہوری کا حصہ بنا۔ شکیل عادل زادہ کا سب رنگ جس میں واقعی سب رنگ تھے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کا جب اجراء ہوا تو وہ ایک علیحدہ رنگ لے ہوئے تھا۔ اس میں خوفناک کہانیاں اور ہندو متھالوبی جو کہ پاکستانیوں کے نوجوانوں کے لیے علیحدہ چیز تھی۔ پھر ایک رسالے کے اجراء کا جاسوسی ڈائجسٹ میں اعلان چھپا جس کے لیے قارئین سے نام تجویز کرنے کا کہا تھا۔ چند مہینے اسی سہنس میں گزرے۔ میں نے زندگی میں پہلا خط ادارے کو لکھا کہ اب تو اتنا زیادہ سہنس پیدا ہو گیا ہے کہ اس جریڈ سے کا نام سہنس ڈائجسٹ ہی رکھ دیں۔ میں اس وقت پاکستان آرڈیننس فیکلٹی میں انجینئر تھا میرے پاس جاسوسی ڈائجسٹ، سہنس ڈائجسٹ کے پہلے شمارے سے رسائل موجود تھے۔ انہوں جب میں واہ سے اسلام آباد شفٹ ہوا تھا تو میرے رسائل اور ادبی کتب سے لبریز تین کارٹن غائب ہو گئے۔ میرے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ پھر میری زندگی میں سرگزشت ڈائجسٹ شامل ہوا۔ سرگزشت میں وہ سب کچھ ہے جو کہ مجھ جیسا قاری پڑھنا چاہتا ہے۔ سرگزشت میں شخصیت پوچھنے کے سلسلے میں ہمیشہ درست جواب لکھا۔ جگر مراد آبادی کی شخصیت کے لیے درست جواب بھی دیا تھا۔ جس وقت جناب جگر مراد آبادی کا انتقال ہوا تھا میں اس وقت میٹرک میں تھا۔“

☆ وحید ریاست بمبئی نے ٹکرسیداں سے لکھا ہے۔ ”سب سے پہلے میں اُن کرم فرماؤں سے اظہارِ تحسّر کرنا چاہوں گا، جو گاہے بگاہے اس فقیر کو یاد کرتے رہے، ہاں ان سطور میں یہ بیان کرتا چلوں کہ سال 2016ء کا تجزیہ جو بوجہ والد صاحب کی علالت کے تحریر نہ ہو سکا، جس پر آپ تمام حضرات سے معذرت خواہ ہوں، زندگی رہی تو انشاء اللہ تعالیٰ سال 2017ء کا تجزیہ آپ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔ اب آتے ہیں ”عہر خیال“ کی جانب، مگر کسی صدارت پر بے شک ”زبانتہ افشاء“ برا جمانا تھے، اور انہوں نے اچھا تبصرہ تحریر کیا، باقی احباب نے بھی نکلے دل سے شمارے پر اظہار خیال فرمایا۔ جتنی ”ندیم اقبال“ کو بھی ”عہر خیال“ کا پاس بنا دیکھا تو ایک خوش کن منظر دل میں اٹھائی لیت محسوس ہوا۔ عید الفطر کی ڈھیر ساری مٹھلیوں میں ”مطالعہ سرگزشت“ سے بڑھ کر اور کیا سوچ ڈش ہو سکتی تھی؟ سو، خوب خوب اس ڈش سے محظوظ ہوئے، ”داستان گو“ میں حضرت شیخ مصلح لدین المعروف شیخ سعدی کے متعلق بہت کچھ جاننے کا موقع ملا، اس کے بعد وسیم بن اشرف کی تحریر ”ہوائے حجاز“، دہمی، مسلمانوں کے عہد رفتہ کو آواز دینے والے اور تاریخ سے خشک معصوم کو افسانوی اور تہذیبی رنگ میں پیش کرنے میں مہارت تانہ رکھنے والے عظیم لکھاری جناب ”نسیم حجازی“ کے حوالے سے پہلی بار پڑھا، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ مرحوم ملک وقوم کے انتہائی خیر خواہ اور همکار تھے، ویڈیو وسیم بن اشرف، اس کے بعد ”قوالی“ پر تنویر ریاض کی تحریر دہمی، اچھی تحریر تھی کچھ کچھ فکری کا احساس ہوتا رہا، قوالی حضرت امیر خسرو سے پہلے بھی صوفیاء کے ہاں مقبول و مقبول رہی ہے، گو اس کے قواعد و ضوابط خاصے دقیق تھے، مزید تفصیل کے لیے ”کشف العجب“، کتاب اللغ، معارف المعارف اور دیگر رسائل کی کتب اس بات پر شاہد ہیں، عزیز میاں قوال کی معروف قوالیوں کی فہرست میں ”آدی ہے بنظیر، آدی ہے بنظیر، یہ ہے سیکدہ یہاں رہند ہیں اور ہرگز مری انجان نہیں ہوتی“، ”کو نہ پا کر، نیز راحت فتح علی خان کی وجہ شہرت بننے والی قوالیوں ”سیدی نرشدی، یا نمی یامی اور جانے یا علی“ کے متعلق محترم مصنف نے اشارہ کیا کہ گوارا نہ کیا آگے بڑھے تو شاید لطیف کی مختصری تحریر ”شاعر خوش نوا“ سرور انور کا بڑا مقام طے کرتی نظر آئی، واقعی وہ ایک بڑے شاعر تو تھے ہی، مگر اس سے بڑے وہ انسان تھے، اس کے بعد جناب انور ہادصاحب ”شہنشاہ جذبات“ مرحوم محمد علی کوثر ان حسین پیش کر رہے تھے۔ ”دیکھی عورت“ میں ملک کی نامور مصنفہ سلمیٰ اعوان کے قلم کا جادو سرچڑھ کر بولا، دیار غیر میں مقیم ”ندیم اقبال“ اپنے دوسرے سفر نامہ کو تمام برصغیر میں برداشت کرنے کے بعد بھی قارئین کی دلچسپی کا محور بنائے رکھنے میں کامیاب نظر آ رہے ہیں۔“

نفسیات دان

ڈاکٹر ساجد امجد

اس نے عمر بھر جس کی آرزو کی ایسے ہی لمحے وبال گزریے لیکن وہ اپنی عزم صمیم کی بدولت شیشہ ہو کر بھی پتھر سے ٹکراتا رہا۔ دنیا نے اسے جھکنا چاہا لیکن وہ ثابت قدم رہا۔ اس کے نظریے دنیا بھر میں گونج رہے تھے اور لوگ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ اس کے نظریے کو باطل قرار دے کر اسے شیطان کا گماشتہ کہہ رہے تھے۔

گزشتہ صدی کے ایک بہت بڑے نفسیات دان کا زندگی نامہ

”اگر تم نے اس وقت کا قصبہ ”فرائی برگ“ دیکھا ہوتا تو تم مجھ سے یہ فضول سوال نہیں کرتے۔ دیکھتے بھی کیسے۔ تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور میں تمہارا باپ نہیں بنا تھا۔ میں یہودی تھا اور وہ شخص عیسائی۔ ہم یہودی تعداد میں اتنے کم تھے کہ عیسائیوں سے دینا بڑھاتا تھا۔“

”آخر اس عیسائی کو آپ کے ساتھ دشمنی کیا تھی۔“

”پہلی دشمنی تو یہی تھی کہ میں یہودی تھا اور دوسری دشمنی یہ کہ میں اسے خوش حال دکھائی دے رہا تھا۔ عیسائی تو یہ چاہتے تھے کہ تمام یہودی مفلوک الحال رہیں۔“

اس کا باپ اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ رہا تھا لیکن بچے کا ذہن نہیں اور تھا۔ اسے اپنے باپ کی بزدلی اور بے بسی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ اس کا باپ جو اسے عیسائیوں کے خلاف شدید نفرت کا سبق دیتا رہتا ہے اس نے خود اسی بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔

وہ پہلے ہی باپ سے ناخوش تھا، یہ قصہ سننے کے بعد رہی کسی عزت بھی جاتی رہی۔ وہ اپنے باپ سے خوش کیوں

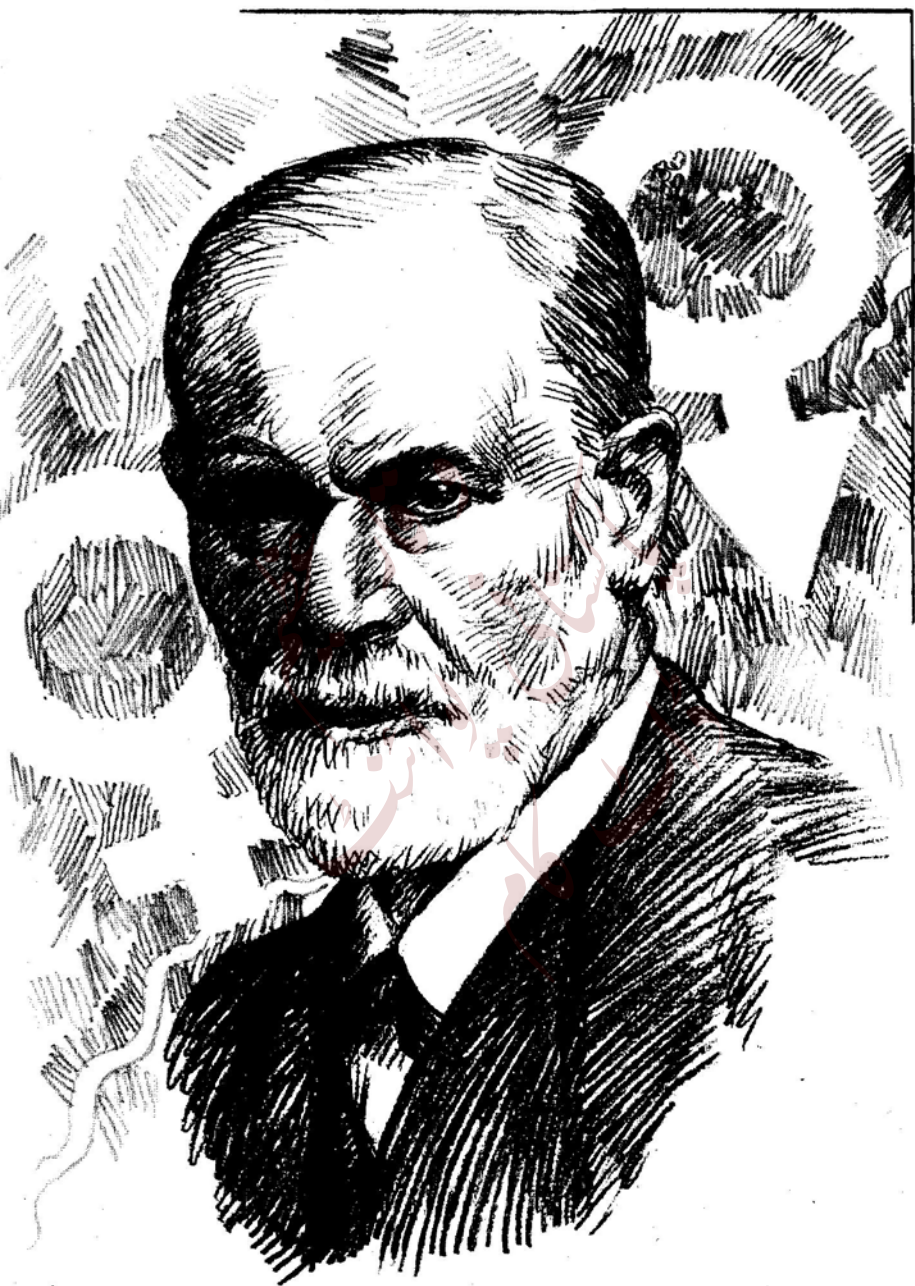
میں اس وقت نوجوان بھی تھا۔ خوب صورت بھی اور خوش لباس بھی اور اس وقت تو ”فر“ کی شاندار ٹوپی بھی میرے سر پر تھی۔ فٹ ہاتھ پر میں یوں چل رہا تھا جیسے چاند پر چہل قدمی کر رہا ہوں لیکن میری یہ خوش فہمی اس وقت دور ہو گئی جب سامنے سے آتے ہوئے ایک عیسائی نے میری قومیت کو لاکارا۔ ”یہودی کتے! ذرا فٹ ہاتھ چھوڑ کر چل۔“

اس نے صرف یہ کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مجھے دھکا بھی دیا۔ اس کے دھکے سے میں تو نہیں گرا البتہ میری قیمتی ٹوپی کچھڑ میں گر گئی۔

بچہ بڑے غور سے یہ داستان سن رہا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ دخل اندازی کی۔ ”پھر آپ نے کیا کیا؟“

”میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے ٹوپی اٹھائی اور جھاڑ کر دوبارہ سر پر رکھ لی۔“

بچے نے غصے کے عالم میں اپنی دونوں مٹھیاں سمجھ لیں۔ ”مجھے آپ کا یہ بزدلانہ رویہ ہرگز پسند نہیں آیا۔ آپ کو اس عیسائی کو اس کی اس بدتمیزی کا مزہ چکھانا چاہیے تھا۔“



نہیں تھا؟ اس کی ایک وجہ باپ کی بے جا ڈانٹ ڈپٹ تھی۔ وہ جب سات سال کا تھا اسے کسی کام سے والدین کے کمرے میں جانا پڑا۔ وہ احازت لیے بغیر بیداروں میں گھستا چلا گیا۔ اس کا باپ اس کی اس حرکت پر شدید غصے میں آ گیا۔

”بے ہودہ بچے نکل جا میرے کمرے سے۔ جانور ہو تم پورے جانور۔“ پھر انہوں نے اس کی والدہ کو مخاطب کیا۔ ”یہ لڑکا کبھی کسی قابل نہ ہو سکے گا۔ زندگی بھر کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ اسے کمرے ہی سے نہیں گھر سے بھی نکال دو۔“ اس کی ماں خاموشی سے اپنے بستر سے اتری اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے باہر نکل جانے کی تلقین کرنے لگیں۔ ”جاؤ اپنے کمرے میں۔ چلے جاؤ۔ اس وقت تمہارا باپ غصے میں ہے۔“

وہ کمرے سے نکل آیا۔ اس کے باپ کی گرج دار آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کے باپ کا طعنہ کہ وہ کسی قابل نہیں بن سکتا اور نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اس کے لیے چیلنج بن گیا۔ اس نے عزم کیا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے باپ کو دکھا دے گا کہ وہ قابل ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو بڑا آدمی بن کر دکھائے گا۔ آگے چل کر واقعی وہ ایک بڑا آدمی بن گیا۔

یہ ”بڑا آدمی“ ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ تھا جس کی نفسیاتی دریافتوں نے یورپ کے اخلاقی و علمی نظریات میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اس سے پہلے علم نفسیات چند دائروں تک محدود اور الجھا ہوا تھا۔ ذہنی عوامل پر نظری، بحثیں ہوتی تھیں۔ پنازوم اور توئم شدہ بازی اور سرکاری کے کارنامے سمجھے جاتے تھے۔ ان کی بنیادیں ایک حد تک علمی حقائق پر استوار ضرورتیں اور ان کو بعض بیماریوں میں کام بھی لایا جاتا تھا مگر ان کے ماہرین خود ان کے بارے میں گہرا علم نہ رکھتے تھے۔ فرائیڈ نے سب سے پہلے لاشعور کو دریافت کر کے انسانی افعال و کردار کی نئے انداز سے تعبیر کرتے ہوئے انسانی شخصیت کی بنیاد جس کو قرار دیا اور یوں اس نے تحلیل نفسی کے ذریعے ذہنی بیماریوں کے علاج میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

☆.....☆

وہ 6 مئی 1856ء کو فرائیڈ برگ مورایا (چیکوسلوواکیہ) کے ایک ادنیٰ متوسط درجے کے یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا نام سگمنڈ فرائیڈ رکھا گیا۔

فرائیڈ برگ مورایا ایک مختصر سا قصبہ تھا جہاں پانچ ہزار جرمن اور چیک باشندے آباد تھے۔ اس وقت یہ آسٹرو ہنگرین شہنشاہیت کا ایک حصہ تھا۔

جس گھر میں فرائیڈ پیدا ہوا تھا وہ کچی اینٹوں سے تعمیر کردہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس کی چھت سلیٹ کی تھی اور آرائش سے عاری بالکل سادہ سا گھر تھا۔ دو عورتیں اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ایک ملازمہ ”ہینی“ تھی۔ دوسری اس کی ماں امیلیا تھی جس کی شفقت نے فرائیڈ کے بچپن کو چمکا دیا تھا۔

سگمنڈ جب پیدا ہوا تو اس کے سر پر بالوں کا ایک گھونسلہ سا تھا۔

وہ بوڑھی کسان عورت جس کے ہاتھوں سگمنڈ کی پیدائش کا مرحلہ ہوا تھا۔ ان بالوں کو دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔ امیلیا نے بستر پر لیٹے لیٹے پوچھا تھا۔ ”تم ہنس کیوں رہی ہو۔“

”میں ہنس نہیں رہی ہوں۔ اس بچے کے عظیم مستقبل پر خوش ہو رہی ہوں۔“

”تم نے اس بچے میں ایسی کیا بات دیکھی؟“

”یہ دیکھو اس کے سر پر بالوں کا گھونسلہ بنا ہوا ہے۔ یہ خوش بختی کی علامت ہے۔ تمہارا بیٹا مستقبل میں بہت بڑا آدمی بنے گا اور دنیا میں نام پیدا کرے گا۔“

اس کے باپ جیکب فرائیڈ نے اس بچے کو دیکھ کر برا سامنہ بنایا تھا۔ ”اس کے سر پر سیاہ بالوں کا گھونسلہ دیکھ رہی ہو۔ یہ تو ہم میں سے معلوم ہی نہیں ہوتا۔ یہ تو عرب دکھائی دیتا ہے عرب۔“

”ہاں یہ میرا ننھا عرب ہی تو ہے۔“ اس کی ماں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

جیکب فرائیڈ کپڑا تیار کرنے والی ایک مل کا مالک تھا۔ سگمنڈ کی ماں سے اس نے دوسری شادی کی تھی جو اس سے آدھی عمر کی تھی۔ اس کے گھر کے قریب ہی اس کے بڑے بیٹے عمانوئیل کا گھر بھی تھا جو اس کی پہلی بیوی سے تھا۔ عمانوئیل شادی شدہ تھا۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ گویا سگمنڈ کی پیدائش سے قبل ہی جیکب دادا بن چکا تھا۔

جیکب کی عمر ایسی نہیں تھی کہ وہ سگمنڈ کی پیدائش کی خبر سن کر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کرتا جب کہ امیلیا کا یہ پہلا بچہ تھا اس لیے وہ خوشی سے بے قابو ہو گئی اور نہایت توجہ اور

پیارا۔۔۔ سے اس کی پرورش کرنے لگی۔

سگمنڈ کو اپنی ماں کی بھرپور توجہ حاصل تھی لیکن باپ کا تھکسا نہ رویہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔ کوئی اور بچہ ہوتا تو ممکن ہے اس کی پرورش بھی نہ کرتا لیکن وہ بے حد حساس تھا۔ باپ کی سرد مزاجی دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا۔ ماں اور باپ دونوں کے متضاد رویوں نے اس کے ذہن کو الجھا دیا تھا۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ اس کی ماں اس سے اتنی محبت کیوں کرتی ہے اور باپ اتنی سختی سے کیوں پیش آتا ہے۔

تعدادات کے اس اندھیرے میں اس کے سوتیلے بھائی عمانوئیل کا بیٹا جان اس کے لیے روشنی کی لکیر تھا۔ وہ ایک سال اس سے بڑا تھا لیکن یہ کوئی ایسا فرق نہیں تھا۔ دونوں دوست بن گئے تھے۔ دونوں آپس میں کھیلتے کودتے تھے۔ اسی کھیل کود میں اکثر لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ یہ جھگڑے جب جیکب کے سامنے پہنچتے تو جیکب ہمیشہ جان کی طرفداری کرتا اور سگمنڈ سے بری طرح پیش آتا۔

باپ کے اس رویے نے اس کے ذہن کو الجھا دیا تھا۔ وہ سوچا کرتا کہ جب جیکب میرا باپ ہے تو میری طرف داری کیوں نہیں کرتا۔ عمانوئیل تو بھی اپنے بیٹے جان سے اس طرح پیش نہیں آتا۔ یہ سوچتے سوچتے باپ کی طرف سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہونے لگتی تھی۔

ایک دن ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا اور وہ بھاگ کر ماں کی گود میں چڑھ گیا۔

”آپ کے جوشو ہرین وہ میرے باپ ہی ہیں نا۔“

”تم کیسے بچے ہو۔ یہ کیا سوال کر رہے ہو۔“

”وہ ہر وقت مجھے ڈانٹتے رہتے ہیں۔“

”تمہاری بھلائی کے لیے ڈانٹتے ہیں۔“

”کیا عمانوئیل کو اپنے بیٹے کی بھلائی عزیز نہیں۔ وہ تو جان کو نہیں ڈانٹتے۔“

”بس بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔“

وہ ماں کے کہنے سے چپ تو ہو گیا لیکن اس کے دل میں باپ کی طرف سے جو نفرت پیدا ہو گئی تھی اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اس کی عمر دو سال سے کچھ ہی زیادہ ہوئی ہوگی۔ عام بچہ ان باتوں پر غور بھی نہیں کرتا لیکن وہ غیر معمولی بچہ تھا۔ ایسی باتیں سن کر اس کی ماں کو یقین ہونے لگا تھا کہ وہ بڑا آدمی ضرور بنے گا۔

فرائیڈ کی طرح اس کی جائے پیدائش بھی پراسرار

تھی۔ فرائیڈ برگ کا مطلب آزاد پہاڑ ہے۔ یہ بستی دریا کے کنارے آباد تھی۔ یہ دریا گرمیوں میں سوکھ جاتا تھا لیکن برسات میں کناروں سے باہر ہو جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں گر جا گھر تھا جس کی گھنٹیوں کی آواز کانوں میں رس گھولنا کرتی تھی۔

اس بستی کی پچانوے فیصد آبادی رومن کیتھولک تھی وہاں مشکل سے دو فیصد یہودی تھے۔ فرائیڈ کا خاندان بھی یہودی تھا۔ یہودی لوگ چونکہ اقلیت میں تھے اس لیے سیاست سے دور ہی رہتے تھے لیکن ملکی حالات نے یہودیوں کو بھی سیاست کی لپیٹ میں لے لیا۔ جب ملک میں آزادی کی تحریک چلی تو جرمنوں نے جو حکومت کر رہے تھے یہودیوں کو مورد الزام ٹھہرایا اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔

فرائیڈ خاندان بھی سیاست سے الگ تھلگ رہا تھا لیکن لبرل انقلاب جو بحالی کے رد عمل کے طور پر وجود میں آیا تھا، نے جو سیاسی صورت حال پیدا کر دی تھی، اس نے چیک قومیت کو آسٹروی سیاست کی سب سے زیادہ فعال قوت بنا دیا تھا اور چیک قومیت رکھنے والوں کے دلوں میں جرمنوں کے خلاف شدید نفرت پیدا کر دی تھی۔ یہودی جو زبان اور قومیت کے اعتبار سے جرمن تھے چیک قومیت رکھنے والوں کے نزدیک سخت قابل نفرت اور واجب القتل گردانے گئے۔

یہ سب فرائیڈ کی پیدائش سے پہلے کی باتیں تھیں۔ فرائیڈ کی پیدائش کے وقت اس کا خاندان معاشی بدحالی کا شکار ہو گیا۔

صنعتی انقلاب نے اس خاندان کو معاشی طور پر کمزور کر دیا۔ یورپ میں ہر جگہ ہاتھ کے کام کی جگہ مشینیں لینے لگیں۔ چیک فرائیڈ کی مل مسلسل خسارے سے دوچار رہنے لگی۔ جب سگمنڈ فرائیڈ تین سال کی عمر کو پہنچا تو آسٹرو اٹالین جنگ چھڑ گئی۔ اب فرائیڈ برگ میں فرائیڈ خاندان کے لیے اپنی گرتی ہوئی معاشی حالت کی بحالی کا کوئی سامان باقی نہیں رہا۔

اسی سال فرائیڈ خاندان نے ہجرت کی۔ عمانوئیل اور اس کے بیوی بچے برطانیہ چلے گئے۔ جیکب نے بیوی اور دو بچوں (فرائیڈ اور بیٹی ایٹا) کو ساتھ لیا۔ پہلے ان لوگوں نے گھوڑا گاڑی میں طویل سفر کیا۔ اس کے بعد ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ ٹرین انہیں فرائیڈ برگ سے ہمیشہ کے لیے

جدا کر کے دی آنا لے آئی۔

پھل کے ذائقے کا مزہ بھی چکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر، وکلاء، جج، اداکار، اخبار نویس سب کے سب یہودی تھے۔ اس کے باوجود وی آنا کی تو بے فیصد آبادی کے سامنے ان کی سماجی حیثیت صفر تھی۔

سگمنڈ فرائیڈ جیسا ذہین اور حساس لڑکا گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ خاموشی سے ان تبدیلیوں پر غور کر رہا تھا جو صنعتی انقلاب کی بدولت برپا ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے کی بات تھی کہ برائے صنعتی نظام نے آخری لنگی لی اور نئے صنعتی نظام نے اس کی جگہ لے لی۔ نئے اور پرانے نظاموں کی کشاکش نے اس کے کردار پر نہایت گہرا اثر مرتب کیا۔

انہی دنوں وہ وی آنا کے یہودیوں کی سماجی حیثیت سے بھی بخوبی آگاہ ہو گیا۔ بعد میں اس نے جو نظریات پیش کیے ان میں سے بہت سے وہ تھے جو اس نے وی آنا کے اس وقت کے معاشرے میں رہتے ہوئے اخذ کیے تھے۔

وہ جس معاشرے میں پلا بڑھا تھا اس میں یہودیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اسی امر نے سگمنڈ میں اپنی آزادی، وقار اور اپنی انا کے تحفظ کا احساس پیدا کر دیا اور پھر یہ احساس شدت اختیار کرتا چلا گیا۔

☆.....☆

اس کی عمر اب گیارہ سال کی ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنی ماں کے ساتھ سیر کے لیے باہر جانے لگا تھا۔ ایک روز اس کی ماں اسے ایک شاندار ریستوران میں لے گئی۔ ابھی انہیں وہاں بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک مفلوک الحال بوڑھا شخص ریستوران میں داخل ہوا۔ سگمنڈ کی ماں کو وہ بوڑھا خاصا دلچسپ دکھائی دیا۔ یہ بوڑھا مختلف میزوں پر جاتا تھا اور تھوڑے سے پیسے لے کر لوگوں کو ان کی قسمت کا حال بتا رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ وہ قسمت کا حال اشعار کے ذریعے بتا رہا تھا۔ کھڑے کھڑے کچھ اشعار موزوں کرتا تھا۔ ان اشعار میں قسمت کا حال چھپا ہوا تھا۔ سگمنڈ کی ماں نے تھوڑی سی ہنسی بکچا ہٹ کے بعد اس بوڑھے کو اپنی میز پر بلایا۔

”کیا تم میرے بیٹے سگمنڈ کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ اس بوڑھے نے سگمنڈ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سگمنڈ کی ماں نے چند سکے اس بوڑھے کے ہاتھ پر

دی آنا کو جرم شہروں کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ اس میں یہ ایک وقت کئی قومیں رہتی تھیں۔ بڑے اخباروں کے دفاتر تھے۔ یہی وہ شہر تھا جہاں موزاری جیسا عظیم موسیقار رہا کرتا تھا۔ ہیڈن نے بھی اسی جگہ مذہبی گیت بنائے۔ مختصر یہ کہ وی آنا موسیقی کا گھر تھا۔ عیش و نشاط کا گڑھ تھا۔ یہاں کے لوگ زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنے کو اپنا مقصد سمجھتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامہ آرائیوں کے سوا اس شہر میں کچھ ہے ہی نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب جھوٹے نعروں کی بڑبڑ کا ری تھی، سب اوپر کی رونمائی تھی۔ یہ معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہوا چکا تھا۔ اخلاقیات کا دیوالیہ نکل چکا تھا۔ یہاں کے لوگ فضول خرچ اور براہ کار تھے۔ منافقت ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ قانونی عدالتیں موجود تھیں۔ حکومت تھی لیکن حکومت کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے۔

جس وقت سگمنڈ وی آنا پہنچا تو اس وقت فرانز جوزف کی حکومت تھی۔ یہ بادشاہ بے حد خود سزا اور رعایا سے الگ تھلک رہنے کا عادی تھا۔ طبقہ امراء کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ بادشاہ برائے نام تھا۔ یہ طبقہ نہایت طاقتور تھا۔ یہ طبقہ ہر اس تحریک کو دبا دیتا تھا جو عوام کی بھلائی کے لیے اٹھتی تھی۔ یہ طبقہ قدیم جاگیرداری نظام کی مثال تھا۔

طبقہ امراء سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر یہودی تھے اور ان کی بالادستی اور امیری عام لوگوں بلکہ خود بادشاہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وی آنا والے اسٹیج اور تھیٹر کے دلدادہ تھے۔ محافل موسیقی پر جان دیتے تھے مگر موسیقاروں کو معاشرے میں کوئی معزز حیثیت حاصل نہیں تھی۔

1867ء میں جب فرائیڈ خاندان کو وی آنا میں رہتے ہوئے سات سال گزر گئے تو آئین کی رو سے یہودیوں کو آسٹریائی شہریوں کے مساوی حقوق عطا کر دیے گئے پھر بھی وی آنا میں یہودیوں سے شدید نفرت قائم رہی۔ یہودیوں نے تجارت و معیشت پر اپنی گرفت قائم کر لی تھی۔ اسی امر نے عوام کو ان کے خلاف کر رکھا تھا۔ ان کے ساتھ اجنبیوں کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا۔

یہودی اپنے لیے ہمیشہ معاشرے میں بلند مقام حاصل کرنے کی تمنا ہی رہا کرتے تھے۔ اس لیے وہ ان علوم پر زور دیا کرتے تھے جن کی بدولت وہ بلند عہدوں تک پہنچ سکیں۔ ان کے ہاں سائنسی علوم پر زور دیا جاتا تھا۔ وہ اس

رکھ دیے۔ اس بوڑھے نے چند شعر پڑھے جس میں سنگمڈ کے بڑا آدمی بننے کی پیش گوئی کی گئی تھی۔

”تیرا بیٹا دنیا میں نام کرے گا۔“

چیزیں ایجاد کرے گا۔

ایسی جیسا کوئی دوسرا ہو

یہ تو مشکل ہوگا

مشکل ہوگا

نوعر سنگمڈ پر تو اس پیش گوئی کا کوئی اثر نہ ہوا لیکن اس کی ماں بہت خوش ہوئی۔ اس دن کے بعد سے وہ اس کا لاڈلہ بچہ بن گیا۔ اب اس کی شفقت میں فقر و غرور بھی شامل ہو گیا جو اسے سنگمڈ پر ہونے لگا تھا۔

سنگمڈ کی پیدائش کے وقت بوڑھی کسان عورت نے بھی یہی پیش گوئی کی تھی اور اب یہ بوڑھا فقیر بھی یہی نوید سنار ہا تھا۔ اس کی ماں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ وہ سنگمڈ کے بڑا آدمی بننے میں بھرپور مدد کرے گی اور اسے بھرپور آسائش فراہم کرے گی۔

دی آنا پیچ کر فرائڈ کا خاندان شہر کے جس حصے میں جا کر رہائش پذیر ہوا تھا وہ گلوکن گارے کہلاتا تھا۔ علاقہ بھی ایسا تھا جہاں نچلا طبقہ رہتا تھا۔ سنگمڈ یہاں کبھی خوش نہ رہ سکا۔ اسے فرائی برگ کے حسین مناظر یاد آتے تھے۔ اگر اس کی ماں یہاں نہ ہوتی تو شاید وہ اس گھر سے ہی بھاگ جاتا۔ اس کی ماں اسے برابر احساس دلاتی رہتی تھی کہ اسے ایک دن بڑا آدمی بننا ہے۔ اس لیے اسے پڑھائی میں دل لگانا چاہیے۔

اس کا باپ سخت گیر تھا لیکن اس کی تعلیم کی طرف سے وہ بھی غافل نہیں تھا۔ وہ اسے روز شام کے وقت لے کر بیٹھتا اور پڑھاتا۔ اس نے اپنے باپ ہی سے انجیل کے اسباق پڑھے۔ انجیل میں جب اس نے سرجری کے بارے میں پڑھا تو اسے ڈاکٹر بننے کا شوق ہوا۔

”کیا میں ڈاکٹر بن سکتا ہوں۔“ اس نے ایک روز اپنے باپ سے کہا۔

”ابھی تو نہیں لیکن جب کچھ اور تعلیم حاصل کر لو گے تو یقیناً ڈاکٹر بن جاؤ گے۔“

”کتنی تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔“

”یہ میں تمہیں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد بتاؤں گا۔“

”پھر آپ مجھے جمنائیم میں کیوں داخل نہیں کرا

دیتے۔“

”تمہاری ماں تمہیں خود سے جدا کرنا ہی نہیں

چاہتی۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہر وقت ان کے پاس

بیٹھا رہوں لیکن پڑھنا بھی تو ضروری ہے۔“ اس کے بے حد

اصرار پر اسے جمنائیم میں داخل کرا دیا گیا۔

جمنائیم میں جن لڑکوں کو اس نے اپنا دوست بنایا وہ

کھیل کود کے شوقین ہونے کی بجائے پڑھائی اور علمی و

نظریاتی بحثوں کے شوقین لڑکے تھے۔ وہ اپنی ٹولی کو ننھے

مفکرین کا نام دیا کرتا تھا۔ اس کے ان ساتھیوں کو کھیل کود

سے غرض نہیں تھی۔ یہ سب جب مل کر بیٹھتے تو آسٹریا اور

فرانس کے درمیان چھڑنے والی جنگ پر باتیں کرتے۔

انہوں نے یورپ کا ایک بڑا سائنسہ کہیں سے حاصل کر لیا تھا

جس میں جنگ زدہ علاقے نمایاں تھے۔ انہی دنوں اسے

یورپ اور امریکا میں آزادی کی تحریکوں سے دلچسپی پیدا

ہونے لگی تھی۔ اسے امریکا کے بارے میں شدید محسوس پیدا

ہوا۔ اس نے امریکا سے متعلق کتابیں پڑھنا شروع

کر دیں۔

اسی عرصے میں اس کا ایک بھائی پیدا ہوا۔ اس بچے کا

نام رکھنے کے لیے اس کے باپ نے سب سے مشورہ کیا۔

سنگمڈ فرائیڈ نے اپنے بھائی کا نام مشہور یونانی فاتح

الیکزینڈر سکندر اعظم کے نام پر الیکزینڈر رجبز کیا۔ اس نے

الیکزینڈر کے بارے میں تمام کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ وہ اس

کا بڑا مداح تھا۔ اس نام کو سب نے پسند کیا اور اس کے

بھائی کا نام الیکزینڈر ہو گیا۔

اسی طرح وہ انہی بال اور نیولین کو بے حد پسند کرتا

تھا۔ ان ناموں کی پسندیدگی اس کی ذہنی کیفیت کا پتا دیتی

تھی۔ یہ ایک یہودی لڑکے کے ان لوگوں کے بارے میں

تاثرات تھے جو غیر یہودیوں کے ظلم و ستم کے خلاف اپنی نسل

کے تحفظ کے لیے مصروف کار رہے تھے۔ یہ عیسائیوں کے

خلاف اس کا غصہ تھا جو ان فاتحین کو پسند کر رہا تھا۔ وہ ظلم کا

مقابلہ طاقت سے کرنا چاہتا تھا گو بعد میں یہ رویہ اسے ترک

کرنا پڑا۔

وہ ”ایڈی پس“ الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ وہ مسئلہ

ہے جس میں کسی بچے کو اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کے

ساتھ شدید نفرت اور دوسرے کے ساتھ شدید محبت ہو جایا

کرتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے شدید محبت کرتا تھا اسی لیے اپنے

باپ کو اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا اور پھر یہ نفرت بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔

نفیاتی نکتے سے فرائیڈ اور اس کے باپ کے درمیان حریفانہ چپقلش جو خفیہ اور دبی دبی تھی، کا سبب آسانی سے سمجھ آ جانے والا ہے مگر اس کی تمام الجھنوں کو ایک الجھن ”ایڈی پس“ الجھن میں سمیٹ دینا بے انصافی ہوگی۔ انسانی نفیات الجھنوں اور بے چیدگیوں سے بھرپور ہوا کرتی ہے۔ فرائیڈ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔

☆.....☆

وقت کے ساتھ ساتھ اس کا خاندان بڑھتا گیا۔ اس کے اور بہن بھائی اس دنیا میں آ گئے تو ”گلگوں گاے“ کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ تنگ دکھائی دینے لگا۔ اس میں تمام افراد کا آرام سے رہنا مشکل ہو گیا۔ اب یہ خاندان ایک چھ کمروں کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا۔ تین بیڈروم چھ بچوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ ایک چھوٹا سا کمر اکیلے سنگنڈ کے حصے میں آیا۔ خاندان کے پاس تیل کا ایک لمبہ تھا وہ بھی اسے دے دیا گیا اور یہ سب سہولتیں اسے اس کی ماں کی بدولت مل رہی تھیں۔ اس لیے بھی کہ وہ بڑا بیٹا تھا اور اس لیے بھی کہ وہ ذہین اور ہوشیار طالب علم ثابت ہو رہا تھا۔ اسے پڑھائی پر مکمل توجہ دینے کے لیے خاموشی اور تنہائی کی ضرورت تھی۔

اس کی ماں اس کی ضرورت کو اپنے باقی بچوں کی ضروریات پر مقدم سمجھتی تھی اور انہیں ہر طرح سے پورا کیا کرتی تھی۔

اس کا کمرانہایت تنگ تھا اور اس میں ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا تھا لیکن وہ خوش تھا کہ اسے پڑھنے کے لیے تنہائی میسر آ گئی ہے۔ وہ نہایت سادہ زندگی گزار رہا تھا۔ کم عمری کے باوجود وہ اپنی ترقی پسندانہ زندگی میں شریک نہیں تھا۔ گھر میں بھی سب سے الگ تھلگ ہی رہتا تھا۔ شاؤی بھائی کے میز پر سب کے ساتھ شریک طعام ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوا لیتا تھا جہاں وہ کتابی کیڑے کی مانند رات گئے تک اپنی کتابوں میں گن رہتا تھا۔

اس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی کہ بڑا آدمی بننے کی یہی نشانیاں ہیں۔ وہ اپنے پڑھا کو دوستوں کو بھی اسی کمرے میں بلا لیتا تھا اور پھر وہ علمی و نظریاتی بحثوں میں مشغول رہا کرتے۔

کچھ دنوں سے اس کی بہن اینا کو موسیقی کا شوق چرایا

تھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ پیانو خرید لائی تھی۔ نیا نیا شوق تھا۔ ہر وقت پیانو کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ سنگنڈ فرائیڈ نے کچھ دن تو اس شور کو برداشت کیا اور پھر وہ ماں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”میں اینا کے پیانو سے تنگ آ گیا ہوں۔ بس اب بہت ہو گیا۔ تو پیانو اس گھر میں رہے گا یا میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

اس کی شفیق ماں اس کی کوئی بات نہیں مانتی تھی۔ اس نے پیانو کہیں بھیجا دیا۔ اب اینا کی باری تھی۔ وہ منہ بسورنی ہوئی ماں کے پاس پہنچ گئی۔

”کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ آپ نے ایک شکایت پر مجھے میرے شوق سے محروم کر دیا۔“

”تمہارا شوق فضول ہے۔ پیشگوئیوں کے مطابق سنگنڈ کو بڑا آدمی بننا ہے۔ اسے پڑھنے کے لیے تنہائی چاہیے۔ اس لیے پیانو بھیجا دیا۔“

اینا کو اپنی ماں کی اس حرکت پر ہمیشہ دکھ ہوتا رہا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ ایک بہترین پیانوٹسٹ بننے بننے رہ گئی۔

☆.....☆

جننازیم میں سنگنڈ نے آٹھ سال گزارے۔ اسے ہم ہائی اسکول بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا حافظہ زبردست تھا۔ جس کتاب کو وہ ایک بار پڑھ لیتا تھا اسے حرف بہ حرف دہرا سکتا تھا اور جس ٹیکسٹ کوں لیتا اسے لفظ بہ لفظ لکھ لیتا تھا۔

کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا اسے جنون تھا۔ ہمیشہ کتب فروشوں کا مقروض رہتا تھا۔ اس کا گھر انانہایت تنگ دستی سے دن گزار رہا تھا لیکن وہ کتابوں میں ایسا مگن تھا کہ اسے یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ اس کا باپ کن مشکلوں سے دن گزار رہا ہے۔ وہ تو بس نئی سے نئی کتاب کی تلاش میں رہتا تھا۔ کوئی موضوع بھی سامنے نہیں تھا۔ فلسفہ، مذاہب، تاریخ، سائنس جو کتاب ہاتھ لگتی اسے پڑھنا اس پر فرض ہو جاتا تھا۔

بے تحاشا مطالعے کے باوجود وہ یہ طے نہ کر سکا کہ اسے کیا بننا ہے۔ اس کے پیچھے اس کا یہ جذبہ پوشیدہ تھا کہ وہ ہر علم کی گہرائی تک پہنچنے کی خاطر ہے یہ ناممکن تھا۔

جب اس نے ہائی اسکول پاس کر لیا تو اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ڈاکٹر بن جائے۔ اس لیے نہیں کہ علم طب سے اسے کوئی خاص دلچسپی تھی بلکہ اس لیے کہ یہ بہترین ذریعہ آمدن تھا اور اس لیے بھی کہ اس طرح وہ

رازوں اور معصوم کو حمل کرنے اور ان پر سے پردہ اٹھانے کا شدید جوش اور اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ انسان کے جسمانی مطالعے کی بجائے اس کا ذہنی مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔

اس کا باپ چاہتا تو یہی تھا کہ وہ کوئی منفعہ بخش پیشہ اختیار کر لے لیکن اس کے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں جاننے کے بعد اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔

اس نے وی آنا کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں یونیورسٹی میں بھی یہودیوں کے خلاف نفرت زوروں پر تھی لیکن اس نے اس تعصب کی پروا نہ کی لیکن سوچتا ضرور تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ اسے ابتداء میں تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اس یونیورسٹی میں زیادہ دن نہ رہ سکے گا لیکن پھر اس نے احساس کمتری کو احساس فخر میں بدل لیا۔ اسے اپنے یہودی ہونے پر فخر ہونے لگا۔ وہ اس شان سے چلتا تھا جیسے یونیورسٹی فتح کرنے آیا ہے۔ کوئی غیر یہودی اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ اس کی طرف حقارت سے دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس عدم تعاون سے اس نے ایک سبق سیکھا ہے چتا چل گیا کہ حزب مخالف میں ہونے سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ تنہائی بہت کچھ سکھاتی ہے۔ جب کوئی سہارا نہیں ہوتا تو آدمی خود کھڑا ہونا سیکھتا ہے۔ ایک جذبہ اس میں بھی پیدا ہوا کہ وہ برہنیت پر غیر یہودیوں کو بچاؤ دکھائے گا۔ خود اعتمادی نے اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ وہ کسی کا سہارا ڈھونڈنے بغیر اپنے کام میں لگا رہا۔

تین سال تک وہ یونیورسٹی میں نیچرل سائنس کے مختلف شعبوں کے چکر لگاتا رہا۔ ابھی ایک طبعی علم اور کبھی دوسرے طبعی علم کو سر کرنے کی کوشش کرتا رہا تا کہ کائنات کی گتھیاں سلجھا سکے۔ شعبہ کیمسٹری میں اس نے پوری تندہی سے کام کیا۔ بڑی محنت کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی پھر حیوانیات کو چنا۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔

سائنسی دنیا سے یہ تعارفی سلسلہ اس وقت ٹوٹ گیا جب اسے برطانیہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار تھا۔ اس لیے باپ نے خوشی سے اجازت بھی دے دی اور سفر خرچ بھی دیا۔ پہلی مرتبہ باپ کی طرف سے اس کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہوا لیکن نئی اب بھی باقی تھی۔ اس کے دو سوتیلے بھائی عمانوئیل اور قلب ان دنوں مانچسٹر تھے۔ اس کا سوتیلا بھتیجا جیمز کا سامعنی جان بھی وہیں تھا۔ وہ بھی اب اس کی طرح جوان ہو چکا تھا۔ عمانوئیل تو بھائی (سگمنڈ) کو دیکھ کر ایسا خوش ہوا کہ

نیچرل سائنس کا مطالعہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نیچرل سائنس ہی انسانی زندگی کی گتھیاں سلجھا سکتی ہے۔

وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی کوئی سترہ سال کہ ڈارون کا نظریہ معرض وجود میں آیا۔ یہ ایسا زبردست تحقیقی انکشاف تھا جس نے پورے یورپ میں ہلکے چاڑیا۔ اس نے محسوس کیا کہ دنیا میں اب بھی بے شمار تحقیقات اور دریافتیں ہونا باقی ہیں۔ یہ ایسا سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

انہی دنوں اس نے گوئٹے کا ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون میں نیچر کے کن گائے گئے تھے۔ نیچر کی فانیوں کا ذکر تھا اور نیچر سے انسان کے رابطے پر زور دیا گیا تھا۔

یہ مضمون پڑھنے کے بعد جب اس نے گوئٹے کے بارے میں مزید معلومات جمع کیں تو وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ گوئٹے اور اس کے درمیان حیرت انگیز مماثلت ہے۔ گوئٹے بھی اس کی طرح بزم تھا۔ گوئٹے کے بال بھی سیاہ تھے۔ سگمنڈ کی طرح گوئٹے کی پیشانی پر بھی بالوں کا گھونسلہ تھا جو عظمت کی نشانی خیال کیا جاتا تھا۔

گوئٹے بھی اس کی مانند بیس اکیس سالہ ماں کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ بھی اس کے باپ کے مانند چڑچڑا اور میز عمر اور سخت گیر شخص تھا۔ فرائیڈ کی طرح گوئٹے کے دل میں بھی ایک کشمکش موجود تھی۔ ایک طرف ادب سے لگاؤ تھا تو دوسری طرف سائنسی علوم سے۔

گوئٹے کے نظریات نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اس نے نیچر کے معنی سلجھانے کی کوشش سائنس کے ذریعے کی۔ یہ نیچر طبعی نہیں بلکہ انسانی تھی۔ اس لیے جب فرائیڈ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آگے بڑھے گا تو اس کے باپ نے باوجود تنگدستی اور مفلوک مالی کے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کے باپ نے باوجود سخت گیر ہونے کے فرائیڈ سے کہہ رکھا تھا کہ تمہیں اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنا ہوگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نفسیات نے ابھی جنم ہی لیا تھا اور صرف تجرباتی حقائق پر زور دیا جاتا تھا۔ محض نظریوں اور خیالات پر کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ تجربے کی کوئی پرہیز بغیر کسی نظریے کو قابل قبول نہ سمجھا جاتا تھا۔ سائیکائٹری نظام کی خرابیوں کا علم محدود تھا۔ اس کی مانند بھائی اور تعریف غیر ملل تھی۔

نوجوان فرائیڈ سائنس کی راہ سے فطرت کے اسرار و رموز کی تحقیقات کرنا چاہتا تھا۔ اس پر فطرت کے پیچیدہ

باپ کے نام ایک لبا چوڑا خط لکھ دیا جس میں سنگنڈ کی شائستگی اور تعلیمی حالت کی تعریف کی گئی تھی۔ فرائیڈ کو باپ کے بارے میں جو غلط فہمیاں تھیں انہیں بھی دور کیا اور باپ کی مشکلات اس طرح بیان کیں کہ اس کی تلخیاں جانی رہیں۔ گھر سے باہر بھی انگریز کی دنیا اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ یہاں وہ یہودی نہ تھا بلکہ دوسرے انسانوں کی طرح عام انسان تھا۔ یہاں کی مذہبی رواداری نے اس پر نہایت خوشگوار اثر مرتب کیا۔

چھٹیوں کے دن گزارنے کے بعد جب وہ ویانا واپس آیا اور یونیورسٹی جانے لگا۔ قدرت اسے کچھ بتانا چاہتی تھی لہذا اب اسے ایسا استاد اور ایسی سائنس مل گئی جو اس کی مرضی کے مطابق تھے یعنی اسے ارنسٹ بروک کی فیزیالوجیکل لیبارٹری میں کام کرنے کا موقع میسر آگیا۔ ارنسٹ بروک ایک ماہر اور نامور ماہر جسمانیات تھا اور یونیورسٹی کا بہترین استاد تھا۔ اس کے معاونین سنگنڈ ایکسز اور فلیشل مارکو تھے۔ فلیشل کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی۔ فرائیڈ اس لیبارٹری میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ اسے گریجویٹیشن کرنا اور ڈگری لینا بھی بھول گیا اور تقریباً چھ سال (1882ء تک) بروک کے ساتھ کام کرتا رہا۔

اپنے مستقبل کو تباہک بنانے کی اُمید میں اس نے بروک کی تجربہ گاہ میں اندھا دھند محنت کرتے ہوئے اپنی جوانی کے چھ بہترین سال گزار دیے۔ بروک اسے جو بھی مسائل حل کرنے کے لیے دیا کرتا تھا وہ اپنی محنت اور قابلیت سے انہیں حل کر دیتا تھا۔

اس نے تحقیقاتی کام اس انتہاک سے انجام دے کہ اپنی دیگر مصروفیات حتیٰ کہ پڑھائی کو بھی قریب قریب نظر انداز کر دیا۔

بروک اسے اپنا معاون بنانے کی ٹریننگ دے رہا تھا۔ اس نے اس کو ہر قابل کو پہچان لیا تھا۔ بروک جب اس کی طرف دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں تو صمیمی چمک نظر آتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ بروک اس کی دلچسپی اور محنت کو دیکھتے ہوئے ضرورتاً تاحیات معاون بنالے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ بروک نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک روز بڑی بے رخی سے کہہ دیا کہ لیبارٹری میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ اسے معاون نہیں بنا سکتا۔ فرائیڈ کے صدمے کی انتہا نہیں تھی۔ ایک تو ڈگری پانے میں دیر ہوئی کیونکہ وہ پڑھائی کی طرف سے غافل ہو گیا تھا اور دوسرے

جس پچیسے کا وہ انتخاب کرنا چاہتا تھا اور جس کے لیے اس نے شبانہ روز محنت کی تھی وہ یکدم ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

لیبارٹری چھوڑنے کے بعد اس کے سامنے اچانک معاشی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب تک اس کا باپ اس کا خرچ برداشت کر رہا تھا لیکن اب معاشی حالات سنوارنے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی وجہ سامنے آگئی۔ گریجویٹیشن کے بعد اس کی مفتی ایک لڑکی مارٹھا سے ملے ہو گئی۔ مارٹھا کا خاندان ہمہ گیر سے وی آنا آتا تھا۔ اب فرائیڈ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور خود کمائے۔ اس نے وی آنا کے جنرل اسپتال میں ملازمت اختیار کر لی جہاں جلد ہی اسے جونیئر ریزیڈنٹ فزیشن بنادیا گیا۔ وہاں بھی اسے بروک کے مانند ایک ایسا فاضل مل گیا جو اپنے کام سے عشق کرتا تھا۔ اس کا نام ڈاکٹر تھیوڈور میرٹ تھا جو شہور سائیکٹریسٹ تھا۔ وہ دماغی اناتومی پر کام کرتا تھا، اس نے اس کام کے لیے انسٹی ٹیوٹ قائم کر رکھا تھا۔ یہ وہ کام تھا جس سے فرائیڈ کو بھی حقیقی دلچسپی تھی۔ اس نے یہاں چھ ماہ تک شاگرد کی حیثیت سے کام کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی شادی کے لیے رقم جمع کرنے کے خیال سے دماغی و اعصابی بیماریوں کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ ان دنوں وی آنا میں اس برانچ آف میڈیسن میں چند ایک ہی اسپیشلسٹ موجود تھے کیونکہ اس وقت تک علم طب کی اس شاخ کو اتنا اہم نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات میں فرائیڈ نے اپنا استاد آپ بننے کا فیصلہ کیا۔ پھر جلد ہی اس کے ذہن میں چارکوٹ کا نام آیا۔ یہ شخص علوم نفسیات میں خصوصی شہرت کا مالک تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کا شاگرد بننے کے لیے اسے پیرس کا سفر کرنا پڑ رہا تھا لیکن اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس کے موجودہ استاد سیزٹ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دماغی اناتومی پر لیکچر دے کر پیسے کمائے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ممکن ہے اس پیشکش کو ٹھکرا دیتا لیکن اس وقت وہ ضرورت مند تھا۔ اسے پیرس جانے کے لیے سفر خرچ درکار تھا۔

چارکوٹ نے اسے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ اس کی لیبارٹری میں کام کرتا رہے۔ وہ اسے اپنی جگہ بھی دینے کو تیار تھا لیکن فرائیڈ نے اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔

”میری منزل یہ لیبارٹری نہیں۔ میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں۔“

”میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب تم میری جگہ لو۔“

”میں پتھر نہیں کہ ایک جگہ بڑا رہوں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن میں آپ کے لیے اپنا مستقبل دھندلا نہیں کر سکتا۔“ اس کے اس دو ٹوک جواب پر اس کا مہربان بینرٹ اس کا دشمن بن گیا لیکن اب فرائیڈ کی شہرت اتنی ہو گئی تھی کہ وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ بالآخر اس کا سابق محسن بروک جس نے کبھی اسے اپنا معاون بنانے سے انکار کر دیا تھا اس کے کام آیا۔ اس کی سفارش پر اسے وظیفہ مل گیا۔ وہ اب اس قاتل ہو گیا تھا کہ پیرس جاسکے۔

”اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں نے تمہیں اپنا معاون کیوں نہیں بنایا تھا۔“ بروک نے کہا۔ ”اگر تم میرے پاس رہتے تو خود پر آگے جانے کے راستے بند کر لیتے۔ میں تمہاری اہلیت کا قائل ہوں اس لیے پیرس جانے کا مشورہ دے رہا ہوں۔“

فرائیڈ نے بروک کا شکریہ ادا کیا اور پیرس جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔

دبلا پتلا سیاہ بالوں والا انتیس سالہ فرائیڈ جب پیرس پہنچا تو یہاں کی رونقیں اور رنگینیاں دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ دینا اور پیرس کا مقابلہ ہی کیا تھا۔ شفاف سڑکوں پر بے فکر شہری اس طرح گھوم پھر رہے تھے جیسے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے دماغی امراض کے شفا خانے سال پٹرمیری اسپتال میں داخلہ لے لیا۔

یہ اسپتال چارکوٹ کی وجہ سے طب نفسی اور طبیات کے ماہرین کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چارکوٹ نے علاج معالجہ کے لیے ہپناٹزم کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا اور یہ اس کا خصوصی طریقہ تھا۔

چارکوٹ کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے میڈیکل پریکٹس میں ہپناٹزم کو ایک نمایاں اور قاتل قدر مقام دلایا تھا۔ ہپناٹزم کا ماخذ مسمریزم ہے اور مسمریزم کو لوگوں نے دھوکا اور مکاری سمجھ رکھا تھا البتہ انیسویں صدی کے وسط میں ایک انگریز ڈاکٹر اور ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے ہپناٹزم کے ذریعے مریضوں کو بے ہوش کر کے کئی کامیاب علاج کیے۔ اس علاج کو پرکھنے کے لیے چارکوٹ نے سال پٹرمیری میں ہپناٹزم کا اسکول کھولا۔ اس اسکول میں ہپناٹزم کے بارے میں تحقیق کا کام شروع ہو گیا۔

یہ چارکوٹ کے تحقیق کاموں کی بدولت ہی ہوا کہ ہپناٹزم کو ایک باقاعدہ طریقہ علاج کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔

سال پٹرمیری میں رہتے ہوئے اسے ایک اندر

گر بجوئیں کی حیثیت سے نفسیات کی اعلیٰ تعلیم اور پیش بہا تجربات کا موقع ملا۔ اس نے اپنی توجہ زیادہ تر نیرواس پر مرکوز رکھی تھی۔ یہ علوم نفسیات کی وہ شاخ تھی جسے طویل عرصے سے نظر انداز کیا جا رہا تھا۔

پیرس میں اس کا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ مصروفیت ایسی تھی کہ دوست بنانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ وہ اسپتال سے تنہا اپنی رہائش گاہ کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ذرا آگے چلا تو پھر کسی نے پکارا۔ آواز مانوس تھی لیکن پہچان میں نہیں آ رہی تھی۔ ایسا کوئی بھی نہیں تھا جسے وہ جانتا ہو۔ ظاہر ہے اس نے اسے وہم قرار دیا اور کوئی پروا نہیں کی۔ دو تین دن کے وقفے کے بعد پھر یہی آواز سنائی دی۔

ان آوازوں کو لے کر اس نے اپنا تجربہ خود کرنا شروع کر دیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ اس کی تنہائی ہے جو اسے پکارتی ہے یعنی اس کے اندر دہلی ہوئی یہ خواہش اسے آواز دیتی ہے کہ کوئی اس کی تنہائی کا سامنی ہو۔ گھر سے اتنی طویل جدائی اور دوری نے اس میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا۔ اکیلے پن کے احساس نے اس کے دل میں تحفظ اور گرجوئی کے حصول کی خواہش پیدا کر دی تھی۔ ان حالات میں اس کے ذہن میں کسی کے زیر سر پرستی آنے کا خیال بھی پیدا ہوا لیکن اس خیال کو اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے عزم کیا کہ وہ اپنی تنہائی کا مسئلہ خود سلجھائے گا۔ اس نے چارکوٹ کو خط لکھا کہ وہ اس کی کتابوں کا ترجمہ جرمن زبان میں کرنے پر تیار ہے۔ چارکوٹ نے اس پیشکش کو منظور کر لیا۔ فرائیڈ نے پہلے ایک کتاب کا ترجمہ کیا پھر دوسری کا اس بہانے چارکوٹ سے ملاقاتیں بھی بڑھ گئیں۔ آہستہ آہستہ اس کا شمار چارکوٹ کے دوستوں میں ہونے لگا۔

چارکوٹ کی شخصیت نے فرائیڈ کو بے حد متاثر کیا۔ وہ صرف ہپناٹزم ہی سے متاثر نہ ہوا تھا بلکہ ہسٹریا کے علاج کے طریقوں سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ چارکوٹ نے تجربوں سے یہ بھی ثابت کیا تھا کہ صرف عورتیں ہی ہسٹریا کی مریض نہیں ہوتیں بلکہ مرد بھی ہوتے ہیں۔ چارکوٹ کی ایک خوبی اسے بہت پسند آئی کہ وہ کسی چیز کو اس وقت تک درست تسلیم نہ کرتا تھا جب تک اسے مختلف تجربات اور حقائق کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھ نہ لیتا۔

فرائیڈ اپنی تحقیقات کو بھی چارکوٹ کے نمونے پر آگے بڑھانے کا متمنی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح لوگ

ہار کوٹ کا تذکرہ کرتے ہیں انہی الفاظ سے اس کا تذکرہ بھی کیا جائے۔

☆.....☆

1886ء کے موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ سبزہ لہلہایا زرد رختوں پر نئے شگوفے کھلنے لگے تو اس کے دل میں بھی نئے موسموں نے انگڑائی لی۔ اسے اپنی مگنیت مارتھا یاد آ رہی تھی جو اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کی یاد بھلانے کا اسے یہی ایک طریقہ سوچا کہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ کام میں منہمک رکھے۔ اس کے ساتھ ہی خود کو سیر و تفریح میں مشغول رکھنے لگا۔ اسے مارتھا سے جلد از جلد شادی کرنے کی خواہش ضرور تھی لیکن یہ بوجھ اٹھانے کے لیے اس کے پاس رقم اب بھی نہیں تھی۔ اس کی اب تک کی عمر حصول علم میں بسر ہوئی تھی۔ اگر میں عام ڈاکٹر کی حیثیت سے پریکٹس شروع کر دوں تو پھر میرے عزائم کا کیا ہو گا۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ شادی کے لیے بے قرار ضرور تھا لیکن پھر یہ بھی سوچتا تھا کہ از دو اجبی زندگی اس کی ترقی میں رکاوٹ بن جائے گی۔ جیسا کہ پہلے ایک مرتبہ ہو چکا تھا۔ پیرس آنے سے ایک سال قبل وہ کوئین پری تجربہ کر رہا تھا لیکن اسے مارتھا کی یاد آئی۔ مارتھا کی کشش نے سب کچھ بھلا دیا اور وہ تجربہ سچ میں چھوڑ کر ہمبرگ روانہ ہو گیا۔ جہاں مارتھا رہتی تھی۔ جاتے ہوئے وہ اپنے دوست (آنکھوں کے ڈاکٹر) سے کہہ گیا کہ کوئین کے ٹیکے سے آنکھوں کا آپریشن کیا جاسکے گا۔ جب وہ ہمبرگ سے واپس آیا تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے دوست نے اس تجربے کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر خود کو اس تحقیق کا ذمہ دار قرار دے دیا ہے اور ساری شہرت و نیک نامی کا مالک بن بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ سے یہ اعزاز چھین گیا کہ وہ اس عظیم دریافت کا سہرا اپنے سر باندھ سکتا۔

اسے یہ افسوس اس وقت بھی ہو رہا تھا جب وہ پیرس میں تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ شادی کرنے لیکن یہ سوچ کر اب بھی رک رہا تھا کہ کہیں کوئی ایسا ہی واقعہ پھر پیش نہ آجائے۔ مارتھا کی قربت اسے عظیم دریافتوں سے روک نہ لے۔

اس وقت تو اس کے اس صدمے نے انتہا کو چھو لیا تھا جب کچھ عرصے بعد اس کا باپ آنکھوں کی بیماری کا شکار ہوا۔ اس کا آپریشن بھی اس کی دریافت کوئین کے ٹیکے سے ہوا اور وہ اپنے باپ کو یہ بتا سکا کہ یہ ٹیکا تمہارے اس بیٹے کی ایجاد ہے جسے تم ناکارہ کہتے تھے جس کے لیے تم نے یہ

تک کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکا دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا۔

اسے افسوس ہوتا رہا کہ اس نے وقتی جذبے کے تحت اپنی ایک اہم ترین دریافت کا راز اپنے دوست کو بتا دیا۔ وہ اس کا ذمہ دار مارتھا کو قرار دیتا رہا۔ شادی کے بعد بھی مارتھا سے اس کی ناراضی کم نہ ہوئی۔ کم از کم اس معاملے میں حالانکہ مارتھا کا اس میں قصور نہیں تھا۔

اب پھر وہ اس وقتی جذبے کے زیر اثر تھا۔ یہ جذبہ تھا شادی کی خواہش۔ مارتھا چار سال سے اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر پیرس سے دی آنا کی طرف جا رہا تھا۔ دی آنا پہنچ کر اسے ملازمت کی تلاش ہوئی۔ جن دنوں اس پر پیرس جانے کی دھن سوار تھی اسے دی آنا میں دماغی بیماریوں کے شعبے میں ایک اچھے عہدے کی پیش کش ہوئی تھی۔ اس نے بہتر سمجھا کہ شادی اور گریجویٹ کا بکھیڑا سنبھالنے سے پہلے اپنے آپ کو اس دوران میں پریکٹس کے لیے تیار کر لے۔

اس نے جلد ہی دی آنا میں عصبی بیماریوں کے اسپیشلسٹ کی حیثیت سے ایک مضبوط مقام بنا لیا۔ بالآخر 1886ء کے موسم خزاں میں مارتھا سے اس کی شادی ہوئی۔ مارتھا کا خاندان پڑھ لکھے یہودیوں کا خاندان تھا۔ اس کا دادا ہمبرگ کا چیف تھا۔ اس کے بیٹے جرمن یونیورسٹیوں میں پڑھاتے تھے۔ یہودی ہونے کے باوجود انہیں پروفسر شپ حاصل ہو گئی تھی۔ یہ ان کی قابلیت کا ثبوت تھا۔

ہمبرگ میں پلنے بڑھنے کے سبب مارتھا میں جفاکشی اور عنت جیسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی تھیں اور دی آنا میں اپنی گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے بالکل آمادہ تھی۔ چنانچہ جب وہ شادی کر کے فرائیڈ کے گھر آئی تو فرائیڈ کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ اس نے ایک مثالی عورت سے شادی کی ہے۔ وہ گھر میں برتن دھونے صفائی کرنے کھانے پکانے کے تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ سنگم نہ فرائیڈ کو کوئی معمولی آدمی نہیں۔

فرائیڈ خوش قسمت تھا کہ اسے مارتھا سے ویسی ہی محبت حاصل ہوئی جو بچپن میں اسے اپنی ماں سے ملا کرتی تھی۔ اس پر یہ مقولہ صادق آتا تھا کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

معالج کی حیثیت سے فرائیڈ کو شروع میں سوائے مخالفت اور نفرت کے کچھ نہ ملا۔ جب بھی ہسپتال کے بارے میں اس نے

اپنے نظریات پیش کیے ڈاکٹروں نے اس کا مذاق اڑایا۔

اس نے جب وہی آنا کے قدامت پسند ممبران کے سامنے اپنے نئے طبی نظریات پر مبنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں اس نے چار کوٹ کی تجربہ گاہ میں جو کچھ دیکھا اور سیکھا تھا اس کا تذکرہ تھا۔ اس رپورٹ میں اس نے ان مردوں کا بھی تذکرہ کیا جو ہسٹریا میں مبتلا تھے۔ میڈیکل سوسائٹی کے ممبران کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ انہوں نے اس کا مستغز اڑایا۔

”آپ ایسی احقانہ باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ ہسٹریا کا لفظ ہسٹرون سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے ”رحم“ اور رحم صرف عورتوں کے جسم میں ہوتی ہے لہذا ہسٹریا صرف عورتوں کا مرض ہے اس کا مردوں سے کیا تعلق؟ اس نے ثبوت کے لیے ایک ایسے مرد کو تلاش کیا جو ہسٹریا میں مبتلا تھا اور اسے سوسائٹی کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اس پر بھی بہت سوں نے چپ سادھ لی اور اس نظریے میں دلچسپی نہیں لی۔“

اس کے فوراً بعد سیزٹ نے جو دائمی خسران کے انشی ٹیوٹ کا مریب تھا اس نے فرائیڈ کو اپنی لیبارٹری سے نکال دیا۔ اب اس کے پاس کوئی جگہ نہ رہی جہاں وہ لیکچر دے سکے۔ اسے عقلی اور تحقیقی زندگی سے بالکل محروم کر دیا گیا۔ جہاں تک اس کی پریکٹس کا تعلق تھا اس کے پاس دو جہزیں تھیں ایک پینانڈرم اور دوسرا بجلی کا علاج۔ اس پریکٹس سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ وہ اس کے بڑھتے ہوئے کنبے کے لیے ناکافی تھی۔

پینانڈرم کو وہی آنا کے طبی حلقوں میں حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ فرائیڈ کا چونکہ طریقہ علاج یہی تھا اس لیے اسے بھی حقارت سے دیکھا جاتا۔ اس میں کچھ پیشہ وارانہ حسد بھی تھا کیونکہ اس کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی اور وہ یہودی بھی تھا۔

پینانڈرم میں کامیابی نے اسے یہ راہ بھائی کہ نامیاتی عصبی بیماریوں کے علاج کے لیے اسے عام طریقہ ترک کر کے پینانڈرم کو استعمال میں لانا چاہیے چنانچہ اس نے پینانڈرم کے طرائق کو کام میں لا کر عصبی بیماریوں کا علاج شروع کر دیا۔ طریق علاج نے اسے بے پناہ شہرت دی۔ اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہونے لگا لیکن اس دوران اسے پینانڈرم کی خامیوں سے آگاہ ہونے کا موقع بھی ملا۔ اس نے دیکھا کہ بعض مریض اس کی کوشش کے باوجود حالت تنویم

(تحقید) میں نہیں آتے تھے یا ان پر قدر پینانڈرم حالت طاری نہیں ہوتی تھی جتنی اسے درکار ہوتی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نے پینانڈرم کی تعلیم حاصل کی ہے وہ ادھوری ہے یا کوئی نہ کوئی کمی رہ گئی ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس عمل کی تعلیم کا اور گہرا مطالعہ کرے۔ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ نینسی فرانس کے میڈیکل کالج میں چلا گیا جہاں پینانڈرم کے متبادل طریقہ علاج کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے یہاں محض چند ہفتوں کے قیام ہی میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی اور ان ذہنی الجھنوں اور مسائل کی بھول بھلیوں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا جن میں اسے سابقہ استاد چار کوٹ نے لا کھڑا کیا تھا۔

یہ اس کی لگن ہی تھی جو اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیے پھر رہی تھی۔

نینسی سے واپسی پر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ماضی سے مکمل طور پر ناپا توڑ کر آزادانہ طور پر تحلیل نفسی پر تحقیقات کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس نے مختلف تجربات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مریض کو پینانڈرم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر مریض کو موقع دیا جائے تو وہ اپنے ماضی کے تجربات بیان کرے، اس عمل سے ہی مریض کا علاج ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام تحلیل نفسی ہے۔ اب وہ مریضوں کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں اپنی بیماری کی وجوہات سے آگاہ کرنے کی ہدایت دینے لگا تھا۔

اس طریقہ کار کے مطابق علاج کرنے کے دوران اس نے جو تجربات حاصل کیے ان کی بناء پر اس نے بے حد اہم دریافتیں کیں اور نفسیاتی نظریات قائم کیے۔ اس کی اہم ترین دریافتوں میں خاندان کے فرد کی شخصیت قائم کرنے میں بنیادی کردار، خاندان اور خاص طور پر باپ کا بچے کی طرف جارحانہ رویہ، لاشعور کا انسانی زندگی میں اہم کردار اور بچے میں ماں کے ذریعے معاشرتی اقدار اور روایات کے منتقل ہونے کا طریقہ کار شامل ہیں۔

اس کی پہلی دریافت انسانی کردار کے لاشعوری محرکات تھے۔ اس نے بتایا کہ پیدائش پر بچے میں صرف لاشعوری جبلی خواہشات اور ضروریات موجود ہوتی ہیں جن کی بچہ فوری تسکین چاہتا ہے۔ ان خواہشات کو اس نے لا ذات یا (id) کا نام دیا جب بچہ ایک سال کا ہوتا ہے تو اس میں اچھے برے کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بڑے

اسے ایسے کاموں سے منع کرتے ہیں جنہیں وہ برا سمجھتے ہیں۔ اس عمر میں اس میں ”انا“ (Ego) پیدا ہو چکی ہوتی ہے لہذا وہ ماں باپ کے ڈانٹنے سے اس عمل کو ماں باپ کے سامنے نہیں کرتا لیکن ان کی غیر موجودگی میں اس عمل کو بار بار دہراتا ہے۔ بار بار منع کرنے سے بچے کی یہ خواہش اس کے لاشعور میں چلی جاتی ہے۔

فرائیڈ کی ایک اور اہم دریافت یہ تھی کہ بچے میں فطرتی خواہشات پائی جاتی ہیں اور والدین ان خواہشات کو دباتے ہیں اس صورت حال کے لیے فرائیڈ نے ایڈیپس کا مپکلس کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کے تحت لڑکے میں اپنی ماں سے متعلق خواہشات پائی جاتی ہیں۔ وہ والد کو اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ لڑکیوں کے لیے اس نے الیکٹرا کا مپکلس کا نظریہ وضع کیا یعنی لڑکی کا رجحان باپ کی طرف ہوتا ہے۔ جب بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو بچے کو قایم میں رکھنے کے لیے بچے کو کسی خدا کے تصور کے لیے نفسیاتی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اب وہ ایسے خدا کے تصور میں ایک جاہل و جاہلہ دیکھتا ہے جو اسے سزا دے دیتا ہے۔ فرائیڈ نے تاریخی مطالعے سے بھی یہ نتیجہ نکالا کہ انسان میں کسی خدا کا تصور اسی وقت پیدا ہوا جب اس نے فطرت کے مقابلے میں خود کو بے بس دیکھا۔

فرائیڈ نے انسانی نفسیات میں لاشعوری محرکات دہی ہوئی خواہشات اور والدین کے کردار کو بخوبی سمجھا۔ اس کے نظریات کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں مغربی یورپی سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقتوں کی پوری اور بھرپور ترجمانی کی۔ یہ اور اس قسم کی دوسری دریافتوں کے باوجود اس کی کوئی عزت افزائی نہ ہو سکی۔ بچپن میں اسے غیر یہودی معاشرے کی طرف سے جو دھک کار ملی تھی اس کا سامنا اب بھی تھا مگر فرائیڈ کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ہر طرف سے بے نیاز اپنے تحقیقاتی کاموں میں لگا ہوا تھا۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ انسان کا ہر مسئلہ جنس کے گرد گھومتا ہے لیکن اسے کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس انکار میں بیشتر حصہ اس خیال کا تھا کہ ایک یہودی کے پیش کردہ نظریات کو کیوں قبول کیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے نظریات اور دریافتوں کو کسی دن دنیا سے منوا کر رہے گا۔ اگر زندگی میں قبولیت نہیں بھی ملی تو اس کے مرنے کے بعد دنیا ضرور انہیں قبول کرے گی۔

اب اس نے تحلیل نفسی کے میدان میں نئے تجربات

کرنے شروع کر دیے اور ان کے لاشعور کی ترجمانی کرنے لگا۔ فرائیڈ مسلسل دس برس تک تنہا کام کرتا رہا۔ اس عرصے میں اسے بہت شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نظریات قبول کرنا تو درکنار کسی نے اس سے ہمدردی کا اظہار تک نہ کیا لیکن ان حالات میں فرائیڈ نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور اپنے نظریات کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کی محنت رنگ لائی۔ اس کا اکیلا پن آہستہ آہستہ اختتام کو پہنچنے لگا۔ اب دہے لفظوں میں لوگ اسے تحلیل نفسی کا بانی کہنے لگے تھے۔ اگر مخالفت بھی تو لفظ ”جنس“ پر تھی۔ اس سے کہا جاتا تھا کہ وہ جنس کا کوئی مترادف لفظ تلاش کر لے لیکن فرائیڈ نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا۔ وہ اب بھی ثابت قدم تھا۔

اس کی ثابت قدمی رنگ لائی۔ ڈاکٹروں، ادیبوں اور سائنس دانوں کا ایک چھوٹا سا گروپ اس کے گرد اکٹھا ہونے لگا اور پھر یہ تعداد بڑھتی گئی۔ یہ گروپ فرائیڈ کا لیکچر سننے اسی کے گھر جایا کرتا تھا تو اہل وی آنا ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اہل وی آنا بدستور بے گنگی اور سردمہری کا رویہ رکھے ہوئے تھے اور معزز و سوسائٹی میں تو اس کا نام لیا ہی نہیں جاتا تھا۔ خواتین کی محافل میں تو اس کا نام آتے ہی چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے۔

دنیا نے طب کا ایک باحیثیت شخص ”ونگر وان“ جو یونیورسٹی کا باقاعدہ پروفیسر تھا (فرائیڈ کو مکمل پروفیسر شپ بھی نہ ملی) اور سائیکائٹری کا ماہر تھا، فرائیڈ کے خلاف اس کے مخالف گروپوں کی قیادت کیا کرتا تھا۔ فرائیڈ کے لیکچر بیٹے کی شام کو کرٹیکس ہاؤس پاگل خانے سے ملحق سائیکا ٹرک کلینک کے لیکچر ہال میں ہوا کرتے تھے۔ اس پاگل خانے میں پاگلوں کو لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا کیونکہ انیسویں صدی تک پاگلوں کے علاج کا کوئی بہتر طریقہ دریافت نہیں ہوا تھا۔ لیکچر ہال میں فرائیڈ کے لیکچر کے وقت چند ہلکی روشنی کے بلب جلا دیئے جاتے تھے۔ اس کی میز کے سامنے بیٹھوں کی قطاریں تھیں جس پر اس کے مخالفین بیٹھ کر اس کا لیکچر سنتے تھے۔

ہانس ساچن نامی سائیکا ٹرسٹ اس کے گروپ میں شامل ہوا تو فرائیڈ کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اس نے فرائیڈ کے خوابوں کی تعبیر کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اس کتاب ہی نے

وہ رات گئے تک جاگ کر اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ تحلیل نفسی میں دلچسپی رکھنے والوں کے نزدیک اس کا گھر سائنس کے مقدس گھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس گروپ کے افراد وہ تھے جو فرائیڈ کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتے تھے۔ اسے ایسے لوگ ہرگز پسند نہ تھے جو تنقید کرنے، بحث کرنے اور کٹ جتنی کرنے کے عادی تھے۔ جو لوگ اس کی مطلق العنانی پسند نہ کرتے انہیں وہ یا تو خود نکال دیتا یا وہ خود اسے چھوڑ کر چلے جاتے۔

فرائیڈ کی کوشش رنگ لا رہی تھیں۔ اسے اپنی تحقیقات میں کامیابی نصیب ہوئی۔ 1910ء میں تحلیل نفسی کی بین الاقوامی انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔

تحلیل نفسی کی کانفرنس منعقد ہوئی تو یہ پہلا موقع تھا جب مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے اور وی آنا کے سائیکا ٹرسٹوں کے علاوہ لندن ملڈ ایسٹ اور پیرس کے سائیکا ٹرسٹ بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس میں جہاں اور باتیں ہوئیں وہیں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ ایک باقاعدہ رسالہ نکالا جائے۔

فرائیڈ کی تحریک تحلیل نفسی اب آسٹریا اور سوئٹزر لینڈ میں ہی نہیں بلکہ امریکا میں بھی مقبولیت حاصل کرنی جاری تھی۔ برطانیہ، کینیڈا اور ہندوستان میں بھی یہ تحریک دل عزیز کی حاصل کر رہی تھی۔

فرائیڈ کے نظریات کو سب سے زیادہ پذیرائی امریکا میں ملی۔ وہ ڈاکٹر برل تھا جو یورپ سے امریکا روانہ ہوا تھا۔ اس نے جب نیویارک میں پہلے پہل تحلیل نفسی کا پرچار کرنا شروع کیا تھا مگر اسے شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی باتیں لوگوں کے دلوں کو لگنے لگیں اور تحلیل نفسی کا نظریہ قبولیت کا شرف حاصل کرتا چلا گیا۔ کلا راک یونیورسٹی نے فرائیڈ اور اس کے اہم ترین ساتھی ڈیگ کو یونیورسٹی کی بائیسویں سالگرہ کی تقریبات میں مدعو کیا گیا اور انہیں دعوت دی کہ وہ تحلیل نفسی پر لیکچر دیں۔ یہ فرائیڈ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

جب فرائیڈ کلا راک یونیورسٹی پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فیکلٹی نہ صرف اس کے کاموں سے واقف تھی بلکہ طلبہ کو ان پر لیکچر دینے کے کام بھی برابر جاری تھے۔ امریکانے اس کے ہر کام کو کسی قسم کے تعصب کے بغیر قبول کر لیا تھا۔

وہ نہایت مطمئن ہو کر امریکا سے وی آنا واپس آ گیا

اسے مزید نفسیاتی علوم حاصل کرنے کی خواہش دلائی اور وہ فرائیڈ کی طرف پہنچ کر آ گیا۔ جب تک اس نے فرائیڈ کو نہیں دیکھا تھا اس وقت تک فرائیڈ کا عجیب سا نقشہ اس کے ذہن میں تھا مگر جب اس نے فرائیڈ کو دیکھا تو اس کی پروقار شخصیت نے اس پر جادو سا کر دیا۔ 1904ء کے لگ بھگ فرائیڈ ایک ادیب عمر کا سنجیدہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی ڈارک براؤن داڑھی تھی۔ قد درمیانہ اور جسم دہلا پتلا تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری اور چمکدار تھیں۔ پیشانی فراخ اور بہت خوب صورت تھی۔ ہانز ساچن نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ صاف سحرے سلیتے اور مہارت سے سسلے ہوئے سیاہ رنگ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس پر اس نے سیاہ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ اس کی چال ڈھال میں نہایت تیزی اور پھرتی تھی حالانکہ اس وقت تک وہ ادیب عمر کا ہو چکا تھا۔

فرائیڈ اپنے لیکچر کبھی لکھ کر نہ لاتا تھا۔ حوالے کے نوٹس تک اس کے پاس نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ دو گھنٹے تک مسلسل لیکچر دیتا رہتا تھا۔ تحلیل نفسی کی تکنیک اور تصویریں مشکل چیزیں تھیں مگر جن طریقوں سے وہ ان پر لیکچر دیتا تھا اس سے سننے والوں کو کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی۔

لیکچر کے بعد سارا گروپ فرائیڈ کے ہمراہ صحن میں نکل آیا کرتا تھا۔ پھر باہر آ کر گھر جانے کے لیے ٹیکسی پکڑتا تھا۔

اسے ٹیکسی پکڑنے کی جلدی ہوتی تھی کیونکہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے چند مخصوص دوست اس کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ تاش کھیلنا کرتا تھا جو وی آنا کا مقبول ترین کھیل تھا۔

اس کی شخصیت کی طرح اس کا گھر بھی پُر اسرار اور دلچسپ تھا۔ یہ گھر وی آنا کی مضافاتی پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھا اور خاصی بلندی پر تھا۔ یہ نہایت خاموش اور پُرسکون جگہ تھی۔ چلی منزل پر اس کا خاندان رہتا تھا اور اوپری منزل پر اس کا کمرہ مشاورت تھا۔ جو کمرے اس کے تصرف میں تھے ان میں ایک وینٹگ روم، ایک کمرہ مشاورت اور ایک لائبریری تھی۔ وہ یہیں بیٹھ کر لکھتے پڑھنے کا کام کرتا تھا۔ ان کمروں میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ ضرورت پڑنے پر کمرے کو گرم کرنے کا انتظام تھا۔ اس کی اسٹڈی میں ایک میز بھی تھی اس پر ایک ایٹش ٹرے رکھی تھی۔ وہ دن بھر میں کم از کم بیس سگار پیتا تھا۔ اس کی انگلیاں کبھی سگار سے خالی نہیں رہتی تھیں۔ وہ یہاں ہر بدھ کی شام کو اور ہفتے کی شام کو لیکچر دیا کرتا تھا۔ باقی دنوں میں

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکا کے بارے میں اس کی رائے بھی اچھی نہیں رہی تھی۔ اس گرجوشی کے استقبال کے بعد بھی امریکا کے بارے میں اس کی منفی رائے تبدیل نہ ہو سکی۔ اس کے چند سالوں بعد ڈنگ نے خطوط کے ذریعے اسے امریکی معاشرے کی جنسیت زدگی اور مرد و زن کے آزادانہ تعلقات کے متعلق تفصیلات لکھی شروع کیں تو اسے امریکا سے اور بھی زیادہ نفرت ہو گئی۔ وہ عورت کی برتری کا شدید مخالف تھا اور یہی بات اسے امریکا کے بارے میں مخالفت پر آمادہ کرتی تھی۔

اس نے جب دوسری تحلیل نفسی کا مگرلیس بلوائی۔ اس کانفرنس کے لیے ڈنگ نے جو بحث کی اس کے بعد فرائیڈ کو یقین ہو گیا کہ ڈنگ کی صورت میں اسے ایک سچا سپاہی مل گیا ہے۔ اگر ڈنگ اسی طرح تحریک تحلیل نفسی کی جدوجہد جاری رکھے گا تو ایسی صورت میں مجھے نظریاتی تحقیقات پر کام کرنے کے لیے خاصی فرصت مل جائے گی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ڈنگ میرے نزدیک میرے بیٹے کی طرح ہے۔

اب اسے یہودی اور غیر یہودی کی بحث کا سامنا تھا۔ اس کے یہودی دوستوں کو یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی غیر یہودی اتنے اختیارات کا حامل ہو جتنا ڈنگ ہو چکا تھا (ڈنگ غیر یہودی تھا) خود فرائیڈ کو بھی یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے ڈنگ کا انتخاب کر کے غلطی کی ہے۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ڈنگ بہترین مگرلیس اور منتظم نہیں ہے۔ ڈنگ جرمن زبان میں نکلنے والا ایک سارکالوجیکل رسالہ چلا رہا تھا۔ اس کا تمام اسٹاف غیر یہودیوں پر مشتمل تھا۔

ڈنگ سے فرائیڈ کے تعلقات کشیدہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈنگ نے ایک مضمون چھاپا جس میں اس نے فرائیڈ اور ایڈلر پر الزام لگایا کہ وہ غلط اور منفی قسم کے نفسیاتی علوم کی ترویج میں مصروف تھے۔ اس طرح تحریک تحلیل نفسی کے دستوں کے سربراہوں کے درمیان اقتدار کی کشاکش غیر محسوس طریقے سے شروع ہو گئی۔ فرائیڈ، ڈنگ اور ایڈلر تینوں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

ایڈلر ایک بلند حوصلہ ذہن اور قابل شخص تھا لیکن اس کے جو نفسیاتی نظریات تھے ان سے فرائیڈ خوش نہیں تھا۔ اسی طرح ایڈلر اس کے نظریات کو نہیں مانتا تھا اور لاشعور کی طرف توجہ بھی نہیں دیتا تھا۔ ایڈلر کے اپنے پیرو کاروں کی

تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا جو زیادہ تر سوشلسٹ اور فرائیڈ کے کٹر مخالف تھے۔ فرائیڈ اور ایڈلر کے حامیوں کے درمیان شدید جھگڑے ہونے لگے۔ فرائیڈ نے بہت چاہا کہ مصالحت ہو جائے مگر اسے ناکامی ہوئی لہذا تھک ہار کر فرائیڈ نے ایڈلر سے کہا کہ وہ اپنے نظریات اپنے مخالفین کے سامنے پیش کرے۔ اس کے لیے اسے تین دن دیئے گئے چنانچہ تین دن تک مسلسل ایڈلر اپنے حامیوں اور مخالفوں کے سامنے اپنے نظریات کی وضاحت کرتا رہا۔ اس کے بعد ان نظریات پر بحث و تجویز کا دروازہ کھل گیا جو جلد ہی نئی کا رنگ اختیار کر گیا۔ اس صورت حال سے گھبرا کر ایڈلر نے سوسائٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بیشتر حامی بھی مستعفی ہو گئے۔

1911ء میں جب چوتھی کانگریس منعقد ہوئی تو تحلیل نفسی کی فضاؤں میں ایک مرتبہ پھر جنگ کے بادل چھانے لگے۔ اسی دوران ڈنگ کی ایک کتاب شائع ہوئی جس سے اس نے خوابوں کو الہامی درجہ دیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت سے فرائیڈ بے حد برا فروخت ہوا کیونکہ وہ خوابوں کو الوہیت کا درجہ دینے کے خلاف تھا۔ اس نے کانگریس میں اس کتاب کی مذمت کی اور اس کتاب کے حامی اور مخالف اراکین کو باہم مباہلے کی دعوت دی گئی۔ یہ مباہلہ کم اور لڑائی جھگڑا زیادہ تھا۔

اس نے ڈنگ سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اسے ڈنگ پر شدید غصہ تھا کیونکہ اس جھگڑے کے پیچھے اس کی سازشیں کام کر رہی تھیں۔

ڈنگ اور اس کے راستے الگ ہو گئے۔

ڈنگ سے علیحدگی اس کے لیے ناخوشگوار ترین سبق تھا۔ یہ صدمہ اسے عمر بھر رہا۔

ایڈلر اور ڈنگ اس کے دوسرا ہی تھے۔ یہ دونوں جب ہاتھ سے نکل گئے تو تحلیل نفسی کی تحریک کو سخت دھچکا پہنچا مگر اس میں اتنی جان تھی کہ پھر بھی زندہ رہی۔

فرائیڈ نے اپنے باپ کی موت کے بعد عزم کیا تھا کہ اب وہ کسی سرپرست کو تلاش نہیں کرے گا لیکن ڈنگ اور ایڈلر کے چل جانے کے بعد اس نے یہ عزم کیا کہ اب وہ کسی کو اپنا جانشین نہیں بنائے گا اور نہ کسی سے توقعات وابستہ کرے گا۔

اس کی عمر ستاون سال تھی۔ ایک مرتبہ وہ پھر تنہا رہ

بارے میں لوگوں میں جو اختلافات تھے وہ ختم ہوتے گئے۔
دباؤ اور مزاحمت کے نظریات کی مدافعت کی مختلف صورتیں
مثلاً ردِ عمل، تدبیل اور برغریب توجہ وغیرہ سب تسلیم کر لیے
گئے۔ البتہ ایڈی پس الجھاد کے متعلق فرائیڈ نے جو نظریہ
پیش کیا تھا وہ بدستور متنازع تھا۔
فرائیڈ نے یہ نظریہ بھی پیش کیا تھا کہ انسان کو ذہنی
مریض بنانے میں ورشت سے زیادہ اس کے ماحول کا حصہ
ہوتا ہے۔
جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس کی مصروفیات بھی متاثر

گیا۔ اس وقت اس کے چھ بچے اور ایک بیوی تھی لیکن وہ
اکیلا تھا۔ اپنے اندر اکیلا۔
یہ تنہائی اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ بچپن سے
اکیلا اور سب سے الگ تھلک تھا۔ اسے اپنی بیوی سے بھی
کوئی ایسی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ جسمانی تقاضے پورے
کرنے کے سوا بیوی سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے
اپنی ماں کو اس انداز میں دیکھا تھا کہ اس کا باپ ایک جابر
مرد تھا اور ماں کا ایمان شوہر، گھر اور بچوں کی نگہداشت تھا۔
وہ بھی اپنی بیوی سے یہی توقع رکھتا تھا۔ بھی بھی اپنے اس
روئے پر پشیمان بھی ہوتا تھا۔ اس کے دوستوں پر بھی اس کا
یہ مزاج عیاں تھا۔ وہ بھی اس کے اس خود غرضانہ رویے پر
اسے ملامت کیا کرتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ اسے اپنے بچوں
سے بے پناہ محبت تھی لیکن اس محبت میں وہ بہت محتاط تھا۔ وہ
اکثر اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے یا انہیں سیر کرانے کے لیے
اپنا کام ادھورا چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی
اپنے بچوں سے توقع کرتا تھا کہ وہ اس کا احترام کریں۔ ان
بچوں سے یہ بھی توقع رکھتا تھا کہ وہ مکمل یہودی بنیں، سائنسی
اعتقاد سے وہ ہر مذہب کو رد کر چکا تھا۔ مذہب اس کے
نزدیک صرف شناخت کے لیے تھا اور اس کی شناخت تھی
یہودی ہونا، وہ اپنے بچوں کی بھی ایسی تربیت کر رہا تھا جو
انہیں یہودی بنا دے۔ عبادت گزار یہودی نہیں بلکہ محض
یہودی۔ غیر یہودیوں کے مقابلے میں شناخت کی حد تک
یہودی۔

وہ اپنے بچوں کی طرح اپنے شاگردوں میں بھی حد
سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور خود پسندی کو پسند نہیں کرتا
تھا۔ ڈنگ کے رخصت ہو جانے کے بعد تو وہ اور بھی محتاط ہو
گیا تھا۔ اس کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ تحلیل نفسی کی
تمام تر ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر آ گئی تھیں۔ اپنے
مخلص شاگردوں کے ذریعے اس تحریک کو آگے بڑھا رہا
تھا۔ اسے اس سلسلے میں خاصی کامیابی ہوئی تھی۔ اس نے
لاشعوری طاقت کو منوالیا تھا۔

لاشعوری ذہن کی طاقت کی دریافت کے ساتھ ہی
فرائیڈ کے لیے فزیا لوجیکل نفسیات کے دور کا خاتمہ ہو گیا اور
اس نئے دور کا آغاز ہوا جو انسانی زندگی کے اسرار کی
دریا فتوں سے تعلق رکھتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ ہی فرائیڈ کے
نظریات کی قبولیت کا دور شروع ہو گیا۔ تحلیل نفسی کے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں
کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔
ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **شمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپینس جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-0 نیو 11 ایڈیشن ڈینٹس باؤنڈنگ تھرائیٹن کوئی روڈ کولٹی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ہونے لگیں۔ وہ کسی معقول وجہ کے باوجود بھی جنگ کو ضروری سمجھنے کے خلاف تھا۔ وہ جنگوں کو مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانیت کا قتل عام سمجھتا تھا۔

اسے ایک ذاتی دھچکایہ لگا کہ جنگ چھڑنے ہی لازمی فوجی ملازمت کی اسکیم آگئی۔ اس اسکیم کے تحت اس کے دو بیٹوں مارٹن اور ایلور کو بھی جرمنی کی طرف سے فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ فرائیڈ نے جب انہیں جنگ کے لیے رخصت کیا تو وہ یہ سوچ کر سخت افسردہ تھا کہ انہیں محاذ جنگ سے زندہ سلامت واپس آنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔

دوسرا دھچکایہ تھا کہ تحلیل نفسی تحریک کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں کیونکہ اس کے بیشتر پیروکار اور شاگرد محاذ پر بھجوا دیئے گئے۔

جنگ نے طول کھینچا تو دی آنا میں خوراک اور ایندھن دونوں کی شدید قلت ہو گئی۔ فرائیڈ کی اسٹڈی برف خانہ بنی رہتی تھی۔ اشیائے خورد و نوش کی کمی کے سبب مارتھا کو گھر کی غذائی ضروریات پوری کرنے میں اپنے منگھڑاپے اور حسن انتظام کے باوجود اکثر شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

☆.....☆

وہ جنگ کے دوران اپنے بیٹوں کو خواب میں دشمن سپاہیوں سے لڑتے، زخمی ہوتے اور مرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا لیکن ان برے خوابوں کی تعبیر اتنی نکلی۔ اس کے دونوں بیٹے زندہ سلامت جنگ کے خاتمے پر گھر لوٹ آئے۔

وہ مطمئن ہو گیا۔ وطن پرستی کا جو جذبہ کچھ دنوں کے لیے سرد پڑ گیا تھا پھر اسے اس کا لبو گرمانے لگا۔ وہ پھر یہ کہتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ”میری زبان جرمن ہے میرا کچھ جرمن ہے لیکن پھر اچانک جرمن اور آسٹریلیئن میں یہودیوں کے خلاف نفرت اور تعصب کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک مرتبہ پھر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ”میں نہ جرمن ہوں نہ آسٹریلیوی، میں تو صرف ایک یہودی ہوں۔“ اس کے باوجود اس کے فلسفوں تصورات و نظرات اس کے طرز تحریر معاشرت سب میں جرمن اثرات نمایاں تھے۔ اسے جرمن ہونے پر فخر تھا لیکن جنگ کہیں بھی ہو وہ اس کا مخالف تھا۔ اس نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے ایک کتابچہ تحریر کیا جس میں اس نے لکھا۔

”جنگ، یعنی نوع انسان کے قتل عام، دنیا کی آبادی کم کرنے اور اس کے حسن کو غارت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نتائج شرح اموات میں زیادتی، وبائی امراض کے پھیلاؤ، بھوک اور غربت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ماہنامہ مسرگوشٹ

ایک جنگ کے بعد تباہ شدہ ملک کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں بڑا عرصہ لگا کرتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جنگیں نہ لڑی جائیں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا رہا کہ ہمیں اس اُمید پر زعمہ رہنا چاہیے کہ ہسٹری کا غیر جانب دارانہ فیصلہ یہ ثبوت مہیا کر دے گا کہ یہ قوم جس کی زبان میں ہم لکھ رہے ہیں اور جس کی فتح کے لیے ہمارے عزیز برسرِ پیکار ہیں ایک ایسی قوم تھی جس نے بین الاقوامی قوانین کی سب سے کم خلاف ورزی کی۔

کٹر یہودی ہونے کے باوجود اس کی اپنی نفسیات یہ تھی کہ اس کے دل میں یہودیت ترک کرنے کی خواہش ابھرتی تھی۔ اس کام کے لیے اس نے روم جانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں یہ خیال بھی ابھرتا تھا کہ اس طرح وہ اپنی قوم اور خاندان سے غداری کا مرتکب ہوگا۔ وہ خود شعور و لاشعور کے نظریے کا شکار ہو گیا۔ اس کی یہ خواہش اس کے لاشعوری ذہن کے نہاں خانوں میں دبی رہی۔ وہ روم گیا ضرور لیکن اس سیاحت کے دوران وہ صرف ایک چیز سے متاثر ہوا اور یہ تھا مائیکل انجلو کا بنایا ہوا حضرت موسیٰ کا مجسمہ تھا۔ مسیح کی جائے پیدائش اور مضبوط مرکز میں اپنے پیغمبر کا مجسمہ دیکھ کر فرائیڈ کی عجیب حالت ہوئی۔ اس مجسمے نے مسیحیت کے ہاتھوں پھینچنے والے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔

اسے اپنے آپ میں اور موسیٰ علیہ السلام میں سخت مشابہت نظر آئی۔ اس کے باغی پیروکاروں نے اس کی تعلیمات کو جھٹلایا تھا بالکل اسی طرح جس طرح موسیٰ علیہ السلام کا مجسمہ بنانے والوں نے مجسمہ تو بنادیا لیکن اسے جھٹلایا جیسی تو مسیحیت وجود میں آئی۔

فرائیڈ کے پیروکاروں کو بھی موسیٰ علیہ السلام اور فرائیڈ میں مشابہت نظر آئی۔ ان کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام کے مانند فرائیڈ بھی انسانیت کا ایک مخلص رہنما تھا۔ اسے اپنے مشن کا بخوبی علم تھا۔ اسے بھی موسیٰ علیہ السلام کے مانند بے شمار رکاوٹوں اور مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جن لوگوں کو فرعون سے نجات دلائی تھی ان لوگوں نے ان کی عدم موجودگی میں ان کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر سامری کی اطاعت قبول کر لی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں دوبارہ راہِ راست پر لائے تھے۔ فرائیڈ بھی اپنے لیے یہی چاہتا تھا کہ اس کے بعد

اس کی تحریک تحلیل نفسی کی ترویج و ترقی کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد لوگوں کو کفر و کمرابی سے بچانے کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ چلتا رہا۔ مسیحیت قبول کیے بغیر وہ اس غریب یہودی کے مانند تھا جس کے پاس کارلرڈ کا کلٹ خریدنے کے لیے رقم نہیں تھی۔ اس کے نزدیک یہ دنیا جہنم تھی جو یہودیوں کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ایک موقع پر اس نے کہا تھا مجھے یہودیت کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے میں بلاشبہ بڑی مسرت ہوگی۔ اس طرح میں خود کو پکا پھلکا اور آزاد محسوس کروں گا مگر میں بھلا اپنے یہودی آباد اجداد کی مذمت کر سکوں گا؟ وہ یہودیت کو ترک نہ کر سکا۔

نازیوں کا طوفان وی آتا بڑھتا چلا آ رہا تھا اور یہودیوں کو چن چن کر ہلاک کیا جا رہا تھا۔ فرائیڈ اپنی اسٹڈی میں بند عہد نامہ قدیم کی تجزیاتی ترجمانی کے کام میں مصروف تھا۔ وہ ایک کتاب ترتیب دے رہا تھا۔ (یہ پروجیکٹ پورا ہونے سے قبل ہی اس کا انتقال ہو گیا)۔

ڈینی پریشانیوں کے بعد اب اسے جسمانی عارضوں کا سامنا ہوا۔ وہ اپنے جڑے میں سخت تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے سرطان تجویز کیا۔ اس نے اس مرض کو پوشیدہ رکھنے کے لیے دوستوں کو کھانے پر بلانا ترک کر دیا۔ معاشرتی تقریبات تو اس کی زندگی ہی سے خارج تھیں مگر اب تو وہ بالکل گوشہ نشین ہو گیا۔

اس کا دل اپنے اس گھر سے بھی اچاٹ ہو گیا جس میں وہ رہ رہا تھا۔ اس نے رہائش کا تبدیل کر دی۔ اس کے جڑے پر پھر سرطان کا حملہ ہوا۔ اس کے جڑے کے کئی آپریشن ہوئے۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کی تھی کہ وہ سگار نوشی ترک کر دے مگر وہ اسے ترک نہ کر سکا اس کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے بار بار آپریشن کی تکلیف سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

وہ شخص جس نے تحلیل نفسی کا نظریہ اور اس کا طریقہ کار دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اپنی زندگی کے نصف آخر میں اس کی افادیت کے بارے میں پاپوس ہو چکا تھا۔ اسے تحلیل نفسی سے یہ حیثیت ذریعہ علاج و چسپی نہ رہی تھی۔ اب اسے اس کی یہ حیثیت نظریاتی علم ترقی میں زیادہ دلچسپی ہو گئی تھی۔

☆.....☆

اس کے سائنسی نظریات اور مذہب کے بنیادی فلسفے

آپس میں ٹکراتے تھے اس لیے اہل کلیسا اس سے ناراض رہتے تھے۔ اس کے اخلاقی نظریات ایسی فضا میں پر دان چڑھ رہے تھے جس میں خالص یہودی اخلاقیات کا سبق دیا گیا تھا۔ اہل کلیسا کی ناراضی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ اس کے لیے گھر میں بھی کوئی خوشگوار فضا نہیں تھی۔ اس نے جو اصول وضع کر رکھے تھے وہ اس کی بیوی کو بھی تسکین نہ دے سکتے تھے۔ فرائیڈ نے اسے بے زبان خادمہ کے سوا کسی روپ میں نہ دیکھا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی بیوی میں وہ ہستی تلاش کرتا رہا جو اسے ماں کا پیار دے سکے۔ اس کی ماں اب بھی زندہ تھی مگر بہت بوڑھی ہو چکی تھی اور اسے جوان ماں درکار تھی حالانکہ اب مارٹھا (بیوی) بھی جوان نہیں رہی تھی۔

اس نا اتفاقی کے باوجود ان کے درمیان بھی شدید لڑائی جھگڑا نہیں ہوا کیونکہ فریقین مہذب تھے جو طبیعتوں کے تضاد کے باوجود نباہ کرنا چاہتے تھے۔

☆.....☆

پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد ایک طریقہ علاج کی حیثیت سے طبی دنیا کی توجہ تحلیل نفسی کی جانب مبذول ہو گئی تھی لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی جو اس میں شامل جنسی نظریات کی وجہ سے اسے تسلیم کرتے ہوئے بچپن جاتے تھے۔

اس موقع پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحلیل نفسی کیا ہے۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ تلازم افکار کو ایسے طریقے سے بروئے کار لانے کو تحلیل نفسی کہتے ہیں جس میں دبے ہوئے خیالات و جذبات اور ان کی صحت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ علاج میں مریض اپنے معالج سے مکمل تعاون کرتا ہے لیکن چنانچہ کے طریق علاج میں مریض و معالج میں اس قسم کا تعاون نہیں پایا جاتا تھا کیونکہ مریض کو اپنے آپ پر کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ نیند کی حالت میں ہوتا تھا اس حالت میں نہیں ہوتا تھا کہ غور و فکر کر سکے، وہ تو معالج کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔

تحلیل نفسی کا بنیادی کام یہی ہے کہ وہ دبائے ہوئے تصورات کو لاشعور کی گہرائیوں سے نکال کر شعور میں لائے تاکہ مریض ان کو عقلی طور پر سمجھ کر ان کا حل دریافت کر سکے۔ اس طرح سے فرد جس ذہنی تناؤ کا شکار ہوتا ہے تناؤ کی وہ قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔

تحلیل نفسی کے لیے دو قسم کے طریقہ کار استعمال کیے

جاتے ہیں۔ ایک تلازمی طریقہ دوسرا خوابی طریقہ۔

تلازمی طریقہ یہ ہے کہ مریض کو ایک آرام دہ بستری کوچ پر لٹا دیا جاتا ہے اور مریض کو کوئی لفظ یا خیال گفتگو کے نقطہ آغاز کے طور پر دے دیا جاتا ہے۔ مریض کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ اس لفظ یا خیال سے وابستہ جو تصورات اس کے ذہن میں موجود ہیں انہیں وہ بغیر کسی دماغی رکاوٹ کے بیان کرتا جائے۔ ضروری ہے کہ وہی لفظ یا خیال وابستہ تصورات تک رسائی حاصل کی جاتی ہے اور پھر ان تصورات سے وابستہ مزید تصورات تک رسائی حاصل کی جاتی ہے اور پھر ان تصورات سے مزید تصورات تک۔ بالآخر یہ سلسلہ لاشعور تک پہنچ جاتا ہے۔

اس طریقے کی بنیاد شعور و لاشعور کی کشش پر استوار

ہے۔

دوسرا طریقہ خوابی طریقہ ہے۔ تحلیل نفسی کے عمل میں خوابوں کی اہمیت خود فرائیڈ نے اس طرح بیان کی ہے۔ ”خوابوں کی تشریح و تحلیل دراصل لاشعور کی تشریح کے مرادف ہے۔ یہ تحلیل نفسی کا سب سے کارآمد ذریعہ ہے اور ایک ایسی شے ہے جس کے بارے میں ہر کارکن کو تعلیم و تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تحلیل نفسی کیسے کی جاتی ہے تو میں اسے خوابوں کے مطالعے کا مشورہ دوں گا۔“

فرائیڈ کے خیال میں خواب بہت سی دوسری خصوصیات کے متحمل ہونے کے علاوہ فرد کے دے ہوئے مطلقاً نہ رجحانات اور دہائی ہوئی خواہشات کی تکمیل کا بہترین اور پوشیدہ راستہ ہے۔ مریض کے لاشعور میں چند ایسی خواہشات ہوتی ہیں جن کی آسودگی نہ تو سماجی ضمیر اجازت دیتا ہے اور نہ تہذیب اجازت دیتی ہے اس لیے نیند کے دوران جب ضمیر و تہذیب کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے تو پوشیدہ انداز میں اس کی آسودگی ضروری ہو جاتی ہے۔ خواب دیکھنے والے کی لاشعوری خواہشات اس کے خوابوں میں ظاہر ہوتی ہیں لہذا خوابوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں یہ لازم سمجھا جاتا ہے کہ مریض کے خواب کی تحلیل کی جائے۔

خوابوں کی تشریح و تحلیل کا عمل آزاد تلازم سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ اگر مریض کو یہ احساس ہو جائے کہ تحلیل کا تمام دار و مدار خوابوں پر ہے تو مزاحمت کی بنا پر خواب نظر آنا بند ہو جاتے ہیں یا کمرہ کن خواب نظر آنے

لگتے ہیں لہذا اس سلسلے میں ان خوابوں کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے جو یا تو مریض بچپن سے ہی دیکھتا آ رہا ہو یا بچپن کے وہ خواب جن کو وہ بھی فراموش نہ کر سکا ہو۔

فرائیڈ کو جدید نفسیات میں تحلیل نفسی کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ تحلیل نفسی کا انسان پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ذہنی بیماریوں کا علاج دریافت کیا۔ یہ ایک ایسا طریقہ علاج ہے جس کے ذریعے طبیب بیماریوں اور عصبی بیماریوں کا علاج دریافت کر سکتا ہے۔

اگر فرائیڈ کے نظریے خواب کو دیکھا جائے تو وہ بڑا جرأت مندانہ ہے۔ اس نے اپنے نظریے میں ہزاروں سال پرانے نظریات کو جھٹلایا ہے۔ (شاہدہ ارشد)

1920ء سے لے کر 1925ء کا درمیانی عرصہ تحریک تحلیل نفسی کے انتہائی پھلتے پھولتے اور ترقی کا زمانہ تھا۔ اس دوران کے منصوبوں پر پوری طرح عمل کیا گیا۔ ترویج و ترقی کا کام آگے بڑھتا رہا۔ بے شمار نئے کارکن شامل ہوئے۔

1926ء میں پہلی مرتبہ وی آنا میں اس کی سالگرہ بڑی شان و شوکت سے منائی گئی۔ اس کی یہ 75 ویں سالگرہ بھی جو وی آنا کے علاوہ لندن اور نیویارک میں بھی منائی گئی۔ اس سالگرہ کے ذریعے عمر بھر کی مخالفتوں اور دشمنیوں نے اس کے لیے محبت و عقیدت کا روپ دھارا۔

فرائیڈ نے اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والی کسی بھی تقریب میں شرکت نہ کی اور نہ ہی کوئی اعزاز قبول کرنے بذات خود گیا۔ اس کی جگہ اس کی بیٹی اینا نے جاکر تمام اعزازات قبول کیے۔ اس نے ملاقاتیوں اور رشتے داروں سے ملنے سے بھی انکار کر دیا تھا اور اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا۔

اس کی سالگرہ کے دس دن بعد اس کی بوڑھی ماں کا 93 سال میں انتقال ہو گیا۔

دنیا اب اس کے نظریات کو قبول کرنے لگی تھی۔ ایڈریس کمپلیکس اور بچوں کی نفسیات، جنسی نظریات، شعور، لاشعور، نیم شعور، انا، لیڈو، خوابوں کی تعبیر کے بارے میں اس کے پیش کردہ نظریات وغیرہ قبول عام کی سند پا گئے تھے۔

اس کے جنسی نظریات کی ترویج امریکی معاشرے میں خوب ہوئی اور اس پر کھلے عام بحث کی جانے لگی۔ ایک مصنف نے اپنی کتاب ”ڈراک لائف“ میں لکھا۔

تعلیمات کو بہتر طور پر سمجھنے کی راہیں بھی ہموار ہوتی رہیں۔
اس کی تعلیمات تخلیقی تو بڑی پر اثر انداز ہوتی رہیں۔
فرائیڈ کی دریافتوں نے مصوری، قلم، تھیٹر اور
موسیقی کو بھی متاثر کیا۔ اب تحلیل نفسی کو کفر، کالا جادو اور
بد رجوح کا علم قرار دینے کا وقت گزر چکا تھا۔

☆.....☆

فرائیڈ نے اپنی تحقیقات اور دریافتوں سے نفسیاتی
علوم میں اس قدر اضافہ کیا ہے کہ اس کی مثال انسانی تاریخ
میں نہیں ملتی۔ وہ پہلا انسان ہے جس نے انسان کو سمجھنے کے
لیے اس قدر کام کیا۔ پھر جو شخص بھی اس سرچشمے سے سیراب
ہوا وہ بھی انسان کو سمجھنے لگا اور نئی نوع انسان کی الجھنوں کو کم
کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ قلم اور زبان سے برابر اپنا
پیغام دنیا کو دیتا رہا۔

فرائیڈ لکھنے سے پہلے اپنے موضوع پر بے تحاشا غور کیا
کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی تحریر میں بھی کسی لفظ کو قلم زد
نہیں کرتا تھا۔ اس کی محنت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ
اس نے کئی کتابیں برسوں شائع نہیں کرائیں بلکہ انہیں بار
بار لکھتا رہا۔

وہ کوئی نظریہ قائم کرنے سے پہلے اس پر خود بہت
سے سوالات اٹھاتا تھا اور پھر ان کے حل کرنے کے بعد کسی
نتیجے کو مرتب کرتا۔

بحث و تجسس کے سلسلے میں اگر کوئی نقاد خلوص سے اس
پر سوالات کرتا تو وہ بڑے جمل سے ان کو مسترد اور جواب دیتا۔
فرائیڈ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ جس موضوع سے
اسے دلچسپی ہوتی وہ اس کے متعلق ہر کتاب اور مقالہ جو اسے
میسر آتا پڑھ لیتا۔ اسے تاریخ سے بہت دلچسپی تھی اس کے
بعد قدیم روم اور یونان کی زندگی اور آرٹ اس کی توجہ کا مرکز
بنے۔ مصر، بابل اور شام کی تہذیب سے بھی اسے کافی لگاؤ
تھا۔ جب کبھی وہ پرانے مدون شہروں کی کھدائی کی روداد
پڑھتا تو اس کے دل میں وہاں کے حالات دریافت کرنے کا
ایک جوش پیدا ہو جاتا۔ خود اس کے پاس نادرات قدیم کا
کافی ذخیرہ تھا۔ اس نے ان نادرات کے ذریعے مختلف
زبانوں میں مختلف قوموں کی ذہنی نشوونما کا اندازہ لگایا اور
تحلیل نفسی کی روشنی ان ساری دلچسپیوں پر اثر انداز ہوتی
تھی۔ جب وہ اپنے اسٹوڈیو میں کسی سے باتیں کر رہا ہوتا تو
ان نادرات میں سے کوئی چیز اٹھا لیتا اور نگاہیں اس پر گاڑ
دیتا۔ ہاتھوں سے اسے چھوتا رہتا۔ اس طرز عمل سے وہ یہ بتا

”اگر تم انسانی زندگی کے بارے میں کچھ جانتا چاہتے ہو
تو ڈاکٹر فرائیڈ کی کتب کا مطالعہ کرلو۔ امریکی ناول نگاروں کی
اکثریت فرائیڈ کی دو کتابوں Totem and taboo اور
Three contribution to theory of sex پر
سے زیادہ متاثر ہوئی تھی۔“

فرائیڈ کے کاموں نے مصنفین کی نظروں کا رخ
انسان کے اندرون کی طرف پھیر دیا تھا۔ اب جو کہانیاں اور
ناول لکھے جانے لگے تھے۔ وہ نفسیات انسانی کی انتہائی
گہرائیوں اور باریکیوں کی خبر لانے لگے تھے یعنی ان میں
نفسیات انسان کی ہر خصوصیت کا احاطہ ہوتا تھا۔ ان میں
تحلیل نفسی کے اصولوں کو خاص طور پر مد نظر رکھا جاتا تھا۔
فرائیڈ کے نظریہ تحلیل نفسی سے گہرا اثر قبول کرنے
والے امریکی مصنفین میں روز میکالے کا نام خاص طور پر
قابل ذکر ہے۔ اسی طرح آٹوس ہسلے کی Antic Hay اور
سوزان گلاسیل کا ڈراما Suppressed desires بھی انہی خطوط پر تحریر کیے گئے۔

1930ء کی دہائی میں اس کی شہرت میں اضافہ ہونا
شروع ہوا۔ اس کی دریافتوں کی شہرت پر لگا کر پرواز کرنے
لگی۔ اس کے ہم عصر بڑے بڑے لوگ مثلاً آئن اسٹائن
تھامس، مین اور روڈین رولینڈ اس سے خط کتاب کرنا باعث
فخر سمجھنے لگے۔

آرٹ اور لٹریچر کے علم برداران تحریکات اور محرکات
کا تجزیہ کرنے لگے، جنہیں فرائیڈ نے دریافت کیا تھا۔
لاشعوری ذہن کے اعمال پر سب سے زیادہ بحث کی جانے
لگی۔ مصنفین اور فنکاروں کے لیے تحلیل نفسی کا انکشاف کسی
انقلاب سے کم نہ تھا۔ یہ دریافتیں کچھ اس طرح اثر انداز
ہوئی تھیں کہ اس زمانے کو فرائیڈ کا دور کہا جانے لگا۔

1930ء کے آتے آتے دنیا میں دو آدمیوں کے
نظریات پوری شد و مد کے ساتھ شرف قبولیت حاصل کرتے
جا رہے تھے۔ ایک تو فرائیڈ کا نظریہ تحلیل نفسی اور دوسرے
کارل مارکس کے لادینی نظریات۔ ان دونوں میں شدید
اختلاف تھا۔ مارکسوں کا نظریہ تحلیل نفسی سے نفرت تھی۔ پھر
پریس اور کلیسا بھی تھے جو تحریک تحلیل نفسی کی راہ میں رکاوٹ
بنے ہوئے تھے۔ اس پر مزید ستم اس کے نظریہ جس پیش
کرنے پر ہوا تھا۔ فرانس میں ایک کتاب شائع ہوئی جس
میں فرائیڈ کو ہٹلر کہا گیا تھا۔

اس پر حملے جاری رہے مگر ساتھ ہی فرائیڈ اور اس کی

رہا ہوتا تھا کہ میں دنیا کو تحلیل نفسی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔
فرائیڈ کی ساری دلچسپیوں کا مرکز انسانی ذہن تھا اور
ان دلچسپیوں کا ایک حصہ کتابوں کا مطالعہ۔ یہ مطالعہ محض فنی
کتابوں تک محدود نہیں تھا بلکہ اس نے دنیا بھر کے اعلیٰ و ارفع
ادب کو کھنگال ڈالا تھا۔ اسے جرمن کے علاوہ انگریزی اور
فرانسیسی زبانوں پر پورا عبور تھا۔ اطالوی اور ہسپانوی
زبانیں بھی وہ بڑی آسانی سے پڑھ لیتا تھا۔

انیسویں صدی کے جرمن کچر پر گونے چھایا ہوا تھا۔
وہ اس کی تصانیف کا دلدادہ تھا۔ اس کی لائبریری میں گونے
کی کتابوں کے اعلیٰ ایڈیشن موجود تھے۔ جب انقلاب کے
بعد اشتراکی روس میں پہلی بار فرائیڈ کی کتابوں کا ترجمہ
سرکاری طور پر شائع کیا گیا تو فرائیڈ کے ایک ساتھی نے اس
پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ تجزیہ نفس نئے روس کی تشکیل پر
کافی اثر انداز ہوگا۔ فرائیڈ نے اس کا بہت دلچسپ جواب
دیا۔

”روسی لوگ بانی کی طرح ہیں جو ہر قسم کے برتن کو بھر
دیتے ہیں لیکن کسی شکل کو مستقل طور پر اختیار نہیں کرتے۔“
شیکسپیر کا وہ بہت مداح تھا۔ ہملٹ کے ڈرامے میں
ایڈی پس ابھرنے میں موجود ہے جو فرائیڈ کی دلچسپی اور توجہ کا
موجب بنی اور اس کا ذکر اس نے اپنی تصانیف میں کیا ہے۔
فرائیڈ کی شہرت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن خود
فرائیڈ اس شہرت سے دور رہنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جوں
جوں اس کا نام روشن ہوتا گیا وہ اور زیادہ اپنے کام میں کھو
گیا۔ اسے ایسی جگہوں میں جانے سے بھی مسرت نہ ہوتی
جہاں اس کے نام کا ورد شروع ہو جاتا۔ اس کی عظمت سے
بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا اور اس عظمت کا باعث اس کی
ذات کے ساتھ اس کا کام بھی تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک
پراسرار طاقت ضرور تھی۔

☆.....☆

اس کے جڑوں کی تکلیف نے اسے بے حال کر رکھا
تھا۔ جب یہ تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی۔ آپریشن کے
بعد بھی کوئی افادہ نہیں ہوا تو ڈاکٹروں نے یہی طے کیا کہ
جڑے کی ہڈی کا کچھ حصہ نکال دیا جائے۔ اسی پر عمل ہوا۔
جڑے کا کچھ حصہ نکال دیا گیا۔ مصنوعی جڑے کے ذریعے
کھانا اور پلانا ممکن ہو سکا۔ اس کے باوجود جڑے کے
دبانے سے مسلسل درد ہوتا رہتا تھا۔ اسے اس درد کی پروا
نہیں تھی لیکن اپنی اس معذوری سے سخت پریشان ہو گیا کہ

گفتگو کرتے وقت الفاظ پوری طرح ادا نہ ہوتے تھے۔ وہ
اپنی اس کمی کو برداشت نہ کر سکا اور گوشہ نشین ہو گیا۔ اپنے
خاندان کے افراد اور چند مخصوص لوگوں کے سوا کسی سے ملنا
گوارا نہ کرتا۔ اور کھانا تو کسی کے سامنے کھای نہیں سکتا تھا۔
اس کی بیماری کو مد نظر رکھ کر تحلیل نفسی کی مجالس اس
کے گھر پر ہونے لگیں۔ ان مجالس میں اعلیٰ پیمانے کے
مضامین پیش کیے جاتے اور ان پر خود فرائیڈ تبصرہ کرتا۔
ایک مجلس میں تبصرہ کرتے ہوئے اس نے اپنی زندگی
کا نچوڑ پیش کر دیا اور یہ اشارہ بھی پیش کر دیا کہ اب وہ عمر کی
کس منزل پر پہنچ گیا ہے۔

”میں نے پہاڑوں کو کھودا۔ ان میں سے اچھے اچھے
کار آمد پتھر نکالے۔ انہیں کندھوں پر لا دیا اور اب اس سے
ایک عمارت کی شکل نمودار ہونے لگی ہے۔ یہ کام بہت سخت
تھا بہر حال برا بھلا جو ہو سکا میں نے کیا۔ اب یہ آپ لوگوں
کا کام ہے کہ آپ اس عمارت کو خوب صورت بنانے کے
لیے جو رنگ و روغن پسند کریں اسے مزین کریں۔“

اس میں ایک تبدیلی اور نمایاں ہوتی تھی۔ اس کے
تعلقات انسانوں سے کم ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی جگہ
کتوں نے لے لی تھی۔ اسے کبھی کتوں کا شوق نہیں رہا تھا
البتہ وہ ایک کتے کا واقعہ بار بار دہراتا تھا۔

”میرے ایک مریض کے پاس چینی نسل کا کتا تھا۔
جونہی میں مریض کو لے کر کمرے میں داخل ہوتا وہ کتا بھی
آ جاتا اور کمرے میں ایک خاص جگہ جا کر بیٹھ جاتا۔ جب
تک تجزیہ نفس کا عمل جاری رہتا، کتا وہاں بیٹھا رہتا۔ کیا محال
ہے کہ اس عرصے میں اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نکلے۔
جو بھی وقت ختم ہونے کو آتا کتا اپنی جگہ سے اٹھتا اور آقا کے
قریب آ کر اسے یوں دیکھنے لگتا جیسے کوئی کہہ رہا ہو بس کیجیے
اب بہت وقت ہو گیا۔“

فرائیڈ کی بیٹی کتوں سے پیار کرتی تھی۔ اس کے پاس
ایک السیشن نسل کا کتا تھا۔ اگرچہ بہت خوب صورت تھا
لیکن شور بہت مچاتا تھا۔ اس کے باوجود جب فرائیڈ کتوں کا
شوق ہوا تو وہ اس کتے سے بانوس ہو گیا۔ اپنی تنہائی دور
کرنے کے لیے اس کی شرارتوں سے لطف اندوز ہونے
لگا۔ اس دوران یونان کی شہزادی ”میری“ (جو پنولین کے
بھائی اودین کی پوتی تھی) اس کی شاگرد ہو گئی۔ وہ تحقیقات
کے سلسلے میں بہت اچھا کام کر رہی تھی اور فرائیڈ کے گھر اکثر
اس کا آنا جانا ہوتا تھا۔

آپ کیسے پڑھے لکھے؟ عقل مند انسان ہیں؟

آپ کو تو ہمارے خیرہ مروارید عنبری صندل
بادام والا معتدل بارد کے فوائد کا علم ہی نہیں

ہمارا خیرہ مروارید سچے موتی والا مقوی قلب اور
مقوی دماغ ہے۔ دل کی بندش یا نہیں کھولتا ہے
دماغی میموری کی اصلاح کرتا ہے۔ جسمانی
نشوونما گرتھ میں اضافہ کرتا ہے۔ فیملی کے تمام
افراد کے لئے یکساں مفید ہے۔ دل کی گھبراہٹ
دل کی تیز دھڑکن اور ہائی بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا
ہے۔ خون کی کمی پوری کرتا ہے۔ گھریلو تمام
پریشانیوں تفکرات سے نجات دلاتا ہے۔ تمام غم
بھلا کر دل کو راحت، جگر کو ٹھنڈک اور دماغ کو
سکون بخشتا ہے۔ انتہائی خوش ذائقہ، مہرکن، مہک
والا خیرہ مروارید عنبری معتدل صندل والا آج ہی
فون کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوا لیں۔

المسلم دار الحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون اوقات

صبح 10 بجے سے شام 6 بجے تک

فرائیڈ نے اس کے سامنے بھی چینی نسل کے اس کتے
کا ذکر کیا اور وہ واقعہ سنایا جو وہ اکثر سنایا کرتا تھا۔ شہزادی کو
خود بھی کتوں کا شوق تھا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے
لیے چینی نسل کا کتلائے گی۔

”آپ کہاں اس زحمت میں پڑیں گی۔ اس نسل کا
کتا ڈھونڈیں اور میرے لیے لائیں۔“ فرائیڈ نے اس سے
کہا۔

”مجھے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“
”کیا وہ چین سے خود چل کر آپ کے پاس آئے
گے؟“

”اے بھی یہ زحمت کرنی نہیں پڑے گی۔“ شہزادی
نے ہنس کر کہا۔ ”اس لیے کہ اس نسل کا کتا خود میرے پاس
ہے۔ اب وہ آپ کے پاس رہے گا۔“
”کیا وہ یہ جدائی گوارا کر لے گا۔“

”اس نسل کے کتے کی یہی تو خوبی ہے۔ عام طور پر یہ
کہادت مشہور ہے کہ بلی گھر کی سناٹا مالک کا لیکن جب میں
اپنے کتے سے کہہ دوں گی کہ اب تمہیں اس گھر میں رہنا
ہے تو وہ احتجاج نہیں کرے گا۔“

شہزادی نے وہ کتا بطور تحفہ اسے دے دیا۔ یہ کتا
”شاہی آداب“ سے پوری طرح واقف تھا۔ چند ہی روز
میں فرائیڈ کو یہ کتا بہت محبوب ہو گیا۔ ہر وقت اس کے ساتھ
رہنے لگا۔ گفتگو کے دوران بھی وہ اس کے پاس ہی بیٹھا
رہتا۔ پہلے گفتگو کرتے ہوئے اپنی انگلی سے گھلیتا رہتا تھا
اب اس کتے سے گھلیتا رہتا۔

عمر کا کارواں چلا جا رہا تھا۔ آخری منزل قریب آرہی
تھی۔ اس کے اعزہ اقارب ہر ممکن کوشش کرتے کہ اسے
آرام پہنچائیں۔ اس کی خدمت گزاری بھی ہو رہی تھی لیکن
عمر پر کسے اختیار، اسے تو بڑھتا ہے۔

آخری ایام میں اس نے حضرت موسیٰ پر ایک تحقیقاتی
کتاب لکھنا شروع کی جس کا نام ”موسیٰ اور وحدت پرستی“
تھا۔ یہ کتاب 1936ء میں لکھی جا رہی تھی۔ یہ اس کی عمر کا
80 واں سال تھا۔

اسے موت سے شدید نفرت تھی لیکن اپنی تمام تر
عقلیت پسندی کے باوجود موت سے مفر بھی ممکن نہیں تھا۔
اس نے موت کو گوارا کرنے کا جواز بھی خوب نکالا تھا۔ وہ کہتا
تھا، آسانی تو تیس خاصی مہربان ہوتی ہیں جو ہماری ذہنی عمر
کو بچنے کے ساتھ ساتھ زندگی ہمارے لیے ٹھیک اور دشوار

بنائی چلی جاتی ہیں۔ آخر میں موت ہمیں آن لیتی ہے جو ان حالات میں ہمیں خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔

اس نے موت کے موضوع پر کم از کم تین پہرے شائع کیے۔ ان سب کا موضوع ایک تھا یعنی عقلیت اور عقلی استدلال پر زور تھا۔ ان میں روح کے وجود سے بھی انکار کیا گیا تھا۔ تیسرے نمبر کا پہرہ اس لحاظ سے دلچسپ تھا کہ اس میں فرائیڈ کو موت میں گہری دلچسپی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ روح سے انکار کے باوجود یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود کو موت کے لیے تیار کر رہا ہو۔

”اڈا اگر تم آنا چاہتی ہو۔ تم تو ہر ذی روح کی روح قبض کرنے آؤ گی پھر بھی میں اس امر پر اصرار کرتا رہوں گا کہ تمہارا تعلق جس زمین سے ہے اس کے حقیقی ہونے کا مجھے قطعی یقین نہیں۔ میں اس ذہن کو بھی اسی بلوئیرج سے اڑا دینے کی اہمیت رکھتا ہوں جس سے میں نے حقیقی دنیا کو بچ کر کر دیا۔ تم زندہ انسانوں سے ٹیلی پتھی کے ذریعے رابطے قائم نہیں کر سکتیں۔“

اپنے اعتقاد کے مطابق میں اب بھی ایک طاقت ور انسان ہوں۔ میں تمہارا... کسی اُمید کے بغیر اور بغیر کسی اور اعتقاد کے سامنا کروں گا۔“

موت کا سامنا تو ابھی دور تھا۔ ابھی تو اسے نازیوں کا سامنا کرنا تھا۔

نازیہ طوفان ناگہانی بلا کی طرح اٹھا اور آسٹریا پر چھا گیا۔ ہٹلر کے لشکر نے چڑھائی کی اور ساری دنیا دھمکتی رہ گئی۔

ہٹلر کے طوفانی دستے بہت بے دردی سے یہودیوں کے گھروں کے اندر دھس آئے اور سفاکانہ حرکتیں کرنے، امیروں کو ہی نہیں لوٹے بلکہ غریبوں کو بھی طرح طرح سے ستاتے۔ قتل و غارتگری ان کا کھیل بننا ہوا تھا۔

ان حالات کا مستحب خود فرائیڈ بھی بنا۔ اس کی تصانیف برلن کے ایک چوک میں نذر آتش کر دی گئیں اور اس کا نام نازیوں کے متوہین کی صفِ اول میں شامل کر لیا گیا۔

فرائیڈ کو اس کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے دوستوں، ہمدردوں اور رشتے داروں نے خبردار کیا تھا کہ اس سے قتل کہ نازی وی آنا میں داخل ہوں وہ جلد سے جلد وہاں سے نکل جائے۔ اس نے یہ مشورے مان بھی لیے تھے اور وی آنا چھوڑنے پر رضامند ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ وی آنا

چھوڑتا، نازی وہاں پہنچ گئے۔ یہ خبر سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”میں حالات کا مقابلہ کروں گا۔“ وہ بوڑھے شیر کی طرح دھاڑا اور بے فکر ہو کر اپنے کام میں لگا رہا۔

82 سال کی عمر اس کے دامنِ جُڑے کو سلطان نے بالکل کھالیا تھا۔ وہ اس جُڑے کے چندرہ آپریشن کروا چکا تھا۔ ہر ہفتے اسے اپنا جُڑا اچھلوانا پڑتا تھا۔

اس تکلیف اور اس احساس نے کہ اس کی کتابیں نذر آتش کی گئی ہیں اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ وہ بالکل بدل گیا اس کا جسم مرجھا گیا، آنکھیں اندر کو دھس گئیں اور وہ شخص ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔ اسے نازیوں کا ڈر نہیں تھا بلکہ اپنی عمر بھر کی کمائی کے ضائع ہو جانے کا خوف تھا۔ اس کی ساری محنت مٹی میں مل رہی تھی۔ اسے جرمن قوم پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ وہ تو ذہانت اور قوتِ فیصلہ میں دنیا بھر میں نامور تھے۔ وہ یہودیوں کے خلاف ہر ظلم سہا جلا آیا تھا لیکن یہ مظالم اس کی روح تک کو کھا گئے۔ وہ شام گئی اندھیری تھی جب وہ اپنا جُڑا اچھلوا کر گھر پہنچا اور اس نے اپنے ڈرائنگ روم میں گسٹاپو والوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

”برائے مہربانی آپ اپنا پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیں۔“

”میں اس کا مطلب سمجھ سکتا ہوں؟“

”آپ کچھ نہیں پوچھ سکتے۔ جو کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔ ورنہ ہمیں زبردستی کرنی پڑے گی۔“

”کیا آپ کو میری خدمات کا بھی اعتراف نہیں؟“

”ہمیں تو آپ کا بھی اعتراف نہیں۔“

اس سے اس کا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات لے لیے گئے اور اسے مزید تحریروں کا کام کرنے سے روک دیا گیا۔ گھر میں رکھی تمام نقدی لوٹ لی گئی اور اس کی لائبریری اور اشاعت گھر کی تمام کتابیں اکٹھی کر کے انہیں آگ لگا دی گئی۔

بین الاقوامی اشاعت گھر تحلیل نفسی کی اینٹ سے اینٹ بن گئی۔ اس کی بیٹی اینا کے فارم پر بھی قبضہ ہو گیا۔

اس بوڑھے آدمی پر کیا گزری ہوگی۔ اس کا اندازہ کوئی بھی نہ کر سکتا تھا۔

اب حالات ہاتھ سے نکلنے لگے تھے۔ سائنسی دنیا خوف زدہ تھی کہ کہیں فرائیڈ بھی نازیوں کے ہاتھوں گرفتار نہ ہو جائے۔

جزائر کیمین Cyman Islands

مغربی کیریبین میں تین بڑے اور متحدہ چھوٹے جزائر کا مجموعہ۔ اس کے شمال میں کیوبا اور جنوب مشرق میں جیکا ہے۔ رقبہ 100 مربع میل یا 160 مربع کلومیٹر، زبان؛ انگریزی، مذہب، عیسائیت دار الحکومت، جارج ٹاؤن، ویسٹ بے دوسرا بڑا شہر ہے۔ برطانیہ کا زیر اثر ایک خود مختار علاقہ ہے۔ اس کا انتظام گورنر اور ایگزیکٹو کونسل چلاتی ہے۔ اس کی اپنی دستور ساز اسمبلی ہے۔ سبزیاں اہم زرعی پیداوار ہیں۔ سمندری کچھوا بھی پایا جاتا ہے۔ سیاحت آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ کرسی کیمین آئی لینڈز ڈائر، 1503ء میں کولمبس نے سیاحت کی 1670ء میں برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ 1962ء میں برطانیہ کی نوآبادی بنالیا گیا۔

کینبرا Canberra

آسٹریلیا کا دار الحکومت۔ جنوب مغربی آسٹریلیا میں واقع ہے۔ اس جگہ کا انتخاب 1908ء میں ہوا۔ 1913ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ آسٹریلیا کا دوسرا دار الحکومت ہے۔ پہلا دار الحکومت ملبورن تھا۔ 1927ء میں یہاں پہلی بار پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں عارضی طور پر دار الحکومت کو پھر ملبورن میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں ایئر پورٹ، ریلوے اسٹیشن، دو یونیورسٹیاں 1946-1989ء اور پارلیمنٹ ہاؤس 1988ء بھی ہیں۔

کیمیائے سعادت

امام غزالی 1058-1111ء نے اسی سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سے احیائے العلوم کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کتاب کا خلاصہ کیمیائے سعادت ہے، جس میں عبادات، مہلکات، منجیات پر مبسوط اور لطیف تبصرہ ہے۔ علاوہ اس کے اس میں فردن و سطی تک اسلامی فکر و نظر کا مل لب لباب بھی دیا گیا ہے۔ اس کی زبان بہت سلیس ہے اور یہ دور سلاحتہ کی بہترین نثری کتابوں میں سے ہے۔

مرسلہ: شاہینہ امتیاز ڈی جی خان

جب حالات زیادہ خراب ہونے لگے تو فرائیڈ کے خاص دوستوں میں سے ڈاکٹر ارنسٹ جونز لندن سے یونان اور یونان کی شہزادی میری یونا پارٹ جو اس کے شاگردوں کے حلقے میں شامل ہو چکی تھیں اس سے وی آنا پہنچ گئے۔ سز ڈراگھی نیویارک سے آکر فرائیڈ کے ہاں رہ رہی تھی۔ وہ بھی جونز اور شہزادی میری کے ساتھ مل کر فرائیڈ کی حفاظت کرنے لگیں۔

ان تینوں نے اپنے اپنے ملکوں کے سفیروں پر زور ڈالا کہ وہ فرائیڈ کی حفاظت کے سلسلے میں ان کی امداد کریں لیکن فرائیڈ آسٹریا کا باشندہ تھا اس لیے وہ اس کو پناہ میں نہیں لے سکتے تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ایک سفیر کی توجہ سے فرائیڈ ظلم و ستم کا نشانہ بننے سے محفوظ رہا۔

حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی پیروی اس کی حفاظت اور حفاظت سے زیادہ نگرانی میں مصروف رہی۔ فرائیڈ اس صبر آزما دور میں بھی اپنے کام میں مگن رہا۔

ایک دن طوفانی رستے کے چند سپاہی اس کے گھر میں گھس آئے۔ فرائیڈ اس وقت اپنی اسٹڈی میں تھا۔ بیگم فرائیڈ نے نہایت بردباری اور نرم لہجے میں ان کا استقبال کیا اور بڑے احترام سے کرسیاں پیش کیں۔ نازیوں پر خوشگوار گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ ایسی آؤ بھگت ان کی کہیں نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ بھی ذرا نرم پڑ گئے۔ بس اتنا ہوا کہ انہوں نے فرائیڈ کے باہر جانے کی صورت میں پانچ ہزار آسٹروی شلنگ (بعض جگہوں پر دس لاکھ آسٹروی شلنگ لکھا ہے) کا مطالبہ بطور تاوان طلب کیا۔ وہ فرائیڈ کے کمرے میں مگنی اور اسے بتایا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مگن تھا کہ سنا ضرور لیکن اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے واپس آکر نازیوں کو بتایا کہ اسے تاوان دینا منظور ہے۔ لیکن یہ رقم بہت بڑی ہے۔ اسے کچھ دن کی مہلت دو۔

اس موقع پر میری یونا پارٹ اس کی مدد کو پہنچی اور اس نے نازیوں کو یہ رقم ادا کر دی اور ساتھ ہی امریکن صدر روز ویلٹ سے اس معاملے میں مداخلت کرنے کی بھی درخواست کی۔ صدر روز ویلٹ نے جرمن سفیر کو بلوا کر اس سے بات کی۔

اس کی خالصانہ کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور حکومت انگلستان نے اسے اپنے ہاں آجانے کی دعوت دی۔ ضروری اجازت نامہ بھی مل گیا لیکن پھر بھی نازیوں

کے ہاتھ جو کچھ آیا انہوں نے ضبط کر لیا۔ جس قدر کتابیں چھپی پڑی تھیں انہیں ضبط کر لیا۔ اس سے نازیوں کی سیری کب ہوتی تھیں۔ فرائیڈ کی بیٹی انا کو پولیس کے مقام پر بلوا کر ایذا دی گئی اور اس سے دریافت کیا گیا کہ ان کی دولت کہاں چھپی ہے۔ جب یہ حرکات کارگر نہ ہوئیں تو اس کے منے کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ اس سے کہا گیا کہ جس قدر کتابیں باہر گئیں وہ واپس منگوائی جائیں ورنہ فرائیڈ کے ناقدان کو انگلستان جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بڑی مشکل سے یہ کتابیں انہیں کی گئیں۔ انہیں بھی جلا دیا گیا۔ جائیداد ضبط ہو گئی۔

اس بوڑھے آدمی پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بالآخر 1938ء میں وہ وکیل چیئر پر بیٹھا۔ اس کا خاندان اور ملازم اس کے ساتھ تھے اور نیٹ ایکسپریس میں سوار ہو گئے۔

جب وہ پیرس پہنچا تو امریکا کے سفیر متینہ پیرس نے اس کا استقبال کیا۔ پرنس میری کے گھر چند روز آرام کرنے کے بعد وہ لندن روانہ ہو گیا۔

اس کے لیے لندن میں رہائش کا انتظام پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ لندن پہنچتے ہی وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اس طویل سفر نے اس کی توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔

سیاسی پناہ کی درخواست پہلے ہی دے دی گئی تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد یہ درخواست قبول کر لی گئی۔

اس کے لندن پہنچنے کی خبر عام ہوتے ہی اخباری رپورٹروں نے اس کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ اس کو جڑے کی تکلیف کی وجہ سے بولنے میں تکلیف ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود اسے بولنا پڑا۔ انٹرویوز کا یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ انا فرائیڈ ان ملاقاتوں میں اس کی مدد کرتی رہی۔

فرائیڈ آرام کرنے کا عادی تھا ہی نہیں۔ ٹھنکن کا احساس تو جیسے اسے چھو کر ہی نہیں گیا تھا۔ 82 سال کی عمر میں بھی اسے کام کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس نے توانائیاں جمع کیں اور کام کا آغاز کر دیا مگر اب عمر کا تقاضا تھا کہ ہر کام ست رومی سے کرتا تھا۔ صبح آٹھ بجے بیدار ہوتا تھا۔ دس بجے ڈاکٹر اس کا معائنہ کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ مریضوں کو دیکھنے کا کام شروع کر دیتا تھا۔

وہ جب وی آنا میں تھا تو اس نے حضرت موسیٰ پر

ایک تحقیقاتی کتاب لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ لندن کے قیام میں فرصت ملنے ہی اس نے کتاب پر کام شروع کر دیا۔ اس شاہین اسی مصروفیت میں گزرنے لگیں۔ کبھی کبھی وہ سیر کے لیے باہر بھی چلا جاتا تھا۔

وہ اپنے کتے کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔ اسے اپنے کتے سے بہت محبت تھی۔ کتوں کے بعد اسے پھولوں سے محبت ہو گئی تھی۔ اس نے لندن آکر بھی اس شوق کو جاری رکھا۔ اپنے گھر کے باغ میں بھی رنگا رنگ مختلف قسم کے پھول لگائے تھے۔ ان پھولوں کو دیکھ کر وہ کہا کرتا تھا۔

”ان کا نہ کوئی کردار ہوتا ہے اور نہ ہی الجھادے۔“

انگلستان کے آسمان پر جنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ سارا ملک آنے والے خطرے سے پریشان اور سرسبز تھا۔ خطرے کے الارم، طیارہ شکن توپیں ہر جگہ نصب تھیں۔ ساری دنیا جنگ کی ہولناکیوں کے انجام سے لرزاں تھی لیکن فرائیڈ کے ارد گرد کا ماحول پھر بھی فرسکون تھا۔ اس کا یہ گھر بہت آرام دہ اور ہوا دار تھا۔ اس کے کمرے وی آنا دالے گھر سے زیادہ کشادہ تھے۔ گھر کا باغ کشادہ نہیں تھا لیکن اس کا لالان بہت نفیس تھا۔ دیواروں پر بوڑھے ورختوں کے سائے ماحول کو اور بھی پرسکون بنا رہے تھے۔ انا فرائیڈ بچوں کی نفسی تحلیل پر کام کرنے میں مصروف تھی۔

یہ زندگی بظاہر تو بہت آرام دہ تھی لیکن اس کے پیچھے ایک ہیبت ناک حقیقت کھڑی تھا کہ موت کا فریشتہ منتظر کھڑا تھا۔

اس کی سولہ سالہ سرطان کی پرانی بیماری نے پھر زور پکڑا۔ اس کے منہ کا درد ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ رات بھر وہ جاگتا رہا۔ دن میں ایک آدھ گھنٹا اوکھ آجائے تو آجائے۔ باغ میں کبھی آرام دہ کرسی پر وہ گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اس بے آرامی نے اسے اور بھی نحیف بنا دیا۔

درد بڑھتا گیا اور آخر مقررہ وقت آ گیا۔ 1939ء کو اس کے نئے وطن برطانیہ کے جرنی کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے تین ہفتے گزرنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

وصیت کے مطابق اس کی لاش کو نذر آتش کیا گیا اور اس کی راکھ محفوظ کر دی گئی۔

تلخیص: سگمنڈ فرائیڈ، توراکینہ قاضی

سگمنڈ فرائیڈ، مرتبہ آصف حسن

نواب سپاہی غلام حسین میمن

قیام پاکستان کے لیے کتنے لوگوں نے قربانیاں دیں۔ جس کی استطاعت جتنی تھی وہ اتنا ہی مجنون بنا ہوا تھا کیونکہ مطالبہ پاکستان مسلمانوں کے لیے جینے مرنے کا مسئلہ بن گیا تھا، اس لیے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں پوری تھیں۔ آریہ سماج کے کارکن مسلمانوں کو شدھی کرن تحریر چلا کر زبردستی ہندو بنا رہے تھے تو آریہ ایس ایس والے ہتھیار بند ہو کر قتل کے درپے تھے۔ اس تغیر کو جس جس نے محسوس کیا وہ سب مطالبہ پاکستان کے لیے دن رات محنت کرنے لگا تھا۔ قائد اعظم کے اس سپاہی نے بھی قربانیوں کی ایک فصیل کھڑی کردی تھی۔

پاکستان کے لیے تن من وھن سے کام کرنے والے ایک نواب کا تذکرہ

سکتا۔ اس لیے وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتا اور تلاوت کرتا۔ تب ثانی اس سے خوش ہوتی۔ حیدر آباد کن کے جاگیردار نصیب یاد جنگ کے گھر فروری 1905ء کو پیدا ہونے والا پچھ محمد بہادر خان ابھی

”آج تم نے اللہ سے بات نہیں کی اس لیے میں بھی تم سے بات نہیں کروں گی۔“ ننھے بہادر کے لیے ثانی کی یہ وارننگ پریشان کن تھی۔ اسے محسوس ہو چکا تھا کہ وہ نماز اور تلاوت سے فرار ہو کر ثانی کی نظروں سے چھپ نہیں



سے نہ صرف آٹھ سال میں یہ سارا قرض چکا دیا بلکہ جاگیر کے انتظامات بھی پہلے سے بہتر کر دیے۔

اب محمد بہادر خان نواب محمد بہادر خان کہلانے لگے جنہیں بعد میں یار جنگ کا خطاب بھی ملا۔ یوں تاریخ انہیں نواب بہادر یار جنگ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

قرض کی ادائیگی کے بعد سکون کے لمحات میسر آئے تو انہوں نے حج کا ارادہ کیا۔ کئی رشتے داروں نے ہمراہ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ طبیعت میں انکساری اور محبت کا جو جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اس نے کسی کو انکار کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ یوں سفر حج کو جاتے وقت خاندان کے 80 افراد ساتھ تھے جس کے سالار نواب بہادر یار جنگ تھے۔

انہوں نے دوران سفر اپنی علمی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور روزانہ درسِ تفسیر کے علاوہ مسافروں کو سفر کی فضیلت اور مسائل حج سمجھاتے رہے۔

حج کے بعد ان کی ملاقات سابق امیر افغانستان امان اللہ خان، ترکی کے جلا وطن سربراہ توحید شاہ، سعودی عرب کے فرمانروا سلطان ابن سعود اور شہزادہ فیصل (جو بعد میں سعودی عرب کے فرمانروا بنے، پاکستان کی شاہ فیصل مسجد ان ہی کے نام سے موسوم ہے) سے ہوئی۔

اس کے بعد ارادہ تو مصر جانے کا تھا مگر پابندی کے باعث بیروت چلے گئے۔ اس بارے میں اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

”دوروز بیروت کی سیر کی، جو شام کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ مغربی تمدن سے پوری طرح بہرہ اندوز، قدرت نے بیروت بلکہ شام کو اپنی فیاضیوں اور مناظر و سرسبزی سے مالا مال کر رکھا ہے۔ نہریں بہتی ہیں۔ آبشار گرتے ہیں، صنوبر سے گھری ہوئی پہاڑیوں کو دیکھ کر جسم میں خون بڑھنے لگتا ہے۔ امریکی مشن کی عظیم الشان یونیورسٹی دیکھی جو ترقی کرنے والوں کا بہترین کارنامہ اور خواب غفلت کے متوالوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے۔“

اس کے بعد بیت المقدس پہنچے جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔ ”انبیاء اس سرزمین پر پہنچے تو بوڑھے ابراہیم کا وعظ، داؤد کے نئے اور یعقوب کی قرباندم کردہ آہ و زاری کانوں میں گونجنے لگی۔ آسواہیوں کا ظلم، مصریوں کا قتل عام، رومیوں کا جلال و جبروت، مسلمانوں کی رواداری اور حسن سلوک ہر قدم پر نظر آ رہا ہے۔ سلیمانی کی عظمت داؤد کے شہر کے ہر پتھر سے ظاہر ہو رہی ہے۔ غرض آنکھیں دیکھ رہی

ایک ہفتے کا ہی تھا کہ والدہ کے انتقال کی وجہ سے وہ اپنی بہترین تربیت گاہ سے محروم ہو گیا۔ باپ نے نومولود کو اپنی ساس کے سپرد کر دیا کہ وہ اس کی پرورش کریں۔ اب وہ ثانی کے زیرِ کفالت آ گیا۔ ثانی ایک دیندار اور خدا ترس خاتون تھیں۔ قومی معاملات میں دلچسپی لینا اور اخبارات کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنا ان کا معمول تھا۔ انہوں نے اپنے نواسے محمد بہادر خان کو مذہب سے رغبت ولا تے ہوئے نماز، روزہ اور تلاوت کا پابند بنایا۔ ثانی سے اس کا یہ تعلق 14 سال رہا۔

محمد بہادر خان نے ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ اور مفید الانام میں حاصل کی پھر مدرسہ العلوم بلاہ میں داخلہ لیا۔ دورانِ تعلیم ان کے تمام اساتذہ اس بات سے واقف تھے کہ اس کی حیثیت ایک اوسط درجے کے طالب علم سے زیادہ نہیں ہے۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ایک رات اس نے عجیب خواب دیکھا۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ ایک قبر کھودی گئی ہے اور اسے کفن پہنا کر لٹا دیا گیا ہے اور اس کے ارد گرد انسانوں کا جم غفیر موجود ہے۔ صبح اٹھ کر اس نے یہ خواب اپنے شفیق استاد علامہ شمسی سے بیان کیا۔ استاد نے مسکراتے ہوئے اس کی تعبیر بتائی کہ ”آئندہ تمہیں مسلمانوں کی قیادت کرنا ہوگی۔“ گویا قدرت بچپن ہی سے اسے آئندہ کے لیے کسی اہم ذمہ داری کے لیے تیار کر رہی تھی۔

ابھی اس نے میٹرک کا امتحان بھی نہ دیا تھا کہ والد نصیب یار ویر جنگ انتقال کر گئے۔ والد کی زمینداری کے تمام تر جھیلے اب اس کے حصے میں آ گئے۔ اس لیے اسے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا مگر علم کا شوق مسلسل اسے بھڑکاتا رہا۔ وہ اپنے طور پر ہی مولوی سعد اللہ خان اور مولوی سید اشرف شمسی سے عربی، تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس لیتا رہا۔

یہ ثانی کی مذہبی تربیت کا حصہ ہی تھا کہ وہ نوجوانی میں قدم رکھنے کے بعد تھوڑی سی نلکتے ہوئے پال کے کٹوانے کا خیال تک دل میں نہ لایا۔ آتے جاتے کچھ دوست مذاقاً اسے ”بکرا“ کہہ کر مذاق کا نشانہ بناتے رہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے فنِ سپہ گری کا بھی شوق تھا۔ ورزش تو وہ بچپن سے ہی کیا کرتا تھا۔ جلد ہی اس نے تلواری بازی، نشانہ بازی اور تیراکی میں بھی کمال حاصل کر لیا۔

والد نصیب یار ویر جنگ نے مرتے وقت پانچ لاکھ کا قرض چھوڑا تھا۔ اس نے اپنی انتظامی صلاحیت اور قابلیت

ہیں، کان سن رہے ہیں۔ قلب سوچ رہا ہے۔ ہاتھ لکھ رہے ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ فلسطین کے بعد مصر پہنچے، جید علماء سے ملاقاتیں کیں جن سے اتحاد رابطہ اسلامی کے مسائل پر گفتگو رہی۔ وہ مصر کی مشہور جامعہ الازہر بھی گئے۔ بعلبک کے کھنڈر دیکھے۔ میدان یرموک کی زیارت کی۔ حضرت مکرمہؓ کے مزار پر فاتحہ پڑھی، حضرت خالد بن ولیدؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمنؓ اور حضرت وحیدؓ کئی کے مزارات پر بھی گئے اور فاتحہ پڑھی۔

اس کے بعد وہ دمشق سے ہوتے ہوئے ترکی پہنچے۔ ترکی میں انہوں نے لوگوں کو یورپین لباس میں دیکھا اور وہاں کے لوگوں نے انہیں سرخ رنگ کی ترک ٹوپی پہنے دیکھا۔ یہ ٹوپی جہاں نوجوانوں کے لیے۔ عقارت کی علامت تھی، وہیں بوڑھوں کے لیے قابل احترام تھی۔

ایک روز ایک ترک نوجوان تنہائی میں ان کے کمرے میں آیا۔ خود ہی دروازہ بند کر کے ان کی طرف بڑھا۔ ایک لمحے کے لیے خطرے کے سبب ان کا ہاتھ اپنی جیب میں موجود پتول پر سختی سے جم گیا مگر دوسرے ہی لمحے ترک نوجوان کی حرکت نے تمام خوف دور کر دیا۔

اس نے انتہائی منت کر کے ان کی سرخ ٹوپی مانگی اور پھر اسے اپنے سر پر رکھ کر آئینے میں صورت دیکھی اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ”میرا بادشاہ یورپین ٹوپی پسند کرتا ہے۔ اس لیے میں بھی یہی پہنتا ہوں مگر میرا دل قدیم ترک ٹوپی پہننے کو چاہتا ہے۔“

اس طرح قسطنطنیہ کے قبوہ خانے کا واقعہ بھی ان کی دلچسپی کا باعث بنا۔ انہوں نے اپنے دوست سے ترکی عورتوں کے یورپین لباس سے متعلق گفتگو کی۔ قریب کی میز پر موجود ایک نوجوان لڑکی نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ شخص لگتا ہے مسافر ہے اور ہمارے لباس کے بارے میں شک میں مبتلا ہے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں۔ ان سے کہو الحمد للہ! ہم سب مسلمان ہیں اور ہماری رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ اسلام پر قربان ہونے کے لیے تیار ہے۔ یہ مسافر آگورہ اور قسطنطنیہ کو دیکھ کر ترکوں کی حالت کا اندازہ لگانے کے بعد اناطولیہ جائیں گے، بہادر یار جنگ نے اپنے ایک ساتھی کو اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ واقعی جب میں اناطولیہ گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں اب تک قدیم ترک تہذیب کے آثار باقی ہیں، جہاں ترکوں کا قدیم لباس، لمبی

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اے کہ ترے وجود پر خالق دو جہاں کو ناز اے کہ ترا وجود ہے وجہ وجود کائنات اے کہ ترا سر نیاز حد کمال بندگی اے کہ ترا مقام عشق قرب تمام عین ذات اے کہ تری زبان سے رب قدیر گل فشاں وحی خدائے لم یزل تھی تری ایک ایک بات اے کہ تو فخر آدمی واقف سر عالمی! لوح و قلم سے بے نیاز، تیرے علوم شش جہات تیرے عمل سے کھل گئیں تیرے بیان سے حل ہوئیں منطقیوں کی الجھنیں فلسفیوں کی مشکلات خورگ بندگی جو تھے تیرے طفیل میں ہوئے مالک مصر و کاشغر، وارث دجلہ و فرات مجھ سے بیان ہو کس طرح رفیع شان احمدی تنگ مرے تصورات پست مرے تخیلات

داڑھیاں، عورتوں کا پردہ اور مسجدوں کا مسلمانوں سے بھرا ہوا ہونا مسلم نشاۃ ثانیہ کی یاد دلاتا ہے۔

اس کے بعد بغداد پہنچے، جس کا حال اپنے ایک خط میں یوں تحریر فرماتے ہیں: ”نیوا کے کھنڈروں پر آنسو بہائے، حضرت جبریلؑ، حضرت شیثؑ، حضرت یونسؑ، حضرت دانیالؑ علیہم السلام کی بارگاہوں پر حاضری دی۔ حضرت اولیس قرطیٰ کا مکان دیکھا۔ موصل سے بغداد پہنچا۔ حضرت غوث پاک قطب الاقطاب شیخ عبدالقادر جیلانی کی بارگاہ پر حاضری دی۔ حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت ابوبکر شبلیؒ، حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت معروف کرخیؒ، حضرت عمر شہاب الدین سروردیؒ، حضرت بہلول داغؒ، حضرت امام موسیٰ کاظمؒ، حضرت سری سقطیؒ، حضرت امام ابو یوسفؒ وغیرہ اولیائے دائرہ عظام کی بارگاہوں پر حاضری دی۔ اشوریوں، بابلیوں، کلدانیوں کے کچھ آثار دیکھے۔ سامرا گیا۔ سلطان معتمد باللہ کا ٹوٹا ہوا محل، مسجد جامعہ کا عجیب و غریب مینار دیکھا۔ طاق کسریٰ کے پاس کھڑے ہو کر تھوڑی دیر مدائن کے کھنڈروں کی سیر کی۔ حضرت سلمان فارسیؒ کی بارگاہ پر حاضر ہو کر آنکھیں بند

کیس اور کسی کو ایران سے تلاش حق سے نکلنے اور مدینہ میں منزل مقصود پاتے دیکھا۔“

چھ ماہ کی سیاحت کے دوران مجلس انجمن تبلیغ اسلام کے تحت شہر شہر اور قریے قریے گھوم کر لگ بھگ پانچ ہزار غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ انجمن تبلیغ اسلام کو وہ اس سفر پر جانے سے چار ماہ قبل قائم کر چکے تھے۔

ان ہی دنوں نواب بہادر یار جنگ نے محسوس کیا کہ ہندو مذہب کی آڑ میں ایک فوج تیار کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کی اکثریت کو کمزور اقلیت میں تبدیل کر سکیں اور ہندوستان کی مسلمان ریاستوں میں رہا سہا اقتدار بھی ختم کیا جائے۔ نواب بہادر یار جنگ نے شدت سے اس بات کی خواہش کو محسوس کیا کہ اگر اس وقت مسلمانوں کو مسلح نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ مسلم اقتدار کے دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں، اتفاقاً اسی زمانے میں عنایت اللہ مشرقی نے خاکسار تحریک کی بنیاد ان ہی اصولوں پر رکھی جس کے نواب بہادر یار جنگ خواہش مند تھے۔ انہوں نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا اور نہ صرف شامل ہوئے بلکہ اس کی اشاعت کے لیے ملک کے گوشے گوشے میں گئے اور مسلمانوں کو اس کا پیغام دیا: ”دوستو! دنیا کے کسی فرد یا قوم نے تکلیف کے بغیر آرام اور راحت کی صورت نہیں دیکھی جس کو تلاش راحت ہے اس کو پہلے مبتلائے مصیبت ہونا چاہیے بقول شاعر

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیر اہم کیا ہے
ششیر و سناں اوں طافِ دس و رباب آخر

جن قوموں نے اس راہِ حیات کو سمر زندگی کو پہچانا، ان کی رفعت اور مرتبت کو جاننا دنیا والوں کے لیے مشکل ہو گیا۔ کیا تم کو ان دنوں کی یاد دلانے کی ضرورت ہے جب دو جہانوں کے سردار اور صاحبِ لولاک خاتم النبیین اور رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی راتیں گھوڑوں کی تنگی پٹھوں پر سفر کیا کرتے تھے اور راتوں کو جاگتے جاگتے آپ کے قدم مبارک متورم ہو جایا کرتے تھے۔ کیا تم نے تاریخ کے ان ایام پر نظر نہیں ڈالی۔ جب فاروق اعظم میدان جنگ سے آنے والے نامہ بر کی تلاش میں مدینے سے میلوں دور نکل جایا کرتے تھے۔ کیا تم نے ان دنوں کو بھلا دیا ہے جب دنیا سے چھوٹے بڑے، امیر و غریب اور عرب و عجم کا فرق مٹانے والا، نفرو ایمان کے درمیان ایک خندق کے ذریعے حید فاضل پہنچ رہا تھا اور اس کے شہم اطہر

پر پتھر پڑے ہوئے تھے۔“

نواب بہادر یار جنگ اس تحریک میں شامل ہو کر ایک عام رضا کار کی حیثیت سے خاکی وردی پہنے، ہاتھ میں بیٹلے سنبھالے، ننگے پیر شاہراہ عام پر پریڈ کی اور بھی یہ بھی ہوا کہ نماز میں تاخیر کرنے پر پیٹھ پر کوڑے بھی کھائے مگر اف تک نہ کی۔ ان کا علامہ عنایت اللہ مشرقی کے بارے میں خیال تھا کہ انہوں نے امیرانہ زندگی ترک کر کے صرف تین جوڑے معمولی کپڑوں پر زندگی گزارنا منظور کیا۔ اس تحریک کی خاطر وہ ایک عرصے تک خاکسار سے وابستہ رہے مگر پھر اختلافات کی چنگاری جلنے لگی۔ اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں: ”چند روز پیشتر مجھ میں اور علامہ مشرقی میں کچھ خفیف سا اختلاف ہو گیا تھا اور وہ محض اس بناء پر تھا کہ علامہ صاحب نے ہمارے ملک کے مقامی حالات سے ناواقف ہو کر انجمن اتحاد المسلمین کے معاملے میں دخل دیا تھا۔ میں انہیں اب بھی غلطی پر سمجھتا ہوں۔“

پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے نواب بہادر یار جنگ کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ جولائی 1943ء کا ایک گرم دن تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے بنگلے پر ایک ملاقاتی آیا اور ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کے پی اے نے ملاقات کروانے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ ملاقاتی نے پہلے سے وقت نہیں لیا ہوا تھا۔ ابھی گفت و شنید جاری تھی کہ قائد اعظم کسی فائل کی تلاش میں اپنے کمرے سے نکل کر پی اے کے پاس آئے اور فائل مانگی۔ جب وہ فائل لے کر کمرے سے جانے لگے تو ملاقاتی نے انہیں روک کر کچھ کہنا چاہا۔ قائد اعظم اس کی جانب متوجہ ہوئے تو اس نے فوراً ہی اپنی قمیص میں اڑسا ہوا خنجر نکال کر قائد اعظم پر حملہ کر دیا۔ قائد اعظم کے سختی سے جسم کو دیکھ کر وہ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ میں ایک ہی وار میں ان کا کام تمام کر دوں گا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دفعتاً قائد اعظم نے ایک ہاتھ سے اس کا خنجر والا ہاتھ اوپر ہی روک لیا اور پھر چھینا چھٹی میں قائد اعظم معمولی سے زخم آئے۔ اسی اثناء میں چوکیدار نے حملہ آور کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حملہ آور قائد اعظم کو قتل کے ارادے سے آیا تھا۔ اس کا نام رفیق صابر معلوم ہوا۔ اس کا تعلق خاکسار تحریک سے تھا۔ اس حملہ آور سمیت خاکسار تحریک کے دیگر ارکان کا یہ خیال تھا کہ قائد اعظم ہندوستان میں اسلام کی راہ میں کانٹے کی طرح ہیں۔

حلیہ

صحیح تو مہند جہم، خوب صورت اور دل فریبی
قد، سرخ و سفید رنگت، کتابی چہرہ اور اس پر ابھری
ہوئی داڑھی، دہشتی ہوئی پیشانی، ذہانت سے بھرپور
آنکھیں، جہم پر شیر وانی اور سر پر سرخ ترکی ٹوپی۔

☆.....☆.....

خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد،
مولانا عبدالحمید بدایونی اور مولانا عطاء اللہ شاہ
بخاری جیسے آتش فشاں مقرر تھے مگر جس قسم کی
بصیرت افراد تاریخی دولت مسلمانوں کو نواب بہادر
یار جنگ کی تقاریر سے ملتی تھی وہ کسی کے حصے میں
نہیں آئی تھی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں وہ سب
سے آخر میں بولتے تھے اور لوگ گھنٹوں خاموش اور
پرسکون ہو کر ان کو سنتے تھے۔

(چوہدری ظلیق الزماں)

موجودہ زمانے میں بہت سے مسلمانوں نے
ملکوں ملکوں کی سیر کی اور سفر نامے لکھے ہیں جن میں
ایک میں بھی ہوں اور مولانا شبلی عثمانی، مولوی محبوب
عالم اور بھوپال کے ایک مسلمان بھی ہیں جنہوں نے
اسٹین کا اچھا سفر نامہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی
بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس
نے ایک ہی وقت میں تمام اسلامی دنیا کے ملکوں اور
قوموں کو یکجا دیکھا ہو اور مذہبی، سیاسی اور معاشرتی
مقاصد کا مطالعہ کیا ہو۔ اس لحاظ سے نواب بہادر یار
جنگ مذکورہ سیاحوں سے اعلیٰ ہیں کہ انہوں نے
مستقل سفر کیا اور چھ مہینے میں عراق، حجاز، شام،
فلسطین، مصر، ایران، قسطنطنیہ، انگورہ، وسط ایشیا اور
افغانستان وغیرہ کو بہت گہری نظروں سے دیکھا، ہر
قسم کے رہنماؤں سے ملے، مباحثے کیے اور ان سے
نتائج نکالے۔ بس میرے عقیدے میں اسٹین کے
ابن بطوطہ سے بڑھ گئے ہیں، تاہم میں قدیمی عظمت
وعزت کو باقی رکھنے کے لیے نواب بہادر یار جنگ کو
ابن بطوطہ سے زیادہ نہیں بلکہ ابن بطوطہ کے برابر
سمجھ کر نواب ابن بطوطہ کا خطاب دیتا ہوں۔

(خواجہ حسن نظامی)

خاکسار تحریک کے ایک کارکن کی یہ حرکت نواب
بہادر یار جنگ کو نہیں پہنچائے بغیر نہ رہ سکی اور انہوں نے
بطور احتجاج اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی: نواب بہادر
یار جنگ۔ آخر وقت تک مجلس اتحاد المسلمین سے وابستہ رہے۔
وہ 1939ء میں پہلی بار اس کے صدر منتخب ہوئے اور اس
کے دستور کا تعارف قائد اعظم محمد علی جناح کے نام خط میں
تحریر کرتے ہوئے لکھا:

”میں نے مجلس اتحاد المسلمین کا دستور بالکل لیگ
کے دستور کی مطابقت میں بنایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ
لیگ کے سیکریٹری اور خازن کا انتخاب جنرل سیشن کرتا ہے
اور میرے کانٹینیوئٹن کی رو سے صدر ہی کو یہ اختیار ہے کہ
وہ مجلس عاملہ کے ممبران کے ساتھ ساتھ جنرل سیکریٹری اور
خازن کو بھی نامزد کرے۔“

1906ء میں ڈھاکہ سے وجود میں آنے والی آل
انڈیا مسلم لیگ کا دائرہ عمل صرف صوبوں تک تھا۔ دیسی
ریاستوں کے معاملات حل کرنا اس کے دائرہ اختیار سے
باہر تھا مگر آل انڈیا کانگریس نے صوبوں کے ساتھ ساتھ
دیسی ریاستوں میں بھی اسٹیٹ کانگریس کے نام سے اپنی
سرگرمیاں بڑھادی تھیں۔ کانگریس کی فرقہ وارانہ سرگرمیوں
سے صوبوں کے ساتھ ساتھ دیسی ریاستوں کا بھی امن و
چین غارت ہو رہا تھا۔ خاص کر مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ
توڑے جانے لگے۔ وہ نہ تو آزادی کے ساتھ اذان دے
سکتے تھے اور نہ ہی عبادت کر سکتے تھے۔ انہیں آزادی سے
قرآن پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ مساجد کو فالتو کام کے
لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان مساجد کو مندروں
میں تبدیل کیا جا رہا تھا اور یہ سب اسٹیٹ کانگریس کی شہ پر
ہو رہا تھا اور کانگریس کو حکمران وقت کی مکمل حمایت حاصل
تھی۔ سڑک بنانے کے بعد مسلمانوں کی مساجد کو شہید اور
قبرستانوں کو تہس نہس کیا جا رہا تھا۔ جنگلات پر مکمل قبضہ
ہندوؤں کو حاصل تھا۔ ٹیکس کے معاملات میں ہندوؤں کو سزا
کم اور مسلمانوں کو زیادہ دیتا تھا۔ مسلمانوں کا قتل عام
ہندوؤں کے لیے مشغلہ بن چکا تھا۔

ایسے نازک دور میں سلطنت آصفیہ کے جاگیردار
نواب بہادر یار جنگ نے ایک ترکیب سوچی۔ اس ترکیب
کے بعد ایک تنظیم عمل میں آئی جس میں ہر دیسی ریاست کے
مسلم نمائندے شامل تھے۔ اس مجلس کا کام صرف اور صرف
مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرنا تھا تاکہ وہ عزت

سے زندگی گزار سکیں۔ بعد میں اس مقصد کے لیے انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ اسٹیشن قائم کی۔ اس کا مرکزی دفتر ناگ پور میں قائم کیا گیا اور شروع میں اس کا تمام تر خرچ نواب بہادر یار جنگ برداشت کرتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ نہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ اسٹیشن کے بانی تھے بلکہ جب تک زندگی نے وفا کی وہ ہر سال اس کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آل انڈیا مسلم لیگ اسٹیشن ایک منظم و مضبوط ریاستی تنظیم بن گئی۔ اس کے سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ساتھ عظیم پیمانے پر ہونے لگے۔ وہ خود کہتے تھے: ”مجھے یقین ہے کہ یہ تحریک مستقبل میں نہایت کامیاب اور ریاستی مسلمانوں کے تحفظ و نجات کا ذریعہ بنے گی۔“

نواب بہادر یار جنگ کو قائد اعظم سے والہانہ عشق تھا۔ وہ قائد اعظم کو دیکھتے ہی گلاب کے پھول کی طرح گل اٹھتے تھے اور جب بھی ان کے ساتھ ہوتے تو خود کو قائد اعظم کا ادنیٰ سپاہی تصور کرتے۔ انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیے بغیر ہی مسلم لیگ اور قائد اعظم کے ساتھ مل کے مسلمانوں کے حقوق کی بحالی اور حفاظت کے لیے دن رات کام کیا۔ قائد اعظم پر جب قاتلانہ حملہ ہوا تو ان کے منہ سے بے اختیار نکلا: ”اگر میری دعا مقبول ہوتی تو میں التجا کرتا کہ اے اللہ! تو میری عمر گھٹا کر قائد اعظم کو طویل عمر عطا فرما۔“

وہ قائد اعظم محمد علی جناح کو مسلمانان ہند کا بے لوث رہنما کہتے تھے اور اس واقعے کے بعد سے انہوں نے خاکسار تحریک سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کر لی۔ خاکسار تحریک کا قائد اعظم سے دشمنی کا رویہ شروع سے برقرار رہا۔ اس ضمن میں یہ واقعہ اہم ہے کہ مارچ 1940ء کے جلسے کے انتظامات مکمل تھے مگر خاکسار تحریک کی سازش سے حکومت نے امن عامہ کے مفاد میں اس جلسے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس پابندی سے جہاں دوسرے رہنما پریشان تھے۔ وہاں قائد اعظم بھی سخت تذبذب کا شکار تھے۔ ایسے وقت میں نواب بہادر جنگ نے قائد اعظم کو مکمل یقین دلایا کہ جلسہ ضرور ہوگا اور آپ سارے انتظامات اور نظم و ضبط کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ قائد اعظم کو اپنے اس ساتھی کے قول اور صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ تھا۔ اس لیے انہوں نے حکومت کو زور دے کر اور اپنی ذمہ داری پر اس جلسے کی خصوصی اجازت لی۔ جلسہ گاہ کے قریب ہی خاکسار تحریک

کے کارکن اپنے جوش میں موجود کسی بد نظمی کے لیے تیار تھے۔ اس موقع پر نواب بہادر یار جنگ نے ان کے سامنے پراثر تقریر کی جس سے ان کا جوش سرد پڑ گیا اور یوں مارچ 1940ء والا جلسہ انتہائی امن کے ساتھ 22 مارچ کو شروع ہو کر 24 مارچ کو ختم ہوا۔

نواب بہادر یار جنگ نے دسمبر 1943ء میں کراچی میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس میں پاکستان کی حمایت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”پاکستان بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کر دو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کے لیے پاکستان بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لیے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے۔“

نواب بہادر یار جنگ ریاستی عوام کو تیار کر کے مسلم لیگ کے تاریخی جلوس میں لاتے اور خود تماشائی بن کر پوری کارروائی دیکھتے اور جب قائد اعظم خود تقریر کی دعوت دیتے تب ڈاکس پر آکر زور خطابت چکاتے، وہ بسا اوقات تین تین گھنٹے تک تقریر کرنے اور مسلمانان ہند میں اسلام اور پاکستان کے لیے جوش اور جذبہ پیدا کرتے اور عوام کا یہ حال ہوتا کہ ان کی تقریر کے دوران ہلٹے تک نہ تھے۔

تحریک پاکستان کے دوران صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کا اثر بہت کم تھا۔ سردار اورنگ زیب خان جو سرحد مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے بھی یہ بات محسوس کی کہ سرحد میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں بڑھنی چاہئیں مگر جہاں دوسری طاقتیں ان کی راہ میں حائل تھیں، وہیں فقیر اپہی کی ہولناک سرگرمیاں پوری دہشت گردی کے ساتھ سرحد میں جاری تھیں ان ہی دنوں کی بات ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ قائد اعظم کو ملک بھر سے خطوط اور ٹیلی گرام ملنے لگے۔ جب سردار اورنگ زیب خان نے خط بھیجا تو قائد اعظم نے جواب میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا: ”میرے زخم اس وقت تک مندمل نہ ہوں گے جب تک سرحد میں مسلم لیگ کو فتح نہ ہوگی۔“

سردار اورنگ زیب اس خط کو پا کر بوے مشکور ہوئے۔ انہوں نے نواب بہادر یار جنگ سے مشورہ کیا اور ان سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی۔ بہادر یار جنگ نے قائد اعظم کی اجازت سے سرحد کے دورے کرنا شروع کیے، ان کے ہمراہ مسلم لیگ کے دو اور رہنما سردار اورنگ زیب خان اور قاضی محمد علی بھی تھے۔ یہ تینوں لگی رہنما ایک کھلی موٹر میں جا رہے تھے۔ سنان سڑک بھی اور ساتھ میں

یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ کسی بھی جگہ سے کوئی گولی آکر کسی کا بھی خاتمہ کر سکتی ہے۔ ایسے میں آگے جانے پر کسی نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی روکوائی۔

گاڑی روک دی گئی۔ اجنبی قریب آیا اور پوچھا: ”آپیں سے نواب بہادر یار جنگ کون ہیں؟“
نواب بہادر یار جنگ نے اپنے سینے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ”میں.....!“

اجنبی نے تنہائی میں چل کر فقیر اپنی کا پیغام دینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ نواب بہادر یار جنگ جانے لگے تو ساتھیوں نے منع کیا کہ کہیں آپ کو نقصان نہ پہنچا دے مگر وہ بے خطر اجنبی کے ساتھ چل پڑے۔ کچھ دور جا کر اس نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا: ”فقیر صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور پیغام دیا ہے کہ آپ کی یہاں تشریف آوری کی اطلاع تھی، اس لیے آپ کے سفر کے انتظامات کر دیئے گئے ہیں۔ آپ جہاں جہاں سفر کرنا چاہیں ہمیں اطلاع دے دیجیے تاکہ حفاظتی انتظامات کر دیئے جائیں۔“

یہ نواب بہادر یار جنگ کا کمال تھا کہ دشمن بھی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ ان کی شخصیت کے جادو کے ساتھ زور و خطابت نے وہ کمال دکھایا کہ سرحد مسلم لیگ انتخابات میں کامیاب ہوئی۔

نواب بہادر یار جنگ کبھی بھی مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن نہیں رہے کیونکہ اس وقت حکومت برطانیہ کا قانون تھا کہ ریاستی عوام کے نمائندے کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں بن سکتے۔ نواب بہادر یار جنگ نے خود کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جب حکومت وقت نے دیکھا کہ وہ اس طرح بھی باز نہیں آ رہے ہیں تو قتل اور ریاست بدر کی دھمکی کے ساتھ تقریر کرنے پر بھی پابندی لگا دی مگر پھر بھی آزادی کا یہ متوالا باز نہ آیا تو ایک اور حکومتی فرمان جاری ہوا۔ ”تمام منصب دار اور جاگیر دار سرکاری ملازم تصور کیے جائیں گے۔“

چونکہ وہ حیدر آباد دکن کے جاگیر دار تھے۔ اس لیے وہ بھی اس فرمان کے تحت سرکاری ملازم میں شمار ہونے لگے۔ اب حکومت کے خلاف کسی بھی سرگرمی میں حصہ لینا صحیح نہ تھا۔ دوسری صورت میں انہیں جاگیر سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ ایسے فیصلہ کن مرحلے پر انہوں نے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو عزیز رکھا اور ساری جائیداد اور جاگیر حکومت کو واپس کر دی۔

نواب بہادر یار جنگ میرے عزیز دوست تھے۔ ان کی موت میرے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔ نواب مرحوم مومن صادق تھے اور اسلام کے بہت بڑے داعی۔ انہوں نے اسلام اور مسلمانانِ ہند کی زریں خدمات انجام دیں۔ تاریخ ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ہمارے لیے قدرت کا بیش بہا عطیہ تھے۔

(قائد اعظم محمد علی جناح)

خط بنام قائد اعظم

11 فروری 1944ء

مائی ڈیر قائد اعظم!

کراچی میں مسلم لیگ کے آخری اجلاس میں، میں نے جو تقریر آپ کے حکم سے کی تھی اس کی نسبت آپ کی ورکنگ کمیٹی کے کئی ارکان کو خفا پایا۔ مجھے نہیں معلوم کہ خود آپ اس کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں لیکن اس کے اثرات جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ یہ کہ میرے پاس ہندوستان کے ہر گوشے سے سیڑوں خطوط موصول ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کی بے عمل اور بے جا مصلحت اندیشی کا جو غلط تصور ناواقفیت کی بناء پر عوام اور خصوصاً نوجوانوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا اس تقریر سے بڑی حد تک ازالہ ہو گیا ہے۔

آپ کا مخلص

بہادر یار جنگ

اب وہ بے فکر و مطمئن ہو کر اپنے مشن میں سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے اس موقع پر کہا تھا: ”میں یقین رکھتا ہوں کہ امتحان کا وقت ہے۔ مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خود غرض نہ ہوگا۔ اگر میں جاگیر کے خیال سے ملک و ملت کی خدمت چھوڑ دوں۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ اب میں جاگیر کے بھی معاملات سے فارغ ہو کر پہلے سے بھی زیادہ مستعدی کام کروں۔“

کچھ عرصے بعد حکومت نے انہیں جاگیر و اعزاز اسٹریٹ واپس کرنا چاہے مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور باقی زندگی قائد اعظم اور پاکستان کی آزادی کے لیے ایک اوفیو کا کارکن بن کر گزاری۔

انہیں مطالعے کے شوق کے ساتھ ساتھ مفید باتیں دوسروں کو بھی پہنچانے کا شغف تھا۔ وہ اسے دین کی خدمت سمجھتے تھے۔ انہوں نے درس قرآن اور درس اقبال کی مجال میں باقاعدہ درس دیا۔ وہ عربی، اردو اور فارسی روانی سے بولتے تھے۔

ان کی انگریزی تعلیم صرف میٹرک کے درجے تک ہوئی تھی مگر جب سیاست میں آئے تو گونا گوں مصروفیات کے باعث مدرسے میں جا کر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا ممکن نہ رہا مگر انہوں نے کتابیں پڑھ کر خود انگریزی سیکھنے کا ارادہ کیا اور کچھ عرصے کی سخت محنت کے بعد اس زبان پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ ایک دفعہ مسز وجنی ٹائیڈو کی ایک مختصر اردو تقریر سن کر کہنے لگے تھے۔ ”اگر مسز وجنی ٹائیڈو اردو میں تقریر کر سکتی ہیں تو کیا محمد بہادر خان انگریزی جیسی آسان زبان میں تقریر نہیں کر سکتا۔“

نواب بہادر یار جنگ، قائد اعظم جیسی با محاورہ اور معیاری انگریزی بولتے تھے۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ کراچی اور الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے دوران قائد اعظم نے جو شاندار تقریریں، ان کا کافی البدیہہ اردو ترجمہ اچھے اچھے انگریز دانوں کے لیے مشکل تھا مگر نواب بہادر یار جنگ نے قائد اعظم کے ایک ہی اشارے پر تقریر کے ختم ہوتے ہی با محاورہ اور معیاری ترجمہ سنائے کہ سب حیرت رہ گئے۔

نواب بہادر یار جنگ کو مسلمانوں کے حقوق سے حد درجے محبت تھی۔ سرحد میں مسلم لیگ کو اپنا کام کرنے میں وقت پیش آرہی تھی، کیونکہ وہاں گاندھی اور کانگریس کا زور تھا۔ انہوں نے صرف دو ماہ کے مختصر عرصے میں پشتو زبان پر عبور حاصل کیا اور پھر صوبہ سرحد کے قصبے قصبے میں جا کر ان کی زبان میں مسلم لیگ کا موقف پیش کیا۔ ان کے اس کام سے مسلم لیگ کو سرحد میں کافی استحکام ملا۔

ان کے زور خطابت اور شیریں بیانی کا یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ حیدر آباد دکن کے ایک محلے میں جس کا نام دھول پیٹھ تھا۔ ہندوؤں کی زیادتی کی وجہ سے وہاں مسلم شمس فسادات ہوئے۔ اس میں کئی مسلمان شہید ہوئے جن میں نواب بہادر یار جنگ کے رشتے دار بھی شامل تھے۔ اس موقع پر مشتعل مسلمانوں نے ہتھیار سنبھال لیے۔ اس انتقامی آگ کو ختم کرنا خود حکومت کے بس سے باہر تھا۔ ایسے موقع پر نواب بہادر یار جنگ

سامنے آئے اور غیض و غضب سے بے قابو مجمع میں گھس کر مدلل اور پُر تاثیر تقریر کے ذریعے ان کو گھر واپس جانے کا مشورہ دیا۔ ان کی اس پُر اثر تقریر کا کمال تھا کہ کوئی بڑا ہنگامہ نہ ہوا۔ یہ سارا منظر فساد ہی ہندو اور امن پسند غیر مسلم بھی دیکھ رہے تھے۔ حیدر آباد دکن سے بھی تعلق رکھنے والی شعلہ بیان مقررہ مسز وجنی ٹائیڈو نے بھی یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور حیرت سے کہنے لگیں: ”میں نے امن و سلامتی کی حالت میں اسٹیج کے لیڈر اور مقرر تو بہت دیکھے ہیں مگر انتقام کی آگ سے مشتعل اور جوش سے بھرے ہوئے مجمع کو قابو میں لانے والا مقرر اور لیڈر آج ہی دیکھا ہے۔“

نواب بہادر یار جنگ جب جاکیر کے مالک تھے تو ان کے لطف و کرم کے حقدار مسلمان ہی نہ تھے بلکہ تمام تر رعایا تھی جن میں ہندو بھی شامل تھے۔ ایک بار ایک ہندو نے کسی سے بارہ سو روپے قرض لیے مگر وقت پر ادانہ کر سکا۔ عدالت سے ڈگری آگئی۔ قریب تھا کہ عدالتی اہلکار اس کی عزت نایام کر دیتے وہ ہندو کسی موہوم سی امید پر نواب بہادر یار جنگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔ انہوں نے فوراً بارہ سو روپے کا چیک لکھ کر اسے دے دیا اور کہا۔ ”جدا قرض ادا کرادو اور جب رقم آجائے تو مجھے دے دینا۔“

اس واقعے کا ذکر ہندوستان کے مشہور وکیل سری کشن بیرسٹر نے کیا۔ انہوں نے نواب بہادر یار جنگ کے اس عمل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس طرح انہوں نے ہندوؤں کے دلوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔

ان کی حق گوئی کا ایک اور واقعہ ہے: ”ایک زمین کا جھگڑا ان کے سامنے لایا گیا۔ مندر اور مسجد کے درمیان والی جگہ پر ہندو اور مسلمان دونوں ہی اپنا حق جتاتے تھے۔ نواب بہادر یار جنگ نے جگہ کا معائنہ کیا اور فیصلہ دیا کہ زمین ہندوؤں کی ملکیت ہے، اس لیے انہیں دے دی جائے۔“

مسلمان آپ کے اس فیصلے سے بڑے ناراض ہوئے کہ انہوں نے مسلمان ہو کر فیصلہ ہندوؤں کے حق میں کیوں دے دیا۔ نواب بہادر یار جنگ نے مسلمانوں کے اس عمل کے خلاف اگلے ہی روز اخبار میں یہ بیان شائع کر لیا: ”مسلمانوں کا شیوہ یہی ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر آن اس آیت مبارکہ کو پیش نظر رکھتے: ”اے ایمان والو! اللہ

ڈرائیور نے عام انداز میں پوچھا۔ ”آپ کتنے ہیں؟“

انہیں مذاق سوچھا اور کہا۔ ”ہم دو ہیں۔“

ڈرائیور نے کرایہ فی آدمی کا بتایا تو نواب بہادر یار جنگ بولے۔ ”کرایہ تو میں ایک ہی شخص کا دوں گا مگر چلیں گے ہم دونوں۔“

اس پر ڈرائیور نے انکار کیا کہ میں تو لے کر نہیں جاؤں گا۔

نواب بہادر یار جنگ بھد تھے کہ میں ضرور جاؤں گا اور صرف اپنا ہی کرایہ دوں گا۔ ساتھی کا ایک حصہ بھی نہ دوں گا۔ کچھ دیر یہی انکار و اصرار چلتا رہا اور جب انہوں نے دیکھا کہ ڈرائیور غصے میں آچکا ہے تو ہنس کر فرمانے لگے۔ ”میں اور میرا اللہ، ہم دو ہیں۔ کیا دونوں کا کرایہ لو گے۔ میرے ساتھ اور کون شخص ہے جو تم نے پوچھا کہ کتنے ہو؟“

اس پر ڈرائیور بڑا شرمندہ ہوا اور بڑی عزت سے مقام منزل تک پہنچا دیا۔

نواب بہادر یار جنگ نے 26 دسمبر 1943ء کو کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں منشور پاکستان پیش کرتے ہوئے کہا تھا: ”ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ وہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو۔ یہ ایک انقلاب ہوگا۔ یہ ایک نشاۃ ثانیہ ہوگی۔“

اس موقع پر قائد اعظم محمد علی جناح نے بڑے جوش سے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا: ”تم بالکل درست کہتے ہو۔“

نواب بہادر یار جنگ نے کہا: ”لیجیے قائد اعظم نے میرے اس قول پر مہر تقدیر ثبت کر دی ہے۔“

اپنی تقریر کے آخر میں نواب بہادر یار جنگ نے فرمایا:

”ہماری منزل اگرچہ نمایاں ہو کر نکلا ہو کہ سامنے آچکی ہے اور ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ہم اپنے عظیم قائد کی رہنمائی میں منزل سے ہٹنا نہ ہو کر رہیں گے لیکن راستے کے خطرات سے آگاہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وقت کے تیز و تند طوفانوں میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اجلاء و آذراناش کی کھٹن گھڑیوں میں کتنے ہی سپاہی بچھڑ سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں آئندہ آپ کے درمیان نہ رہوں۔ میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا ہے۔“

تعالیٰ کے لیے پوری پابندی کرنے والے اور انصاف کے ساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے۔“

ہر سال جلسہ عید میلاد النبیؐ میں وہ حیات طیبہ کی جامعیت پر ایمان افروز تقاریر کیا کرتے تھے۔ ایک بار اس جلسے میں دکن کے خسرو نے بھی شرکت فرمائی اور بے مثل خطیب محمد بہادر خان کو ان کی اثر آفریں تقریر اور زور و خطابت پر ”بہادر یار جنگ“ کا خطاب دیا۔ اس کے بعد سے محمد بہادر خان، بہادر یار جنگ کہلانے لگے۔ میلاد کی اکثر تقاریر سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے انہیں لسان الامت کا خطاب بھی دیا تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ملت اسلامیہ کی صحیح ترجمانی پر انہیں قائد ملت کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ بعد میں قائد ملت کا یہ لقب لیاقت علی شہید کے لیے مخصوص ہو گیا۔

روزانہ بعد نماز فجر نواب بہادر یار جنگ مسجد میں ایک گھنٹے قرآن مجید کی تفسیر سنایا کرتے تھے۔ موسم خواہ کیسا ہی ہو، بارش ہو یا سخت سردی، وہ ایک چھوٹی سی چٹائی پر بیٹھ کر اس محفل کا باقاعدہ اہتمام کرتے تھے۔ وہ اکثر اس درس کی محفل کی بابت کہا کرتے تھے: ”مجھے اگر کسی عمل کے صلے میں بخشش کی توقع ہے تو وہ یہی قرآن کی خدمت ہے اگر مسلمانوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔“

جب وہ ریاست حیدرآباد کے جاگیردار تھے تو غریب اور نادار طلباء کے لیے وظائف دیتے تھے اور بعض غریب لوگوں کو اپنے ہاں ہی رکھ لیتے اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال فرماتے۔ وہ تاریخ اسلام کے مضمون میں اول آنے والے اور اچھی تقریر کرنے والوں کو انعامات سے نوازتے تھے۔ جو طلباء علم حاصل کرنے علی گڑھ جاتے تو ان کو قرض حسنہ بھی دیتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ میں حس مزاح بھی خوب تھی۔ ایران میں ایک بار نواب بہادر یار جنگ کو کسی مقام تک جانا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کرائے کی گاڑی لینا پڑی۔ نیکی ڈرائیور نے پوچھا۔ ”کرایہ کیا لو گے؟“

میری آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم مقصد میں کامیابی عطا فرمائے، آمین۔“

کے فضل و کرم سے چھ سال تک تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن پاک ختم کر سکا ہوں۔“

ایک صاحب نے اس موقع پر عرض کیا: ”نواب صاحب یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔“
تو فرماتے گئے: ”آپ کو کیسے گمان ہوا کہ اب میں یہ سلسلہ ختم کر دوں گا۔ قرآن تو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ اب کی دفعہ اس میں اور زیادہ لطف آئے گا۔ انشاء اللہ یہ سلسلہ میری زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہے گا۔“ اور پھر یہی ہوا۔

دوسرے روز سے پھر تفسیر شروع ہوئی اور ان کی زندگی کے آخر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

انہوں نے ایک بار کہا تھا: ”خانہ خدا میں بیٹھے، کتاب اللہ کو ہاتھ میں لیے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریروں کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ اگر مسلمانوں نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ یہی ان کی پناہ گاہ ہے۔ زمانے نے ممکن ہے راستے میں کچھ تبدیلی کر دی ہو لیکن منزل اگر قرآن نہیں ہے تو وہ ذلت و خواری کے جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔“

25 جون 1944ء کی شام اپنے مکان بیت الامت میں درس اقبال کی محفل تھی۔ اسی رات اپنے ایک دیرینہ دوست جسٹس ہاشم علی خان کے ہاں دعوت تھی۔ وہاں مشہور ریاضی دان ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی و دیگر احباب بھی موجود تھے۔ کھانے میں کچھ دیر گئی کہ آپ کے سامنے حقلا کر رکھا گیا۔ ابھی نواب بہادر یار جنگ ایک کش ہی لگا پائے تھے کہ ایک زبردست جھکا لگا اور وہ منہ کے بل گر پڑے۔

لوگ سنبھالنے بھی نہ پائے کہ روح نفس عصری سے پرواز کر گئی۔

ان کے جنازے میں لوگوں کا جم غفیر تھا اور شہر سے چار میل دور شہر آباد کے قبرستان میں ان کو دفن کیا گیا۔ لوگوں کا ہجوم اتنا تھا کہ لوگ جنازے کو کاغذ ہادینے کے لیے کئی کئی کوس انتظار میں چل رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان کے جنازے کا منظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ”جنازے میں زبردست عقیدت و محبت رکھنے والے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دیگر مذاہب کے افراد بھی تھے۔“

نواب بہادر یار جنگ نے اردو زبان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اردو ادب میں کوئی ایسی صنف نہ تھی جس کا بہترین ادب ان کی نظر سے نہ گزرا ہو۔ وہ بہت معیاری زبان بولتے تھے۔ انہیں اردو پر گرفت صرف گفتگو اور تقریر کے دوران ہی نہ تھی بلکہ وہ ایک اچھے ناقد بھی تھے۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے پلیٹ فارم کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند کے جلسوں میں بھی اپنے زورِ خطابت کا لوہا منوایا تھا۔ بابا اردو مولوی عبدالحق کا یہ اعتراف ان کی علمی خدمات کا بین ثبوت ہے: ”راس کماری سے لے کر کشمیر تک نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر سے زبان اردو کو بڑا فروغ نصیب ہوا ہے۔“

علامہ اقبال کے کلام اور ان کی فکر سے نواب بہادر یار جنگ کو خاص شغف تھا۔ وہ کلام اقبال کا ہفتہ وار درس اپنے گھر پر دیا کرتے تھے۔ خود علامہ اقبال بھی انہیں اس کام پر داد تحمیں دیتے تھے۔ ان کے درس میں پروفیسر ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر غلام دھیمیر رشید اور مولانا عبدالقدوس ہاشمی جیسے عالم شامل ہوتے تھے۔

جب پاکستان کی منزل قریب آتی دکھائی دی تو خود نواب بہادر یار جنگ نے اپنی زیر نگرانی اسلامی نظام معیشت کی تدوین کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس میں ماہرین معاشیات، علماء اور دانشوروں کو شامل رکھا۔ وہ خود اس کے سربراہ تھے مگر انفس کہ موت نے انہیں مہلت نہ دی۔

نواب بہادر یار جنگ کو قرآن مجید سے بے حد شغف تھا۔ وہ روزانہ بعد نماز فجر تفسیر قرآن بیان کرتے اور جس روز ایک پارہ ختم ہو جاتا۔ اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے اپنے حقیر بندے سے اتنی تفسیر ستانے کا کام لیا۔ وہ اس خوشی کے موقع پر اپنی طرف سے سامعین میں شیرینی بھی تقسیم کرتے تھے۔ جب چھ سال بعد قرآن مجید ختم ہوا تو اس دن ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بار بار آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاتے۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے ہار پہنائے تو کہنے لگے: ”پہنائیے صاحب! میں آج ضرور پہنوں گا۔ میری زندگی میں انتہائی مسرت کے دو ہی دن ہیں۔ ایک وہ جب طواف بیت اللہ کیا اور ایک آج جب کہ اللہ تعالیٰ

دلچسپ دریافت

دانیہ صدیقی

بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ سائنس دان بنانے کی کچھ اور کوشش کر رہا ہوتا ہے لیکن بن کچھ اور جاتا ہے۔ وہ تلاش کچھ اور کر رہا ہوتا ہے لیکن اسے مل کچھ اور جاتا ہے۔



پیشہ دلچسپ دریافتوں کا ذکر خوش ذوق قارئین کے لیے

ایسے اتفاقات بھی ہو جاتے ہیں کہ کسی معمولی انسان کے ہاتھوں انجانے میں تاریخ کے کسی اہم راز پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے جیسے معمولی انسانوں کی بے پروائی یا کسی نہ کسی حادثے کے نتیجے میں کئی اہم

ماہرین آثار قدیمہ اپنی تمام زندگی دور قدیم کے نوادرات اور پرانے زمانے کے لوگوں کے رہن سہن کے متعلق کھوج لگانے میں بسر کر دیتے ہیں لیکن کبھی کبھار

برفیلے پہاڑی سلسلے اونٹل میں ایڈ ونچر کی غرض سے دوکوه...
 بیاباؤں نے تنگ گھاٹیوں سے گزر کر پہاڑوں پر چڑھنے کا فیصلہ
 کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اندرونی راستوں پر سفر
 کرنا شروع کر دیا۔ وہ برف میں راستہ بناتے آگے بڑھ
 رہے تھے جب انجانے میں ان کے پیروں سے برف میں
 منہ کے بل پڑی ہوئی لاش ٹکرائی۔ ظاہر ہے کہ لاش دیکھ کر وہ
 دونوں گھبرا گئے۔ انہوں نے لاش کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ
 سردی کی وجہ سے اس کی کھال کسی چیز کے کی طرح سخت ہو کر
 اس کی ہڈیوں پر منڈھی ہوئی تھی اور گوشت پر عجیب طرح
 سے سلوٹیں پڑی تھیں۔

انہوں نے جلدی جلدی اس کی چند تصویریں اتاریں
 اور پولیس کو اطلاع کرنے کے لیے سر پر پیر رکھ کر بھاگ
 کھڑے ہوئے۔ انہیں لگا تھا کہ شاید کسی نے اس آدمی کو قتل
 کر کے یہاں پھینک دیا۔ پولیس آئی مگر لاش کی حالت دیکھ
 کر چونک گئی کیونکہ یہ کہیں سے بھی قتل کی تازہ واردات نہیں
 لگ رہی تھی اور لاش پوری طرح سے برف میں پھنسی ہوئی
 تھی۔ ماہرین کو اس مقام پر طلب کیا گیا اور چار دنوں کی
 سر توڑ کوششوں کے بعد یہ لاش پوری احتیاط کے ساتھ برف
 سے نکال لی گئی۔

جب اس لاش پر تحقیق ہوئی تو ایک حیرت انگیز
 دریافت سامنے آئی کہ برف میں قدرتی طور پر محفوظ رہ
 جانے والی اس مومی کا تعلق 3300 قبل مسیح سے ہے اور یہ
 شخص کوئی شکاری تھا، یعنی غاروں میں رہنے والا انتہائی
 قدیم باشندہ! اس کا شمار قدرتی طور پر محفوظ رہ جانے والی دنیا
 کی قدیم ترین مومیوں میں ہوتا ہے اور اس کے ذریعے
 ماہرین کو دور قدیم کے انسانوں کے رہن سہن اور طرز...
 معاشرت کے بارے میں جاننے میں کافی مدد ملی۔

مصری شہزادی

دور تھی ایڈی جب تین برس کی تھی تو وہ بیڑھیوں
 سے گرنے کے نتیجے میں موت سے بال بال بچی تھی۔ اس
 حادثے میں اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ اس
 واقعے کے بعد سے اسے عجیب و غریب خواب آنے لگے
 جس میں وہ خود کو لیے لیے ستونوں والی وسیع و عریض
 عمارت میں کھڑا دیکھتی۔ خوابوں کا یہ سلسلہ جاری رہا
 یہاں تک کہ ایک دن وہ اپنے والدین کے ہمراہ ایک
 مصری میوزیم میں گئی اور وہاں جا کر چلا اٹھی۔ ”ہاں، یہی
 میرا گھر ہے!“

دریافتیں ہوئی ہیں۔ یہ دریافتیں اتنی اہمیت کی حامل ہیں
 کہ انہوں نے تاریخ کے بارے میں ہمارا نظریہ یکسر بدل
 ڈالا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ماہرین آثار قدیمہ اس قسم کی
 دریافتوں کے لیے خون پینا ایک کرتے ہوئے ساری عمر در
 در کی خاک چھانٹتے ہیں لیکن لاطینی میں کسی معمولی انسان
 کے ذریعے کوئی اہم دریافت دنیا کے سامنے آجانی
 ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر ایسی ہی چند عجیب
 و غریب دریافتیں پیش خدمت ہیں۔
 رو سینا کا پتھر

1799ء میں نپولین کی فوجوں کا گزر جب سرزمین
 مصر سے ہو رہا تھا تو ایک سپاہی کے ہاتھوں انجانے میں
 تاریخ کی اہم ترین دریافت ہوئی۔ ہوا کچھ یوں کہ نپولین
 افواج نے رو سینا کے مقام پر ڈیرا ڈالا۔۔۔ اور وہاں پر قلعہ
 تعمیر کرنے کی ٹھانی۔ اس سلسلے میں فوجی جوان زمین کھود کر
 بڑے بڑے پتھر جمع کرنے لگے اور چٹانوں کو توڑا جانے
 لگا۔ ایک سپاہی نے زمین کھود کر پتھر کی سل حاصل کی اور
 اسے قلعے میں لگانے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کے
 کمانڈر کی نظر اس سل پر پڑ گئی جس پر مختلف زبانوں میں کچھ
 الفاظ کندہ تھے۔

کمانڈر نے وہ پتھر سپاہی سے لے لیا اور غور سے
 اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے نپولین کے قائم کردہ تحقیقی
 سینٹر بھجوا دیا جہاں اس عجیب و غریب پتھر پر تحقیق ہوئی اور
 یہ بات سامنے آئی کہ اس پتھر پر لاطینی اور قدیم مصری
 زبان میں تحریریں درج تھیں جو دراصل تصویروں کی
 صورت لکھی جاتی تھیں، انہیں انگریزی میں
 hieroglyphic کہا جاتا ہے جبکہ اردو زبان میں
 انہیں ’مورنی لکھاوت یا تصویری تحریر‘ کا نام دیا گیا ہے۔
 یہ ایک بے حد اہم دریافت تھی جو انجانے میں ایک سپاہی
 کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

لاطینی سائنسدانوں نے اس پتھر پر برسوں عرق
 ریزی کے بعد بالآخر قدیم مصری لکھاوت پڑھنے کا راز جان
 لیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس کے بعد ماہرین اس...
 قافلے ہو گئے کہ مصری آثار قدیمہ سے برآمد ہونے والی قدیم
 زبان کو پڑھا اور سمجھ لیں۔

اونٹل کا قدیم باشندہ

یہ سن 1990ء کی بات ہے۔ آسٹریا کے مشہور

ماہنامہ سرگزشت

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



ماہ آزادی کی

گہما گہمی کا

جگمگاتا شمارہ

اولین صفحات

وقت کے ساتھ زندگی میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ حالات و ماحول میں بس جانے والی وحشتوں کا احوال۔ **کبیر عباسی** کی آزادی کے حوالے سے یادگار تحریر

انکارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمنین کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نفس میں آگے بڑھتا **طاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے سرسبز پیکار نو جوان کی سرگزشت..... **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے وار کہانی

سُرورق کے رنگ

اسماء قادری اور امجد جاوید

کی سرورق پر پُر تجسس کہانیاں

ان کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، سلیمان نور، امرشد بیگ، جمال دستی، تمکین مرزا اور عکس فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

جینی تکتہ جینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلیپ باتیں... کھائیں

جوان ہونے پر ڈور توٹی نے مصر میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ وہ خود کو 'اوم سیٹی' کہلاتی اور یہ دعویٰ کرتی کہ وہ مصری فرعون سیٹی اول کی محبوبہ ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اوم سیٹی کا دوسرا جنم ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اس کی باتوں پر کان نہیں دھرتے تھے لیکن ایک واقعے نے سب کو حیران کر دیا۔ ڈور توٹی نے دعویٰ کیا کہ وہ سیٹی اول کے قدیم باغات کا مقام جانتی ہے۔ ماہرین کا کافی عرصے سے ان باغات کی جستجو میں تھے۔ جب ڈور توٹی نے یہ بات کی تو انہوں نے پہلے تو اس کی بات نظر انداز کر دی.... مگر جب اس کا اصرار بڑھا تو اس کے بتائے ہوئے مقام پر کھدائی کی گئی جہاں سے واقعی سیٹی اول کے قدیم باغات کا سراغ مل گیا۔

ڈور توٹی با آسانی پتھر کی سلوں پر قدیم مصری زبانوں میں لکھی گئی تحریروں کا ترجمہ بھی کر دیا کرتی تھی۔ مرتے دم تک اس کا یہی دعویٰ رہا کہ اسے اپنی پچھلی زندگی کی تمام باتیں یاد ہیں اور وہ ابھی تک اسی زندگی میں سانس لے رہی ہے۔

قدیم مہر

یہ سن 1784ء کا واقعہ ہے جب ایک جاپانی کسان اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ پیری لگانے کے لیے زمین کھودتے ہوئے اس کی نظر کسی چمکدار چیز پر پڑی۔ اس نے وہ نکال لی اور اسے دھو کر دیکھا تو وہ سونے کی ایک مہر تھی۔ وہ کسان اسے گاؤں کے ایک پڑھے لکھے شخص کے پاس لے گیا۔ اس نے غور سے اس مہر کو دیکھا پھر اسے حکومت کے کارندے کے حوالے کر دیا۔ اس مہر پر تحقیق ہوئی اور یہ بات سامنے آئی کہ یہ مہر 57 عیسوی میں چین کے شہنشاہ گوانگ کی جانب سے اپنے جاپانی ہم منصب کو پیش کی گئی تھی۔ سفارتی سطح پر چین اور جاپان کے درمیان ہونے والی یہ پہلی ملاقات تھی۔

اس مہر پر موجود کھاد کے ذریعے جاپانی پہلی بار چینی رسم الخط سے واقف ہوئے تھے۔ بعد میں اسی رسم الخط کی مدد سے جاپان میں 'کانچی رسم الخط' متعارف کروایا گیا جسے جاپان میں آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اٹلی کا قدیم شہر

انٹرنیٹ استعمال کرنے والے قارئین یقیناً جانتے ہوں گے کہ 'موگل ارتھ' پر آپ کس طرح گھر بیٹھے سیٹلائٹ کی مدد سے دنیا بھر کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ایک روز اٹلی کا

باشندہ اپنی بوریّت دور کرنے کے لیے گوگل کے نعتوں میں اپنے شہر کو دیکھ رہا تھا جب اسے ایک مقام پر بیضوی شکل کا میدان سامنا نظر آیا جس کی لمبائی پانچ سو میٹر کے قریب تھی۔ اس کے آس پاس ہی کچھ عجیب سے سائے بھی نظر آرہے تھے۔

اس شخص نے غور سے ان ساپوں کا جائزہ لیا تو اسے یوں لگا جیسے یہ زمین میں دھنسی ہوئی عمارتوں کے سائے ہوں۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ماہرین آوار قدیمہ کو اس کے بارے میں بتایا اور انہیں اس جگہ کو کھوجنے کی اپیل کی۔ چنانچہ اس شخص کے بتائے ہوئے نقشے پر عمل کرتے ہوئے ماہرین نے اس مقام پر کھدائی شروع کر دی اور کچھ ہی عرصہ بعد وہاں سے قدیم روشن عہد کی ایک پُر شکوہ اور طویل دُعاریض حویلی کے آثار برآمد ہو گئے۔

اس طرح انٹرنیٹ پر پیشہ کرخص وقت گزاری کرتے ہوئے ایک شخص کی بدولت تاریخ کا ایک اہم باب دنیا کے سامنے آ گیا۔

گوتم بدھ کی طلائی مورتی

تقریباً سات سو سالوں تک تھائی لینڈ کے ایک قدیم بدھ مندر میں گوتم بدھ کی چونے سے بنی ہوئی ایک بھاری بھر کم کر معمولی سی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اس مورتی میں کوئی خاص بات نہ تھی اس لیے لوگ بھی اسے زیادہ دلچسپی سے نہیں دیکھتے تھے۔ 1935ء میں مندر کے منتظمین نے سوچا کہ یہ خواستہ وہاں بڑی بڑی جگہ گھیر رہی ہے تو کیوں نہ اسے اٹھا کر گودام منتقل کر دیا جائے۔ اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چند صحت مند کارندوں پر مشتمل ایک ٹیم کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ اس باری بھر کم مورتی کو اٹھا کر گودام میں لے جائے۔

ان لوگوں نے مورتی اٹھائی اور گودام میں رکھنے کے لیے بڑے لیکن نجانبے کیسے ان میں سے ایک کا پاؤں رہنا اور وہ مورتی ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ فرش سے ٹکرانے پر اس کا چونا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھڑ گیا تو لوگوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا کہ ان کے سامنے گوتم بدھ کی ساڑھے پانچ ٹن خالص سونے سے بنی ایک شاندار مورتی بڑی تھی۔ سونے کی یہ مورتی دراصل چونے کے پلستر میں چھپی ہوئی تھی جو ہزاروں سال پہلے کاریگروں نے لاپچی لوگوں سے بچانے کے لیے اس پر پھیر دیا تھا۔

یوں ایک شخص کی نااہلی کی بدولت دنیا کے سامنے

تاریخ کا ایک شاہکار آ گیا۔ آپ کی معلومات کے لیے بتاتے چلیں کہ اس مورتی کو دنیا کی سب سے بڑی طلائی مورتی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔
تو تان خاسن کا مقبرہ

اگر ہم آپ کو یہ بتائیں کہ بیسویں صدی کی سب سے اہم تاریخی دریافت دراصل ایک مٹکی لڑکے کی بدولت ہوئی تھی تو آپ ضرور حیرت زدہ رہ جائیں گے اور اس اتفاق کی تفصیلات ضرور جاننا چاہیں گے۔ ہوا کچھ یوں کہ مشہور ماہر آثار قدیمہ ہاورڈ کارٹر بہت عرصے سے تاریخی لحاظ سے مشہور مصری بادشاہ تو تان خاسن کا مقبرہ تلاش کرنے کی جان توڑ کوششیں کر رہا تھا لیکن کسی طرح اس کا سراغ نہیں مل پا رہا تھا۔ مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے نوبت یہاں تک آ چلی تھی کہ اس منصوبے کا فنڈ چند ماہ بعد روک دیا جانے والا تھا۔

کارٹران دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مٹکی لڑکا بھی رہتا تھا جس کی ذمہ داری پانی لانے کی تھی۔ ایک روز وہ لڑکا بوریّت بھگانے کے لیے مصر کی مٹی میں کھیل رہا تھا جب اچانک اس کا پیر کسی پتھریلی چیز سے ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اس نے غور سے دیکھا تو مٹی کے اندر اسے ایک پتھر کی بنی ہوئی سیڑھی نظر آئی۔ وہ لڑکا دوڑتا ہوا کارٹر کے پاس پہنچا اور اسے سیڑھی کی بابت بتایا۔ کارٹر اس کے ہمراہ فوراً اس مقام پر پہنچا اور کھدائی شروع کر دی۔

اس کھدائی میں بائیس دن لگے اور بالآخر کارٹر اور اس کے ساتھی ان سیڑھیوں کے ذریعے کھدائی کرتے ہوئے مقبرے کے دروازے تک پہنچ گئے اور جب وہ مقبرے کے اندر پہنچے تو وہ سونے، چاندی اور جواہرات سے اٹاٹ بھرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اتنی تعداد میں سونے سے بھرا مقبرہ کہیں دریافت نہ ہوا تھا اور اس کی دریافت کا سہرا ایک معمولی مٹکی لڑکے کے سر بندھتا ہے جس نے اپنی بوریّت دور کرنے کی تنگ دود میں ایک اہم دریافت کر ڈالی۔

نیرا کوٹا کی فوج

ہم آپ کو نیرا کوٹا کی فوج کے بارے میں بتاتے ہیں کیونکہ بہت سے قارئین اس دلچسپ و عجیب فوج کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے ہوں گے۔ قد آدم جسموں پر مشتمل یہ شاندار فوج جو آٹھ ہزار سپاہیوں، 130 گھوڑوں اور 520 گھوڑوں پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ چینی شہنشاہ کون شہی کے زمانے میں بنائی گئی تھی۔ تاریخی لحاظ سے آپ اس کی قدامت کا اندازہ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ شہنشاہ کون شہی

بے وقت موت نمبر

ان افراد کی روداد جو ”بے وقت کی موت“ کا شکار ہوئے۔
لیکن اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے قابلِ تقلید کام کیے۔
اس خاص شمارے کے لیے آپ بھی لکھیں

کیونکہ سرگزشت کا خاص نمبر

اہمیت کا حامل ہوتا ہے، لوگ مجلد کرا کر رکھتے ہیں۔
اگر آپ ایسی کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں تو پہلے آگاہ کر دیں
تا کہ کوئی دوسرا اس شخصیت پر لکھ رہا ہو تو اسے روک دیا جائے۔

دیوار چین کا بانی ہے، یعنی یہ فوج 210 قبل مسیح کے آس پاس تیار کی گئی تھی۔ اس کا مقصد شہنشاہ کے مرنے کے بعد اگلی دنیا میں بھی اسے اس کی شاہان شان فوج فراہم کرنا تھی۔ اسی لیے کونن شی کے انتقال پر جنموں کا یہ لشکر اس کی لاش سمیت ہی دفن دیا گیا تھا۔

تک نیچے گھوم کر کسی قدیم شہر کی باقیات سے جا ملتا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس نے مقامی انتظامیہ کو اس کی اطلاع کر دی جنھوں نے آ کر اس جگہ کو سیل کر کے اپنی نگرانی میں کھدائی شروع کر دوائی۔ آخر کار یہاں سے ڈیرنگ نامی ایک قدیم شہر برآمد ہوا جو بارہ یا پندرہ صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس زیر زمین شہر کو ناٹولہ کے 'حتی' نامی قدیم باشندے فوجوں کی یلغار سے بچنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے اور ایک وقت میں یہاں بیس ہزار افراد پناہ لے سکتے تھے۔

آج سیاح اس شہر کی سیر کر سکتے ہیں اور یہاں گھوم پھر کر اس کے معماروں کی مثنائی اور ذہانت کی داد دے سکتے ہیں۔ مزید بات یہ

ہے کہ یہ پورے کا پورا تاریخی شہر اس ترکی شہری کی دیوار کی دوسری جانب آباد تھا اور اسے اندازہ تک نہ ہوا۔ بحیرہ مردار کے قدیم نئے

سن 1947ء میں چند بدو چرواہے اپنی بکری ڈھونڈ رہے تھے جب ان کا گزر ایک متروک غار سے ہوا۔ اس غار میں ان کی نظر اجنبی زبان میں لکھے ہوئے نسخوں پر پڑی جو مرتانوں کے اندر بند تھے۔ انہیں بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ بے خبری میں انہوں نے عہد نامہ قدیم کے نئے دریافت کر لیے تھے جو ایک انتہائی اہم تاریخی دریافت تھی۔

انہوں نے یہ مرتان اٹھائے اور شہر آ کر ایک تاجر کے ہاتھوں ساٹھ ڈالر میں فروخت کر دیئے۔ رفتہ رفتہ چڑے پر لکھے گئے یہ نئے دنیا بھر میں پھیل گئے اور لوگوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ کچھ نئے امریکا میں بھی فروخت ہوئے، جن کی قیمت ڈھائی لاکھ ڈالر تک لگا گئی۔ ان بدو چرواہوں کو جب اندازہ ہوا کہ عہد نامہ قدیم پر مشتمل یہ نئے اس قدر اہمیت کے حامل ہیں تو انہوں نے اپنا پیشہ تبدیل کر دیا اور ماہرین کے ہمراہ اس علاقے میں گھوم پھر کر ان جیسے مزید نسخوں کی دریافت میں ان کی مدد کرنے لگے۔ ان بدوؤں کی مدد سے ماہرین نے اب تک 981 قدیم نئے برآمد کر لیے ہیں۔

آج یہ چرواہے اور ان کی اولادیں اپنے اس نئے پیشے کی بدولت تیس لاکھ ڈالر سالانہ کماتے ہیں۔ اس طرح انجانے میں ہونے والی ایک دریافت نے انہیں زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

اس کی تاریخ کی طرح اس کی دریافت کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ 1974ء میں ایک چینی کسان اپنے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے کنواں کھود رہا تھا جب اس کی کدال ایک گول منہ کے مرتبان جیسی چیز سے ٹکرائی۔ اس نے مرتبان کو باہر نکالنے کے لیے کھدائی جاری رکھی اور تھوڑی دیر بعد ہی اسے ایک جسمے کی جھلک نظر آئی۔ اس نے کسی طرح کوشش کر کے وہ قدیم جسمہ باہر نکال لیا اور اسے میوزیم میں دکھانے چل پڑا۔ میوزیم کی انتظامیہ نے جو نمبی یہ جسمہ دیکھا تو وہ فوراً بات کی تک پہنچ گئی کہ... حادثاتی طور پر ایک معمولی کسان کے ہاتھوں کس قدر قیمتی تاریخی ورثہ دریافت ہوا ہے۔

اس کے بعد وہاں بڑے پیمانے پر کھدائی کا کام شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ماہرین نے وہاں سے ٹھیکہ دار کی پوری فوج برآمد کر لی۔ اس غریب کسان کو صلے میں پانچ ہزارین سے نوازا گیا اور حکومت کی طرف سے اسے میوزیم میں اعزاز کی نوکری بھی دے دی گئی۔ ٹھیکہ دار کی یہ عظیم الشان فوج آج میوزیم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ آٹھ ہزار سپاہیوں کے یہ جسمے قد کاٹھ اور شکل و صورت میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں اور ان کی تیاری میں معمولی باریکیوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے اس لیے دیکھنے میں یہ کسی جیتے جاگتے سپاہیوں کے لشکر سے مختلف نہیں لگتے۔ یہ یقیناً اس زمانے کے جسمہ سازوں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ترکی کا زیر زمین شہر

1963ء میں ترکی کے ایک شہری نے اپنے چھوٹے سے گھر کی مرمت کرنے کی ٹھانی۔ اس مقدمے کے لیے اس نے اپنے گھر کی ایک کمزور پڑتی دیوار گرا دی تاکہ وہاں پر دوسری دیوار تعمیر کر سکے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیوار کی دوسری جانب ایک غار نما کمرہ دیکھا۔ اس شخص نے گھبراہٹ کے باوجود کھدائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور کچھ عرصہ لگا تا کہ کھدائی کے بعد رفتہ رفتہ اس نے اپنے سامنے سرنگوں کا ایک جال سا بنا دیکھا جو 280 میٹر

فلم نمری

گولڈن اسٹار

انور فرہاں

انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ قسمت کے آگے وہ بے بس ہے۔ یہی کچھ اس کے ساتھ ہوا۔ وہ گلوکار بننے چلا تھا لیکن قسمت نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ پھر جب قسمت نے انگلی تھامی تو وہ خود بھی حیران رہ گیا کہ اس میں یہ خوبی بھی تھی۔

پاکستان کے سیرا سٹار کا زندگی نامہ

خدا کے دین کا موئی سے پوچھے احوال
کہ آگ لےنے کو جائیں پیہری مل جائے
اب آپ کو یا کسی دوسرے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام
کہاں ملیں گے کہ اس شعر کی صداقت کے بارے میں ان
سے خدائے ذوالجلال کی فیاضی کی تصدیق کریں گے۔ ہاں
اس کی تصدیق مرزا نذیر بیگ سے بھی کی جاسکتی ہے کہ دل
کھول کر دینے والی ذات بابرکات کی فیاضی میں آج بھی کمی
نہیں آئی ہے۔



”مجھے تو گمانے کا شوق تھا اور میں اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے کراچی سے ڈھاکے گیا تھا۔ رب رحیم و کریم سے یہ دعا کرتے ہوئے گیا تھا کہ مولا! کراچی میں میری یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ ڈھاکے میں پوری کر دے۔ وہاں کی فلموں میں گانے کا چانس دلا دے۔ قربان جاؤں اس مولا کی فیاضی پر کہ اس نے میرے ماتحتے سے نہیں بڑھ کر مجھے دیا۔ گلوکار کی بجائے ہیرو بنادیا۔ پھر ہٹ ہیرو۔“

جی ہاں یہ نذیر بیگ کا اعتراف ہے جو وہ بطور اداکار ندیم اپنے ہائر ویو میں کرتے ہیں۔ ندیم ہماری فلم انڈسٹری کے ماشاء اللہ سپر ڈیر ورسٹائل فنکار ہیں۔ اپنی اداکارانہ کیریئر کے پچاس سال گزارنے کے باوجود آج بھی ہماری فلمی صنعت کا اثاثہ ہیں۔ کروڑوں رستاروں کے محبوب فنکار ہیں۔ فلم اور ٹیلی ویژن انڈسٹری کی گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

یوں تو ان کے بارے میں عوام کی بہت بڑی اکثریت بہت کچھ جانتی ہے۔ پھر بھی بہت سی باتیں نہیں جانتی۔ اس لیے آج کی نشست میں ہم آپ کو ایسی باتیں بھی ان کے بارے میں بتائیں گے جن سے عام لوگ آگاہ نہیں۔

ندیم صاحب کا پیدائشی نام نذیر بیگ ہے۔ ان کی پیدائش ہندوستان میں مدراس کے علاقے وجے واڑا میں ہوئی تھی۔ ان کے والد مرزا محمود بیگ ہندوستان میں کھل ٹکس شپنگ و پیارمنٹ میں ملازم تھے۔ ہندوستان سے وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تو کھل ٹکس کی شاخ سے وابستہ ہو گئے۔ ملازمت کے دوران ان کا تبادلہ سابق مشرقی پاکستان کے شہر کھلنا ہو گیا اور وہیں سے ریٹائر ہو کر کراچی آ گئے۔

مرزا نذیر بیگ کی تعلیم کی ابتداء وجے واڑا ہی میں ہوئی تھی۔ ان کے والد اپنے خاندان میں سب سے پہلے پاکستان آئے تھے۔ پچاس کی دہائی کے اواخر میں انہوں نے اپنی فیملی کو بھی کراچی بلا لیا۔ نئے ملک کے نئے شہر میں آنے کے بعد مرزا نذیر بیگ کو بھی نئے سرے سے تعلیمی سلسلہ شروع کرنا پڑا۔ ان کو کراچی کے ناظم آباد نمبر چار کے گورنمنٹ اسکول میں داخل کروایا گیا جب کہ انہوں نے سندھ مدرسۃ الاسلام سے میٹرک پاس کیا۔

مرزا نذیر بیگ کو ابتداء ہی سے گانے کا شوق تھا۔ کہیں آتے جاتے کوئی اچھی آواز کا گانا سنتے تو رک جاتے

اور ان پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور دل ہی دل میں وہ سوچتے۔ ”کاش کہ میں بھی ایسی ہی سریلی آواز میں گانے والا بن جاؤں۔“

یہ اور ایسے ہی خیالات میں وہ اکثر کھوئے رہتے۔ ”خدایا! وہ دن کب آئے گا جب میں ایک گانے والا بن جاؤں گا؟ میرے گانے ہوئے گیت لوگ شوق سے سنیں گے۔“

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں رکھتی ہے پرواز مگر رکھتی ہے نذیر بیگ کے دل سے نکلی ہوئی یہ دعا بھی ایک دن قبول ہو گئی۔ نوجوان گانے کے رسیا کو ایک دن خبر ملی کہ بھارت سے آئے ہوئے ایک بڑے موسیقار نثار بڑی کراچی میں تشریف فرما ہیں اور ”یہ کراچی ہے“ نامی بننے والی فلم کی موسیقی دے رہے ہیں۔

نذیر بیگ نے قسمت آزمانے کا عزم کیا۔ نثار بڑی صاحب سے ملنے میں دیر نہیں لگائی۔ ”بڑی صاحب! مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ مجھے بھی اپنی فلم میں گانے کا موقع دیجیے۔“

نثار بڑی صاحب نے اس خوبرو نوجوان کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ ”میاں صاحبزادے! پہلے بھی کسی فلم کے لیے گایا ہے؟“

”جی نہیں۔“

”تمہارا استاد کون ہے؟ کس سے گانا سیکھا ہے؟“

”کوئی استاد نہیں ہے۔ کسی سے گانا نہیں سیکھا۔ گانے کا شوق تھا۔ بس خود ہی گاتا رہا۔“

نثار بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ ”یہ لڑکا تو محض شوقیہ گاتا ہے۔ گانے کی تعلیم یعنی سر تال سے بالکل بے بہرہ ہے۔ فلم میں کیسے گائے گا؟“

”سربجی۔“ نذیر بیگ نے نثار بڑی کو سوچنا ہوا دیکھ کر کہا۔ ”آپ میری آواز سن لیجیے۔ دیکھ لیجیے کیسی ہے؟“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم کچھ گا کر سناؤ۔ آواز سے کچھ اندازہ تو ہو۔“

”نذیر بیگ جو اکثر بڑے گلوکاروں کے گیت گنگناٹا کرتے تھے اور دوستوں کی فرمائش پر گایا کرتے تھے۔ انہی گیتوں میں سے ایک گیت کا کرنا یا۔ نثار بڑی غور سے سنتے رہے اور دل ہی دل میں کہتے رہے۔ آواز تو بری نہیں ہے۔ تراش خراش کے بعد اور اچھی ہو جائے گی۔“

زندگی نامہ

خاندانی نام: مرزا نذیر بیک

فلمی نام: عدمی

پیدائش: وجہ واڑا (ہندوستان میں مدراس کا ایک علاقہ)

والد کا نام: مرزا محمود بیک

تعلیم: ابتدائی تعلیم وجہ واڑا میں ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد کراچی کے ناظم آباد نمبر 4 کے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ پھر سندھ مدرسۃ الاسلام سے میٹرک پاس کیا اور اسلامیہ کالج کراچی سے گریجویشن کیا۔

پہلی فلم: پچوری

پہلی فلم میں ملنے والا معاوضہ: ڈیڑھ ہزار روپے۔
پہلی فلم میں ملنے والا ایوارڈ: بہترین اداکار کا نگار ایوارڈ۔

فلموں کی تعداد: پچاس سالہ فلمی کیریئر میں کوئی 219 فلموں میں اپنی فنّی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

اعزازات: فلم آئینہ میں کراؤن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ 9 فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کیا۔ 8 فلموں نے پلاٹینم جوبلی کا تمغہ حاصل کیا۔ 29 فلموں نے گولڈن جوبلی کے اعزازات حاصل کیے۔ جب کہ 71 فلموں نے سلور جوبلی کے اعزازات حاصل کیے۔

ایوارڈز: 130 کے قریب ایوارڈز مل چکے ہیں۔ ان ایوارڈز میں نگار ایوارڈ، گرینجیوٹ، کرفیک، ون، مصور، بولان، ایشین، آل فنکار، سندھ عوامی ایوارڈز، نیشنل فلم ایوارڈ، نیشنل فلم ایوارڈ، کا را فلم ایوارڈ، الیاس رشیدی گولڈ میڈل۔ وحید مراد میموریل ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔ 1990ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے فنّی خدمات کے اعتراف پر پرائیڈ آف پرفارمنس۔

ذاتی فلمیں: اردو فلمی کے پتے، پنجابی فلم کھڑا۔ شادی: کیپٹن احتشام کی بیٹی فرزانہ کے ساتھ ہوئی۔ یہ شادی بڑے رازدارانہ انداز میں اور خفیہ طور پر ہوئی۔ رخصتی کئی سال بعد ہوئی۔ جو دکھاوے کی شادی کے طور پر دھوم دھام سے رچائی گئی۔

اولاد: دو بیٹے، مرزا فرحان بیک، مرزا فیصل بیک۔

مرزا نذیر بیک کا کر خاموش ہوئے اور سوالیہ نگاہوں سے موسیقار کی طرف دیکھا۔ غار بڑی پوئے۔ ”ٹھیک ہے میاں! ہم تمہیں گانے کا ایک موقع دیں گے۔“

نذیر بیک کو یوں لگا۔ جیسے انہیں دنیا جہان کی دولت مل گئی ہے۔ ”شکریہ سر! بہت بہت شکریہ۔ انشاء اللہ! میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

اس طرح انہیں کراچی کی فلم ”یہ کراچی ہے“ میں پہلی بار غار بڑی صاحب نے چانس دیا۔ نذیر بیک کی طرح فیصل خان نامی ایک شوقیہ فنکار کو بھی چانس دیا۔

غار بڑی صاحب کو ایک اور فلم ”سہرا“ میں بھی موسیقی ترتیب دینے کا موقع ملا۔ وہ بھارت کے منجھے ہوئے اور تجربہ کار کمپوزر تھے۔ ”یہ کراچی ہے“ کے گانوں کی ریکارڈنگ سے ان کے کام کی مزید تصدیق ہو گئی تھی۔ اس لیے کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیو کے مالک سعید اے ہارون نے جب اپنی فلم ”سہرا“ شروع کی تو غار بڑی ہی کو بطور موسیقار سنا لیا۔

غار بڑی صاحب کو دوسری فلم ملی تو اس کا فائدہ مرزا نذیر بیک کو بھی ہوا۔ کیونکہ انہوں نے ”یہ کراچی ہے“ میں گانے کر بڑی صاحب کا اعتماد حاصل کر لیا تھا لہذا ”سہرا“ میں بھی انہیں گانے کا موقع دیا گیا۔

نذیر بیک بہت خوش تھے کہ انہیں دو فلموں میں گانے کا موقع مل گیا ہے۔ ان فلموں کی ریلیز کے بعد انہیں عوامی مقبولیت حاصل ہو گئی اور وہ پاکستانی فلموں کے نامور گلوکار بن جائیں گے۔ دوسرے موسیقار بھی انہیں اپنی فلموں کے لیے گوائیں گے۔

مگر ان کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ بندہ سوچتا ہے اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ ان کی دونوں فلمیں ”یہ کراچی ہے“ اور ”سہرا“ مکمل ہی نہیں ہو سکیں۔ نذیر بیک کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ ایک نہیں۔ دو فلمیں ملیں مگر دونوں نے ہی مایوس کیا۔ دونوں مختلف وجوہ پر پھیل کے مراحل سے گزر نہ سکیں۔

وہ دل ہی دل میں اللہ سے شکوے شکایت کرتے۔ پتا نہیں تیری کیا مصلحت ہے مولا! دو فلموں میں گانے کا موقع ملا۔ میں نے بھینا اچھا گایا ہو گا جی غار بڑی صاحب نے اپنی دوسری فلم میں بھی گانے کا چانس دیا مگر دونوں فلمیں شوٹنگ کے مرحلے ہی میں دم توڑ گئیں۔

ان دنوں نذیر بیک بہت دل برداشتہ تھے مگر اپنے

شوق کے آگے مجبور بھی تھے اور اس شوق کی تکمیل کے لیے جدوجہد بھی کرتے رہے۔

اسی فرسٹ ہڈ دور میں ان کی ملاقات مشرقی پاکستان کی نامور گلوکارہ فردوسی بیگم سے ہوئی۔ فردوسی بیگم کراچی اور لاہور کی فلموں کے لیے بھی بلائی جاتی تھیں یا کوئی موسیقی کی تقریب ہوتی تو اس میں شرکت کے لیے بھی انہیں بلایا جاتا تھا۔ فردوسی بیگم متحدہ بنگال کے معروف فوک گلوکار عباس الدین احمد کی صاحبزادی ہیں۔ عباس الدین احمد نے نامور بنگالی شاعر نذرا الاسلام کے گیت گا کر بے پناہ شہرت حاصل کی تھی۔ ان کے بیٹے اور بیٹی نے بھی گلوکاری شروع کی تو انہیں بھی شہرت ملی۔ ڈھاکے کی فلموں میں گارفردوسی بیگم نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ نذیر بیگ فردوسی بیگم سے ملے اور بتایا کہ انہیں بھی گانے کا بہت شوق ہے۔ دو فلموں میں ٹائر بڑی صاحب نے گانے کا چانس بھی دیا مگر اسے بسا آرزو کہ خاک شد۔ دونوں فلمیں مکمل ہی نہ ہو سکیں۔

”اس کے بعد کسی اور فلم میں گانے کا موقع نہیں ملا؟“ فردوسی بیگم نے پوچھا۔

”نہیں یہاں فلمیں ہی کبھی بکھار بنتی ہیں اور جو بنتی ہیں وہ بھی.....“

”آپ ڈھاکے آئیں۔“ فردوسی بیگم نے کہا۔

”وہاں کی فلم انڈسٹری بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ میں آپ کی ہیلپ کروں گی۔ اللہ نے چاہا تو آپ کامیاب ہوں گے۔“

کہا جاتا ہے کہ فردوسی بیگم، اس بلوری آنکھ والے خوب روٹو جوان سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ اس لڑکے سے مل کر ان کے دل میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ اس لیے بھی وہ اس کی مدد کرنا چاہتی تھیں اور انہوں نے ڈھاکے آنے کی دعوت دے دی تھی۔

نذیر بیگ کراچی کی فلم انڈسٹری سے اپنے لیے کسی بہتری کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے فردوسی بیگم کی بات پر سوچنے لگے۔ اس بات سے تو انکار نہیں کہ ان دنوں ڈھاکے میں خوب فلمیں بن رہی ہیں۔ وہاں اگرچہ گانے والوں کی کمی نہیں لیکن فردوسی بیگم کا اگر سپورٹ حاصل ہوگا تو ایک دو فلموں میں باآسانی جاس مل جائے گا۔

اور پھر ایک دن وہ کراچی سے بذراچہ پی آئی اے ڈھاکے پہنچ گئے۔ آدی جہاں بھی جائے روٹی اور روزی کا

لاحقہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ نذیر بیگ نے ڈھاکا پہنچ کر گانوں کے سلسلے میں جدوجہد شروع کی۔ ریڈیو اور ٹی وی میں گانے شروع کیے۔ دوسری طرف کسی مستقل آمدنی کے بارے میں بھی کوشش کی۔ کیونکہ ریڈیو یا ٹی وی میں تو کبھی بھی گانے کا موقع ملتا تھا اور اس کے عوض جو چیک ملتا تھا۔ وہ بھی اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ مہینہ بھر ساتھ بچائے۔ اسی دوران ایک دوست نے کہا کہ ہدایت کار ظہیر ریحان ایک انڈورٹائزنگ کمپنی کے چیف ہیں۔ تم ان سے ملو۔ شاید وہاں تمہیں کوئی مناسب کام مل جائے۔ نذیر بیگ پہلی ہی فرصت میں ان سے ملا اور اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ ظہیر ریحان نے ملازمت دے دی۔

یہ بات قرین قیاس ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی پر گانے کا چانس دلوانے میں فردوسی بیگم کی کوشش رہی ہو۔ دوسری طرف تقریبات میں لے جانے اور گانے کا چانس دلوانے میں بھی فردوسی بیگم اپنا کردار ادا کرتی رہیں۔ اس سلسلے میں ایک خاص تقریب قابل ذکر ہے۔ ہدایت کار احتشام کی رٹکن اور سنیا اسکوپ فلم ”مالا“ کی سلور جوبلی کی تقریب جب گلستان سنیمیا میں انعقاد پذیر ہوئی تو اس میں بھی نذیر بیگ کو پرفارمنس کا موقع ملا۔ جب کہ اس تقریب کے آرگنائزرز میں فردوسی بیگم بھی شامل تھیں۔

تقریب اس لیے بھی نذیر بیگ کی زندگی میں اہمیت کا درجہ رکھتی ہے کہ اس میں احتشام کی لاڈلی بیٹی فرزانہ نے اس بلوری آنکھ والے کو دیکھا تو اسے اپنا دل سنہالنا مشکل ہو گیا۔ وہ جو کہتے ہیں عشق اول درد مل معشوق پیدا شود۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ اس شوخ و خشک لڑکی کے دل میں وہ ایسا بسا کہ اسے اپنی زندگی سے نکالنا آسان نہ رہا۔ دوسری طرف بے چارے نذیر بیگ کو ایسی کسی بات کا کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کون اس کے گانے سے متاثر ہوا اور کون اس سے۔

یہ تقریب بھی بڑی عجیب تھی۔ ”مالا“ رٹکن اور سنیا اسکوپ فلم ہونے کے بعد بھی عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ گلستان سنیمیا میں زبردستی اس کی سلور جوبلی کروائی گئی تھی کیونکہ سنیمیا گھر پر ڈویسرو ڈوسانی صاحب کا ذاتی تھا۔ اس لیے پہنچ جان کر اسے 25 ہفتوں تک لے جایا گیا تھا اور سلور جوبلی تقریب مناکر اس فلم کو مزید پلٹ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

بات ”مالا“ کی ناکامی کی نگلی ہے تو مناسب ہے کہ لیو

فلمز اور ڈوسانی پچرز والوں کے اشتراک کے بارے میں بھی بتا چلوں ”چندا“ اور ”ملاش“ کی سپرہٹ کا سیانی کے بعد احتشام اور مستفیض بیگم کی فلموں کے بعد اردو فلموں کے بھی کامیاب ہدایت کار تصور کیے جانے لگے۔ فلمی دنیا کی یہ ریت ہے کہ جب کسی ڈائریکٹر کی فلم پکس آفس پر کامیاب ہو جاتی ہے تو پروڈیوسرز کی کوشش ہوتی ہے کہ اسی سے اپنی فلم بنوائے۔ یہی کچھ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ بھی ہوا۔ کئی فلم سازوں نے ان کے لیے سرمایہ کاری کی آخری۔ جن میں گلستان سینما کے مالکان ایف ایم ڈوسانی اور ان کے بیٹے انیس ڈوسانی ان ہدایت کار برادران کو زیادہ اچھے لگے۔ کیونکہ ان کے پاس مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا اور ماڈرن سینما گھر بھی تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے سینما بزنس میں قدم جمانے کے بعد فلموں کی ڈسٹری بیوشن بھی کرنے لگے تھے اور اس میں بھی بہت کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ پھر ان کی دلچسپی فلم سازی میں بھی بڑھی اور انہوں نے احتشام اور مستفیض کے ساتھ مل کر فلم سازی کا پروگرام بنایا۔ سرمایہ ڈوسانی پچرز کا فلم سازی کی ساری ذمہ داری یو فلمز کی۔ ان دونوں بھائیوں کے فلم ساز ادارے کا نام یو فلمز تھا۔ دونوں اداروں کے اشتراک سے بننے والی ابتدائی کچھ فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوئیں تو دونوں پارٹیوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ مگر ان دونوں بھائیوں کی ایک عادت اچھی نہیں تھی۔ دونوں بڑے حریص تھے دوسرے فلم والوں کی نقل کرنے بلکہ ان سے ایک قدم اور آگے بڑھانے کے معاملے میں۔ سنجیدہ فلم والے انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ ہدایت کار بے بی اسلام نے ڈھاکہ میں سب سے پہلے اردو فلم بنانے کی طرح ڈالی تو اس کی کامیابی ان سے ہنسم نہ ہو سکی اور دیکھا دیکھی ”چندا“ بنا ڈالی اور بے بی اسلام کی فلم ”تہا“ کی نمائش میں رخا ڈال کر اپنی فلم ”چندا“ پہلے ریلیز کر کے ڈھاکہ کی پہلی اردو فلم بنانے کا سہرا اپنے سر سجایا۔ ظہیر ریحان نے پہلی رنگین فلم ”سنگم“ بنائی تو ان دونوں نے رنگین اردو فلم ”ساگر“ بنا ڈالی۔ ہدایت کار ظہیر ریحان نے پہلی سنیما اسکوپ فلم ”بہانہ“ بنائی تو ان لوگوں نے رنگین سنیما اسکوپ فلم ”مالا“ بنا دی۔ ظہیر ریحان کی سنیما اسکوپ فلم بلیک اینڈ وائٹ تھی اور کراچی کی لوکیشن میں بنائی گئی تھی۔ اس دو میں ان کی فلموں کا معیار کم سے کم ہوتا گیا۔ اچھے فلم میکر فلم بنانے سے پہلے اس کی کامیابی کی جو منصوبہ بندی کرتے ہیں اس کا یہ دونوں بھائی خیال نہ رکھ سکے اور

ندیم کے گیت جو انہی پر فلمائے گئے

☆ محبوبوں کے قدرداں نہ شہر میں نہ گاؤں میں۔ فلم ”جلے نہ کیوں پروانہ“۔

☆ نجر جیادو جیلائے لے۔ فلم ”امنگ“

☆ زمانہ سنگ ناچے گا۔ فلم ”پھول میرے گلشن کا“

☆ اکھیاں ملائے نیندیں چرا کے۔ فلم ”دوبدن“

☆ دیوانہ دیوانہ دل میرا۔ فلم ”پھول“۔

☆ میری اداس غم کی بانہوں میں۔ فلم ”پھول“

☆ لکھے پڑھے اگر۔ فلم ”اناڑی“

☆ نادان تھے جو آپ کی قتل میں آگئے۔ فلم ”مٹی کے پتے“

☆ تمہیں کیوں نہ چاہیں۔ فلم ”من کی جیت“

ندیم کے گائے ہوئے دوگانے

☆ کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ ندیم، فردوسی فلم چکوری۔

☆ اور حسین بھی دیکھے ہوں گے۔ ندیم، احمد رشدی،

نیر نور فلم دوبدن۔

☆ ارے طعنہ تیرا طعنہ۔ ندیم، مالا فلم بھول۔

☆ منڈیا دو پٹا (چٹابی)۔ ندیم، نور جہاں فلم کھڑا۔

☆ اذنبوں نکلیا پھڑک گئی (چٹابی)۔ ندیم، نور

جہاں، مسعود رانا فلم کھڑا۔

ندیم بطور شاعر

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ندیم صاحب کو شعرو

شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ وہ نہ صرف اچھی شاعری

شوق سے پڑھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی خود بھی اشعار کہا

کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے کچھ نمونے پیش

خدمت ہیں۔

اب تو بچنے لگے سانوں کے دیے

زندگی بھی ٹھہرنے والی ہے

ان اندھیروں کے ڈھلتے آئینے سے

اک نئی صبح نکلتے والی ہے

☆

میں ہی صحرا میں تھا میں ہی تھا بہاروں میں

میں چلا جاؤں گا تو ڈھونڈو گے ستاروں میں

☆

کون جاتا ہے چھوڑ کر دنیا

بس ذرا نقش بدل جاتے ہیں

ان کی رنگین فلم ”ساگر“ اور رنگین اور سنیماسکوپ فلم ”مالا“ بڑی سرمایہ کاری کے باوجود باکس آفس پر بری طرح فلاپ ہو گئیں۔ اس بات پر ان کے انویسٹر ڈوسانی پکچرز والے سخت برہم ہوئے اور کہا۔ ”ہم تم لوگوں کے ساتھ ایسے گھائے کا سودا نہیں کر سکتے۔ بابا! ہم کاروباری لوگ ہیں۔ اس امید پر روکڑا لگاتے ہیں کہ دو خرچ کریں تو چار کمائیں۔ ہم اپنی محنت کی کمائی لگائیں اور تم لوگ پورا اور بکواس فلمیں بنا کر ہمارا دھڑن تختہ کرو۔ یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔“

ڈوسانی پکچرز والوں کے اس بدلے ہوئے رویے پر دونوں بھائیوں کی سٹی مٹی ہو گئی۔ گھر واپس آکر سر جوڑ کر بیٹھے۔ اب کیا کیا جائے۔ ان کا ایک دستور تھا کہ کوئی خاص فیصلہ کرنا ہوتا تو گھر میں گول میز کانفرنس کیا کرتے تھے جس میں دونوں بھائیوں کی بیگمات بھی شریک ہوتی تھیں۔ ان کے پاس بھی اپنا کمایا ہوا سرمایہ تھا مگر اب انہیں دوسروں کے پیسوں سے فلم بنانے کا چکا لگ چکا تھا۔ اس لیے یہی فیصلہ ہوا کہ ڈوسانی پکچرز والوں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے انہی کے سرمائے سے اگلی فلم بنائی جائے۔ لہذا دونوں بھائی ان باپ بیٹوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کیا۔ ”ہمیں ایک موقع اور دیجیے۔ ہم آپ کو واپس نہیں کریں گے۔“

یہ باپ بیٹے بھی منجھے ہوئے کاروباری لوگ تھے۔ انہوں نے ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ ”دیکھو بھئی!“ بڑے ڈوسانی بولے۔ ”ہم تمہاری اگلی فلم کے لیے اسی صورت میں سرمایہ لگا سکتے ہیں کہ تم لوگ.....“

”ہمارا پچھلا گھانا بھی پورا کرو۔“ چھوٹے ڈوسانی نے باپ کی بات آگے بڑھائی۔

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے ان باپ بیٹے کی شرط کا مطلب سمجھنا چاہتے ہوں۔ بڑے ڈوسانی بولے۔ ”ہماری بات کا مطلب یہ ہے کہ اب تم لوگ جو فلم بناؤ گے اس کے منافع سے ہمارے اس گھائے کو بھی پورا کرو گے جو ”ساگر“ اور ”مالا“ میں ہمیں برداشت کرنا پڑا ہے۔“

یہ بڑی مشکل شرط تھی۔ دونوں بھائیوں نے ذرا سوچا۔ غور و فکر کیا پھر یہ شرط قبول کر لی۔

”دیکھو اب فلم بہت سوچ سمجھ کر بناؤ۔“ چھوٹے ڈوسانی بولے۔ ”خوب اچھی طرح منصوبہ بندی کرو۔“

زبردست پلاننگ کرو۔ اس کے بعد ایسی فلم شروع کرو جس میں ناکامی نہ ہو۔“

”دوسروں کے راستے پر چلنے کی کوشش نہ کرو۔“ بڑے ڈوسانی نے بیٹے کی بات آگے بڑھائی۔ ”دوسرے اپنی سوچ، سمجھ، صلاحیت اور پلاننگ کے تحت کام کرتے ہیں۔ تم لوگ بھی خوب اچھی منصوبہ بندی کرو۔ تم اپنی صلاحیتوں کو نظر میں رکھ کر سوچو کہ کیا کر سکتے ہو۔ کیسے ایک کامیاب فلم پروڈیوس کر سکتے ہو۔ اس طرح ایک فلم شروع کرو۔“

”ٹھیک ہے جی۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔“

گھر آکر مستفیض نے احتشام سے کہا۔ ”بھیا! یہ شرط کچھ بھاری نہیں ہو گئی؟“

احتشام نے انگوٹھے کا ناخن دانت سے کترتے ہوئے کہا۔ ”بھاری تو ہے مگر کیا کیا جائے کسے ماننے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔ فلم بنانا بھی ایک جوا ہے۔ اس میں ایک بازی ہے بھی سہی۔ اب ہمیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ ہمیں کیسی فلم بنانی چاہیے۔“

ان ہی دنوں گلستان سنیماسکوپ میں ہدایت کار پرویز ملک اور فلم ساز و اداکار وحید مراد کی فلم ”ارمان“ کی کامیاب نمائش جاری تھی۔ اسی فلم نے تماشاخوں کو زبردست طریقے سے اپنی پسندیدگی کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ ایسا کوئی شو نہیں ہوتا تھا جو ہاؤس فل نہ ہو۔ ایک بار اسے دیکھنے والا دوسری تیسری بار بھی دیکھنے آتا۔ دوستوں کو بھی دیکھنے کا مشورہ دیتا اور اپنی فیملی کے ساتھ بھی آکر دیکھتا۔

جب کوئی فلم کامیابی کے جھنڈے گاڑتی ہے تو دوسرے فلم میکرز کا دل چل جاتا ہے کہ کاش ہم بھی کوئی ایسی ہی فلم بنائیں۔ یہ دونوں حریف بھی بھائی بھی سوچنے لگے۔

”پرویز ملک نے یہ کیسی فلم بنالی ہے کہ شائقین فلم اس پر ٹونے پڑ رہے ہیں۔“

”تم لوگ بھی ایسی فلم بناؤ۔“ ان کی بیگموں نے انہیں مشورہ دیا۔

”مگر اس فلم میں ہے کیا جسے لوگ پسند کر رہے ہیں؟“ احتشام نے مستفیض کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میرے خیال میں تو بھیا۔“ مستفیض نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس فلم کی بنیادی چیز رومانس ہے۔ ڈیپ رومانس۔ وحید مراد اور زبانا نے اپنا محبت بھرا کردار ایسا ادا کیا ہے، اس قدر ڈوب کر پر فارم کیا ہے کہ بار بار دیکھنے

کے بعد بھی دیکھنے والوں کا دل نہیں بھرتا۔“

”ہاں!“ احتشام نے اپنے انگوٹھے کا ناخن دانتوں سے کترتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رومانس ہی اس فلم کا بنیادی فیکٹر ہے جس نے عوام کو اپنے کھجے میں جکڑ رکھا ہے۔“

ذرا دیر تک دونوں خاموش رہ کر اپنے اپنے طور پر کچھ سوچتے رہے پھر مستفیض بولے۔ ”محبت! فلموں کے لیے ایک ایسا یونیورسل سبجیکٹ ہے جس پر بننے والی فلمیں کبھی ناکام نہیں ہوتیں۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اسی لیے ”لوک رومانی“ داستانوں“ پر بننے والی فلمیں فلم بین شوق سے دیکھتے اور پسند کرتے ہیں۔ لیلیٰ مجنوں، سسی پڑوں اور بہر رانجھا کی داستان عشق پر فلمیں بار بار بنائی جاتی ہیں اور ہر بار انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔“

”چونکہ اب نئے دور کے تقاضوں کے تحت فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔“ مستفیض بولے۔ ”اس لیے اب موجودہ ماحول کے مطابق رومانی کہانیاں فلمائی جانے لگی ہیں۔“

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انہیں بھی کوئی ایسی فلم بنانی چاہیے جس میں ڈیپ رومانس ہو۔ بہت اچھی موسیقی ہو اور دل میں اتر جانے والے گیت ہوں۔

دونوں بھائیوں نے کئی دنوں تک ایسی کوئی کہانی سوچنے کی کوشش کی مگر ایسی کوئی کہانی ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو زبردست رومانوی ہو۔ جب تک وہ بنگالی فلمیں بناتے تھے انہیں چھپی ہوئی کوئی کہانی مل جاتی تھی جسے وہ فلمی پیرائے میں منتقل کر کے فلم بنالیتے تھے۔ اردو فلمیں بنانا شروع کیں تو بنگال کے پس منظر میں کوئی ہلکا پھلکا موضوع سوچ کر کسی اردو فلم نویس سے ڈیویپل کروا کر اس کے اسکرین پلے اور مکالمے لکھوا لیے اور مصنف کے طور پر اپنی بیگمات میں سے کسی ایک کا نام دے دیا۔ جب کہ ظہیر رحمان اور قاضی ظہیر یا نذر الاسلام ایک مضبوط اور مستحکم کہانی کی بنیاد پر فلم بناتے تھے۔ ظہیر رحمان خود ایک بہت اچھے فکشن رائٹر تھے جب کہ قاضی ظہیر اور نذر الاسلام وغیرہ۔ مستند رائٹرز کی کہانیاں حاصل کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اچھی کہانی پر ہی اچھی فلم بنتی ہے۔

جب کوشش بسیار کے باوجود یہ دونوں بھائی کوئی کہانی نہ گڑھ سکے تو تھک ہار کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں

ایک یادگار دن

یکم اگست 1975ء کو ایک انہونی ہو گئی۔ اس دن ندیم کی دو فلمیں ”اناڑی“ اور ”پچان“ ایک ساتھ نمائش پذیر ہوئیں اور دونوں نے ڈائمنڈ جوبلی کی۔ اناڑی ایس سلیمان کی تھی جب کہ پچان کے ہدایت کار پرویز ملک تھے۔ دونوں فلموں میں شبنم ندیم کی ہیروئن تھیں۔

عظیم فتوحات

کراؤن جوبلی فلم

آئینہ ریلیز 1977ء

ڈائمنڈ جوبلی فلمیں

نادان (ریلیز 1973ء) اناڑی، پچان (ریلیز 1975ء)، تلاش (ریلیز 1976ء)، ہم دونوں (ریلیز 1980ء)، لا جواب (ریلیز 1981ء) قربانی (ریلیز 1981ء) سنگدل (ریلیز 1982ء)، دلہیز (ریلیز 1983ء)

پلاٹینم جوبلی فلمیں

چکوری (ریلیز 1967ء)، دل گئی (ریلیز 1974ء)، امبر، زندگی (ریلیز 1978ء)، پاکیزہ (ریلیز 1979ء)، بندش (ریلیز 1980ء)، میاں بیوی راضی (ریلیز 1982ء)، حساب (ریلیز 1986ء)

گولڈن جوبلی فلمیں

چھوٹے صاحب (ریلیز 1967ء)، سنگدل، ہدایت کار اظفر شہاب ریلیز 1968ء، بہن بھائی (ریلیز 1968ء)، دیا اور طوفان (ریلیز 1969ء)، پھول میرے گلشن کا (ریلیز 1974ء)، پھول۔ شمع (ریلیز 1974ء)، زینت، جب جب پھول کھلے (ریلیز 1975ء)، لپے بوائے (ریلیز 1978ء)، صائمہ، رشتہ (ریلیز 1980ء)، خوب صورت، مہرانی (ریلیز 1982ء)، دیوانی (ریلیز 1983ء)، کامیابی، بہرا (ریلیز 1984ء)، ہم سے ہے زمانہ۔ دیوانے وو۔ زمین آسمان (ریلیز 1985ء)، فیصلہ (ریلیز 1986ء)، چوروں کی بارات (ریلیز 1987ء)، بازار حسن (ریلیز 1988ء)، انسانیت کے دشمن (ریلیز 1990ء)۔

لائے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں بس اس سے ایسا جادو ہو جو سب کے سرچڑھ کر بولے۔“

زین العابدین بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ سید پور سے تعلق رکھنے والے جن نو جوانوں کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ان میں زین العابدین بھی تھے اور انہیں بھی محی الدین نواب اور حیدر صفی کی طرح افسانہ نگاری کا شوق تھا۔ احمد سعدی اور ادیب سہیل کی سرپرستی انہیں بھی حاصل تھی۔ ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور اپنے افسانے سناتے تھے۔ پھر جب وہ سید پور سے ڈھاکے آئے تو ادبی پرچوں میں ان کے افسانے شائع بھی ہونے لگے۔ فلمی دنیا میں قدم رکھا تو اسکرپٹ رائٹنگ کا شعبہ اپنایا۔ شروع میں ان کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ لکھا انہوں نے مگر کریڈٹ کسی اور کو دیا گیا مگر وہ ان باتوں سے دلبرداشتہ نہیں ہوئے کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

کوئی ہفتہ عشرہ کے بعد زین العابدین ایک فلمی کہانی لکھ کر دونوں ہدایت کار بھائیوں کے دربار میں پہنچ گئے۔

”آئے کہانی؟“

”جی ہاں۔“

”تو پھر سناؤ۔“

”زینو بھائی نے مسودے کو کھول کر پڑھنا چاہا تو مستفیض ایک دم بول بڑے ذرا ٹھہر دیا۔“

زینو بھائی ٹھہر گئے۔ ”بھیا! ان دونوں کو بھی تو بلا لیجیے ناں جو ہماری فلموں کی مصنفہ ہوتی ہیں۔“

”ہاں ہاں ان کی موجودگی بھی ضروری ہے۔“

اتفاق سے اس وقت دربار میں کوئی اور (درباری) نہیں تھا۔ دونوں بیگمات بھی آکر بیٹھ گئیں۔ ”ہاں اب سنائیے زینو بھائی۔“

زینو بھائی نے کہانی سنانی شروع کی۔ وہ ایک ایک سطر ایک ایک جملہ بہت ٹھہر ٹھہر کر سنانے لگے اور وقفے وقفے سے سننے والوں کے چروں پر بھی نظر ڈالتے رہے۔ جلد ہی ان کے تاثرات سے زینو بھائی کو اندازہ ہو گیا کہ کہانی میں وہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ کہانی میں زینو بھائی نے اپنی فکشن نگاری کا کمال دکھایا تھا۔ بنگال کے برقعہ مقام میں رہنے والے دو پریمیوں کا ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاٹنے کے مناظر ایسے جادو اثر تھے کہ ان کے چروں کی چمک گواہی دے رہی تھی کہ کہانی ان کے حسبِ فضا لکھی گئی ہے۔ کہانی ختم ہوئی تو دونوں بیگمات نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا تھا کہ ان

نہ کسی رائٹر کو یہ ٹاکس دیا جائے۔ کوئی ڈیپ رومانس کی بنیاد پر کہانی لکھنے کو کہا جائے۔ ان دنوں سرور بارہ بنگلوی کے علاوہ شاعر صدیقی، نقی مصطفیٰ اور زین العابدین ڈھاکے کی اردو فلموں کے اسکرپٹ رائٹرز کی حیثیت سے نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ سرور صاحب کے بارے میں سوچا مگر وہ بہت زیادہ مصروف تھے۔ ان سے وہ حسبِ فضا کام نہیں کروا سکتے تھے۔ شاعر صدیقی خاصے سینئر تھے مگر ایک طرح سے وہ ایس ایم پرویز کے گروپ سے ان کا تعلق ٹھہرا تھا اس کام کے لیے وہ بھی انہیں کچھ بچے نہیں۔ نقی مصطفیٰ، قاضی ظہیر اور خان عطاء الرحمن سے زیادہ قریب تھے لہذا ان سے اس بات کا خطرہ تھا کہ وہ اگر کوئی منفرد کہانی دیں گے تو شاید فلم کی ریلیز سے پہلے وہ کہیں لیک آؤٹ نہ ہو جائے۔ رہ گئے زین العابدین تو ان کی چھان پھٹک کے بعد پتا چلا کہ وہ بنیادی طور پر فکشن رائٹر ہیں اور ایک اچھے صحافی بھی ہیں اور کسی فلمی گروپ سے ان کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔

دونوں بھائیوں نے انہیں بلا کر کہا۔ ”زینو بھائی! ہمیں ایک فلمی کہانی چاہیے۔“

”کیسی کہانی؟“

”ایک رومنٹک کہانی۔“

زینو بھائی بولے۔ ”کیپٹن صاحب! ہر فلم رومنٹک ہوتی ہے۔ ایک رومانی جوڑے کے گرد گھومتی ہے۔“

”ارے بھی! بھیا! کا مطلب ہے۔“ مستفیض نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کہانی میں صرف رومانس ہو۔ ڈیپ رومانس اور کوئی مسئلہ مسئلہ نہ ہو۔“

زین العابدین ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے موڈ مزاج سے بھی واقف تھے۔ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ لوگ ”ارمان“ ٹائپ کی کوئی ڈیپ رومنٹک فلم بنانا چاہتے ہیں۔

”ٹھیک ہے۔“ زینو بھائی نے خالص فلمی انداز میں کہا۔ ”میں ایسی کوئی کہانی بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”بس اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ ہمارے بنگال کے پُر فضا ماحول اور لوکیشنز میں اکتوسی میں کیجیے کی طرح ہو۔“

”انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا کیپٹن صاحب۔ عام روایتی فلموں سے ذرا ہٹ کر۔ بنگال کا حسن۔ بنگال کا جادو اس میں بھرپور طور پر پیش کرنے کی کوشش کروں گا بس چند روز کی مہلت دیجیے۔“

”ٹھیک ہے اطمینان سے سوچیے۔ اطمینان سے لکھ کر

سلور جو بی فلمیں

چاند اور چاندنی۔ میں کہاں منزل کہاں۔ قلی
(ریلیز 1968ء)، نازنین (ریلیز 1969ء)،
شیخ اور پروانہ، بازی، جلے نہ کیوں پروانہ،
سوغات، چاند سورج (ریلیز 1970ء)، چراغ
کہاں روشنی کہاں (ریلیز 1971ء)، آؤ پیار
کریں، انگارے، من کی جیت، احساس
(ریلیز 1972ء)، سہرے کے پھول، بادل اور
جلی، سوسائٹی (ریلیز 1973ء)، دودن، ساج،
انتظار، من پہی، بہشت، شرافت
(ریلیز 1974ء)، فرض اور ماما، ہارگیا انسان،
پاکلی، روشنی، انجیر (ریلیز 1975ء)، انسان اور
فرشتہ، سیاں اناڑی، دو آنسو، جیو اور جینے دو
(ریلیز 1976ء)، محبت ایک کہانی، عشق عشق،
درو، روٹی کپڑا اور انسان، بڑے میاں دیوانے،
شرمیلی، بھٹی بھر چاول، پلس (ریلیز 1977ء)،
مہندی لگی میرے ہاتھ (ریلیز 1980ء)، وطن
(ریلیز 1981ء)، آہٹ، آس پاس، آنگن،
تھوڑی سی بے وفائی (ریلیز 1982ء)، گمنا،
یہ کیسے ہوا (ریلیز 1983ء)، خوش نصیب،
لازوال (ریلیز 1984ء)، ہیرو، پروانا،
کندن، بدلہ، لو ان لندن (ریلیز 1987ء)،
میری عدالت، کھڑا (ریلیز 1988ء)، طاقت کا
طوفان، بارود کی چھاؤں (ریلیز 1989ء)،
راجا، بلندی (ریلیز 1990ء)، دولت کے
پجاری (ریلیز 1991ء)، خونی شعلے، عبداللہ
دی گریٹ، چاہت (ریلیز 1992ء)، میں
ایک دن لوٹ آؤں گا (ریلیز 2007ء)، میں
ہوں شاہد آفریدی (ریلیز 2013ء)

کے۔

”بھیا! ایک بات اور کہوں؟“

”کہو۔“

”جو رقم ادھر سے ملے اس کا آدھا قلم پر خرچ کیا
جائے اور آدھے کو خدا نخواستہ اپنے بڑے وقت کے لیے
اپنے بینک میں جمع کروادیتا چاہیے۔“
”بہت اچھا مشورہ ہے۔“

کے شوہروں نے نگاہوں کے اشارے سے انہیں روک کر
خالص کاروباری انداز میں کہا۔ ”ہاں..... ٹھیک ہے۔“
زیو بھائی بھی کوئی اناڑی کھلاڑی نہیں تھے۔ جھٹ
بولے۔ ”اگر پسند نہیں آئی تو کوئی بات نہیں۔ اسے گولی
مارئیے۔ میں دوسری لکھ دوں گا۔“
”نہیں اتنی بری بھی نہیں۔“

”ہاں اسکرین پلے اور بہترین ٹریٹمنٹ کے بعد اس
میں جان آجائے گی۔“

”کیوں رسک لیتے ہیں؟“ زیو بھائی نے بھی
چیتھرہ بدلا۔ ”میں اس سے بھی زیادہ مصالے دار.....“

زیو بھائی کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ان کے ہاتھ
سے مسودہ لے لیا گیا۔ ”ارے یار! قلم تو قیم ورک کا نتیجہ
ہوتی ہے۔ اس میں کچھ ہمارا حصہ بھی پڑے گا تو یہ ایک اچھی
قلم بن جائے گی۔“

”چند روز تک ہم اس کہانی پر غور و فکر کریں گے۔ اس
کے اسکرین پلے پر کام کریں گے۔ پھر تم ہی اس کے مکالمے
لکھو گے۔“

زیو بھائی کے جانے کے بعد انہوں نے مکمل کر اپنے
جذبات کا اظہار کیا۔ ”کہانی تو واقعی بہت اچھی ہے۔“
”بہت ڈیپ رومانس ہے۔“

”ایک نوجوان جوڑے کے جذبات و احساسات کو
ظالم نے بڑے آرٹسٹک انداز میں پیش کیا ہے۔“

دونوں بھائی بہت خوش تھے کہ انہیں ایک بھر پور
رومانی کہانی مل گئی ہے۔ ”اگر اس پر اچھی قلم بنی تو ارمان
کی طرح نہ سہی۔“ اس سے کم بھی کامیاب ہوئی تو ہمارے
دارے تیارے ہو جائیں گے۔

”بھیا! قلم کی کامیابی اور ناکامی کے بارے میں کچھ
کہنا مشکل ہے۔ ہماری رنگین قلم ”ساکرز“ اور رنگین اور سنہما
اسکوپ قلم ”مالا“ کا جو شہر ہوا کیا ہمیں اس کی اُمید بھی؟ اس
لیے اب بہت مختصر مقدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”میں کہتا یہ چاہتا ہوں کہ اس بار جو پسا ان باپ
بیٹوں سے ملنے والا ہے اسے بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنا ہو
گا۔ اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ پروڈکشن ہیوی نہ ہو۔
کم سے کم سربانے سے قلم مکمل ہو جائے۔“

”کہانی کی مناسبت سے تو لوکیشن گاؤں دیہات کی
ہے۔ چند ایک سیٹ لگوانے پڑیں گے۔ وہ بھی معمولی نوعیت

اور اس مشورے پر انہوں نے عملی طور پر چلنا شروع کر دیا۔ فلم کے اخراجات کم کرنے کے لیے نئے لوگوں سے کام لینا شروع کر دیا۔ ایسے لوگ جن کو جو دیں وہ قبول کر لیں۔ ایسے میں ان کے ہیرو عظیم نے ڈیمانڈ کر دیا کہ اس فلم میں مجھے زیادہ معاوضہ دینا ہوگا۔

”کیوں یہ زیادہ معاوضے کی کیا تک ہے؟“

”کیپٹن صاحب! میں ایک بڑا ہیرو ہوں۔ بڑی بڑی فلمیں کر چکا ہوں۔ رنگین اور سنہا اسکوپ فلموں کا ہیرو رہ چکا ہوں۔“

”اور تمہاری ہی وجہ سے ”ساگر“ اور ”مالا“ کامیاب نہ ہو سکیں۔“

”فلم کی کامیابی یا ناکامی میں صرف ہیرو وین کا حصہ نہیں ہوتا۔ انہیں بتانے والے زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔“

دو بڑی فلموں میں ناکامی کے بعد اس بار ہم ایک لو بجٹ کی فلم بنا رہے ہیں اور آرٹسٹوں کو پیسے بھی کم دے رہے ہیں۔ ہم تو تمہیں بھی تمہارے ریٹ سے کم پیسے دیں گے۔“

”پھر تو آپ کسی دوسرے کے ہیرو سے رابطہ کریں۔ میں تو کم پیسے لے کر کام نہیں کر سکتا۔“ یہ کہہ کر عظیم دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔

”بہنہ! کامیاب فلموں کا ہیرو ایسے غرے کرے تو کوئی بات بھی ہے۔“

”اچھا ہوا وہ خود ہی چلا گیا۔“

یہ ساری باتیں تو وہ ہیں جو اندرون خانہ ہوئیں۔ فلمی اصطلاح میں جنہیں بیک گراؤنڈ یا پس پردہ ہاس کہا جاتا ہے۔ ان کا علم انہی کو ہوتا ہے جو وہاں موجود ہوتے ہیں یا کچھ کھوجی لوگ اپنے ذرائع سے معلوم کر لیتے ہیں۔

کیپٹن احتشام صاحب کی نئی فلم ”چکوری“ کا گانا ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ مرزا ندیر بیک کو چونک گانے کا شوق تھا اس لیے گانوں کی ریکارڈنگ کے موقع پر اگر جانے کا موقع ملتا تو وہ ضرور جاتا تھا۔ روین گھوش سے چونکہ صاحب سلامت تھی۔ وہ ڈھاکے میں موجود اس کے چچا کے جاننے والے تھے۔ انہوں نے ہی اسے روین گھوش سے ملوایا تھا۔

اس دن بھی وہ روین گھوش کی وجہ سے ریکارڈنگ کے موقع پر موجود تھا۔ گانا جبار اور فردوس بیگم کی آواز میں

ماہنامہ سرگزشت

ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔

نذیر بیک نے دیکھا کہ کیپٹن صاحب، جبار کے گانے سے مطمئن نظر نہیں آرہے ہیں۔ جب بھی وہ گانے کے بول گانا احتشام صاحب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہو جاتے اور وہ روین گھوش سے کہتے۔ ”نہیں یار! کچھ بات نہیں بنی۔“

”اچھا میں دوبارہ گواتا ہوں۔“

جبار اپنے حصے کے بول دوبارہ گاتے۔ کیپٹن صاحب دوبارہ ریجیکٹ کر دیتے۔ اچانک ان کی نظر نذیر بیک پر پڑی تو انہوں نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلوایا اور روین صاحب سے بولے۔ ”جبار کی بجائے اس لڑکے سے گواؤ۔“

روین گھوش کے کچھ بولنے سے پہلے میں بول پڑا۔ ”میں نہیں گاؤں گا۔“

”کیوں؟“ انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ ”جبار صاحب انٹرسٹی کے سینئر گلوکار ہیں۔ یہ تو ان کے منہ سے نوالہ چھیننے کے برابر ہوگا اگر میں نے ان کی جگہ گایا۔“

”سینئر ہوگا تمہارے لیے۔ مجھے تو میری پسند کی پرفارمنس چاہیے۔ چاہے وہ کتنا ہی جونیئر ہو۔“

اس موقع پر روین گھوش اور فردوس بیگم نے بھی اسے سمجھایا۔ ”اپنے سینئر کا احترام بہت اچھی بات ہے مگر جب فلم کا ڈائریکٹر اس کی پرفارمنس سے مطمئن نہیں اور اس کی جگہ وہ تم سے گوانا چاہتے ہیں تو انکار نہ کرو۔“

نذیر بیک نے بڑی بے بسی کے ساتھ جبار صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی اپنی طرف سے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے یار! گاؤں تم نہیں گاؤ گے تو وہ کسی اور سے گوا لیں گے۔“

اب مجھے اطمینان ہوا۔ میں نے گایا اور میری آواز بولوں کی ادائیگی اور گیت کے احساسات و جذبات کو کیپٹن صاحب کے علاوہ سب نے پسند کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ اختر یوسف صاحب کے لکھے ہوئے گیت میں جن تاثرات کا اظہار کیا گیا تھا جبار صاحب بنگالی ہونے کی وجہ سے ان کو سمجھ نہیں پائے اور اپنی آواز سے اسے وہ رنگ نہ دے سکے۔ جس کا یہ گیت متقاضی تھا۔

گانے کی کامیاب ریکارڈنگ کے بعد جب کیپٹن صاحب اور مستنضیٰ صاحب نے اپنے گھر میں یہ دلچسپ

اگست 2017ء

روداد سنائی تو سننے والوں میں سب سے زیادہ خوشی ان کی بیٹی
فرزانہ کو ہوئی۔

”ہاں!“ اس کی والدہ بولیں۔ ”یہ لڑکا جتنا خوب
صورت ہے اتنا ہی بالادب اور تیز دار بھی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھائی،“ مستفیض کی بیگم
بھی بولیں۔ ”مجھ نے کی اتنی بڑی آفر کو وہ محض اپنے سینئر
گلوکار کے احترام میں ٹھکرا رہا تھا۔ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی کی
دلیل ہے۔“

مما اور آئی کی باتیں سن کر فرزانہ کی خوشیوں کا پیمانہ
چھلکتا جا رہا تھا۔ جس لڑکے کو اس نے ”مالا“ کی سطور جوہلی
تقریب، میں پہلی بار دیکھ کر اس کے لیے اپنے دل کے
سارے دروازے کھول دیئے تھے وہ اب اس کے علاوہ
دوسروں کو بھی پسند آنے لگا ہے۔ ”یہ تو..... یہ تو..... اس کے
لیے میری دھڑکنوں کی کامیابی ہے۔“ اس نے خود گلا کی۔
زین العابدین نے اپنی لکھی ہوئی کہانی کے مکالمے
بھی لکھ لیے تھے اس لیے اب شوٹنگ کا مرحلہ قریب سے
قریب تر آتا جا رہا تھا۔ دیگر کرداروں کے لیے آرٹسٹوں کا
چناؤ بھی ہو چکا تھا۔ بس ابھی تک ہیرو کا مسئلہ حل نہیں ہوا
تھا۔ فلم کی کہانی کی مناسبت سے جیسے ہیرو کی ضرورت تھی
ابھی تک پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو کوئی چٹانیں تھا۔ اندرونی
طور پر وہ اس بات کے متنبی تھے کہ ”ارمان“ کے وحید مراد کی
طرح آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے والا کوئی چکور۔
”چکوری“ کا ہیرو ہونا چاہیے۔

یوں تو ڈھاکے کی فلموں میں بہت سے ہیرو پر فارم
کر رہے تھے مگر کسی نہ کسی عنوان سے وہ ”چکوری“ کے چکور
کے لیے مناسب نظر نہیں آتے تھے۔

گھر کے سارے ہی لوگ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے
میں اپنی اپنی سوچ اور فکر کے مطابق اظہار خیال کر رہے تھے
مگر دونوں بھائیوں کو جتنے نہیں تھے۔ مگر تلاش بسیار کے بعد
ایک لڑکا عابد انہیں پسند آ گیا اور انہوں نے اسے ہیرو کے
رول کے لیے منتخب کر لیا۔ اس کے بعد ایک دن فرزانہ نے
ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”چپا! ایک بات کہوں؟“

”ہاں ہاں کہو۔“

”یہ میرے چھوٹے منہ کی بڑی بات تو نہیں سمجھی
جائے گی؟“

”ارے نہیں بیٹا! چھوٹی اور بڑی بات کیا۔ اچھی ہو
گی تو قبول کر لی جائے گی۔ بری ہوئی تو ریجیکٹ کر دی

ندیم کے ہدایت کار

ہر آرٹسٹ کی فنی زندگی میں اس کے ہدایت
کاروں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ ندیم صاحب
نے اپنے کیریئر میں جن ہدایت کاروں کی
ہدایت پر فلموں میں کام کیا اس کا ایک جائزہ:
احتشام پانچ فلمیں، مستفیض تین فلمیں، ظفر
شباب تین فلمیں، محمد جاوید فاضل تیرہ فلمیں،
پرویز ملک بارہ فلمیں، نذر الاسلام گیارہ فلمیں،
ایس سلیمان گیارہ فلمیں، شباب کیرانوی آٹھ
فلمیں، کے خورشید سات فلمیں، اقبال اختر
سات فلمیں، سگیتا سات فلمیں، حسن طارق
پانچ فلمیں، اقبال کشمیری پانچ فلمیں، حسین
پانچ فلمیں، اسلم ڈار سات فلمیں، مسعود بیٹ دو
فلمیں، رفیق علی راکن تین فلمیں، نذر شباب
تین فلمیں، رضا میر دو فلمیں، رکیلا دو فلمیں،
ایس اے بخاری دو فلمیں، اقبال رضوی دو
فلمیں، فرید احمد دو فلمیں، جعفر شاہ بخاری دو
فلمیں، شمیم آراء دو فلمیں، عزیز حسن دو فلمیں،
ایم اے رشید چار فلمیں، حسن عسکری دو فلمیں،
سید نور گیارہ فلمیں، ریمیا خان دو فلمیں، جاوید
شیخ دو فلمیں، پرویز رانا دو فلمیں

قومی ایوارڈ۔ صدارتی اعزاز

ندیم نے پاکستان میں فلمی اداکاری
کے پیشے کو وقار اور اعتبار بخشا ہے۔ ساٹھ کی
دہائی کے وسط سے اسی کی دہائی کے آخر تک
اپنی فلمی زندگی کے دوران انہوں نے اپنے
فن کی شان اور امتیاز کو برقرار رکھا۔ لاتعداد
نئی انعامات کے علاوہ انہوں نے 1985ء،
میں لازوال اور 1987ء میں قاتل کی
تلاش نامی فلموں میں بہترین اداکاری کا قومی
فلمی ایوارڈ حاصل کیے۔

فلمی اداکاری کے شعبے میں ان کی اداکاری کے
اعتراف میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان نے
مرزا نیر بیگ (ندیم) کو صدارتی اعزاز برائے
حسن کارکردگی عطا فرمایا۔

جائے گی چلو اب منافٹ بتا دو۔“

فرزانہ نے فوراً ہی زبان نہیں کھولی۔ اپنے دل کو سنبھالا اور دل ہی دل میں دعا کی کہ اس کے مشورے کو رجسٹریٹ نہ کیا جائے۔

”ہاں ہاں بولو۔“

”وہ..... وہ جو گلوکار لڑکا ہے۔“

”کون لڑکا؟“

”کون لڑکا بھی؟“

”وہ جس نے جبار کی جگہ گانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”تمہارا مطلب نذیر بیگ سے ہے؟“

”جی..... جی ہاں وہی، میں کہنا ہی چاہتی ہوں کہ اب

جب آپ نئے لڑکوں کو لے کر قلم بنارہے ہیں تو نذیر بیگ کو بھی کسی اچھے سے کردار کے لیے چانس دیں۔“

”گڈ!“ کیپٹن صاحب نے سب سے پہلے اس

مشورے پر اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”اس کی طرف تو ہمارا دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ ہیر تو تم نے عابد کو لے لیا ہے نذیر بیگ کو دل بنادیں گے۔“

”ہاں بھیا!“ مستفیض بول پڑے۔ ”یہ لڑکا تو ہیرو

کے خانے میں بھی فٹ ہو سکتا تھا۔“

”مگر اس نے تو.....“ کوئی بولا۔ ”کسی قلم میں کام

نہیں کیا ہے۔“

”تو اب کرے گا۔ ہم کرائیں گے اس سے

اداکاری۔ کوئی بھی تو ماں کے پیٹ سے اداکار بن کر پیدا

نہیں ہوتا ہے۔“

اس گلوکار کو اداکار بنانے کا مشورہ اکثر جی طور پر پسند

کیا گیا۔

”مرزا نذیر بیگ ڈن۔“ کیپٹن صاحب نے اپنا حتی

فیصلہ سنا دیا۔ ”اب ”چکوری“ کا دل وہی بنے گا۔“

دوسری طرف فرزانہ کا حال یہ تھا کہ ساغر کو میرے

ہاتھ سے لینا کہ چلی میں۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ

بڑوں کی محفل سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آ کر رونے لگی۔

یہ آنسو بے اختیار نکلے تھے جو خوشی کے تھے اظہار تشکر کے

تھے۔

اسی رات احتشام صاحب کا ڈرائیور نذیر بیگ کے

پاس آیا اور بولا۔ ”آپ کو کیپٹن صاحب نے بلایا ہے۔“

”کیوں بلایا ہے؟“

”میں کیا جانوں۔ آپ خود جا کر ان سے پوچھ

لیجیے۔“

نذیر بیگ ڈر گیا کہ خدا جانے کیا بات ہے۔ دو بار پہلے بھی اس کے ساتھ یہ ہو چکا تھا کہ گانے ریکارڈ ہونے کے بعد بھی قلم ریلیز نہ ہوئی۔ یہ اور ایسے خیالات نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ بہر حال اسے ڈرائیور کے ساتھ جانا پڑا۔

وہ پہنچا تو وہاں گھر کے شاید سارے ہی لوگ موجود تھے۔ میں نے سب کو مخاطب کر کے السلام علیکم کہا اور پھر خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

”نذیر بیگ!“ کیپٹن صاحب بولے۔ ”تم نے

فردوسی بیگم کے ساتھ جس قلم کا گانا گایا ہے نا۔“

نذیر بیگ کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر ہی رہ

گئی۔

”اب یہ بولیں گے ہم یہ قلم نہیں بتائیں گے۔“ نذیر بیگ نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”یہ خبر مجھے یہاں بلا کر

بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے اپنی تقدیر کا کھانا تو بعد میں بھی

معلوم ہو جاتا۔“

”ہم اس قلم میں۔“ کیپٹن صاحب نے اپنا جملہ مکمل

کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ایک اداکار کے طور پر پیش کرنا

چاہتے ہیں۔“

”جی!“ نذیر بیگ نے گہرا کر انہیں یوں دیکھا جیسے

وہ کہہ رہے ہوں۔ ”ہم تمہارا جینا دو بھر کر دیں گے۔“

”نہیں.....“ نذیر بیگ نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ”میں

اداکار نہیں بنوں گا۔ اداکاری نہیں کروں گا۔“

سب لوگ اسے حیران پریشان نگاہوں سے دیکھنے

لگے۔ ”کیوں؟ اداکار کیوں نہیں بنو گے؟ اداکاری کیوں

نہیں کرو گے؟“ اس بار مستفیض کی بیگم بولیں۔ ”میں اگر

تمہاری جگہ ہوتی تو اس زبردست آفر پر خوشی سے ناپچنے

لگتی۔“

”وہ..... وہ..... جی، میری جاب چھوٹ جائے

گی۔“

”ارے بیٹا!“ مزاحشام بولیں۔ ”تم اداکار بن

جاؤ گے تو تمہیں پھر جاب کرنے کی کیا ضرورت ہوگی۔ تم

عظیم کی طرح جلیل کی طرح، انور حسین کی طرح اور

دوسرے اداکاروں کی طرح قلموں میں کام کرنے لگو گے اور

ڈھیر سارے روپے کمانے لگو گے۔“

”تم کہاں جاب کرتے ہو۔ کیا جاب کرتے ہو؟“

ایک ہدایت کار کی ایک فلم

مندرجہ ذیل ہدایت کاروں کی ایک ایک فلم میں
 ندیم صاحب نے اداکاری کی۔ فاروق میمنگل
 (ہجرت)، فہر او غفور (دی سسٹم)، علی رضا
 اسامہ، (میں ہوں شاہد آفریدی)، سید فیصل
 بخاری (بھائی لوگ)، میسر لقمان (پہلا پہلا
 پیار)، عمران ملک (تیرے بن جانا نہ جانے)،
 عجب گل (کیوں تم سے اتنا پیار ہے)، اقبال ٹی
 (کندن)، امتیاز قیصر (دل میں چھپا کے رکھنا)،
 شمیمہ حیدر زادہ (تہا)، الطاف قمر (چاند گرہن)،
 سمیل خان (انداز)، زاہد شاہ (پابندی)، ایم
 حیدر شاہ (خونی شعلے)، ادریس شاہ (دولت کے
 پجاری)، عثمان حیدر زادہ (گوری دیاں جھانجرا)،
 جہانگیر قیصر (پروانہ)، اقبال یوسف (ہیرو)،
 اے ایچ صدیقی (خوش نصیب)، شریف
 (بیرا)، امیش میمنگل (درویش) سرور بارہ
 بنکوی (تم میرے ہو)، اقبال شہزاد (بازی)،
 شورش کھنوی (چاند سورج)، نور الحق (جلتے سورج
 کے بچے)، حسن شیرازی (بادل اور بجلی)، شوکت
 ہاشمی (جلے نہ کیوں پروانہ)، رزاق خان (دو
 بدن)، اختر یوسف (ساون آتا تم نہیں آئے)،
 ثناء اللہ خان (ساجن رنگ رنگیلا)، ایس ایم
 یوسف (ہار گیا انسان)، علی سفیان آقانی
 (جاکیر)، قمر زیدی (پاکلی)، اطہر شاہ خان
 (آس پاس)، کیفی (روٹی، کپڑا اور انسان)،
 قوی خان (روشنی)

”تو میری ایک مینیہ کی چھٹی قبول؟“

”ارے یار! تم جس جاب میں جا رہے ہو اس کے
 آگے اس جاب کی کیا حقیقت ہے۔ فلم کامیاب ہو گئی
 تو..... فلم کامیاب نہ ہوئی تو بھی تم ہاروں کی طرح کامیاب
 ہو جاؤ گے۔“

ظہیر ریحان صاحب کی باتوں سے نذیر بیک کو بڑا
 حوصلہ ملا۔ اس نے کیپٹن صاحب کو جا کر بتایا۔ ”ظہیر ریحان
 صاحب نے میری چھٹی قبول کر لی ہے۔ ایک مینیہ کے لیے
 مجھے چھٹی دے دی ہے۔“

کیپٹن صاحب نے پوچھا۔

”ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے۔“ نذیر بیک نے
 آہستہ سے کہا۔ ”نئی نئی یہ نوکری ہے فلم کے چکر میں ناغہ کیا تو
 میری چھٹی کر دیں گے۔“

”کون سی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے؟“

نذیر نے نام بتایا تو بولے۔ ”وہی تو نہیں جس میں
 ظہیر ریحان بھی کام کرتے ہیں؟“

”جی ہاں..... جی ہاں وہی۔ وہ اس کے چیف
 ہیں۔“

”ارے بھی! وہ ہمارے ہی قبیلے کا آدمی ہے۔ وہ
 بھی ہماری طرح فلم ڈائریکٹر ہے۔ شریف آدمی ہے۔ تم اس
 سے جا کر بتاؤ گے کہ تمہیں ایک فلم میں اداکار کے طور پر کام
 کرنے کا موقع ملا ہے ایک مینیہ کی مجھے چھٹی دے دیجیے۔
 ظہیر ریحان تمہیں ضرور چھٹی دے دیں گے۔“

”اور اگر انہوں نے میری مستقل چھٹی کر دی تو؟“

”یار! تم سارا فیصلہ خود ہی کر لیتے ہو۔“ مستفیض
 صاحب بولے۔ ”جاؤ ان سے بات تو کرو۔“

اگلے روز نذیر جاب پر گیا تو موقع مناسب دیکھ کر
 ظہیر ریحان صاحب سے ملا اور کہا۔ ”سر! مجھے ایک مینیہ کی
 چھٹی چاہیے۔“

انہوں نے نذیر کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر
 مسکراتے ہوئے بولے۔ ”کیا شادی کر رہے ہو؟“

”جی نہیں۔“

”پھر کس لیے چھٹی چاہیے؟“

”وہ سر! نذیر بیک کہتے ہوئے شرمانے لگا۔
 ”بھئی! جب تک مجھے جی بات نہیں بتاؤ گے ایک
 مینیہ کیا ایک دن کی بھی چھٹی نہیں دوں گا۔“

اب نذیر بیک نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔ ”سربجی!
 مجھے ایک فلم میں اداکاری کا چانس مل رہا ہے۔“

وہ ایک دم خوش ہو گئے۔ ”ارے بھئی! یہ تو بڑی خوش
 کی بات ہے مگر یہ تو بتاؤ تمہیں کون یہ چانس دے رہا ہے؟
 کس کی فلم ہے؟“

نذیر بیک نے بتا دیا۔ ”کیپٹن احتشام کی فلم ہے۔ فلم
 کا نام ”پکوری“ ہے۔ اس فلم کے لیے میں نے فردوسی بیگم
 کے ساتھ ایک گانا بھی گایا ہے۔“

”کیپٹن صاحب نے تمہارا انتخاب بہت درست کیا
 ہے۔ تم واقعی اداکار بننے کے قابل ہو۔“

”گڈ!“ احتشام صاحب خوش ہو کر بولے۔ ”میں نے کہا تھا نا ظہیر رحمان اچھا آدمی ہے۔ تمہارے ساتھ ضرور تعاون کرے گا۔“

”ارے بھئی! اس موقع پر تو تمہیں ہم سب کو مٹھائی کھلانی چاہیے تھی۔“ مستفیض صاحب خوشگوار انداز میں بولے۔ ”نذریک خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہی بولے۔“ ”چلو ہم ہی تمہارا منہ مٹھا کر دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کسی سے کہا۔ ”ہماری نئی فلم کے نئے اداکار کی طرف سے سب کا منہ مٹھا کر دو۔“

یہ سب کچھ تو ٹھیک تھا مگر نذریک اس بات کی وہ خوش نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ وہ اندر سے خوفزدہ تھا۔ اس نے کبھی اداکاری نہیں کی تھی نہ اس کا خواب دیکھا تھا۔ اس نے گلوکار بننے کا خواب دیکھا تھا۔ گلوکار بننا چاہتا تھا۔ یہ جو اسے اچانک فلم کا دن بتا دیا گیا تو وہ ایک دم اپ سیٹ ہو گیا۔ اس کے دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑ گئی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ اداکاری اور وہ بھی برے آدمی کی اداکاری۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو خود ہی سمجھانا شروع کیا۔ ”یار نذریک اب تو تم نے ان لوگوں کی بات مان لی ہے، اداکاری کرنے کی ہائی بھر لی ہے، تم سے اداکاری ہوئی تو ٹھیک، نہیں ہوئی تو بھی ٹھیک تم نے جو اداکاری کی اسے انہوں نے پسند کیا تو وہی ہوگا جو گانے کی ریکارڈنگ کے موقع پر ہوا تھا۔ جس طرح جبار کو رنجیت کر کے تم سے گیت گوالیا گیا اسی طرح..... ہاں بالکل اسی طرح تم کو کیمبرے کے پاس سے ہٹا کر بلکہ بھگا کر کسی اور سے اپنی پسند کی اداکاری کروالیں گے۔ یہی ہوگا نا، تمہارا کیا بکڑ جائے گا؟ تم کون سا رکابی سے ڈھاکے ہیرو بننے آئے ہو؟ تم گلوکار کی حیثیت سے ہی کامیاب ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لیے بہت ہے۔“

اپنے آپ کو سمجھانے کا یہ طریقہ کار گراں ثابت ہوا۔ اس کی پریشانیاں دیر بے دیر سے ختم ہو گئیں۔ شوٹنگ کی تاریخ قریب سے قریب آتی گئی اور پھر ایک دن یونٹ کے تمام لوگوں کو فیصلہ منجھکے خیر لگا انہوں نے کہا کہ دن کا کردار کر سکتا ہے نہ ہیرو کا۔ جو دوسروں سے بات کرتے ہوئے شرماتا ہے۔ اداکاری کیا کرے گا۔ پتا نہیں کیپٹن صاحب نے ایسا غیر دانشمندانہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔ اچانک خبر ملی کہ عابد کو کاسٹ سے خارج کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ ریپرسل کے دوران احتشام کو مطمئن نہ کر سکا۔ کئی دنوں کی محنت شالٹہ

کے بعد بھی جب وہ ان کے معیار پر پورا نہ اترتا تو اس کی جگہ انہوں نے مجھے ہیرو کے طور پر کام کرنے کو کہا۔

نذریک سے کہا گیا کہ تم گاؤں کے ایک سادہ لوح نوجوان ہو۔ اس مناسبت سے اسے بڑا سیدھا سادہ لباس پہنانا یا گیا تھا۔ کیمبرے کے سامنے کھڑا کر کے اس کو مکالمے بتائے گئے کہ تم اس طرح یہ ڈائیلاگ بولو گے۔ کیمبرہ اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔

اس سے پہلے کہ اس شوٹنگ کی بات آگے بڑھائی جائے مناسب ہے کہ چکوری کی کہانی اختصار کے ساتھ بیان کر دی جائے۔

انور جسے گاؤں والے پیار سے انوکہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ایک دیہات میں رہتا ہے۔ اس کا کل اثاثہ ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی اور ایک گھوڑی ہے یا پھر چکوری کی محبت۔ اسی گاؤں میں انور کا ایک دوست شمسو ہے جو ماہی گیری ہے۔ گاؤں میں ایک ڈاک بنگلا بھی ہے۔ جہاں لوگ تفریح کے لیے آتے ہیں۔ انور ان لوگوں کو اپنی گھوڑی پر بیٹھا کر سیر کراتا ہے۔ اس طرح جو پیسے کماتا ہے اس سے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ گاؤں میں رہنے والا ایک ڈاکہ جن بھی چکوری پر مرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے چکوری اور انوکے بڑھتی ہوئی محبت سے تنگ آ کر وہ ایک دوست اصغر بھی ہے جو اسے اٹنی سیدھی پیڑ پٹھایا کرتا ہے۔ چکوری اور انوکے بڑھتی ہوئی محبت سے تنگ آ کر وہ اصغر سے مدد طلب کرتا ہے۔ اصغر پہلے تو چکوری کے بھائی سے شکایت کرتا ہے پھر مہاجن کو اکساتا ہے کہ وہ اپنا قرضہ وصول کرے۔ مگر جب سب ترکیبیں ناکام ہو جاتی ہیں تو انوکے کی گھوڑی چوری کر دیتا ہے۔ اس کڑے وقت میں اس کا دوست شمسو اسے دلاسا دیتا ہے اس کی مدد کرتا ہے۔

جن دنوں انور کی گھوڑی اس کے پاس تھی ایک سیٹھ فاروق ڈاک بنگلے میں اپنی بہن (ریٹشمان) اور اپنی بیٹی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ انور ان کی لڑکی کو گھوڑی پر بٹھا کر سیر کرایا کرتا تھا۔ سیٹھ فاروق کی بیوی مرچھی تھی۔ وہ اس کے غم میں گیت لکھا کرتے تھے۔ انور کو ایک بار انہوں نے گاتے ہوئے سنا تو اس سے بولے۔ ”تم بہت اچھا گاتے ہو۔ میرے ساتھ شہر چلو میں تمہیں ایک بڑا گانے والا بنا دوں گا۔“ لیکن انور چکوری کو چھوڑ کر شہر جانے پر تیار نہیں ہوا۔

اب جب کہ اس کی گھوڑی چوری ہو چکی تھی وہ اپنے

نگار ایوارڈز

نگار اور نگار ایوارڈ کے بانی الیاس رشیدی مرحوم کی یاد میں 28 اکتوبر 2016ء کو منعقدہ ایک شام میں ندیم صاحب نے بھی شرکت کی اور اس موقع پر کہا۔ ”میں جب بھی کبھی کسی قلم میں کام کرتا تھا تو میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ مجھے اس قلم میں نگار ایوارڈ ملے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے مجھے نگار ایوارڈ ملتا رہا اور پھر میں سب سے زیادہ نگار ایوارڈ لینے والا اداکار بن گیا۔“

ندیم صاحب کی نگار ایوارڈ یافتہ فلموں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

”چکوری“ بہترین ہیرو 1967ء۔ ”احساس“ بہترین ہیرو 1972ء۔ ”ناٹائی“ بہترین ہیرو 1975ء۔ ”آئینہ“ بہترین ہیرو 1977ء۔ ”پاکیزہ“ بہترین ہیرو 1979ء۔ ”صائمہ“ بہترین ہیرو 1980ء۔ ”قربانی“ بہترین ہیرو 1981ء۔ ”سنگدل“ بہترین ہیرو 1982ء۔ ”دلہیز“ بہترین ہیرو 1983ء۔ ”لازوال“ بہترین ہیرو 1984ء۔ ”ناراض“ بہترین ہیرو 1985ء۔ ”فیصلہ“ بہترین ہیرو 1986ء۔ ”چوروں کی بارات“ بہترین ہیرو 1987ء۔ ”کھڑا“ بہترین ہیرو 1988ء۔ ”بارود کی چھاؤں“ بہترین ہیرو 1989ء۔ ”گوری دیاں جھانجراں“ بہترین ہیرو 1990ء۔ ”وطن کے رکھوالے“ بہترین ہیرو 1991ء۔

کر کہا۔ ”اوہ..... نو۔“

نذیر نے ہمت کر کہا۔ ”سر جی! میں نے بالکل ویسا ہی کہا اور ویسا ہی ایشن دیا جیسا آپ نے کہا تھا۔“

”تم نے ایشن اور ڈائلاگ ڈیلوری میں تو غلطی نہیں کی مگر یہ تو دیکھو تم کھڑے کہاں ہو؟ تم نے کسرے کے فریم سے باہر جا کر اداکاری کی ہے۔“

نذیر نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اس وقت کیا معلوم تھا کہ کسر کا فریم کیا ہوتا ہے۔ احتشام نے اسے بتایا تو آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آنے لگا۔

دوست ہمسو کے مشورے پر چکوری کو بتائے بغیر شہر چلا گیا۔ کیونکہ مہاجن نے بھی اس کی جھونپڑی پر قبضہ کر لیا تھا۔ لہذا اس خیال سے وہ شہر چلا گیا کہ وہاں سے کما کر آئے گا تو چکوری کو اپنی لہن بنالے گا۔ شہر کچ کر بڑی مشکلوں کے بعد اسے سیٹھ فاروق کا پتا ملا۔ سیٹھ فاروق اور ان کی بہن یحشام نے اسے تربیت دے کر ایک مشہور گلوکار بنا دیا۔

انور کے چلے جانے پر چکوری اداس اداس رہنے لگی۔ ہمسو نے اسے بتایا کہ وہ تجھے اپنی لہن بنانے کے لیے پساکمانے شہر گیا ہے۔ چکوری اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف انور کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جمن ڈاکے اور اس کے دوست نے چکر چلایا کہ اس کا بھائی اس کے ساتھ چکوری کی شادی کر دے۔ اس دوران شہر سے انور نے چکوری کے نام خط بھجوایا تھا کہ وہ جلد ہی آکر اس سے شادی کر لے گا مگر یہ خط جب ڈاکے جمن کے ہاتھ آیا تو اس نے یہ خط چکوری تک نہیں پہنچایا اور ہمسو کے نام سے انور کو خط بھجوادیا کہ چکوری کی شادی جمن سے ہوگئی ہے۔

چکوری کا بھائی کسی حال میں جمن سے اس کی شادی نہیں کر دانا چاہتا تھا مگر چکوری انور سے اب بالکل مایوس ہو چکی تھی کیوں کہ انور کا دوست ہمسو جب شہر گیا تھا تو اس نے انور کے ساتھ سیٹھ فاروق کی بہن کو دیکھا تھا۔ یہ بات اس نے آکر چکوری سے کہہ دی تھی کہ انور تو اب بڑی اونچی اڑان اڑنے لگا ہے۔ لگتا ہے وہ سیٹھ کی بہن سے ہی شادی کر لے گا۔

چکوری نے بھائی کی رضا مندی کے باوجود جمن سے شادی کی ہامی بھری کہ وہ انور سے مایوس ہوگئی تھی مگر اس شادی سے پہلے انور کا دوست ہمسو اسے گاؤں واپس لے آیا اور جمن کی ساری سازشوں کا پول کھل گیا اور دو چھڑے ہوئے پر پی آہیں میں مل گئے۔

اب دوبارہ شوٹنگ کے آغاز کی کہانی سنئے۔

”نذیر بیگ کا ڈرخوف یہ سوچ کر رو چکر ہو گیا تھا کہ جب اوکھلی میں سر دے دیا تو مزید کیا ڈرتا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ قلم کے ہدایت کار نے اسے جو کچھ سمجھایا۔ اس نے ذہن نشین کر لیا۔ دیکھو یہ تمہارا مکالمہ ہے۔ تم اسے بولتے ہوئے اس طرح کا ایشن دو گے۔“

جب احتشام صاحب نے ایشن کہا تو نذیر نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا مکالمہ بولا۔ مگر کیپشن نے کٹ کہہ

وہ جیسا کہتے رہے جیسا سمجھاتے رہے۔ نذیر اسی طرح کرتا رہا۔ ہر شات پر وہ خوش ہو کر گڑو گڑویری لکھتے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے۔ شاباشی دیتے۔
چکوری کے ڈائریکٹر کیٹین احتشام نے اپنے گھر اپنے بھائی مستفیض الرحمن کو فون کیا۔

”مستفیض تم کل کی فلاسٹ سے رائگا مانی پہنچو۔“
”کیوں! کیا بات ہے۔ میری ضرورت کیوں آگئی آپ کو؟“

”میں فون پر تمہارے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ بس تم کل یہاں پہنچ جاؤ۔“
”مگر بھیا!“ مستفیض نے حیراری سے کہا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
”کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ کل ہر حال میں تمہیں یہاں پہنچنا پڑے گا۔“

کیٹین صاحب آخر ان کے بڑے بھائی تھے اور وہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ بس وہ اس بات پر ان سے خوش نہیں تھے کہ وہ ایک ایسے لڑکے کو لے کر فلم بنارہے تھے جو ہیر تو کیا کسی معمولی کردار کے لیے بھی موزوں نہیں۔ کبھی کبھی وہ ضد میں ایسی بے ٹکی باتیں کر جاتے ہیں جو سراسر نقصان کا سبب بنتی ہے۔ نئے ہیر وہ ہیروں کی فلم پہلے ہی رسکی ہوتی ہے۔ اس پر ایسے بولنے کو لے کر فلم بنارہے ہیں۔

بہر حال اگلے دن انہیں بادل خواستہ رائگا مانی جانا پڑا اور جب وہ لوکیشن پہنچے تو دیکھا۔ نذیر بیک کیمرے کے سامنے کھڑا اداکاری کر رہا ہے۔ کیٹین صاحب نے خاموشی سے انہیں نذیر بیک کی طرف دیکھنے کو کہا۔

نذیر بیک جسے وہ ایک بے حد شرملاڑ کا سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ اداکاری کی الف بھی نہیں ادا کر سکے گا۔ اس اعتماد کے ساتھ اس وقت ایسے اداکاری کر رہا تھا جیسے کوئی ننھا ہوا اور تجربہ کار اداکار ہو۔ انہوں نے اپنے جسم میں چنگی کاٹی کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں مگر یہ خواب نہیں تھا۔ حقیقت تھی۔ شات مکمل ہوا تو مستفیض صاحب آگے بڑھے اور نذیر بیک کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی پیشانی چومی۔ اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا اور بولے۔ ”تم تو چھپرے رہتے تھے۔“

”جی! میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“
”اور یہ جو تم کر رہے تھے؟“

”وہ تو جی..... جو کچھ کیٹین صاحب نے کہا میں نے ویسا ہی کر دیا۔“
اب وہ بھائی کے پاس آئے۔ ”بھیا! یہ ہل بھر میں کیا ماجرا ہو گیا؟“

”میں خود حیران ہوں۔“ کیٹین صاحب نے اپنے انگوٹھے کا ناخن دانت سے کترتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا راز دارانہ انداز میں دھیمے لہجے میں بولے۔ ”سچی بات تو یہ ہے کہ تمام لوگوں کی مخالفت اور ناپسندیدگی کی وجہ سے میں بھی اندر ہی اندر خوفزدہ ہو گیا تھا اور تم سب سے دور آ کر اس کی فلم بندی کا آغاز کرنے کا اسی لیے پروگرام بنایا تھا کہ اگر وہ بھی عابد کی طرح میرے معیار پر پورا نہ اترے، بولٹ ثابت ہوا تو اس شرمندگی کے وقت میرے مخالفین میرے سامنے موجود نہ ہوں مگر..... مگر اس نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے اداکاری کی تو بس اور یہاں پونٹ کے دیگر لوگ بھی حیران رہ گئے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ وہی شرمیلا اور ڈراڈرا رہنے والا نذیر بیک ہے یا کوئی اور.....“

”بھیا! آپ کا بھی جواب نہیں۔ بڑے باکمال آدمی ہیں۔“ مستفیض نے کہا۔ ”اگر آپ اپنے نادر شاہی حکم کے تحت مجھے نہیں بلاتے اور فون پر نذیر بیک کی جادوگری کی روداد سناتے تو مجھے ہرگز یقین نہ آتا۔“
”میں جانتا ہوں۔ دیکھئے اور سنئے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“

مستفیض جب گھر واپس گئے تو گھر کے لوگوں نے انہیں گھیر لیا کہ کیا بات تھی؟ کیوں بلایا تھا کیٹین صاحب نے اس طرح؟“

”کیا بتاؤں!“ مستفیض صاحب نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ حاضرین میں فرزانہ بھی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور دل ہی دل میں وہ دعا مانگنے لگی۔ ”یا اللہ! انکل کوئی بری خبر نہ سنائیں۔“

”وہی بتاؤ جس کے لیے انہوں نے تمہیں بلایا تھا۔“
”بھائی! انہوں نے اس لیے بلایا تھا کہ.....“
مستفیض نے جملہ اوروں اور چھوڑ دیا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔
”بول دیجئے نا۔“ ان کی نیکی بھی بولیں۔ ”جب آپ دیکھ کر بھی سبھی سلامت ہیں تو ہم نہ کبھی.....“

”وہ جو گلوکار نذیر بیک ہے نا۔“
”اس نے تمہارے بھیا کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہو گا؟“

کامیڈی اداکاری

ندیم دراصل اداکار ہیں۔ جس طرح کا بھی انہیں کردار دیا گیا اس میں وہ مکمل طور پر پورے اترے۔ ان کی پہلی فلم ”چکوری“ بے حد سنجیدہ تھی مگر اگلی ہی فلم ”چھوٹے صاحب“ غیر سنجیدہ یعنی کامیڈی فلم تھی۔ ایک اداکار جو حادثاتی طور پر اداکاری کے میدان میں نمودار ہوا تھا اس کو دوسری ہی فلم میں مزاحیہ اداکاری کا ٹاسک دیا گیا۔ اس میں بھی وہ پورے اترے جب کہ مزاحیہ اداکاری سنجیدہ اداکاری سے زیادہ مشکل سمجھی جاتی ہے لیکن ندیم نے کامیڈی فلموں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

چھوٹے صاحب، اناڑی (ہدایت کار مستفیض)، احساس، نادان، دل لگی، پیچان، اناڑی (ہدایت کار ایس سلیمان)، سیاں اناڑی، بڑے میاں دیوانے، امیر، ہم دونوں، صائمہ، لا جواب، میاں بیوی راضی، استادوں کے استاد، کھڑا اور تیس مارخان ندیم صاحب کی ایسی فلمیں ہیں جن میں انہوں نے مزاح کی پختل جڑیاں بکھیری ہیں۔ وہ کامیڈی رنگ اور ڈھنگ میں خوب سچے ہیں۔

سب کچھ میری دعاؤں کے اثر سے ہوا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ”یا اللہ! میں آپ کا شکر یہ کس زبان سے ادا کروں۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو کچھ آپ سے مانگتی رہی آپ دیتے رہے۔ نذیر بیگ کی گلوکاری سے اداکاری تک میں نے اس کی کامیابی کے لیے جو دعا مانگی آپ نے قبول کی۔ سب لوگ مخالف تھے۔ انکل تک اسے اداکار بنانے کے خلاف تھے۔ بس ایک پایا تھے جو میرے کہنے پر میرے مشورے پر عمل کر رہے تھے۔ آج انہوں نے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ اس نے اپنی اداکاری سے سب کو حیران کر دیا ہے۔ میرا مولا اسے آنے والے وقت میں ہر قدم پر ایسی ہی عظیم کامیابی عطا کرنا۔“

وہ اسی دن سے پایا کا یونٹ کے ساتھ رانگا مائی سے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ واپس آئیں گے تو شوٹ کیے ہوئے پرنٹ کے ریشیر نکلا کر سب کو دکھائیں گے۔

”اسے وہ رانگا مائی اس لیے لے کر گئے تھے کہ اگر اس نے بھی عابدی طرح انہیں مایوس کیا تو اس شرمندگی کے وقت ہم لوگ موجود نہ ہوں۔“

”تو پھر آپ کو کیوں بلایا تھا؟“ اس بار فرزانہ نے سوال کر دیا۔ ”کیا اپنی غلطی کی معافی مانگنے کے لیے؟ یہ کہنے کے لیے کاش میں تم لوگوں کی بات مان لیتا۔“

”ارے نہیں بیٹا! تم جانتی ہو۔ اپنے پایا کو، انہوں نے کبھی اپنی غلطی تسلیم کی ہے؟ وہ تو دراصل غلطی کرتے ہی نہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بتانے اور دکھانے کے لیے بلایا تھا کہ دیکھو میرا فیصلہ کتنا درست تھا۔“

”کیا مطلب!“ بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔

”مطلب یہ کہ انہوں نے مجھے نذیر بیگ کی جادوگری

دکھانے کے لیے بلایا تھا۔“

”جادوگری!“

”نذیر بیگ کی جادوگری!“

”ہاں بھئی! نذیر بیگ کیمرے کے سامنے اپنی اداکاری کے جو جادو جگا رہے تھے اسے دیکھ کر تو میں بھی حیران پریشان ہو گیا۔ مجھے پہلے تو یقین نہیں آیا۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ پتا نہیں یہ کیا ماجرا تھا۔ کس کی دعاؤں کے اثر سے یہ شرمیلا اور ہر وقت خوف زدہ نظر آنے والا لڑکا، اتنے اعتماد کے ساتھ اداکاری کر رہا تھا جیسے کوئی مجھنا ہوا تجربہ کار اداکار پر فارم کر رہا ہو۔“ وہ ذرا رکے پھر بولے۔ ”بھینانے یہی جادوئی تماشا دکھانے کے لیے مجھے بلایا تھا۔“

ذرا دیر کے لیے سب کے چہرے پر طمانیت کے آثار دکھائی دیے۔ پھر نجمہ رحمن بولیں۔ ”تم بھی کچھ کم اداکار نہیں ہو۔ ہم تمہاری اداکاری سے لطف اندوز ہوئے۔ اب اصل بات بتا دو کیوں بلایا تھا کیپٹن صاحب نے تمہیں؟“

”ارے بھائی! اصل بات یہی ہے۔ آپ کی قسم بھیا

نے اسی لیے مجھے بلایا تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے نذیر بیگ

کی جادوگری دیکھ لوں۔“

”کیا تم واقعی سچ کہہ رہے ہو؟“

”جب وہاں شوٹ کیے ہوئے رش پرنٹ نکلیں گے تو

آپ لوگ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے گا۔ اس جادوگر کی

جادوگری۔“

سب نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ سب کو خوشی

ہوئی تھی مگر جو فرزانہ کو بھی تھی وہ ناقابل بیان تھی۔ ”یہ

مجھے بھی اس جادوگر کی جادوگری دیکھنے کا موقع ملے گا جس نے مجھے پہلی ہی نظر میں ہوش و حواس بے گانہ کر دیا تھا۔
قلم ریلیز ہوگی تو ہر دیکھنے والا اس کے جادو کا امیر ہو جائے گا۔

اس جادوگر لڑکے کے بارے میں ڈھاکے میں اگر کچھ لوگ کچھ جانتے تھے تو وہ یہی کہ یہ ایک گلوکار ہے شوقیہ گلوکار جو فلمی گانے گا کر اپنا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے۔ اس مقصد سے وہ کراچی سے ڈھاکے آیا ہے۔

لہذا اس کے اداکار بننے کی مزید کہانی سنانے سے پہلے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈھاکے آنے سے پہلے کراچی میں گزارے ہوئے اس کے شب و روز کی روداد کتنی سنا دی جائے۔ اس کے لیے میں نے اس کے ایک انتہائی قریبی دوست پونسی ہمد کی تحریر سے مدد لی۔

”یہ اس کا تعلیمی دور تھا۔ میٹرک پاس کر کے اس نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اسلامیہ کالج کراچی کا ایک ایسا کالج تھا جہاں طالب علموں کی فوج ظفر موح ہوا کرتی تھی۔ یہ کالج اپنے وقت کا مقبول ترین کالج تھا۔ اس نے ادب، اسپورٹس اور فنون لطیفہ کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اتوار کو یہاں ہفتہ واری چھٹی ہوا کرتی تھی۔ ہفتے کے دن جب کلاسز آف ہو جاتی تھیں تو چند لڑکے اپنی کلاس کی اندر سے چھٹی لگا لیا کرتے تھے اور پھر کلاس کے دو تین فنکار طالب علم نذیر بیگ، امیر احمد خان اور قاسم صدیقی موسیقی کی محفل سجالیتے تھے۔ چھپا کر لائے ہوئے ہارمونیم اور طبلہ لگا لے جاتے احمد خان ہارمونیم اور قاسم صدیقی طبلہ سنبھال کر اپنے فن کے جوہر دکھاتے اور نذیر بیگ اپنے گیتوں سے محفل موسیقی میں رنگ بھرتے اس طرح یہ آرٹس گروپ اپنی کارکردگی میں اتنا مشہور ہو گیا کہ جب بھی انٹر کالجیٹ میوزک کمیشن ہوتا تو اسلامیہ کالج کے امیر احمد خان کو پہلا، قاسم صدیقی کو دوسرا اور نذیر بیگ کو تیسرا انعام ضرور ملتا تھا اور یوں میوزک ٹرائی اسلامیہ کالج آ جاتی تھی۔ ان دنوں نذیر بیگ کو کمیشن کے تین چار گیت یاد تھے۔ خاص طور پر وہ یہ دو گیت ہر محفل میں سنایا کرتا تھا۔“

☆ چاند آجیں بھرے گا پھول دل تمام لیں گے

☆ چھوٹی سی یہ زندگی تیری دودن کی یہ جوانی تیری

یہ دودنوں گیت ان دنوں نذیر بیگ کی پہچان بن گئے

تھے۔ جس محفل میں وہ جاتا اس سے انہی گیتوں کی فرمائش کی جاتی تھی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلامیہ کالج میں آج کے دور کی کئی نامور شخصیتیں یکجا تھیں بلکہ تقریباً ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں جن میں ریڈیو پاکستان کراچی کا سینئر پروڈیوسر امیر احمد خان، ریڈیو کا نامور صدا کار طلعت حسین، ٹی وی پروڈیوسر ایم ظہیر خان، ٹی وی پروڈیوسر اقبال حیدرو آفتاب عظیم اور دعویٰ ٹی وی کا کمپیئر سلیم جعفری۔ اسلامیہ کالج میں ہم سب ایک ہی کلاس میں تھے اور فنکارانہ سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھے۔ کمپین سے لے کر کرکٹ کا من روم تک ہماری بڑی آؤ بھگت تھی۔

ان دنوں اسلامیہ کلب کی بھی بڑی شہرت تھی۔ وہاں بڑے بڑے نامور فنکار اپنے فن کا جادو جگانے آتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے فنکار دوست بھی وہاں اکثر پروگراموں میں مدعو کیے جاتے تھے۔ امیر احمد خان، قاسم صدیقی اور نذیر بیگ زمانہ طالب علمی ہی میں اسلامیہ کلب کے پروگراموں کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے جب کہ بہت سارے فنکار ابھی سیکنڈ ایئر کے طالب علم تھے۔

ایک دن پتا چلا کہ اسلامیہ کلب میں ڈھاکا سے آئے ہوئے فنکاروں کا ایک بڑا زبردست میوزیکل پروگرام ہے۔ پروگرام والے دن ہم بھی وہاں پہنچے۔ بنگالی فنکاروں نے اپنے فن سے لوگوں پر جادو کر دیا تھا۔ فردوسی بیگم جو بڑی اچھی گلوکارہ بھی جس کی آواز میں اپنا جادو تھا جو سر پڑھ کر یوتا تھا۔ اس پروگرام میں نذیر بیگ نے بھی اپنی پرفارمنس دی تھی۔ یہیں فردوسی بیگم سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے نذیر بیگ کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور اسے ڈھاکا جا کر قسمت آزمائی کا مشورہ دیا۔ فردوسی کا یہ مشورہ نذیر بیگ کو اچھا لگا تھا مگر رات گئی بات گئی کے مصداق غالباً وہ اسے بھول گیا۔

امتحانات سر پر آئے تو سب یکسوئی سے امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور پھر جب امتحان کا مرحلہ ختم ہوا اور پھر سے نئی کلاس میں موسیقی کی محفلوں کا آغاز ہوا تو اس میں نذیر بیگ کی غیر حاضری محسوس کی گئی۔ جب اس غیر حاضری نے طول پکڑا تو دوستوں کو تشویش ہوئی کہ یہ خود ہر فنکار کہاں غائب ہو گیا ہے؟ لہذا دوستوں نے اس کی کھوج شروع کر دی۔ ایک دن سلیم جعفری نے کہا۔

”یارو! یہ پرعدہ تو لگتا ہے کہیں اڑ گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اس شہر میں وہ کہیں بھی موجود نہیں

”ہے۔“ ”مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔“ امیر احمد خان نے کہا۔
”کہاں اڑ گیا؟ کس شاخ پر جا بیٹھا؟“

”ہاں یہ بات معلوم کرنے کی ہے۔“
اور پھر چند دنوں کے بعد سلیم جعفری جو دور کی کوڑی
لانے کا ماہر تھا۔ یہ بتایا۔ ”بھائیو! نذیر بیک کی گمشدگی کا پتا
چل گیا ہے۔“

سب اس کی طرف ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ”مصدقہ خبر
ہے کہ نذیر بیک اسلامیہ کلب کے سیکریٹری مجید صاحب کے
ساتھ ایک فچرل ٹرپ میں شامل ہو کر ڈھاکے گیا ہوا ہے۔“
”اوہ!“ سب کے منہ سے فوری طور پر یہی لفظ نکلا
تھا۔

”اس بارے میں کچھ پتا چلا کہ وہ کب آئے گا؟“
”اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ البتہ امکان اس
بات کا ہے کہ جب تک وہ کچھ بن نہیں جائے گا۔ اس کی
واپسی کا امکان نہیں۔“

سب نے سمجھ لیا قدرت اسے آگے بڑھانے کے لیے
مختلف مراحل سے گزار رہی ہے۔ اس کا حادثاتی طور پر
ڈھاکے پہنچنا اور پھر گلوکاری کے پائیدان پر پیر رکھ کر
اداکاری کے میدان میں قدم بھانے کا مرحلہ یہ سب کچھ
قدرت کا کارنامہ تھا۔ قدرت اس پر مہربان ہوئی تو اس کے
خلاف تمام تر مخالفتیں بے اثر ہو گئیں۔ رانگا مانی سے اپنی
ابتدائی شوٹنگ مکمل کروا کر وہ واپس ڈھاکے آیا تو اس کی قدر
وقیمت بدل چکی تھی۔ جاتے وقت اس کی جو حیثیت تھی اس
میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ ایک اداکار، ایک بھرپور
اور بے پناہ صلاحیتوں کا اداکار سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کی
شوٹنگ کے رخصسہ دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ اتنی نیچرل
اداکاری جیسے وہ کوئی پیدا کئی اداکار ہو۔ ایف ڈی سی کے
نگار خانے میں رخشو دیکھنے والوں میں گھر کے افراد کے
علاوہ فلم انڈسٹری کے چیدہ چیدہ افراد بھی تھے۔ سب نے
کیپشن احتشام کو زبردست مبارک باد دی کہ یہ کارنامہ آپ
ہی کا ہے کہ ایسا انمول ہیرا آپ نے فلم انڈسٹری سے
متعارف کرایا۔

ندیم کو فلم والوں نے مبارک باد دی اور کہا۔ ”یار اتم
نے تو کمال کر دیا۔“

”نہیں میرا کوئی کمال نہیں۔“

”پھر یہ کس کا کمال ہے؟“

ندیم کی ہیر و شنیں

ندیم کی ہیر و شنوں کی تعداد 26 ہے۔ اس طرح
یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ہیر و شنوں کی بھی
سلور جوبلی کی ہے۔ انہوں نے معروف اور صنف
اول کی ہیر و شنوں کے ساتھ بھی کام کیا اور غیر
معروف اداکاراؤں کے ساتھ بھی۔ انہوں نے
اپنی فلمی زندگی کا آغاز بنگالی اداکارہ شبانہ کے
ساتھ کیا مگر سب سے زیادہ فلمیں شبنم کے ساتھ
کیں۔ شبنم اور ندیم کی مشترکہ فلموں کی تعداد
48 ہے جب کہ دوسرا نمبر بابرہ شریف کا ہے۔

ان دونوں کی مشترکہ فلموں کی تعداد 27 ہے۔
شبانہ کے ساتھ ندیم کی 9 مشترکہ فلمیں ہیں۔ دیپا
کے ساتھ 10 فلموں میں اداکاری کی ہے۔ رانی
اور ندیم کی تین مشترکہ فلمیں ہیں۔ نشو نے ندیم
کے ساتھ 9 فلموں میں کام کیا۔ شیم آراء اور
ندیم کی مشترکہ فلمیں 3 ہیں۔ بنگلہ دیشی اداکارہ
سیتا نے دو فلموں میں ندیم کی ہیر و شن کا کردار ادا
کیا ہے۔ کویتا اور ندیم کی مشترکہ فلموں کی تعداد
12 ہے۔ سسلی آغا نے دو فلموں میں ندیم کی
ہیر و شن کا رول ادا کیا۔ ترکی کی اداکارہ نازاں
نے بھی ندیم کے ساتھ دو فلموں میں بطور ہیر و شن
کام کیا۔ نادرہ نے چار فلموں میں ندیم کے ساتھ
کام کیا۔ کنول کے ساتھ تین فلموں میں کام کیا۔
ثمینہ پیرزادہ کے ساتھ دو فلموں میں مرکزی
کردار ادا کیا۔ 9 ہیر و شنیں ایسی ہیں جنہوں نے
صرف ایک ایک فلم میں کام کیا ہے۔ اداکارہ ...
(فلم میں کہاں منزل کہاں)، روزینہ (فلم
سوغات)، عالیہ (فلم دامن اور چنگاری)، زبیا
(فلم پاکسی)، انجمن (فلم دور استے)، سری لنکا کی
اداکارہ سیتا (فلم زمین آسمان)، نیپالی اداکارہ
ششما شہی (فلم چوروں کی بارات)، بنگلہ دیشی
اداکارہ چوریتا (میری عدالت)، نیلی (فلم
عبداللہ دی گریٹ)۔

”مجھے تو کیپٹن صاحب نے جو کہا جو سمجھایا میں نے بس ویسا ہی کر دیا۔“

رائگانا مائی سے واپس آنے کے بعد ایک اور انقلابی اعلان کیا گیا۔ نذیر بیگ! ایک فلم آرٹسٹ کی حیثیت سے تمہارا یہ نام پسند نہیں۔ میرے خیال میں تمہارا فلمی نام ندیم ہونا چاہیے۔

نذیر بیگ بے چارہ کیا کہتا۔ اسے تو اداکاروں کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم بھی نہ تھا۔ اسے نہ اداکاری سے دلچسپی تھی نہ اداکاروں سے۔ اسے تو گمانے کا چکا تھا۔ گانے والے ہی اسے پسند تھے۔ محمد رفیع، مکیش، ہمنٹ کمار، کشور کمار وغیرہ۔

اس نے دھیرے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے کیپٹن صاحب! آج سے بطور اداکار میں مرزا نذیر بیگ نہیں ندیم ہوں۔“

”کیا تمہیں میرا دیا ہوا یہ نام پسند نہیں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بہت اچھا نام ہے۔ مجھے بھی پسند آیا ہے۔“

ہدایت کار احتشام نے اخباروں اور جریدوں کے نمائندوں سے کہا۔ ”ہماری نئی فلم ”چکوری“ کے ہیرو کا نیا فلمی نام ندیم ہے۔ آپ لوگ اب نذیر بیگ کی بجائے اسے ندیم ہی کے نام سے یاد رکھیے گا۔“

اخباروں میں یہ خبر چھپ گئی کہ گلوکار نذیر بیگ جو کیپٹن احتشام کی فلم ”چکوری“ میں ہیرو کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کا فلمی نام ندیم رکھا گیا ہے۔ اب وہ اسی نام سے یاد کیا جائے گا۔

فرزانہ جس کی دعاؤں سے نذیر بیگ، ندیم بن گیا تھا۔ اسے بھی پایا کا دیا ہوا یہ نام اچھا لگا تھا۔ اب ہر وقت اس کا دل بھی چاہتا تھا کہ اس کے ندیم کی فلم جتنی جلدی ممکن ہو سکے ریلیز ہو جائے مگر اس کی اس تمنا اس خواہش کے آگے حالات اور واقعات دیوار بن گئے تھے۔ بابا اور انکل کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کی زیر تحمیل فلم تم سے کم دقت میں ریلیز ہو جائے مگر اس بار نئی فلم چکوری کی تکمیل کے سلسلے میں یہ فارمولا کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات، ایسا رخ نہ ہو جاتا کہ چکوری کی شوٹنگ میں تاخیر ہوئی چلی گئی۔ سابقہ فلموں کی طرح کم مدت میں مکمل ہونے کی بجائے، رک رک کر اس کی فلم بندی ہونے لگی۔ اس صورت حال سے شاید ندیم سے زیادہ فرزانہ پریشان تھی۔ وہ جتنی

جلدی اپنے ہیرو کو سلور اسکرین پر جلوہ گرد دیکھنا چاہتی تھی اسی قدر تاخیر ہوئی جا رہی تھی۔ اس ناچنر کی دیکر وجہ کے علاوہ ایک وجہ کیپٹن صاحب کے شوگر کا عارضہ تھا جو ان دنوں انہیں زیادہ تنگ کر رہا تھا۔ بہر حال کئی مہینوں کی ایکسٹرا مدت گزرنے کے بعد شوگر کا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ اب اس کا ان ڈور کام باقی رہ گیا تھا کہ کیپٹن صاحب کی بیماری انہیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ فرزانہ ایسے حالات میں اپنے باپ سے کیا کہتی۔ ایک دن مستفیض انکل سے بول پڑی۔ ”آخر یہ فلم کب تک التوا کا شکار رہے گی؟“

”تم کس فلم کی بات کر رہی ہو بیٹا؟“

”یہ جو بابا بیمار ہے ہیں چکوری کے نام سے۔“

”تم تو دیکھ رہی ہو کہ ان کے شوگر نے انہیں کس قدر پریشان کر رکھا ہے۔“

”اس پریشانی کی وجہ بھی تو وہ خود ہیں۔ بیٹھا کھانے سے باز نہیں آئیں گے، پرہیز نہیں کریں گے تو پریشان تو ہوں گے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔ اس بیماری میں دوا سے زیادہ پرہیز ضروری ہوتا ہے۔“

”انکل! آپ ہی چکوری کے لیے کچھ کیجیے۔“

”میں کیا کروں بیٹا! وہ تمہارے پایا کی فلم ہے۔“

مستفیض بولے۔ ”میں کچھ کہوں گا تو وہ ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔“

”اچھا! ٹھیک ہے۔ میں ہی ان سے کہتی ہوں۔“

اور ایک دن پایا کا موڈ مزاج اچھا دیکھ کر فرزانہ نے کہہ ہی دیا۔ ”آپ کا زبردست کارنامہ کب منظر عام پر آئے گا۔“

”کون سا کارنامہ بیٹا! میرے تو بہت سے کارنامے ہیں۔“

”آپ کی لوجسٹ کی بہت بڑی فلم چکوری کب ریلیز ہوگی؟ کب آپ کے نام کا ڈنکا بجے گا؟“

کیپٹن صاحب مسکرائے۔ پھر اداس ہو گئے۔ ”اس بیماری نے تو مجھے کسی کام کا نہیں رکھا ہے۔ دعا کرو۔ میری طبیعت سنبھل جائے۔“

”پاپا! میں ایک بات کہوں؟“

”ہاں ہاں کہو۔“

”آپ اپنے بھائی سے کہیں نا۔ وہ اس فلم کا باقی کام مکمل کر دیں۔“

”ہاں تمہارا یہ آئیڈیا اچھا ہے مگر وہ تو شاید اپنی آنے والی فلم کی تیاری کر رہا ہے۔“

”ان کا کام بھی ہوتا رہے گا۔ آپ اپنی فلم کی تکمیل کے بارے میں ان سے کہہ کر تو ویسے۔“

”ٹھیک ہے میں مستفیض سے بات کروں گا۔“

کپٹن صاحب کے کہنے پر مستفیض نے چکوری کے شوٹ کیے ہوئے حصوں کو دیکھا تو سر پیٹ لیا۔ یہ بھیا نے ندیم کی غیر معمولی اداکاری کی وجہ سے اتنے طویل طویل شاٹ لیے ہیں۔ کہانی کو اس قدر کھینچا ہے کہ اچھی خاصی فلم ورنہ دوسرے بن جائے گی۔ انہوں نے فلم کے ٹپو کو تیز رکھنے کے لیے غیر ضروری حصوں کو کاٹنا شروع کیا اور چند دنوں کی جان توڑ مشقت کے بعد باقی حصوں کو اس طرح لنک اپ کیا کہ کہانی کے تمام تر تاثرات کے ساتھ فلم ابتدا سے انتہا تک پہنچی۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر اس کا ایک خصوصی شو ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں ہی کیا جس میں گھر کے تمام لوگوں کے علاوہ یونٹ کے افراد اور اہم فلم والے شریک ہوئے۔ سب نے اس کی تعریف کی کہ کہانی، موسیقی، اداکاری اور ہدایت کاری کو جس چابکدستی کے ساتھ اس فلم میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ اس فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کرے گی۔

سب لوگ بہت خوش ہوئے۔ فرزانہ کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ اس نے اپنے پایا اور انکل سے کہا ”اب اس فلم کی نمائش کا بندوبست کیجیے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“

”ہاں بیٹا! ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اب یہ فلم ریلیز ہو جائے۔“

”بھیا! میرا تو خیال ہے کہ اس فلم کی نمائش سے پہلے اس کے پروڈیوسروں کو یہ فلم دکھا دی جائے کہ وہ اس سے مطمئن ہیں یا نہیں۔“

”ہاں اس بار یہ ضروری ہے۔“

اور دونوں بھائی دوسرے ہی لمحہ کے دفتر پہنچ گئے۔

”نئی فلم مکمل ہو گئی ہے۔“

”اچھا! ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کبھی مکمل نہیں ہوگی۔“

”وہ میری بیماری کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔ بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ پہلے آپ لوگ یہ فلم دیکھ لیں۔ پھر اس کی نمائش کا پروگرام ترتیب دیا جائے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ ذرا ہم بھی دیکھ لیں۔ کیا کارنامہ انجام دیا ہے آپ لوگوں نے۔“

نبی اور انجمن ایسی اداکارائیں ہیں جنہوں نے اور بھی کئی فلموں میں ندیم کے ساتھ کام کیا ہے لیکن وہ ان فلموں میں ندیم کی ہیروئن نہیں تھیں۔

اداکارہ شبنم نے جن 9 فلموں میں ندیم کی ہیروئن کا کردار ادا کیا ان میں ایک فلم پلانیم جوبلی اور دو فلموں نے گولڈ جوبلی کی۔ ان میں کچھ فلمیں سابق مشرقی پاکستان کی اور تین پاکستان کی تھیں۔

شبنم اور ندیم کی مشترکہ 48 فلموں میں 15 فلموں نے گولڈ جوبلی تین فلموں نے پلانیم جوبلی اور 7 فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کی جن میں چار سال تک مسلسل چلنے والی فلم آئینہ بھی ہے جس نے کراؤن جوبلی کی جب کہ ان دونوں کی ناکام فلموں کی تعداد 10 ہے۔

☆☆☆

بابرہ شریف اور ندیم کی مشترکہ 27 فلموں میں شمع، انتظار، بھول، پرس، پلے یو آئے، آس پاس، مہربانی، قاتل کی تلاش نے گولڈ جوبلی کی۔ تلاش، لا جواب اور سنگدل نے ڈائمنڈ جوبلی اور زندگی نے پلانیم جوبلی کی جب کہ درد، آنگن، گوری دیاں جھانجراں، خونی شعلے اور شہزادہ اس جوڑی کی ناکام فلمیں ہیں۔

کوئٹا اور ندیم کی مشترکہ 12 فلموں میں میاں بیوی راضی نے پلانیم جوبلی کی جب کہ محبت اور مہنگائی، عشق عشق، محبت ایک کہانی، مہندی لگی میرے ہاتھ، گولڈن جوبلی فلمیں تھیں۔ مٹی بھر چاول، محل میرے سپنوں کا، بارود کی چھاؤں اور آندھی نے بھی کامیابی حاصل کی۔ کیسے کہوں اور خوش نصیب اس جوڑی کی ناکام ترین فلمیں تھیں۔

نشو اور ندیم کی مشترکہ 9 فلموں میں نادان ڈائمنڈ جوبلی فلم، بازی، سماج، پھول میرے گلشن کا گولڈن جوبلی جب کہ ان کی ناکام فلمیں انگارے، حیرا غم رہے سلامت، گمراہ اور مٹی کے پتے تھیں۔

دیبا اور ندیم نے دس فلموں میں ہیروئن ہیروئن کے کردار کیے جن میں 5 فلمیں کامیاب اور 5 فلمیں ناکام ثابت ہوئیں۔ دو فلموں نے گولڈن جوبلی کی۔

اور پھر ایک خصوصی شو کا اہتمام گلستان سینما میں ہوا جس میں دونوں باپ بیٹوں نے ”چکوری“ دیکھی۔
 ”کیسی ہے؟“ فلم کے اختتام پر ٹیٹن صاحب نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ خالص کاروباری انداز میں جواب ملا۔

”دیکھئے۔“ ڈوسانی بولے۔ ”نئے آرٹسٹوں کی فلم ہے۔ اس لیے اس کی نمائش سے پہلے اس کی پبلسٹی پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔“

”جی ہاں یہ بات تو ہمارے پیش نظر بھی ہے۔“ مستفیض بولے۔ ”بتائیے اخبارات وغیرہ میں آپ لوگ کب سے اشتہار دینا شروع کریں گے۔“
 ”شیڈول کی پبلسٹی کے علاوہ بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔“ بڑے ڈوسانی نے کہا۔

”بتائیے۔ اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں کیا آئیہ یا ہے؟“

”میرا تو خیال ہے۔ اس فلم کی نمائش سے ہفتہ دس دن پہلے اس کا پریس شو لکھا جائے تاکہ اخبارات و جرائد میں اس کی نمائش سے پہلے اس کے بارے میں تنقید و تمبرے چھپ جائیں۔“

بیٹے نے باپ کی بات آگے بڑھائی۔ ”یہ پبلسٹی اشتہارات سے کہیں بڑھ کر موثر ہوگی۔ اخبارات کسی بات کی تعریف کریں نہ کریں نئے ہیرو کی پرفارمنس کا ضرور تذکرہ کریں گے۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ فلم کی نمائش سے بہت پہلے گلستان سینما میں اس کا پریس شو کا انعقاد ہوا۔ میں نے بھی بطور اخباری نمائندہ کے اس پریس شو میں شرکت کی۔

ان دنوں ڈھاکے کا سب سے بڑا فلمی اخبار ”چترالی“ تھا جو دو زبانوں میں چھپتا تھا۔ بنگالی اور اردو۔ اردو چترالی کے ایڈیٹر انچیف زین العابدین تھے۔ اگرچہ میں چترالی کا اسٹاف نہیں تھا مگر اس دفتر میں کام کرنے والے سارے لوگ میرے دوست تھے۔ اس لیے وہاں آنا جانا رہتا تھا۔

زین العابدین نے مجھ سے کہا۔ ”یار انور فرہاد! تم ”چکوری“ کا تمبرہ لکھ دو۔“

”زینو بھائی! یہ کام تو آپ خود بھی کر سکتے ہیں۔ آپ خود لکھ دیجئے نا۔“

”یار! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں نے اس فلم کا اسکرپٹ لکھا ہے۔ لوگ بھی کہیں گے کہ اپنی فلم کی تعریف کی ہے۔“

ان کی بات معقول تھی۔ اگرچہ فلم کے کریڈٹ میں نہ کہانی کے شعبہ میں ان کا نام دیا گیا تھا نہ مکالمے میں۔ مصنف کے طور پر نجمہ رحمان کا نام تھا۔ مکالموں کا ذکر ہی نہیں کیا گیا تھا کہ کس کے زور قلم کا نتیجہ ہے؟ یہ ان دونوں بھائیوں کا ویرہ تھا کہ مصنف کے طور پر اپنے ہی خاندان کے لوگوں کا نام دیتے تھے۔ مثلاً ”چھوٹے صاحب“ کے کہانی نویس مستفیض۔ ”چاند اور چاندنی“ کی مصنفہ نجمہ رحمان۔ ”قلی“ کے کہانی کار مستفیض۔ ”داغ“ کے کہانی نویس آئی اے رحمان اور ”ناٹائی“ کے مستفیض۔ اگرچہ یہ لوگ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ بس صاف ستھری اردو بول لیتے تھے۔

لیو قلم کا ادارہ بھی شباب بروڈکشن کی طرح تھا کہ اس ادارے کی فلم بڑی پابندی سے بنی تھی۔ یکے بعد دیگرے دونوں بھائی فلم ڈائریکٹ کرتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کی فلمیں لکھنے والے رائٹران کی یہ زیادتی برداشت کر جاتے تھے کہ چلو باہر کے لوگ نہ سہی قلم والے تو جانتے ہیں کہ فلاں فلم کس نے لکھی ہے۔

ہاں بات ”چکوری“ کے تمبرے کی مور ہی تھی۔ میں زینو بھائی کے حکم پر ”چکوری“ کا تمبرہ لکھنے بیٹھا تو اس کے ہیرو نے ادا کار ندیم کی اداکاری کے بارے میں ایک مکمل مضمون لکھ بیٹھا۔ یہ سوچ کر کہ اس فلم کا تمبرہ تو سارے اخباروں میں شائع ہوگا۔ زینو بھائی کو یہ تحریر دی تو اسے پڑھ کر انہوں نے کہا۔

”میں نے تو تمہیں تمبرہ لکھنے کو کہا تھا۔“

”ہاں! آپ نے کہا تھا۔ مگر وہ تو سارے اخبارات و جرائد میں شائع ہوگا۔ نئے ہیرو کے بارے میں پہلی تحریر کے طور پر یہ تحریر آپ کو چھاپنے کا اعزاز ہوگا۔“

”ہاں! یہ بات بھی درست ہے۔ تم نے اس فلم کے ہیرو کی اداکاری کے بارے میں بہت اچھی تحریر لکھی ہے۔“

فلم کی نمائش سے پہلے ”چترالی“ میں نئے اداکار ندیم کے بارے میں یہ تحریر شائع ہوئی تو ڈھاکے کی فلم انڈسٹری کے لوگوں کے علاوہ شائقین فلم نے بھی اس پر اپنے ایکشن اور ری ایکشن کا اظہار کیا۔ اداکار عظیم جس سے میرا بڑا یار تھا، نگار خانے میں اس سے ملاقات ہوئی تو مجھ سے الجھ

عجیب اتفاق

موسیقار نثار بڑی صاحب نے ابھرتے ہوئے گلوکار کی حیثیت سے نذیر بیگ کو اپنی دو فلموں ”یہ کراچی ہے“ اور ”شیرا“ میں پہلی بار پہلے بیک سکر کی حیثیت سے گانے کا چانس دیا تھا مگر دونوں ہی فلمیں مکمل نہ ہو سکیں۔ ان میں سے کسی ایک فلم میں نذیر بیگ نے خورشید شیر کی ساتھ ایک دو گانا ریکارڈ کرایا تھا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ جب نذیر بیگ ہیرو بن گئے اور ندیم کے نام سے فلموں میں کام کرنے لگے تو وہی دو گانا۔

بہت یاد آئیں گے وہ دن صنم تیری قسم
فلم ”انیلا“ میں مہدی حسن کی آواز میں ندیم
صاحب پر قلم ایا گیا کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے۔

اور کئی کو اپنے بھول بنے اور گلشن کی رونق میں اضافہ کرنے کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اس لیے اس نو زائیدہ اداکار کو بھی اپنی قدر و قیمت کا احساس نہیں تھا۔ وہ اداکاری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اچھی اداکاری کیا ہوتی ہے؟ بری اداکاری کیا ہوتی ہے؟ ان اداکاری کے ابتدائی دور میں اس غریب کہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس بات کا اظہار انہوں نے خود کیا ہے۔ اپنے ایک حالیہ انٹرویو کے درمیان انہوں نے کہا۔

”اس فلم کے مکمل ہونے کے بعد جب یہ فلم سب سے پہلے ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں چلائی گئی تو میں اپنی اداکاری دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا اور چپکے سے وہاں سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں اپنے آپ کو کون سے لگا کہ میں نے کیوں فلم میں کام کیا۔ کراچی میں میرے دوست احباب اور گھر والے اگر میری یہ فلم دیکھیں گے تو وہ کیا سوچیں گے؟ میرے وہم و گمان میں کبھی نہیں تھا کہ یہ فلم ہٹ ہو جائے گی اور لوگوں کو بہت پسند آئے گی۔“

ندیم صاحب نے اپنی پہلی فلم کی نمائش کے بعد کا احوال سناتے ہوئے کہا۔ ”جب لوگ مجھے اس فلم کی پسندیدگی کی خبریں دیتے تو میں سوچتا۔ یہ لوگ میرا دل رکھنے کے لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔“

اسی انٹرویو میں وہ کہتے ہیں۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ مجھے اداکاری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ احتشام صاحب جو

گیا۔“ میری اتنی بڑی بڑی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ تم نے کبھی میرے لیے تعریف کے دو کلمے نہیں کہے۔ اس نئے لوٹے پر تم نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ وہ تمہاری بولی بولنے والا ہے نا۔ اس لیے تم نے اس کے ساتھ یہ جانبداری برتی ہے۔“

وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے لائٹ موڈ میں کہا۔ ”تم نے بے شک بڑی بڑی فلموں میں کام کیا مگر کاش کہ تمہاری اداکاری میں بھی کچھ بڑا پن ہوتا۔ کوئی بڑی بات ہوتی۔ کوئی انوکھا انداز ہوتا۔ جس کی وجہ سے تمہاری ان فلموں کو فائدہ پہنچتا۔ وہ فلمیں کامیاب ہوتیں۔ میں نے ندیم کے ساتھ کوئی جانبداری نہیں برتی ہے۔ اس نے جو اداکاری کی ہے اس کی تعریف کی ہے۔ اس کی یہ فلم واقعی تمہاری فلموں کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے۔ بلکہ اینڈ وائٹ ہے۔ لو بجٹ کی ہے۔ مگر دیکھنا تمہاری رنگین اور سینما اسکوپ فلموں سے کہیں زیادہ کامیاب ہوگی اور اس کی کامیابی میں اس کے نئے ہیرو کا بھی نمایاں کردار ہوگا۔ اس کی اداکاری اسے بہت آگے لے جائے گی۔“

عظیم یوں بھی پہلے سے تپا ہوا تھا کہ کیپٹن نے اسے کاسٹ کرنے کی بجائے پیسا بچانے کے لیے نئے ہیرو ہیروئن کو لے کر فلم بنائی۔ شاید اسے اسی بات کی توقع ہوگی کہ میرے بغیر بننے والی فلم دو دوڑی کی ثابت ہوگی۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ تبصرہ خود ندیم کا تھا۔ اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے بھی شکایت کی۔ ”انور صاحب! آپ نے میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی لکھ دیا ہے۔“

”نہیں زیادہ نہیں جو لکھنا چاہیے تھا وہی لکھا ہے۔“
”یہ جو آپ نے مجھے وحید مراد اور محمد علی کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیا ہے یہ زیادہ نہیں ہے؟“
”نہیں ہرگز نہیں۔ تمہارے اندر جو فنی صلاحیتیں ہیں میں نے اسی کے تناظر میں لکھا ہے۔“

میں نے لکھا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ”پکوری“ کا ہیرو وحید مراد اور محمد علی کی نگر کا ہیرو بن جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ آنے والے دنوں میں میری بات میرا وٹن صد فیصد درست ثابت ہوا۔ میں چونکہ ایک صحافی ہوں اور اچھے اور تجربہ کار صحافی سامنے کی باتوں کو دیکھ کر دور کی باتوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ ندیم چونکہ ان دنوں کچی کلی کی طرح تھے

”جیتے رہو۔ تم بہت اچھے بہت نیک اور فرمانبردار لڑکے ہو۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ اللہ نے تمہیں جو عزت اور شہرت دی ہے تم اس کی قدر کرو۔ تاکہ دوسرے بھی تمہاری قدر کریں۔ عزت کریں۔“

”مجھے تو کچھ پتا نہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آپ لوگ ہی بتائیں۔“

”دیکھو سب سے پہلے تو تم اپنا بوریا ستر اٹھا کر یہاں ہمارے پاس آ جاؤ کہ اب تم سڑک چھاپ لو جو ان نہیں ہو۔“

”ہم تمہیں یہاں آنے کو اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ابھی تم اپنا کوئی علیحدہ مکان لے کر نہیں رہ سکتے۔“

”مگر..... آپ لوگوں کا مجھ پر پہلے ہی اتنا احسان ہے۔“

”احسان و احسان کچھ نہیں اگر ہم ایک دوسرے کے وقت میں کام نہیں آئے تو انسان کہلانے کے بھی حقدار نہ ہوں گے۔“

”دیکھو بیٹے شو بڑی دنیا کا کچھ اپنا ہی طور طریقہ ہوتا ہے۔ بڑا اداکار بننے کے لیے بڑی ترقی کرنے کے لیے بڑی احتیاط اور بڑی سوجھ بوجھ سے کام لینے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔“

”یہاں ہمارے پاس کچھ دن رہو گے تو ہم تمہیں گائیڈ کریں گے۔ اوجھڑا سچا سمجھائیں گے۔ پھر جب تم خود بھلے برے کی تمیز کرنے لگو گے تو اپنی پسند سے اپنی دنیا آباد کر لینا۔“

قصہ مختصر یہ کہ نذیر بیک کو جو ”چکوری“ کا کامیاب ہیرو بن کر ندیم بن گیا تھا ان کے گھر نیا سا کٹن روڈ منتقل ہوتا پڑا۔ وہ بڑا خود دار تھا۔ اسے ان کے گھر جا کر بڑا عجیب سا لگا۔ ایک ویل فریڈ کمر اس کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ اس کی خدمت کے لیے نوکر چاکر تو لگے ہی رہتے تھے مگر اس کی اصل مگرانی فرزانہ کی ذمہ تھی۔

”آپ میرے لیے کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ مجھے یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں، یوں بھی میں اپنا کام خود کرنے کا عادی ہوں۔ جب کہ اتنے نوکر چاکر میرے آگے بھیجے لگے رہتے ہیں۔“

وہ بے چاری کیا کہتی اور کیسے کہتی کہ ہم لوگ تمہارے ساتھ یہ بدتاؤ کیوں کر رہے ہیں؟ بس وہ مسکرا کر کہتی۔ ”ندیم صاحب! اب آپ نذیر بیک نہیں ہیں۔“ ”چکوری“

کہتے۔ میں وہی کر دیا کرتا تھا۔ کیونکہ اس وقت مجھے اداکاری بالکل نہیں آتی تھی۔ اس لیے اس فلم میں بدانت اور تصنع بالکل نہیں ہے۔ بلکہ سچائی اور مصمصیت ہے جو میرا اصل ہے۔“

اس نئے نولے اداکار کو اپنے کام کا اندازہ ہونا ہو اس فیلڈ کے تجربے کار اور گہری نگاہ رکھنے والے لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے اندر خدا داد صلاحیتیں موجود ہیں اور اداکاری کے آسمان پر یہ چاند سورج بن کر چمکے گا۔ ان لوگوں میں کپٹن احتشام اور ان کے گھر والے سرفہرست تھے۔ ان لوگوں نے پہلی فرصت میں ایک خفیہ میٹنگ کی جس میں یہ بات سامنے لائی گئی کہ یہ گویا نیا بھجور جو سو فیصد ہماری دریافت ہے کہیں اسے دوسرے نہ لے اڑیں۔ فلم انڈسٹری میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہوا تو ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ چڑیاں کھیت چگ جائیں گی۔ ہمیں اس کے تذکرے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ کس طرح ہم اپنے حق میں اس کے حقوق کے مالک بن سکتے ہیں؟ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس کے پر پڑے نکل جائیں اور وہ خود پھر سے اڑ جائے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

”اس کے پر کتر کر اسے منجرے میں بند کر دینا چاہیے۔“

”ہاں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ پھر دونوں بھائیوں اور ان کی بیبیوں نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا۔ جس کے بعد انہوں نے نذیر بیک کو بلا کر اس سے کہا۔ ”تم کہاں رہتے ہو؟“

”اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ۔“

”دیکھو بیٹے! اب تم پہلے والے نذیر بیک نہیں ہو۔“

ایک فلم کے ہیرو بن گئے ہو، اب تم ندیم ہو۔ ایک سپر ہیٹ فلم کے ہیرو۔ اگر تم نے اس وقت اپنے آپ کو مین مین نہیں کیا تو تمہیں اس کا نقصان پہنچے گا۔ تمہاری ساکھ متاثر ہو گی۔“

”جی پھر میں کیا کروں؟“

”پہلے یہ بتاؤ تم ہم لوگوں کو اپنا دوست سمجھتے ہو یا دشمن؟“

”یہ کیسی بات کہہ رہے ہیں آپ لوگ؟ آپ لوگ میرے دشمن کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ آپ ہی لوگ ہیں جنہوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے۔“

کے سپر اسٹار ہیرو ہیں۔ آپ کی خدمت کر کے ہمیں خوشی ہوتی ہے۔“

وہ بے چارہ شرما کر کہتا۔ ”مجھے شرمندہ نہ کریں۔ دوسروں کے لیے نہ سبکی، آپ لوگوں کے لیے تو وہی نذیر بیگ ہوں جو پہلے تھا۔“

”آپ نہیں جانتے آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں۔“ یہ حقیقت بھی سچی۔ ان کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ پکوری کے ہیرو بننے سے بہت پہلے سے کسی کے ہیرو بن چکے ہیں اور پکوری کا ہیرو بھی وہ اسی ہیروئن کی کوششوں کاوشوں اور مشوروں سے بنے ہیں۔ اس بے چارے کو تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ اسے یہاں کس منصوبے کے تحت لایا گیا ہے۔ اس کے ہیرو دشب کے تحفظ اور پروان چڑھانے کے بہانے اسے اس شیش محل کے پتھرے میں قید کر دیا گیا ہے۔

دوسری فلم ”چھوٹے صاحب“ شروع ہو گئی تھی۔ گھر سے شاہانہ انداز میں موٹر کار پر شوٹنگ کے لیے جانا اور شوٹنگ مکمل کر دیا اس شان سے واپس آنا بظاہر بڑا دل خوش کن تھا۔ واپس آتے ہی بے بی نے اس کے فریش اپ ہونے سے لے کر کچھ کھانے پینے اور پھر آرام کرنے تک پیش پیش رہتی۔ وہ ہزار منع کرتے روکتے کہ آپ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہیں مگر انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا جاتا۔

”مجھے ہلکان ہونے سے پریشان ہونے سے نہ روکیں۔ روکیں گے تو مجھے تکلف ہوگی۔ میں یہی سمجھوں گی کہ آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ.....“

”وہ بھولا بادشاہ مجھے کا شکار ہو جاتا۔ آخر بے بی ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟ بے بی آخر کیا چاہتی ہیں؟ بے بی کو کیا پسند ہے؟“

فرزانہ گھر بھر کی لاڈلی تھیں۔ اس لیے انہیں سب لوگ بے بی ہی کہتے تھے۔ وہ خود تو انہیں بے بی نہیں کہتے تھے مگر ان کی یہ باتیں یہ حرکتیں یہ خواہشیں بے بیوں ہی جیسی لگتی تھیں۔ لیکن ایک دن انہیں اصل حقیقت کا پتا چلا تو وہ سناٹے میں آ گئے۔ کب اور کیسے انہیں اس بات کا پتا چلا اس کی تو کوئی مصدقہ اطلاع نہیں مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب ان سے کہا گیا۔

”ہم تمہیں اپنے خاندان کا فرد بنانا چاہتے ہیں۔“

”جی..... میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”اگر واقعی تم نہیں سمجھتے ہو تو تمہیں سمجھانے کی یہ بات

ہے کہ ہم تمہیں اپنا داماد بنانا چاہتے ہیں۔“

”جی.....!!“ حیرت و استعجاب کی شدت سے وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔

”تم بے بی کی پہلی اور آخری پسند ہو۔ اس کی اسی پسندیدگی کی وجہ سے تم اس مقام تک پہنچے ہو۔ تمہیں ہیرو بنانے میں سب سے بڑا کردار اسی کا ہے۔ اگر تم اس کے حقیقی ہیرو بننے سے انکار کر دو گے تو اس کے ساتھ ہم سب کو بھی بہت صدمہ پہنچے گا۔“

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد جب ان کے اعصاب ان کے قابو میں آئے تو انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کی فیملی کا ممبر بن جاؤں گا بس مجھے اتنی مہلت دیجیے کہ میں کچھ بن جاؤں۔ فلم انڈسٹری میں اپنا کوئی مقام بنا لوں۔“

”بیٹے! شاید تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ اس لیے تمہیں اس بات کا کچھ پتا نہیں کہ چاہنے والوں کے لیے صبر و ضبط کا مرحلہ کتنا مشکل، کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بے بی اس انتظار میں تو تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔“

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ انہیں روک کر کہا گیا۔ ”تمہیں جس بات کا خطرہ ہے ہم ہرگز ایسی کوئی بات ہونے نہیں دیں گے۔ نہایت خاموشی کے ساتھ بے حد رازداری کے ساتھ ہم تم دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیتے ہیں۔ جب تم چاہو گے دھوم دھام سے رخصتی کر دیں گے۔“

”مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے اگر میری شادی کی خبر لیک آؤٹ ہو گئی تو میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔“

”کیسے لیک آؤٹ ہو گی؟ کیسے کسی کو پتا چلے گا۔ جب گھر کے لوگوں کے علاوہ اس موقع پر کوئی شریک نہیں ہو گا تو باہر کے کسی آدمی کو اس بات کا کیسے پتا چلے گا؟ تم بالکل اطمینان رکھو۔ تمہاری ساکھ اور کیریئر کا تم سے زیادہ ہمیں خیال ہے۔“

وہ ایک طرف اکیلے تھے۔ دوسری طرف گھر کے تمام اہم لوگ۔ انہوں نے اپنی بات اپنا فیصلہ ان سے منوائی لیا۔

اور ایک دن بے بی کی پسند کو بے بی کا حقیقی ہیرو بنادیا گیا مگر اس احتیاط اور اس رازداری کے ساتھ کہ نکاح خوانی اپنے گھر پر بھی نہیں کی گئی۔ انہیں ڈوسانی کے گھر میں یہ انتہائی خفیہ تقریب انعقاد پذیر ہوئی جس میں گھر کے بھی انتہائی اہم افراد نے شرکت کی اور اس میں ڈوسانی کے گھر کے بھی بے حد پُر اعتماد افراد شریک ہوئے۔

آگئے۔ ”ندیم صاحب کہاں ہیں؟“
 ”اپنے کمرے میں۔“ گھر والوں نے ان کے
 کمرے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”آخر کیا ہوا کہ وہ آندھی اور طوفان کی طرح آکر
 اپنے کمرے میں بند ہو گیا؟ ہم اسے آواز دے رہے ہیں
 کمرہ کھولنے کو کہہ رہے ہیں مگر نہ کوئی جواب دیتا ہے نہ کمرہ
 کھولتا ہے۔“

اب آنے والوں نے اصل وجہ بتائی۔ ”کراچی کے نگار
 اخبار میں ان کی شادی کی خبر چھپی ہے۔ جسے دیکھ کر.....“
 چند لمحوں کے لیے گھر والے بھی سنائے میں آگئے۔
 پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ ”یہ سراسر جھوٹی خبر
 ہے۔ ندیم تمہے دشمنوں نے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچانے
 کے لیے چھپوائی ہے۔“

آنے والوں نے بھی دروازے پر دستک دے کر
 اسے کھولنے کو کہا اور یہ بھی سمجھانے لگے۔ ”ایسی جھوٹی خبر پر
 آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھیے
 اور ہمارے ساتھ چل کر شوٹنگ میں حصہ لیجیے۔ آپ تو بڑے
 بہت اور حوصلے والے آدمی ہیں۔ ایسی خبر پھیل کر آپ کو کوئی
 نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

”ایسا ہے کہ.....“ گھر والوں نے ان سے کہا۔ ”خبر
 سچی ہو یا جھوٹی اس کے دل و دماغ پر منفی اثر ہوا ہے۔ اس
 لیے اس وقت تو وہ اداکاری نہیں کر سکے گا۔ اس کی شوٹنگ
 کسی اور دن کروا لیجیے گا۔“

یہ بات معقول تھی۔ ایسی ذہنی پریشانی کے عالم میں
 کوئی کیا پر فارم کر سکتا ہے؟ یہ سوچ کر ”تم میرے ہو“ کے
 یونٹ کے لڑکے واپس چلے گئے۔

اس کے بعد کی اطلاع یہ ہے کہ بڑی مشکلوں سے دروازہ
 کھلوا یا گیا تو ندیم صاحب غم و الم کی تصویر بنے نظر آئے۔

”اب تو آپ لوگ خوش ہیں نا۔ میری ترقی کے راستے پر
 دیوار کھڑی کر کے آپ لوگوں کے دل کو شکنک مل گئی نا؟“

”ارے بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم اس خبر کی پُر
 زور تردید کریں گے۔ الیاس رشیدی کو بتائیں گے کہ یہ
 سراسر غلط خبر ہے۔ جھوٹی خبر ہے۔ ہمارے دشمنوں نے ہمیں
 بدنام اور ناکام کرنے کی نیت سے شائع کروائی ہے۔“

”مگر ہم تو جانتے ہیں کہ یہ خبر سچی ہے اور میں یہی کہتا
 تھا کہ یہ خبر باہر چلی گئی تو.....“
 ”کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اس کی پُر زور تردید شائع کروا

بے قرار لوگوں کی بے قراری کو قرار آگیا۔ پچھلی کے
 پرکٹر کر اسے سنہرے جگرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ سب کچھ
 اتنی ہوشیاری سے ہوا تھا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں
 تھا کہ اس احتیاط اور رازداری کے باوجود ہر پریس تک پہنچ کر
 طشت از بام ہو جائے گی۔ یہ پریس والے..... یہ اخباری
 نمائندے بھی کسی جن بھوت سے کم نہیں ہوتے کہ جہاں
 پر عہدہ پر نہیں مار سکتا وہاں کی خبریں بھی لے اڑتے ہیں۔

ایک دن ایف ڈی سی کے نگار خانے میں ”تم
 میرے ہو“ کی شوٹنگ ہو رہی تھی کہ ایک اخباری نمائندہ عقل
 پرویز وہاں جا پہنچا۔ شاٹ اوکے ہو جانے کے بعد جب
 دوسرے شاٹ کی تیاری کی جانے لگی۔ عقل پرویز آگے
 بڑھے اور ندیم صاحب سے شکایت کی۔ ”ندیم صاحب!
 آپ نے اتنی اہم خبر مجھے نہیں بتائی، انور فرہاد کو بتادی۔“
 عقل پرویز کو شاید اس بات کا گمان تھا کہ وہ ندیم
 کے بہت قریب ہیں۔

”کون سی خبر عقل صاحب؟“ ندیم نے بڑے خلوص
 سے پوچھا۔

”ارے بھئی! اپنی شادی کی خبر۔“ عقل پرویز بر جتہ
 بولے۔ ”آپ نے شادی کر لی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیسی شادی؟“
 عقل پرویز صاحب نے جھٹ اپنے بغل سے نگار
 کراچی کا تازہ شمارہ نکال کر ان کے رو بہ در کیا جس کی شد
 سرخی تھی۔

”ندیم نے کیپٹن احتشام کی بیٹی فرزانہ سے شادی
 کر لی۔“

ندیم صاحب کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں
 تھی۔ ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اخبار سمیت وہ سیٹ سے
 آندھی اور طوفان کی طرح باہر نکلے اور کار ڈرائیو کر کے گھر
 پہنچے اور اپنے کمرے میں خود کو بند کر لیا۔ گھر کے لوگوں نے
 انہیں اس طرح اچانک آتے اور کمرے میں خود کو بند کرتے
 دیکھا تو گھبرا گئے اور دروازے پر جا کر دستک دینے لگے اور
 پوچھنے لگے۔ ”کیا بات ہے؟“

اندر سے کوئی جواب دیا گیا..... نہ دروازہ کھولا گیا۔
 گھر کے لوگ حیران پریشان کہ اچانک اس لڑکے کو کیا ہو
 گیا؟ کس نے اسے کیا کہہ دیا؟

یہ لوگ ابھی اسی تذبذب میں تھے کہ نگار خانے سے
 اسٹنٹ ڈائریکٹر مفتی مصطفیٰ اور یونٹ کے ایک دولڑکے

دیں گے۔“

اور اس سلسلے میں دونوں بھائیوں احتشام اور مستفیض صاحبان نے نگار کے ایڈیٹر الیاس رشیدی صاحب کو ہر طرح سے یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ غلط خبر ہے۔ اگلے شمارے میں یہ خبر بھی نمایاں انداز میں چھپ گئی کہ مستحقین نے اس خبر کی پر زور تردید کی ہے۔ ندیم کی جانب سے یہ کہا گیا ہے کہ ابھی میں شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ یہ وقت اپنے مستقبل کے لیے جدوجہد کرنے کا ہے۔ شادی تو بہت بعد کی بات ہے۔

ایسی تردیدی خبروں کی اشاعت کے بعد ندیم صاحب کی کچھ تسلی ہوئی اور وہ اپنی نئی مصروفیات میں حصہ لینے لگے۔

دوسری طرف اس بات کی جستجو نے گھر والوں کو پریشان کر رکھا تھا کہ آخر یہ خبر ایک کیسے ہوئی؟ کیسے انور فرہاد تک پہنچی؟

”یہ تو انور فرہاد ہی بتا سکتا ہے۔“

لہذا ان کے لیے انور فرہاد سے ملنا ضروری ہو گیا۔ انہوں نے اپنے کچھ کارندوں کو اس کام پر مامور کیا اور کہا کہ انور فرہاد کو کسی طرح بھی یہاں لاؤ۔

اس سے پہلے کہ ان لوگوں کا کوئی فرد مجھ تک پہنچتا میرے جاسوس نے مجھے آکر سارے حالات سے باخبر کیا اور تاکید کی کہ خبردار کسی کے کہنے سننے پر آپ ان کے ”دربار“ میں نہ پہنچیں گے۔

”آخر کار وہ لوگ کیوں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”اس کے علاوہ اور کیا بات معلوم ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ پوچھیں گے۔ شادی کی خبر آپ تک کیسے پہنچی؟“

میں ہنس دیا۔ جس پر میرے جاسوس نے کہا۔ ”آپ

ہنس کیوں رہے ہیں؟“

”یہ تو ایسی بات ہے جو میں اپنے اخبار کے ایڈیٹر کو بھی نہیں بتا سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ صحافتی قانون کے خلاف ہے۔ کسی صحافی سے اس کا سورا معلوم نہیں کیا جاسکتا۔“

”پھر تو وہ آپ کے لیے اور بھی خطرناک بن جائیں گے۔ زور زبردستی کریں گے۔ آپ کی زبان کھلوانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”ایک طرف تو وہ تردید چھو کر اسے جھوٹی خبر ثابت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ

خبر مجھے کیسے حاصل ہوئی؟ کیا اس بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کجی خبر ہے؟“

”ہاں انور صاحب! دال میں پھینا کچھ کالا ہے۔ بس آپ احتیاط برتتے۔“

وہ اپنے دربار میں مجھے بلانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو انہوں نے یہ پیش کش کی کہ میں پریس کلب میں ان سے مل لوں۔

میرے یہی خواہوں نے اس ملاقات سے بھی مجھے منع کیا اور کہا۔ ”نی الحال کچھ دنوں تک آپ اسٹوڈیو بھی نہ جائیں یا کسی فلمی تقریب میں بھی شرکت نہ کریں۔ ان کو خوش کرنے کے لیے ان کے خوشامدی آپ کو اغوا بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے آپ کچھ دنوں تک گھر پر ہی رہیں۔“

وہ جو شاعر نے کہا ہے

ہر گھڑی مقلب زمانہ ہے
میری قدرت کا کارخانہ ہے

وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد حالات معمول پر آنے لگے۔ ندیم صاحب کی اداکاری جاری رہی۔ ان کی شادی کی خبر ان کی ساکھ پر بھاری ثابت نہیں ہوئی۔ ان کی شہرت بڑھتی رہی۔ ان کی فلموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ ان کی پہلی فلم ”چکوری“ ڈھاکے میں نمائش کے کچھ دنوں بعد کراچی میں نمائش پذیر ہوئی تو یہاں بھی اس نے دھوم مچا دی۔ ٹائٹیم جوبلی کا اعزاز حاصل کر کے ایک تاریخ رقم کی۔

ان تمام باتوں کے بعد ایک نمایاں تبدیلی یہ بھی ہوئی ”چکوری“ کے ہیر و بہترین اداکار کو نگار ایوارڈ بھی مل گیا۔ احتشام اور مستفیض صاحب کی نگار سے جو ناراضگی بھی ختم ہو گئی۔ ان حالات میں وہ لوگ مجھے بھی بھول گئے۔ واضح رہے یہ زیادہ دنوں چھپا نہیں رہا۔ ندیم صاحب کے نارمل ہونے ہی ان کے مربی بھی اپنی مصروفیات میں گم ہو گئے۔ تو میں بھی اپنی صحافتی ذمہ داریاں کھل کر ادا کرنے لگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک موقع ایسا آیا کہ محترم الیاس رشیدی صاحب بھی تہذیب کا شکار ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے۔ ”تم نے اچھی طرح تحقیق کر کے شادی کی خبر بھجوائی تھی یا بس سنی سنائی پر ہی بھروسہ کر لیا تھا؟“

”الیاس بھائی! اس قدر مصدقہ خبر ہے کہ اسے جھٹلایا ہی نہیں جاسکتا۔“

”مگر اتنی خفیہ شادی کی خبر تمہیں معلوم کیسے ہوئی؟“

ہی دلچسپی لیتے ہیں اور منہ مانتے دام دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ندیم صاحب کی زیادہ تر فلمیں زیادہ کامیاب ہوئیں اس لیے ان کی فلمیں تقسیم کاروں کی اولین پسند ہیں۔ اس موقع کا انہوں نے بھی فائدہ اٹھایا اور فلم سازوں سے منہ مانتے معاوضے لیے۔

احتشام صاحب ان دنوں بیٹی داماد کے ساتھ لاہور میں تھے۔ وہ جو کہتے ہیں بیکار مباحث کچھ کیا کر تو کیپٹن صاحب نے بھی سوچا بیکار بیٹھنے سے بہتر ہے کوئی فلم ہی بنالی جائے۔

ان کی فلم ”ماٹیر پوتول“ ڈھاکے میں بہت کامیاب ہوئی تھی۔ انہوں نے بیٹی داماد سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا۔ ”ضرور بنائیے۔“

”مگر اس سلسلے میں تم لوگوں کو بھی میرا ساتھ دینا پڑے گا۔“

ندیم صاحب تو سمجھ گئے کہ ساتھ دینے سے ان کی کیا مراد ہے مگر فرزانہ پوچھ بیٹھیں۔ ”ہمیں کس طرح آپ کا ساتھ دینا پڑے گا؟“

”ارے بھئی! میرا مطلب ہے میں ڈائریکٹر۔ تم لوگ پروڈیوسر۔“

”اچھا!“ کہہ کر ان کی بیٹی نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ جن لوگوں نے ندیم صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ بڑے بامروت آدمی ہیں جس نے کبھی بھی ان پر کوئی احسان کیا ہے اسے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں احتشام صاحب کے احسان کو وہ کیسے فراموش کر سکتے تھے۔ انہوں نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھئی ہم ان کی فلم پروڈیوس کریں گے۔“

”جیتے رہو۔“ بیٹی کی بجائے باپ نے جواب دیا۔

”مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔“

”ٹھیک ہے آپ بلا ٹنگ کیجیے۔“

احتشام صاحب نے سوچا تو اسی نتیجے پر پہنچے کہ انہیں اپنی حالیہ کامیاب بیگانی فلم ”ماٹیر پوتول“ کو اردو زبان میں بنانے کا خیال آیا۔ انہیں اس لحاظ سے بھی ”ماٹیر پوتول“ کا سبکیٹ پسند آیا کہ ان دنوں پاکستان میں مزدوروں کے مسائل عروج پر تھے۔ کارخانوں میں آئے دن ہڑتالیں ہوتیں اور جلاؤ کھیاؤ ہوا کرتا تھا۔

”ماٹیر پوتول“ کی کہانی کا موضوع عام اور محنت کش

”میں انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اپنے سورس کے بارے میں آپ کو کچھ بتانیں سکوں گا۔“

میں نے اس خبر کی سچائی کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”اگر یہ خبر جھوٹی ہوتی تو نگار میں اس کی اشاعت کے بعد ندیم صاحب کا اتنا شدید ردی ایکشن کیوں ہوتا؟“

اور پھر وہ وقت بھی آگیا جب ندیم صاحب نے فلم انڈسٹری میں اپنا قدم مضبوطی کے ساتھ جمالیا۔ تو اس شادی کو مزید چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ دراصل رخصتی تھی جسے باضابطہ شادی کے طور پر چایا گیا۔ ڈھاکے میں انعقاد پذیر ہونے والی یہ ایک بہت بڑی تقریب تھی۔ شبنم اور روبن گھوش کی شادی کی تقریب کے بعد یہ دوسری بڑی اور اہم شادی تھی مگر انفس کے اتنی بڑی تقریب ناقص انتظام کی وجہ سے بد مزگی کا شکار ہو گئی۔ ندیم کے بے شمار پرستار بن بلائے مہمانوں کی حیثیت سے ٹوٹ پڑے۔ اس ہلڑ بازی میں تقریب کا سارا حسن بے ہوش ہو گیا۔

شادی کی اس اعلانیہ تقریب کے بعد ندیم صاحب اپنی شریک حیات کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئے۔ فرزانہ جس نے پہلی نظر میں ہی اسے اپنا حقیقی بیرو بنالیا تھا۔ اس وقت کس قدر خوش بھی شاد اور آدھی اس کا اظہار بہت مشکل ہے۔ اب وہ فرزانہ نہیں ایک سہرا اشار کی بیوی ہیں تھیں۔

لاہور میں ان کی پہلی فلم ”سنگدل“ تھی جس کے فلم ساز شاپ کیرانوی اور ہدایت کار ظفر شاپ تھے۔ ان دنوں چاکلیٹی بیرو وحید مراد اپنے عروج پر تھے۔ ان کا اس وقت معاوضہ دس ہزار تھا لیکن ندیم نے ”سنگدل“ سائن کی تو اس کا معاوضہ پندرہ ہزار لے کر سب کو حیرت زدہ کر دیا۔

نئے نوے لے بیرو کے زیادہ معاوضہ لینے اور فلم ساز کے دینے پر اس دور کے دوسرے اداکاروں نے بھی اپنے معاوضوں میں اضافہ کر دیا جن میں سرفہرست وحید مراد اور محمد علی تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ندیم صاحب کی فلمیں فتوحات کے ایک سے بڑھ کر ایک میدان مارنے لگیں۔ ان کی ڈیمانڈ اور مانگ میں اضافہ ہوتا گیا اور انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا معاوضہ بھی بڑھانا شروع کر دیا۔

ہمارے ہاں فلم بزنس کا ایک سسٹم بھی رہا ہے کہ مقبول فنکاروں کے نام پر فلم بکتی ہے۔ جس فلم میں جتنا بڑا ہیرو یا جتنی مقبول ہیروئن ہوتی ہے فلم تقسیم کار اس میں اتنی

لوگوں سے متعلق تھا۔ انہوں نے بیٹی داماد سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کیا۔

”پاپا! آپ کا آئیڈیا زبردست ہے۔“ فرزانہ بولیں۔ ”یہ بہت اچھا موقع ہے۔ اسے نافذ بنا کر ریلیز کر دیجیے۔“

اور کپٹن صاحب نے مائیر پوتول کو ”مٹی کے پتلے“ کے نام سے بنانا شروع کر دیا لیکن اسی دوران احتشام صاحب کو دل کا دورہ پڑا اور فلم رک گئی۔ انہیں صحت یاب ہونے میں کافی عرصہ لگا۔ اب انہوں نے ”مٹی کے پتلے“ کا بقیہ کام شروع کیا۔ فلم جب مکمل ہوئی تو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اس وقت تک مزدوروں کے مسائل تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اتنی تاخیر سے یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جسے پیش نظر رکھ کر یہ فلم شروع کی گئی تھی۔ 22 فروری 1974ء کو ”مٹی کے پتلے“ نمائش پذیر ہوئی تو محض 20 ہفتے چل سکی۔ پاکس آفس پر بری طرح ناکام ہو گئی۔ لیکن اپنے موضوع اور عظیم کے لحاظ سے یہ ایک قابل قدر فلم تھی۔ پڑے لکھے اور بائیس باز کی تحریک سے وابستہ لوگوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ محنت کشوں کے مسائل پر مبنی ہونے کی وجہ سے اسے ”لنہین پرائز“ سے بھی نوازا گیا۔ اس فلم میں ندیم کے مقابل نشو نے مرکزی رو مانوی کردار ادا کیا تھا۔ دیگر آرٹسٹوں میں فرح جلال، توی اور منور سعید قابل ذکر تھے۔

”مٹی کے پتلے“ کے بعد ندیم کی ذاتی پروڈکشن ”کھڑا“ تھی۔ یہ پنجابی فلم تھی اور 1988ء میں بنائی گئی تھی۔ ندیم نے اب تک کسی پنجابی فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ پھر انہوں نے خود پنجابی فلم کیسے بنائی؟ یہ بات عام لوگوں کو معلوم نہیں تھی مگر لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ندیم صاحب کو تو اردو فلموں ہی کا فنکار سمجھا جاتا تھا پھر انہوں نے نہ صرف پنجابی فلم میں کام کیا بلکہ اسے پروڈیوس بھی کیا۔

اس اہم سوال کا جواب خود ندیم صاحب کی زبانی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو کے درمیان بتایا۔ ”کھڑا“ میں نے اس وقت بنائی جب اردو فلمیں بنی بالکل بند ہو گئی تھیں اور پنجابی فلموں کا دور تھا۔ میرے پاس پنجابی فلموں میں کام کرنے کی پیش کش آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں پنجابی فلموں میں گنڈا سا نہیں پکڑ سکوں گا۔ چنانچہ کیوں نہ اپنی ذاتی پنجابی فلم بنائی جائے۔ اس لیے میں نے ”کھڑا“ بنائی جو رومانوی اور مزاحیہ پنجابی فلم تھی۔ اس کے گانے بہت مشہور ہوئے اور مجموعی طور پر لوگوں نے اسے

بہت پسند کیا۔“

”کھڑا“ 2 ستمبر 1988ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے شریک فلم ساز ایم صادق اور ہدایت کار اقبال کشمیری تھے۔ کہانی بشیر نیاز کی اور موسیقی وجاہت عطرے کی تھی۔ ندیم کے ساتھ بابرہ شریف نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ دیگر آرٹسٹوں میں شمینہ پیرزادہ، اسماعیل شاہ، ادیب اور طاہر شامل تھے۔

”کھڑا“ کے بعد ندیم نے مزید کوئی پنجابی فلم نہیں بنائی کیونکہ ان دنوں فلم انڈسٹری تیزی سے رو بہ زوال تھی۔ البتہ کئی فلم سازوں کے اصرار پر دو پنجابی فلموں میں اداکاری ضرور کی یہ فلمیں تیس مارخان اور گوری دیاں جھانجراں تھیں۔ تیس مارخان ہدایت کار اقبال کشمیری کی فلم تھی جس میں ندیم کے ساتھی فنکار نادرہ، شمیم آراء، ساون اور ہمایوں قریشی تھے۔ یہ فلم 10 نومبر 1989ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ ”گوری دیاں جھانجراں“ ہدایت کار عثمان پیرزادہ کی فلم تھی۔ بابرہ، ستارا، شہیل احمد، عثمان پیرزادہ اور مصطفیٰ قریشی اس فلم کے دیگر آرٹسٹ تھے۔ یہ فلم 19 جنوری 1990ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

یہ دونوں فلمیں بھی کاروباری لحاظ سے بہت نرم رہیں۔ ان دنوں حالات ایسے تھے کہ پنجابی فلمیں بھی نہیں چل رہی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عام لوگوں کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے۔ پھر اچھے فلم ساز بھی نہیں تھے۔ جو زندہ تھے وہ فلم انڈسٹری کے حالات دیکھ کر کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ نااہل لوگ فلم انڈسٹری میں آ گئے تھے جنہیں فلم سازی کی سوجھ بوجھ بالکل نہیں تھی۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ندیم صاحب نے سوچا کہ اب لاہور میں رہنا بے سود ہے۔ کیا فائدہ ایسے حالات میں رہ کر اور وہ لاہور سے کراچی آ گئے۔ یہ سن 2000ء کی بات ہے کہ ندیم صاحب اپنا بوریا سترسمیٹ کر لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے۔

”جب میں نے دیکھا۔“ یہ رواد خود ندیم صاحب کی زبانی ہے۔ ”میں ان فلمیں نہیں بن رہی ہیں۔ جو بن رہی ہیں وہ کچھ اس طرح کی ہیں کہ میں ان میں کام نہیں کر سکتا تو میں نے ٹی وی پر آنے کا سوچا۔ کیونکہ ٹی وی پر فلموں سے بہتر کام ہو رہا تھا۔ ٹی وی کا کام کراچی میں زیادہ ہو رہا تھا اس لیے میں لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا۔“

ٹی وی ڈراموں کے بارے میں ندیم صاحب کا کہنا

ہے۔ ”مجھے شروع میں اپنے آپ کو ٹی وی کے ماحول میں ڈھالنے میں مشکلات پیش آئیں لیکن رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو اس کا عادی بنالیا۔“

ندیم صاحب جب نذیر بیگ کی حیثیت سے اپنی طالب علمی اور نوجوانی کی زندگی گزار رہے تھے تو بڑے چپ اور خاموش طبیعت کے تھے۔ اس لیے اپنا دکھ درد کسی سے شیئر نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہ جو خواب دیکھ رہے تھے اس کے لیے انہیں بڑے دھکے کھانے پڑ رہے تھے۔ مگر وہ اس کا اظہار کسی سے نہیں کرتے تھے۔ اپنی جدوجہد جاری رکھتے تھے اور بہت سوچ سمجھ کر اپنا لائحہ عمل اختیار کرتے تھے۔ ان کی یہ عادت اس وقت اور پختہ ہو گئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی قابل کیا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھاتے تھے۔ بہت محتاط ہو کر کوئی فیصلہ کرتے تھے۔ ان کی اس عادت کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے فلم انڈسٹری میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا اور وہ جس نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ آپ نے میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی لکھ دیا ہے۔ آپ نے میری اس پہلی فلم کے بعد ہی لکھ دیا کہ وہ دن دور نہیں جب یہ بنا ہیر و وحید مراد اور محمد علی کی ٹکر کا ہیر و ہوگا۔ اس نے میری پیش گوئی سے بڑھ کر ترقی کی۔ وحید مراد اور محمد علی کی مقبولیت اور شہرت سے بڑھ کر فلم انڈسٹری میں اپنا مقام بنایا۔

وقت گزرنے کے ساتھ جب حالات میں تبدیلی آئی اور کراچی میں فلمیں بننے لگیں تو ندیم صاحب نے دوبارہ فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا مگر اب بھی انہوں نے محتاط رویہ اپناتے رکھا۔ اچھی کہانیوں کے اچھے کردار دیکھ کر ہی فلمیں سائن کیں۔

ندیم صاحب نے اپنے اچھے دنوں میں ایک بھارتی فلم ”دور دیش“ میں بھی کام کیا تھا۔ مگر اس فلم میں جس کردار میں انہیں پیش کیا گیا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ اس بات پر یہاں پاکستان میں کچھ لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ ایک بڑے پاکستانی فنکار ہونے کے باوجود انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اتنے مختصر کردار کی فلم میں کیوں کام کیا؟ اس کا جواب انہوں نے ایک صحافی کو کچھ اس طرح دیا۔

”اگرچہ یہ ایک مختصر کردار تھا لیکن میرے لیے ایک چیلنجنگ کردار تھا۔ میں نے اس فلم کو سائن کرنے سے پہلے اس کے اسکرپٹ کو بہت غور سے پڑھا تھا اور وہ کردار مجھے اچھا لگا تھا۔ اس میں اداکاری کی گنجائش بہت زیادہ تھی۔ اس

فلم کی نمائش کے بعد بھارت میں میرے کردار کو پسند کیا گیا۔ البتہ پاکستانی دوستوں اور پرستاروں نے چونکہ مجھے شروع سے مرکزی کردار میں دیکھا ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کردار کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ صرف اس کے مختصر دورانیے کو دیکھا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے فلمی کیریئر میں جو چند اچھے کردار میں نے کیے ہیں ان میں فلم ”دور دیش“ کا یہ مختصر کردار بھی شامل ہے۔“

اس بھارتی فلم کے بعد ندیم صاحب کو مزید انڈین فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی گئی مگر یہ وہ وقت تھا جب وہ اپنی پاکستانی فلموں میں بہت زیادہ مصروف تھے اس لیے آفرز انہوں نے قبول نہیں کیں۔ پھر ایک بہت بڑی بھارتی فلم کی دعوت ملی مگر انہوں نے قبول نہیں کی۔ فلم کا اسکرپٹ پڑھنے کے بعد انہیں پتا چلا تھا کہ اس کا موضوع متنازعہ ہے۔ ہندو مسلم کے مسئلے پر اس فلم میں بحث کی گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ سوچ کر آفر ٹھکرا دی کہ ان کے پرستار اور چاہنے والے ان کو کسی متنازع فلم میں دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے۔ ندیم صاحب کی بے پناہ مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ محض اپنے فائدے اور مفادات کا خیال نہیں رکھتے اپنے چاہنے والوں اور پرستاروں کے جذبات اور احساسات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ آج اگر انہوں نے اپنے کامیاب کیریئر کے پچاس سال مکمل کر لیے ہیں اور اب بھی ان کی مقبولیت اور شہرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے تو اس میں ان کی بہت سی قربانیوں کا بھی حصہ ہے۔

ندیم صاحب کے اکثر بیانات اخبارات میں شائع ہوتے ہیں کہ پاکستان میں بھارتی فلموں کی نمائش نہیں ہونی چاہیے مگر پاکستان میں فلم انڈسٹری کی زبوں حالی کا بھی انہیں بخونی ادراک ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ سینما انڈسٹری کی بقا کے لیے فی الحال بھارتی فلموں کی نمائش ضروری بھی ہے۔ وہ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ہماری فلم انڈسٹری اس قابل ہو جائے کہ ہمارے سارے سینما گھروں کی سال بھر تک ضرورت پوری کرے مگر اس کے لیے جن باتوں کی فی الحال ضرورت ہے ان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں۔ ”مجھے پاکستانی سینما پر انڈین فلمیں دکھائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اپنے سینما پر مشترکہ طور پر بنائی جانے والی فلمیں دکھائیں تاکہ اپنی فلم انڈسٹری کو بھی فائدہ پہنچے۔“

وہ اس سلسلے میں کہتے ہیں۔ ”جب ہم دنیا کے تمام قسم

کے کاروبار مشترکہ طور پر کر سکتے ہیں تو بھارت سے مشترکہ فلم سازی کیوں نہیں کر سکتے؟ اس سلسلے میں ہمیں کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ہمارے مقابلے میں بھارت ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے لیکن پاکستان میں بھی بہت باصلاحیت لوگ موجود ہیں جو اچھا کام کر سکتے ہیں۔“

ندیم صاحب اپنی موجودہ پاکستانی فلموں کے بارے میں بھی فکرمند رہتے ہیں۔ وہ موجودہ فلموں کے بارے میں کہتے ہیں۔ ”ہمارے ہاں فلمیں بن تو رہی ہیں مگر ان میں وہ بات نہیں جو فلموں میں ہونی چاہیے۔ ماضی میں ہماری فلمیں ”فلم“ ہوتی تھیں مگر اب جب میں سینما فلم دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کوئی ایڈیٹیو ڈی ڈراما دیکھ رہا ہوں۔ فلم کا الگ مزاج ہوتا ہے اور وہ اسی مزاج پر بننا چاہیے مگر یہ خوش آئند بات ہے کہ فلمیں ختم ہو رہی تھیں تو نئے لوگوں نے انہیں نئے سرے سے نئی زندگی دی۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ اور بہتر فلمیں بنانے لگیں گے۔ دیکھتے دیکھتے ہی فلم سازی سیکھ جائیں گے۔ مجھے پچاس سال ہو گئے ہیں۔ اس فیلڈ میں آج بھی میں سیکھ رہا ہوں۔ یہ بڑی بات ہے کہ اس دور میں بھی کچھ لوگ فلم بنانے کی ہمت کر رہے ہیں اور اچھی فلمیں بھی بن رہی ہیں لیکن فلم کو سوچ سمجھ کر بنانا ضروری ہے۔“

ندیم صاحب کی ایک انسانی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شہرت اور مقبولیت کے اتنے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کے باوجود اپنے پرانے دوستوں کو نہیں بھولے ہیں۔ جن کے ساتھ انہوں نے اپنی طالب علمی کا دور گزارا۔ اپنی نوجوانی کا زمانہ بتایا۔ وہ ان دنوں اور ان دوستوں کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”فلم میں آنے سے پہلے میں سندھ مدرسۃ الاسلام میں پڑھتا تھا اس کے بعد اسلامیہ کالج سولجر بازار میں آگیا۔ اس وقت کے جو دوست تھے ہم فلمیں ان کے ساتھ دیکھتے تھے اور ہندو کباب والے کے ریٹوئرنٹ میں جا کر کباب کھاتے تھے۔ جب ہم سب کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ اکیلے وہ سارا بل ادا کرے۔ ہم سب لوگ تھوڑا تھوڑا ملا کر لیڈنڈ اعزاز میں بل ادا کرتے تھے۔ اس دور کا مزہ ہی الگ تھا۔“

بات اس دور کی چل نکلی ہے تو کچھ مزید باتیں بھی اس دور یا اس کے فوری بعد کی باتیں بھی ہو جائیں۔ ندیم صاحب کی پہلی فلم ”چکوری“ بنی، ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کے دوسرے شہروں میں ریلیز ہوئی۔ ان دنوں کی بات ہے

کہ جب ”چکوری“ کا فوٹو سیٹ لاہور پہنچا تو انہوں نے مشورے کے لیے یاسین گوریچ کو طلب کیا۔ انہوں نے فوٹو سیٹ دیکھا تو فیصلہ دیا کہ اول تو ندیم ایسا نام ہے جو کسی فلمی ہیرو کے لیے چننا ہی نہیں۔ دوسرے کوئی بھی ایسی خوبی نہیں فوٹو سیٹ میں نظر نہ آئی۔ ان دنوں ڈوسانی فلم کارپوریشن کی ہر فلم ڈبہ ہو رہی تھی۔ ”چکوری“ کے لیے انہوں نے کوشش کی کہ کراچی، لاہور میں کوئی فلم تقسیم کار مل جائے تو وہ اس کو فروخت کر دیں لیکن کسی نے ہامی نہ بھری۔ چنانچہ یاسین گوریچ نے مشورہ دیا کہ اس فلم کے دو پرنٹ بنوا کر پہلے کراچی میں ریلیز کر دیجیے۔ اگر چلے گی تو مزید پرنٹ بن جائیں گے۔ ورنہ یہی پرنٹ لاہور آ جائیں گے۔

19 مئی 1967ء کو یہ فلم کراچی کے پیرا ڈائمنز اور بندر روڈ کے لائٹ ہاؤس سینما میں ریلیز ہوئی۔ یاسین گوریچ کی رہائش ان دنوں قیصر سینما کے پاس رحمان کورٹ میں تھی۔ جمعہ کی شب گوریچ نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ اس فلم کو دیکھ لیا جائے۔ ہفتے کی صبح ابھی وہ بستر پر ہی تھے کہ ایک فلم ساز تقسیم کار آ گئے۔

انہوں نے بتایا۔ ”رات انہوں نے چکوری دیکھی ہے۔“ اور پھر جو انہوں نے اس کی تعریفیں شروع کیں تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ دلپ کمار کے عاشق تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”دلپ کمار کے بعد اگر کوئی ہیرو آیا ہے تو وہ ندیم ہے۔ آج آپ بھی یہ فلم دیکھیں اور جیسے بھی ممکن ہو سکتے ندیم کو میری فلم میں سائن کرادیں۔ میں گارنٹی کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ندیم پاکستان میں صاف اول کا ہیرو بنے گا۔“

ہفتے کے روز پیرا ڈائمنز سینما میں اس کا پریس شو تھا۔ گوریچ نے بھی اس شو میں ”چکوری“ دیکھی۔ ندیم نے ان کی تمام پیشہ وارانہ پیش گوئیاں جھٹلا دی تھیں۔ اس نے واقعی بے حد اچھا کام کیا تھا۔“

”چکوری“ جس دن ریلیز ہوئی تو عام فلم بینوں نے اس کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی کاسٹ ہونے کی وجہ سے ریگولر فلم بینوں نے اس فلم کو پسند نہیں کیا مگر اسلامیہ کالج کے ہزاروں ساتھیوں نے ایک ہفتے بعد ہی اس سینما گھر پر لگی اس فلم کو کامیابی سے ہنگامہ کر دیا۔ ”چکوری“ دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان دلوں کی دھڑکن بن گئی اور نڈر بیک ندیم کے روپ میں رومان پرست نوجوانوں کا دوسرا دلپ کمار بن کر آسمان فلم پر چمکتا چلا گیا اور اس کی پہلی فلم کو عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔ ایسی کامیابی جو بھی اس کے تصور تک میں نہ تھی۔

”چکوری“ کی نمائش کے بعد جہاں اس فلم اور اس کے ہیرو ندیم کی تعریف و توصیف کی گئی وہاں کچھ ناقدین اور مبصرین نے اس نئے ہیرو پر یہ الزام بھی لگایا کہ اس نے دیپ کمار کی نقالی کی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں بھی کچھ چھان بین کی کہ یہ بات کہاں تک درست ہے؟ اگر درست ہے تو اس کا فائدہ دار کون ہے؟ اس سلسلے میں اس وقت ایک تحریر کا اقتباس پیش کروں گا جو اس دور کے ایک ہدایت کار شریف امینی نے تحریر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”ایک ٹی وی پروگرام میں انور مقصود نے ندیم سے ازارہ مذاق کہا۔ ”دیپ کمار اگر نہ ہوتے تو آپ کیا کرتے؟“

انور مقصود نے اس سوال سے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ندیم کی اداکاری میں دیپ کمار کی اداکاری کا رنگ ہے۔

جواب میں ندیم نے بڑے خوب صورت پیرائے میں کہا۔ ”دیپ کمار فن کا سمندر ہے اور میں اس سمندر سے چند قطرے ہی حاصل کر پایا ہوں۔“

یہ ندیم کی اعلیٰ ظرفیت تھی کہ اس نے حقیقت کو تسلیم کیا اور یہ سچ ہے کہ شروع شروع میں ندیم کی اداکاری میں دیپ کمار کا رنگ نمایاں تھا۔ مگر اس کی ایک خاص وجہ بھی تھی۔ فلم ”چکوری“ ندیم کی پہلی فلم تھی۔ اس فلم کی کامیابی میں ندیم کی اداکاری کے ساتھ ساتھ فلم کی ہدایت کاری اور عکاسی کا بھی بہت دخل تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار احتشام اور کیرامین اے آر تانصر ان دونوں حضرات کو میں بخوبی جانتا ہوں۔ ان دونوں حضرات کے ذہنوں پر دیپ کمار بہت زیادہ چھایا ہوا تھا۔ احتشام صاحب کے ساتھ میرا ایک فلم میں ساتھ رہا ہے اور کیرامین اے آر تانصر کے ساتھ میں نے کئی فلمیں کی ہیں۔ احتشام صاحب جب بھی کسی اداکار کو کسی فلم کا کوئی سین سمجھاتے ہیں تو بالکل دیپ کمار کے انداز میں بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ندیم چکوری میں کام کر رہے تھے تو دیپ کمار کی جگہ ندیم کی شکل میں احتشام صاحب کو ایک نیا اداکار مل گیا اور پھر جس نے فوٹو گرافی کرنی تھی وہ بھی دیپ کمار کا والدہ مارا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ”چکوری“ ریلیز ہونے کے بعد سب لوگوں نے کہا۔ پاکستان کو ایک دیپ کمار مل گیا ہے۔

”چکوری“ میں ندیم کے وہ Angles جن میں وہ دیپ کمار سے مشابہ نظر آتا ہے خاص طور پر فلم بند کیے گئے تھے لیکن اس ساری کارروائی میں ندیم کا کوئی قصور نہیں،

اسے اس روپ میں پیش کرنے والوں کا ہے۔ جہاں تک ندیم کا تعلق ہے اس نے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنا خاص انداز اختیار کر لیا اور اپنے آپ پر دیپ کمار کی چھاپ کے الزام سے اپنے آپ کو بچا لیا۔“

اللہ رب العزت نے ندیم کو حسن کی دولت جس فیاضی سے عطا کی ہے اسی دیا دلی کے ساتھ اسے فنی صلاحیتوں سے بھی مالا مال کیا ہے، ایک شرمیلا شرمیلا سا لڑکا جب اداکار بنا تو اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اداکاری کیسے کی جانی ہے مگر جب وہ مکمل اداکار بن گیا تو اس نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے فنی دنیا میں صوم چمادی۔ ورسائل اداکاری کی حیثیت سے ہر طرح کی اداکاری کی۔ بھرپور رومانوی اداکاری بھی کی، کامیڈی میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ مشکل ترین اور چیلنجنگ کرداروں میں بھی اپنے آپ کو بہترین فنکار ثابت کیا۔ ان کی فلمیں اگر کراؤن جوبلی (آئینہ)، ڈائمنڈ جوبلی، پلائیم جوبلی، گولڈن جوبلی اور سلور جوبلی کرتی رہیں تو اس میں ان کی اداکاری کا بھی بڑا حصہ شامل رہا۔ بے شک فلم ٹیم ورک سے جتنی سے جتنی کامیاب بھی بہت چھان چٹک کر کرتے تھے۔ اچھے فلم میکر اور اچھے اسکرپٹ پر انہوں نے ہمیشہ خصوصی توجہ دے کر فلم سائن کی۔

اداکار یا اداکارہ اگر اپنی ساکھ کو مستحکم رکھنے کے سلسلے میں خود مختار ہو تو وقت اور حالات کے تدارک تیز چھوٹوں میں بھی اپنے آپ کو محفوظ و معاون رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ ان کے اس ذہن میں خیالات کا اندازہ ان کے اس اظہارِ رائے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک بار ایک صحافی نے ان سے کہا۔ ”ناضی کے معروف اور معروف اداکاران دونوں کمپری کی زندگی گزار رہے ہیں ان کی موجودہ حالت کا قصور وار آپ کے ٹھہرائیں گے؟“

اس پر ندیم صاحب کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ ”مکمل اگر اللہ نہ کرے میرے حالات خراب ہو جائیں تو اس کا سب سے پہلا ذمہ دار میں خود ہوں گا۔ اس کا الزام میں حکومت اور فلم انڈسٹری پر عائد نہیں کروں گا۔ فلم انڈسٹری نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ دوسری طرف ہم حکومت کو ہر کام کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ ہمارے اوپر بھی کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ حکومت ایک حد تک مدد کرتی ہے۔ ہم پرامر براقت آتا ہے تو وہ ہماری اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے آتا ہے۔ نامور اداکاروں کی موجودہ بد حالی کے

اصل ذمہ دار وہ خود ہیں۔ اس میں کسی اور کو قصور وار ٹھہرانا درست نہیں۔“

صحافی نے اس موقع پر ان سے یہ سوال کر دیا۔ ”بولی ووڈ کے گوند پر زوال آیا تو سلمان خان نے انہیں اپنی فلم میں چانس دے کر انہیں سہارا دیا مگر ہمارے یہاں جب وحید مراد پر زوال آیا تو کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ہمارے یہاں ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

غذیم صاحب اس سوال کو سن کر بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ”زوال سے آپ کی کیا مراد ہے۔ آپ زوال کسے کہتے ہیں؟ وحید مراد اچھا خاصا بڑا کھلا اور کھلتے چلتے گھر لانے کا فرد تھا۔ اس کا اپنا پروڈکشن ہاؤس تھا اگر اس کی فلمیں کم ہو گئی تھیں تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ آج اگر میری فلمیں ہٹ نہیں ہو رہی ہیں اور دوسرے ہیر وز کی ہو رہی ہیں تو فلم پروڈیوسر اپنی فلموں میں انہیں زیادہ سائن کریں گے۔ اس میں زوال کی کوئی بات نہیں۔ ماشاء اللہ جو وقت وحید مراد نے گزارا ہے ایسا وقت کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ صحیح معنوں میں اگر پاکستان کا کوئی سپر اسٹار تھا تو وہ وحید مراد تھا۔ جس کا ہر اسٹار نقل کیا جاتا تھا۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلم انڈسٹری کی بے حسی تھی کہ اتنے بڑے اداکار کی اگر چند فلمیں

نہیں چلی سکیں تو انڈسٹری نے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے وہ مایوس اور ڈپریشن کا شکار ہوا۔ فلم انڈسٹری کے وحید کے ساتھ برتاؤ کا مجھے غم تھا، اس لیے میں جب ان سے ملتا تو اس موضوع پر ان سے کوئی بات نہیں کرتا تھا تا کہ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ جب وہ مایوسی کی باتیں کرتے تو میں ان سے کہتا۔ ”تم فلم انڈسٹری کی پروا کیوں کرتے ہو۔ تم اپنی فلمیں خود بناؤ۔ خود ڈائریکٹ کرو۔ ہم سب مل کر تمہاری فلم میں کام کریں گے۔“

جب وحید مراد کا کارایکسڈنٹ ہوا تو وہ اپنے فلمی مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ میں ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر گیا۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں ہم نے ساتھ کھانا کھایا اور ڈھیر ساری باتیں کیں۔ ان کے چہرے اور جسم پر کافی چوٹیں آئی تھیں۔ وحید نے مایوسی سے کہا۔

”دیکھو میرا کیا حال ہوا۔“

میں نے کہا۔ ”تمہیں کچھ نہیں ہوا معمولی زخم ہیں۔ چند دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے اور پھر پلاسٹک سرجری سے سارے نشانات ختم ہو جائیں گے۔“

خواب سراپ

عشق کی جنوں خیزیوں میں اٹھنے والے انتہائی قدم کارلر زہ خیز انجام..... آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی سوجنا

سیوا سے سنبھا تک

مختلف تاریخی ادوار کے بکھرتے رنگوں کا احاطہ کرتی ایک اور خوبصورت تحریر..... ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم کی روانی

باغی

مثبت اور منفی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی..... خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم بغاوت بلند کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان..... ایک یادگار تحفہ

وقت

وقت کی بھول بھلیوں اور چال چلن کا قصہ..... وہ جوابے مرکز سے ہٹ کر ایک نئی دنیا کی تلاش میں چل نکلا ہے..... دیکھیے قسمت اسے کہاں لے جاتی ہے۔ حسام بٹ کے قلم سے خوبصورت داستان

اگست 2017ء کا لٹریچر



منظر امام۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید۔ ذویا اعجاز۔ تنویر ریاض۔ سلیم انور اور علی اختر کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

اس کی حلاوت

”ان سے اس ملاقات کے بعد میں پاکستان سے باہر چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد کسی نے فون پر مجھے ان کی وفات کی خبر دی تو کانوں کو یقین نہ آیا۔ پچھلے سال جب میں ان کی برسی کے اجتماع میں گیا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کو ہم سے چھڑے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے جب ہم سب مل کر فلموں میں کام کیا کرتے تھے۔“

ندیم صاحب کے ان خیالات، جذبات اور احساسات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حقیقت پسندانہ سوچ کے حامل ہیں۔ اپنے کیے کا ذمہ دار اور قصور وار دوسروں کو نہیں ٹھہراتے۔ حالات اور حادثات کا جو انفرادی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے روادار ہیں۔ جو شخص ایسے خیالات کا حامل ہو ظاہر ہے وہ خود بھی ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ ندیم صاحب نے اپنی فنی زندگی کے پچاس سال مکمل کر لیے ہیں، اس کے باوجود وہ تندرست ہیں اور تندرستی کے ساتھ آج بھی ٹی وی ڈراموں اور فلموں میں کام کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف ان کا بے حد محتاط رویہ ہے۔ وہ ہر طرح کے حالات میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ اپنے فن اور تخلیقی صلاحیتوں پر کسی بھی طرح آنچ آنے نہیں دیتے۔ ان کا فن آج بھی بھرپور طمانیت کے ساتھ زندہ ہے اور ان کی زندگی فنی زندگی اپنانے والوں کے لیے معجزی راہ ہے۔

اس موقع پر میں ایک خاص شخصیت کو ٹریبونٹ پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے اللہ کے بعد ندیم صاحب کو گولڈن انار بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے یہ کوئی اور نہیں فرزانہ بیگم ہیں۔ ندیم صاحب کی شریک حیات۔

انہیں میں نے گلستان سینما (ڈھاکا) میں رنگین اور سینما اسکوپ فلم ”مالا“ کی سلور جوبلی تقریب میں ایک شوخ و شنگ لڑکی کے روپ میں دیکھا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی آنے والے دنوں میں کوئی اہم، بہت زیادہ اہم کام سرانجام دینے والی ہے۔ اس نے اسٹیج پر ایک خوب دلڑے کو گاتے ہوئے دیکھ کر اس کے بارے میں کیا سوچا؟ کیا محسوس کیا؟ یہ تو وہی جانتی ہے یا خدا جانتا ہے۔ میں یا میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ تو محض اس کی شوخی اور شرارت سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ہمارے تو ہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس موقع پر اس ہنسی مسکراتی چلبلی سی لڑکی نے اپنی آنکھوں کے راستے اس گلوکار کو اپنے دل میں اتار لیا

ہے۔ اس کمسنی کے دور میں یہ اس کی پہلی محبت تھی جو آخری محبت بھی ثابت ہوئی۔

محبت بھی بڑی عجیب شے ہے۔ کبھی بربادی کا سبب بنتی ہے اور کبھی آبادی کا۔ اسٹیج پر پر فارم کرنے والے گلوکار کے فرشتوں کو بھی اس بات کی خبر نہیں ہوئی کہ اسے کسی نے اپنے من مندر میں ایک دیوتا بنا کر سب لیا ہے۔

”مالا“ کی اس سلور جوبلی تقریب کا اس کے بزنس پر کچھ اثر پڑا یا نہیں پڑا۔ اس سے قطع نظر اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ ایک لڑکی اس تقریب سے خالی ہاتھ واپس نہیں آئی۔ اپنے دل میں کسی کو سب کر اپنے ساتھ گھر لے آئی۔

اس محبت نے اسے جتنا بڑایا، جتنا دلایا، اس کے دل میں یہ چاہت اتنی ہی مستحکم ہوئی تھی اور اس محب کو اپنانے اور اسے کچھ بتانے کا عزم و ارادہ اور مضبوط ہوتا گیا۔ ارادہ جب مضبوط و مستحکم ہو تو مولانا کریم بھی مددگار ہوتا ہے وہ بھی ایک دن اپنے ارادے میں کامیاب و کامران ثابت ہوئی۔ اس لیے اسے گلوکار سے اداکار بنانے میں ہی کلیدی کردار ادا نہیں کیا اپنے جیون کا اوتار بنانے میں کامیاب ہوئی۔ محبت ہو تو ایسی ہو۔

گلوکار نذیر بیگ کو اداکار ندیم بنانے والی فرزانہ بیگم نے ندیم کی بیوی بن کر بھی اس کی بہتری، بہبود اور ترقی کے لیے اپنی کوششوں اور کاوشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

اچھی، نیک اور چاہنے والی بیوی اللہ تبارک و تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ بلاشبہ ندیم صاحب کے لیے ان کی بیگم فرزانہ قدرت کا ایک انمول تحفہ ایک بہت بڑی نعمت ہیں۔ آج ندیم صاحب جو کچھ ہیں، انہوں نے اپنی پچاس سالہ فنی زندگی میں جو فتوحات حاصل کی ہیں اس میں بھی ان کی چاہنے والی بیوی کا بہت اہم کردار ہے۔ انہوں نے ندیم صاحب کو پرسکون ہو کر اپنی فنی سرگرمیاں جاری رکھنے میں ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ کسی طرح سے بھی انہیں ڈسٹرب نہیں کیا، پریشان نہیں کیا۔ ندیم صاحب کے موڈ اور مزاج کے عین مطابق ان کے گھر اور ان کے بچوں کی نگہداشت اور پرورش و پرداخت کی۔

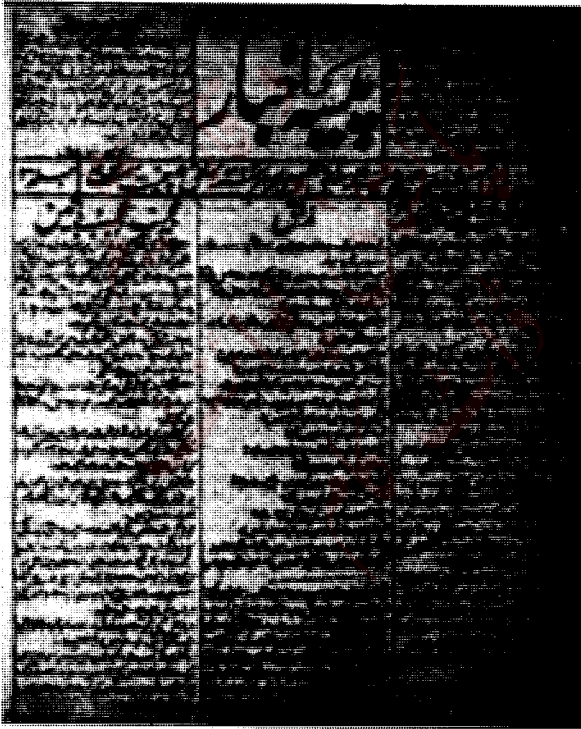
میں اس عظیم خاتون کو سلوٹ پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ہماری فلم انڈسٹری کو نہ صرف ایک اچھا ٹیلنٹڈ اداکار دیا بلکہ اسے ایک انمول فنی ہیرا بنانے میں بھی کوئی کمی کوئی کسر نہ چھوڑی۔

روزنامہ پیسہ

شکیل صدیقی

جب مسلمانان برصغیر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اس وقت قلمی جہاد میں مصروف جتنے روشن نام نظر آتے ہیں ان میں سے ایک نام پیسہ اخبار کا بھی ہے۔ لاہور سے شائع ہونے والے اس اخبار پر ایک مختصر سا مگر جامع جائزہ۔

اپنے وقت کے ایک مشہور اخبار پر مختصری تحریر



تھا۔ جسے بعد میں انہوں نے لاہور سے شائع کیا۔ اس اخبار کا نام پیسہ اس لیے رکھا گیا کہ اس کی قیمت ایک پیسہ تھی۔ یہ اخبار سیاست اور سماجیات کا احاطہ کرتا تھا۔ اس میں لوگوں کی دلچسپی کے لیے کہانیاں بھی ہوتی تھیں اور قومی صورت حال سے متعلق

منشی محبوب عالم 1863ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین گجراتوالہ میں رہتے تھے۔ جنوبی ایشیا کی صحافت میں انہیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ انہوں نے 1887ء میں روزنامہ ”پیسہ اخبار“ کی بنیاد رکھی۔ یہ گجراتوالہ سے شائع ہوتا

مضامین بھی۔ یہ قومی معاملات پر کھل کر تبصرہ بھی کرتا تھا۔ لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لیے اس میں ادبی مضامین اور شاعروں کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔

یہ لوگوں میں جلد مقبول ہو گیا اور اس کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ جب کہ ”اخبار عام“ اس وقت 2700 شائع ہوتا تھا جس کے مدیر پنڈت گوہی ناتھ تھے۔ مولوی محبوب عالم نے صحافت کی تربیت لینے کے لیے 1900ء میں یورپ کا سفر کیا۔ وہ اٹلی، آسٹریلیا، جرمنی، بینکمن، فرانس، روم، انگلستان، شام اور مصر کی سیاحت کی۔ واپس آ کر انہوں نے سفر کے حالات پہلے پیسہ اخبار میں قسط وار شائع کیے اس کے بعد ”سفرنامہ یورپ“ کتابی صورت میں شائع کیا۔ گورنمنٹ پنجاب نے انہیں اس سفرنامہ پر چار سو روپے کا انعام دیا۔ وہ ایک اچھے مصنف اور مبلغ تھے۔ تقریر کرنے پر آتے تھے تو لفظوں کے دریا بہا دیتے تھے۔

پیسہ اخبار کے بعد انہوں نے خواتین کے لیے ایک ماہنامہ ”شریف بی بی“ شائع کرنا شروع کیا، جولاءِ ہور کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی فروخت ہونے لگا۔ اس وقت خواتین کے لیے کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا، اس لیے یہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے 1902ء میں ”بچوں کا اخبار“ شائع کرنا شروع کر دیا، جو ہفت روزہ تھا۔ یہ ہفت روزہ دس برس تک شائع ہوتا رہا۔ اس کی اشاعت ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ مٹی محبوب عالم نے 1913ء میں حج کیا اور مکہ شریف سے واپس آنے کے بعد اسلامی انسائیکلو پیڈیا پر کام شروع کر دیا۔ ان کے وسائل محدود تھے، لیکن عزم و حوصلہ پختہ جس کی بنا پر انہوں نے یہ کام بھی پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

خواتین کے لیے مٹی ممتاز علی نے ”تہذیب النساء“ کا اجرا کیا جس کی مدیران کی بیوی محمدی بیگم تھیں۔ یہ ماہنامہ اشاعت کے لحاظ سے سب سے آگے نکل گیا اور اس کی اشاعت روز بروز مستحکم ہوتی چلی گئی۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا اردو اخبار دہلی سے شائع ہوا تھا جس کا نام ”دہلی اردو اخبار“ تھا جو 1836ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے مدیر مولوی محمد باقر تھے۔ ان اخبارات اور اس کے بعد شائع ہونے والے اخبارات کو اس لیے اہمیت دی گئی کہ حکومت نے اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا تھا۔ یہ سب لیتھو پر چھپتے تھے۔ (پہلا سا کاغذ ہوا کرتا تھا جس پر کاتب سیاسی میں قلم

ڈبو کر لکھا کرتے تھے) اردو اخبارات لوگوں میں بے حد مقبول ہوئے حالانکہ فارسی اس وقت زبانِ زد عام تھی۔ یہ اخبارات اپنے ملک کی ہی نہیں بلکہ افغانستان، ترکی اور فلسطین کے مسلمانوں کی خبریں بھی لگایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں خبر رساں ایجنسیوں کا رواج نہیں تھا، چنانچہ اخبارات نے اپنے نمائندے دوسرے ممالک میں مقرر کر رکھے تھے۔ یہ نمائندے خبریں ارسال کیا کرتے تھے جو ڈاک و تار کے ذریعے ہندوستان دو تین دن بعد پہنچا کرتی تھیں۔ مگر اخبارات انہیں شائع کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ تازہ اور باسی خبروں سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو اپنے اخبار کے ذریعے لوگوں کو باخبر رکھنا چاہتے تھے۔ حکومت ان اخبارات کو خریدتی تھی اور اشتہارات بھی دیا کرتی تھی۔

اردو اخبارات دہلی، لاہور، ملتان، کراچی، پشاور، راولپنڈی، لکھنؤ، بمبئی، علی گڑھ اور مدراس سے شائع ہوتے تھے، لیکن دہلی اور لاہور صحافت کی جنم بھومی سمجھے جاتے تھے۔ ان اخبارات کی اشاعت لمبی چوڑی نہیں تھی۔ کوہ نور جو مٹی ہر سکھ رائے شائع کرتے تھے 350 کی تعداد میں روزانہ شائع ہوتا تھا، مگر یہ 54 برس تک شائع ہوتا رہا۔ ایک ہفت روزہ جس کا نام ”سید الاخبار“ تھا، اس کی صرف 27 کاپیاں شائع ہوئی تھیں۔ زیادہ تر اخبارات کی 50 کاپیاں روزانہ شائع ہوتی تھیں۔ جن اخبارات کو انگریز خرید لیا کرتے تھے ان کی اشاعت 200 تک پہنچ جایا کرتی تھی۔

مولوی محمد باقر جنہوں نے دہلی اردو اخبار شائع کیا تھا انہیں انگریزوں نے پھانسی کی سزا دے دی۔ چنانچہ انہیں ہندوستان اردو صحافت کا پہلا شہید کہنا مناسب ہے۔ ہفت روزہ ”سید الاخبار“ کے مدیر جمال الدین کو تین برس کی سزا سنائی گئی۔

1848ء میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں 26 اخبارات شائع ہونے لگے جن میں سے 19 اردو تھے۔ ان میں سے بیشتر انگریزوں کے خلاف تھے، اس لیے ان کے مدیروں کو انگریزوں کی پالیسیوں کے خلاف لکھنے پر سزا سنائی جاتی تھی۔ 1877ء میں ”اودھ شیخ“، سجاد حسین کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا جو پہلا حراجیہ اخبار تھا۔ جب کہ خواتین کے لیے پہلا رسالہ ”اخبار النساء“ کے نام سے آیا۔ جس میں کارٹون اور لطیفے بھی شائع ہوتے تھے۔

1903ء میں مولانا ظفر علی خان نے جب ”زمیندار“ اخبار کی ادارت سنبھالی تو اسے انقلابی بنا دیا۔ یہ اخبار لاہور

سے شائع ہوتا تھا۔ اس وقت تک نواز ایجنسیاں قائم ہو چکی تھیں، اس لیے وہ ان سے خبریں لے لیا کرتے تھے۔ اپنے اداروں اور مضامین کی بنا پر اخبار لوگوں میں مقبول ہو گیا اور اس کی اشاعت 30,000 تک پہنچ گئی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ انگریزوں کی مخالفت کی بلکہ تحریک پاکستان کی بھی حمایت کی۔ یوں پنجاب کے نوجوانوں کا حلقہ ان کے قریب ہوتا چلا گیا۔

1912ء میں مولانا محمد علی جوہر نے ”نقیب اہد“ شائع کیا اور اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ہفت روزہ ”الہلال“ شائع کیا جس کی دھوم مچ گئی، کیونکہ اس میں سیاست اور مذہب کے موضوع پر مضامین شائع ہوتے تھے جس سے لوگوں کے دلوں میں حریت کی شمع روشن ہو گئی۔ اس ہفت روزہ اخبار کا لے آؤٹ اور ڈرائنگ دوسرے اخبارات کے مقابلے میں بہترین تھا۔ 1945ء میں جواہر لال نہرو نے بھی ایک اخبار شائع کرنا شروع کر دیا جس کا نام ”قومی آواز“ تھا۔ اس اخبار کے ادارے لوگوں کے جذبات میں شعلے بھڑکا دیا کرتے تھے۔

تقسیم کے وقت اردو اخبارات 513 کی تعداد میں شائع ہوتے تھے اور ان کی مجموعی اشاعت ساڑھے سات لاکھ تھی۔ جب کہ پچاس برس بعد اردو روزناموں کی تعداد 3168 ہو گئی اور ان کی مجموعی اشاعت 1.7 کروڑ تک پہنچ گئی۔ حیدر آباد (انڈیا) سے شائع ہونے والے اخبار ”سیاست“ 1990ء سے انٹرنیٹ پر اپنی خبریں دینے لگا۔

مولوی محبوب عالم ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ موضع بھروکی، وزیر آباد ضلع کو جرنالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد افلاس کی وجہ سے انہیں زیادہ تعلیم نہیں دلا سکے۔ لاہور میں ان کے چچا مولوی احمد دین مدرس تھے۔ وہاں انہوں نے پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے دوسرے چچا ماسٹر محمد دین کے پاس چلے گئے جہاں اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ ایک ماہنامہ ”کلید امتحان“ کے مالک بھی تھے۔ وہاں انہوں نے مڈل کا امتحان دیا۔ اوائل عمری میں مثنوی صاحب کی طبیعت سمجھتی باڑی اور زرعی صنعت و حرفت کی طرف مائل تھی۔ وہ مقامی انجمن ترقی زراعت کے سیکرٹری تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ اپنے چچا کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ وہاں انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن اسی اثنا میں ان کے والد مولوی احمد دین کی وفات ہو گئی۔ ان کی اور ان کے بھائی مثنوی عبدالعزیز کی شادی چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی، اس لیے والد

صاحب کی وفات کے بعد گھر کا سارا بوجھ اٹھانا پڑا۔ چند ہی ماہ بعد انہیں کالج چھوڑنا پڑا۔ غالباً قدرت انہیں کسی اور طرف لے جانا چاہتی تھی۔

وہ لاہور آ گئے اور پرائیویٹ طور پر مثنوی اور مثنوی فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور صوبے بھر میں اوّل آئے۔ جس کے اعتراف کے طور پر پنجاب یونیورسٹی نے انہیں ایک سو روپے کے انعام سے نوازا اور اس کے علاوہ پچاس روپے کی کتابتیں بھی دیں۔ اس کے علاوہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ انہوں نے عربی اور انگریزی علوم کا اکتساب کیا۔ فارسی علم و ادب میں انہیں ایک طرح سے مستند سمجھا جاتا تھا۔ تمام قابل ذکر شعرا کا انتخاب انہیں از بر تھا۔ مثنوی محبوب عالم کی تعلیم کے زمانے میں انہوں نے اپنے بھائی مثنوی عبدالعزیز کو جو بعد میں پیسہ اخبار کے مدیر مقرر ہوئے تحصیل قصور سے اپنے پاس بلا لیا جہاں وہ چھ روپے ماہانہ پراسکول میں ملازم ہوئے۔

ان کے چچا چونکہ فارغ البال تھے اس لیے انہوں نے رسالہ ”کلید امتحان“ ان دونوں کے سپرد کر دیا۔ رسالے کا انتظام سنبھالنے کے بعد مثنوی محبوب عالم نے ایک پریس کھول لیا جس کا نام تعلیم کی مناسبت سے ”خادم تعلیم“ تھا۔

اس کے بعد انہوں نے اسی روپے سے کاروبار شروع کیا۔ اس مصروفیت کے باوجود تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ اور اپنے چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال ان کے لیے ضروری تھی۔ اس لیے مجبوراً وہ ایک سال کے بعد لاہور سے کو جرنالہ چلے گئے۔

اپنے گاؤں فیروزہ والد سے انہوں نے ایک ماہنامہ ”زمیندار“ جاری کیا۔ پھر ایک ہفت روزہ اخبار ”ہمت“ شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے چند ماہ بعد ایک اور ہفت روزہ ”اسکول ماسٹر“ جاری کیا۔ مگر چند ماہ بعد انہیں محسوس ہوا کہ عام لوگوں کو سستا اخبار چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے ہمت کو پیسہ اخبار سے بدل دیا۔

پیسہ اخبار ہر ہفتے جمعہ کے روز آٹھ چھوٹے چھوٹے صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ صرف بارہ آنے تھا۔ البتہ ڈاک خرچ کے لیے تیرہ آنے ملے۔ پڑھنے والے کو ایک روپہ نو آنے ادا کرنا پڑتے تھے۔ چونکہ انہوں نے ابتدائی زندگی افلاس میں گزاری، اس لیے اس اخبار کے مدیر، منیجر، کاتب، سنگساز، پروف ریڈر اور کلرک وہ خود تھے۔ چار برس تک انہوں نے بے جد محنت سے کام کیا اور اس کے بعد اخبار اور رسائل کی ایک زنجیر بننا ڈالی۔ لاہور کی یاد انہیں

پھر آنے لگی تو وہ وہاں چلے گئے اور اخبار کو وہاں سے جاری کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ایک سو کی تعداد میں چھاپا۔ جس کو ان کے بھائی مٹھی عبدالعزیز اسکولوں میں جا کر خود ایک ایک پیسے میں فروخت کرتے تھے۔

1895ء میں انہوں نے ایک انگریزی اخبار ”دی سن“ جاری کیا، جو لوگوں کی ناقدری کی بنا پر دو سال کے بعد بند کرنا پڑا۔

16 مارچ 1897ء کو ہفتہ وار ایڈیشن کے علاوہ پیسہ اخبار کا روزانہ ایڈیشن بھی جاری کیا۔ مگر چونکہ اس وقت لوگ روزانہ اخبار کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھے، اس لیے 2 مئی 1899ء کو اس کا روزانہ ایڈیشن بند کرنا پڑا۔

گو جرنالہ میں کچھ سرمایہ جمع ہو گیا تھا اور پریس کا تجربہ بھی تھا، اس لیے انہوں نے لاہور میں ایک پریس لگا لیا۔ جس میں رفتہ رفتہ کر کے سترہ مشینیں لگا لیں۔ یہ پریس اور دفتر انگلری سے ملحقہ گلی میں تھا۔ اس کا نام پیسہ اخبار اسٹریٹ سرکاری طور پر رکھا گیا۔ اس گلی میں ایک پوسٹ آفس بھی قائم کیا گیا۔ دونوں چیزیں آج بھی قائم ہیں۔

1900ء میں وہ اخبار نویسی کا مطالعہ کرنے کے لیے یورپ چلے گئے۔ سرسید کے بعد یہ دوسرے صحافی تھے جنہوں نے یورپ کے اخباری تجربات سے استفادہ کر کے اخبار نویسی کی بنیاد رکھی۔ ان کی روایتی پران کے دوستوں نے ایک شاندار جلیہ کیا تھا جس میں شیخ محمد اقبال علامہ اقبال نے ایک نظم بڑھی تھی۔ یورپ سے جو مضامین وہ پیسہ کے لیے بھیجا کرتے تھے اس سے اخبار میں ایک دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

وہ جب دسمبر 1900ء میں لاہور آئے تو ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال انجمن اسلامیہ پنجاب اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اراکین کے علاوہ ہزاروں دوستوں نے کیا۔ انہوں نے یورپ میں نہ صرف صحافت کی تعلیم حاصل کی بلکہ زبانیں بھی سیکھیں۔ انہیں اردو، فارسی، عربی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور رومی آتی تھی۔ انہیں مطالعے کا بہت شوق تھا، اس لیے ان کے ذاتی کتب خانے میں تقریباً بیس ہزار کتابیں موجود تھیں۔ اس وقت ہندوستان کا کوئی اخبار نویس اتنی زبانیں نہیں جانتا تھا۔

”پیسہ“ لوگوں میں روشناس ہو گیا تو انہوں نے اسے 1904ء میں ایک بار پھر روزنامہ بنا دیا۔ پہلے جب انہوں نے اسے روزنامہ کیا تھا تو اس کا سائز چھوٹا تھا، مگر اب انہوں نے اسے غیر ملکی اخبارات کی طرح بڑے سائز پر شائع کرنا

شروع کر دیا۔ یہ انداز لوگوں کو پسند آیا اور وہ لوگوں میں معروف و مقبول ہوتا چلا گیا۔ دیکھا دیکھی اردو کے دوسرے اخبارات بھی اسی سائز پر آنے لگے۔

کتاب ”اخبار نویسوں کے حالات“ نے مٹھی محبوب عالم کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا:

جہاں تک علم ہے یہ بات بلا خوف و تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو اخبارات میں لطیف، عجائبات، اعداد و شمار، با تصویر حکمت کے مولیٰ، معلومات، نامور لوگوں کے با تصویر حالات اور سیکڑوں قسم کی دلچسپیاں پیدا کرنے والے آپ ہی پہلے شخص ہیں۔

قدرت نے ان کی محنت کا پھل اس طرح سے دیا کہ وہ اپنے ہم عصر ”اخبار عام“ سے بازی لے گیا۔ صحافت کی دنیا میں اس کا چرچا ہو گیا۔ اس میں لطائف، معلومات اور اقتباسات سب ہی کچھ شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کا ہفت روزہ ایڈیشن بھی کامیاب ہو گیا۔ بچوں کے لیے TIT BITS کی طرز پر ایک ماہنامہ اور جاری کیا، جو خالصتاً تفریحی تھا۔ اس کا نام ”انتخاب لا جواب“ تھا۔ طلبہ کے لیے ماہنامہ ”تکلیف امتحان“ دوبارہ شائع کرنا شروع کر دیا۔ زراعت پر ایک ماہنامہ ”باغبان“ بھی جاری کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا، اس لیے اس کی بہت سی کاپیاں ڈسٹرکٹ بورڈ خریدتا تھا۔ انہوں نے اپنے اشاعتی ادارے سے تقریباً ایک ہزار کتابیں شائع کیں، جن میں سے پچاس تصانیف خود ان کی تھیں۔

جب ان کا اخبار اپنے عروج پر تھا تو ان کے پریس میں آگ لگ گئی۔ ساری مشینیں برباد ہو گئیں اور کاغذ جل گیا۔ انہیں تقریباً دو لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن سے ڈھائی ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ جاری ہوا جو ان کی موت تک جاری رہا۔

مٹھی محبوب عالم عالمی ادب سے بھی بخوبی واقف تھے۔ غیر ملکی ادیبوں کی خود نوشت اور سفر ناموں میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے پیسہ اخبار کے حوالے سے لاکھوں روپے کمائے اور اچھی خاصی جائیداد بنائی۔

اردو صحافت کی ترقی میں ”پیسہ اخبار“ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”کوہ نور“ کے بعد یہ پہلا اخبار تھا جہاں مستقبل کے کئی صحافیوں نے تربیت حاصل کی یا اس میں نمایاں کام کیا۔ مثلاً لالہ دینا ناتھ جنہوں نے بعد میں ”ہندوستان“ جاری کیا۔ حکیم غلام نبی جو بعد میں

”الحکمہ“ کے مدیر ہوئے۔ فشی احمد دین جنہوں نے ”منخواں عالم“ شائع کیا۔ فشی محمد دین فوق جنہوں نے ”فقیری میگزین“ نکالا اور بے شمار اچھی کتابیں لکھیں۔ اور مولوی شجاع اللہ جنہوں نے کچھ عرصہ بعد ”ملت“ جاری کیا۔

ان سب سے جاندار شخصیت میر جالب دہلوی کی تھی، جنہیں بعد میں فشی محبوب عالم نے ”پیہ“ کا مدیر مقرر کر دیا تھا۔ بقول والد عبد المجید سالک اس زمانے میں پیہ اخبار کے ادارے نہایت پُر مغز ہوتے تھے، اس لیے کہ میر صاحب کی معلومات اور ان کا بے نظیر حافظہ سطر سطر میں نظر آتا تھا۔ پیہ اخبار سے نکل کر میر جالب دہلوی ”ہمدرد“ اور پھر ”ہمد“ میں کام کرنے لگے۔

پیہ اخبار کی دوسری خصوصیت اس کی متانت اور سنجیدگی تھی۔ اس پر سرسید کی صحافت کا پرتو تھا۔ اس لیے جموں میں اسے نمایاں مقام حاصل تھا۔ ”اخبار عام“ یوں تو غیر فرقہ وارانہ اخبار تھا، لیکن کبھی کبھی ہندوؤں کے حق میں لکھ جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں پیہ اخبار اسلامی طرز فکر رکھتا تھا۔ وہ اسلامی حقوق کا علم بردار تھا۔ اردو کی پرانی روایت کے برعکس اس پر ”اخباریت“ غالب تھی۔ مضامین اور ادارے ان موضوعات پر لکھے جاتے تھے جن کا لوگوں کی زندگی کے مسائل سے تعلق تھا۔ چونکہ تجارتی طور پر اخبار کی قیمت کم تھی، اس لیے لوگوں سے درخواست کی جاتی تھی کہ وہ اس میں اشتہارات دیں۔ بہت سے اخبارات اشتہارات نہ ملنے کی وجہ سے سسک سسک کر دم توڑ گئے، مگر پیہ اخبار نصف صدی سے زیادہ زندہ رہا۔

اس کی آخری خصوصیت اس کی اشاعت تھی۔ 1890ء میں جب تک یہ ہفت روزہ تھا اس کی اشاعت پانچ ہزار کے قریب تھی جب کہ روزنامہ کی حیثیت سے یہ دو ہزار ہو گیا۔ اس کے باوجود اس کا کوئی بھعصر اخبار اس تک نہ پہنچ سکا۔ آج صرف پیہ اخبار محبوب عالم کے عظیم صحافتی کارنامے کی یاد دلاتی ہے۔ طرابلس کی جنگ کے دوران انہوں نے برطانوی حکومت کی حمایت کا دم بھرا۔ اس لیے ہندوستان کے آزادی پسند عوام میں نامقبول ہوتے چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے سارے پرچے اور اخبار رفتہ رفتہ بند ہو گئے۔ پیہ 1888ء میں جاری ہوا تھا اور 38 برس بعد 1924ء میں بند ہو گیا۔ اس کے باوجود بھی فشی صاحب نے کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا اور روزِ زبان میں دنیا کے ہر موضوع پر کتابیں پیش کیں۔

وہ ذاتی طور پر بااخلاق تھے اور ان کی طبیعت میں انکسار تھا۔ کسی کو نقصان پہنچانا ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ برطانیہ کی حکومت نے قدر و منزلت کی اور 1904ء اور 1912ء میں شاہی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا۔

ابتدائی عمر میں ان کی طبیعت موزوں تھی اور وہ شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا تخلص مسافر رکھا تھا۔ جب اخبار کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا تو شاعری ترک کر دی۔ بہر حال ضرورت کے وقت کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کے ایک شکاری دوست نے تیر شکار کر کے انہیں بھیج دیے۔ انہوں نے شکریے کے طور پر تین اشعار لکھ بھیجے۔

تین تیر جو آپ نے بھیجا ان سے بندہ ہوا بہت مفلوظ
اے شکاری تجھے خدار کے حملہ آفات سے سدا محفوظ
چونکہ تیر تین تھے تھی تھی اس لیے تین شعر ہیں ملفوظ
ان کا انتقال 23 مئی 1933ء میں ہوا۔

اخبار کا ایک ادارہ یہ ملاحظہ فرمائیے جس میں ”البرٹ بل“ کے پاس ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ بات انگریزوں کو اس لیے ناپسند تھی کہ اس کی رو سے انگریزوں کو عدالتوں میں پیش ہونا پڑتا تھا۔

لارڈ لٹن صاحب ہندوستان کے انگریزوں کے ساتھ اس امر میں متفق الراء ہیں کہ البرٹ بل پاس ہونے سے ان انگریزوں کو سخت بے عزتی، شرم، مصیبت اور بربادی برداشت کرنی پڑے گی، لیکن ہم لوگ ان سے ہاتھ جوڑ کر اور ٹوپی اتار کر اپنے کانوں پر پھڑپھڑ مار کر، اپنا سر پیٹ کر، اپنا گلہ بھڑکھڑا کر عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کا سراسر خیال خام ہے، کیونکہ انگریز لوگ نئی مقامات اور علاقہ جات میں ہندوستانیوں کے ماتحت ہیں۔ انگریز لوگوں کے کل دیوانی مقدمات ہندوستانی فیصل کرتے ہیں۔ انگریز لوگ برابر ہندوستانی حاکموں کے اجلاس میں کام پڑنے پر ٹوپی اتار کر جاتے ہیں۔ انگریز لوگ کتنے ہی راجا مہاراجوں کے ہاں نوکر ہیں۔ انگریز کتنے ہی بڑے آدمیوں کے سپہ سالار و دارو کو چپان ہیں۔ انگریز لوگ لاکھوں روپے کے ہندوستانیوں کے قرضدار ہیں۔ انگریز لوگ دو آنے میں ہندوستانی لوگوں کو تماشے دکھاتے ہیں۔ ان باتوں میں انگریز لوگ بے عزت نہیں ہوتے۔ وہ بے عزتی فقط عدالت میں ہندوستانی حاکموں کے جسم میں جا چٹی ہے۔ ہندوستانی کالے جنگلی، دھوکا باز، حاسد سب ہیں اور انگریز گورے

اداریے کا عنوان ایک شعر تھا۔

وہ کون ہے جو مجھ سے تاسف نہیں کرتا

پر میرا جگر دیکھ کہ میں اف نہیں کرتا

قاعدے کی بات ہے کہ مظلوم بے زبان پر بڑے

بڑے سنگدل ظالموں کو بھی رحم آجاتا ہے۔ مہمات خارجہ

ہندوستانی فوج بھیجتا اور مصارف کا بار بھی غریب ہندوستان

ہی کے گلے میں باندھتا اتنا بھاری ظلم ہے کہ اخبار ناٹمر لندن

جیسا متعصب و طرف دار گورنمنٹ بھی اسے بے اختیار

نا انصافی کہہا تھا ہے اور ان سختیوں پر ہندوستان کی خاموشی، اور

تحلل دیکھ کہ اس کا دل بھرا آیا۔ 19 مئی کے لندن کے تاریخی

سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار مذکورہ نے بڑے شہد و مد سے اس

معاملے پر کئی مضامین لکھے ہیں۔

اور جو ہندوستانی افواج افریقہ وغیرہ میں مصروف

کارزار ہے یا ہونے والی ہے، اس کی تنخواہ وغیرہ کے

مصارف کو بھی خزانہ ہندوستان اس کی صریح نا انصافی اور

ہندوستان پر ظلم کہا ہے۔ بھئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن نے

سیکرٹری آف اسٹیٹ اور اسٹراٹجی ہند کو تار دیے ہیں کہ ہم

سوڈان میں ہندوستانی فوج کے خرچ کا کوئی حصہ

ہندوستان پر نہ ڈالا جائے۔ یہ سچ ہے اگر یہ فوج ہندوستان

میں رہتی تو اس کی تنخواہیں وغیرہ ہندوستان سے دی

جاتیں۔ لیکن جب کہ ہندوستان اس کے وجود سے خالی

ہے اور ان کی خدمات سے محروم کیا گیا اور جب کہ ان کی

خدمات سے ممالک غیر میں منتقل کردی گئیں تو ایسی حالت

میں ہندوستان سے ان کی تنخواہیں دلائی کیا نا انصافی نہیں

ہے؟ اس بحث میں سیکرٹری آف اسٹیٹ نے سابق کی نظیروں

پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بیہودہ جہت اور عذر بدتر از

گناہ ہے۔

انگریزوں نے ذرا سی زمین انعام میں ملنے کے بعد

تمام ہندوستان پر قبضہ جمالیا۔ ایسی خطرناک قوم کے بارے

میں بعض ریاستوں میں وہاں کے قانون یا رسم و رواج کے

مطابق ان کو وہاں زمین خریدنے کا اختیار نہیں تھا، جس کو انگریز

حکومت تسلیم بھی کر چکی تھی۔ لیکن طاقت و حکومت کا غرور کام

میں آتا ہے۔ وہاں اس کے سامنے سب قانون و معاہدوں کی

اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ وائسرائے

ہندوستان نے اس معاہدے کی مٹی پلید کردی اور حیدرآباد میں

انگریزوں کو زمین خریدنے کا اختیار دے دیا۔ جس پر پیر اخبار

نے 6 جون 1896ء کے ادارے میں اس جبر و ستم پر تبصرہ کیا

سولائزڈ بمیئر باہر سے ایک سے، انصاف کے، ایمان کے،
خود خدا کے اوتار سب ہی، لیکن عدالت تو دونوں کے ماننے
لائی ہے۔ ہاں اگر انگریز لوگ عدالتوں میں جانے کو ہی بے
عزتی سمجھتے ہیں تو ہم انہیں صلاح دیتے ہیں کہ آج سے کبھی
ایسا کام مت کرو جو عدالت میں جانا پڑے۔ ہندوستان میں
بھی ایسے بھلے آدمی بہت سے ہیں جو مر جانے پر بھی عدالت
میں جانا پسند نہیں کریں گے۔ کیا ایسی صاف باطنی اور پاکیزہ
مزاجی انگریز لوگوں میں نہیں ہو سکتی؟

(12 مئی 1889ء) انگریزوں نے ہندوستان کو
سونے کا انڈا اپنے والی مرغی سمجھ رکھا تھا۔ اس نے جو سفارت
خانے دوسرے ملکوں میں قائم کر رکھے تھے ان کے اخراجات
وہ ہندوستان کے خزانے سے پورے کرتا تھا۔ اس کی مخالفت
پہلی فروری 1896ء کے پیر کے ادارے میں کی گئی۔ اس
نے اپنے ذرائع سے ان اخراجات کی تفصیل معلوم کر کے بھی
درج کی۔ اس ادارے کا عنوان تھا۔ ”انگلستان کا خرچ
ہندوستان کے سر۔“ انگلستان کے اکثر اخراجات مکمل طور پر
خزانہ انگلستان سے دیے جانا چاہئیں۔ یا کم از کم اس کا
واجبی ساحبہ ہندوستان سے لے لینا چاہیے۔

لیکن مکمل اخراجات غیر واجبی ہندوستان کے سر
بندھے ہوئے ہیں۔

گزشتہ دس برس سے 30 فیصد کے اوسط سے ان میں
اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ 1882ء میں یہ خرچ مکمل طور پر دو کروڑ
انیس لاکھ گیارہ ہزار روپے تھا۔ لندن میں انڈیا آفس بنا
اس کا خرچ تعمیر ہندوستان سے پانچ لاکھ پاؤنڈ لیا گیا۔ جو
کلونیل آفس لندن میں بتایا گیا۔ اس کے لیے خزانہ ہند سے
ایک لاکھ روپیا اٹھایا گیا۔ (مال مفت دل بے رحم) 2 لاکھ
20 ہزار پاؤنڈ سالانہ مصارف انڈیا آفس لندن ہندوستان
سے لے جاتا۔ ہوم گورنمنٹ قیام سفارت خانہ چین کے لیے
ساڑھے 12 ہزار پاؤنڈ اور سفارت خانہ ایران کے لیے
7 ہزار پاؤنڈ سالانہ ہندوستان سے لیا جاتا ہے۔ رزیڈنسی
عرب، ترکی اور کوسل بغداد کا خرچ ایک لاکھ ہتر ہزار تین سو
ساتھ انگلستان ہندوستان سے دلواتا ہے گویا اسے ان
مقامات سے کوئی غرض نہیں۔

انگریز ہندوستان کی فوج کو غیر ممالک بھیجتا تھا، لیکن
اس کے اخراجات ہندوستانی خزانے سے ادا کیے جاتے
تھے۔ پیر اخبار کے 6 جون 1896ء کے شمارے میں اس کی
مخالفت میں ادارہ لکھا گیا۔ سخت الفاظ میں مذمت کی گئی۔ اس

ہے۔ جس کا عنوان ہے:

ہندوستانی ریاستوں کے حقوق میں گورنمنٹ کی غفلت اب تک ریاست حیدر آباد دکن میں دیگر ریاستوں کے کسی یورپین کوزمین خریدنے یا اس پر کوئی عمارت مثلاً گرجا وغیرہ بنانے کی اجازت نہیں تھی اور یہ عہدہ قدیم ایام سے چلا آتا تھا۔ حال میں مدارس کے کسی پادری نے علاقہ نظام میں زمین خریدنی چاہی اور گورنمنٹ نظام کی ممانعت پر اس نے مدارس کے بشپ سے فریاد کی۔ بشپ نے ریڈیٹنٹ حیدر آباد کو لکھا اور ریڈیٹنٹ مدارالمہام ریاست سے کہ پادری کوزمین خریدنے کی اجازت دے دی جائے۔ مدارالمہام نے بھی عذر خلاف دستور قاعدہ ریاست پیش کر کے اس درخواست کو نامنظور کر دیا۔ مسٹر پلاؤڈل ریڈیٹنٹ نے گورنمنٹ ہندوستان کو لکھا اور زور دیا کہ یہ قاعدہ منسوخ کیا جائے۔ وائسرائے نے کونسل کا اجلاس بلانے کے بعد حکم دیا کہ برٹش گورنمنٹ کو حق حاصل ہے کہ جو حقوق خرید زمین تجارت و دیگر جائز کاروبار کے رعایا حیدر آباد کو علاقہ سرکارگریزی میں حاصل ہیں وہی برٹش رعایا کو علاقہ نظام میں سرکار موصوف سے باصرار دلائے۔ عیسائی لوگ خصوصاً پادری جس طرح ریاستوں میں قدم جماتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی جا بجا مداخلتوں کو ہر معاملے میں بڑھاتے ہیں اور چونکہ ریاست کو ان کے مقدمات سننے کا اختیار نہیں ہوتا، لہذا یہ لوگ مار آستین بن کر وقتاً فوقتاً کس طرح حیران اور ان کے اختیارات کی توہین کرتے رہتے ہیں۔ مسٹر پلاؤڈل جب تک ریڈیٹنٹ حیدر آباد دکن میں ریاست کی جس قدر حق تلفیاں ہوں اور جتنا اسے ضعف پہنچے تھوڑی ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان کے ہر شعبے پر قبضہ جمارکھا تھا اور ہندوستان کی ہر صنعت کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اگر ہندوستان کا کپڑا بلا ٹیکس ہندوستان میں فروخت ہوتا تو ستا بکتا۔ اس صورت میں غیر ملکی کپڑا یہاں فروخت ہو نہیں سکتا تھا۔ انگریز حکومت کو یہ برداشت نہیں تھا۔ اس لیے کہ مانچسٹر اور لکا شائر میں جو کپڑے کی صنعتیں لگ چکی تھیں ان کا مال ہندوستان کی منڈی میں کیسے فروخت ہوتا؟ چنانچہ ہندوستانی کپڑے پر ٹیکس لگا دیا گیا۔ جس پر مدیر پیرا اخبار نے 8 فروری 1896ء کی اشاعت میں انگریزوں کی اس شرمناک پالیسی پر نکتہ چینی کی۔ جب انگریزی حکومت نے ہندوستانی

کپڑے پر ٹیکس لگا دیا تو ہندوستانیوں نے فیصلہ کیا کہ بدلی کپڑے کا بائیکاٹ کیا جائے اور دیسی کپڑا خریدنے کی درخواست کی جائے۔ اس مشورے پر عمل درآمد کرانے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں جلسے ہوئے اپنے دیس کی چیزوں کو خریدنے کے لیے نئے نئے اسٹور کھولے گئے۔ اس پر پیرا اخبار نے ایک مضمون شائع کیا جس میں اس جدوجہد کی تحریف و تائید کی گئی۔ عنوان تھا:

دیسی اشیاء کے استعمال کی ضرورت باوجود ہندوستان کے کارخانہ داروں کی عام مخالفت اور اوراجی شکایت کے محض اہل مانچسٹر کے فائدے کے لیے گورنمنٹ نے پارچہ جات پر ٹیکس کے جدید قانون کو نافذ کر کے ہندوستان میں بدولی اور ناخوشی پھیلا دی۔ یہی میں جا بجا مجلس منعقد ہو کر گورنمنٹ کی اس ناانصافی پر اظہار نفرت کیا جا رہا ہے۔ اس وجہ سے لوگ اب زیادہ سرگرم معلوم ہوتے ہیں کہ ولایتی کپڑے کا استعمال ایک دم چھوڑ کر صرف اپنے ہی ملک کا بنا ہوا کپڑا جو مضبوطی اور عمدگی کے لحاظ سے ولایتی کپڑے کی نسبت کہیں سستا ہے، پہنا کریں۔ چنانچہ 15 فروری کو اکولہ صوبے ہرار میں بھی اس غرض کے لیے ایک ہزار اور پچوش جلسہ ہوا اور یہی کے لوگ بھی اس معاملے میں ہوش اٹھا رہے ہیں اس جلسے میں لوگوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ ایک نمونہ دار واد منظور ہوئی اور جمع حاضرین نے عہد کیا کہ جب تک حکومت پارچہ جات کے ٹیکس کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے گی۔ وہ لوگ صرف دیسی کپڑے پہنیں گے۔ اور ولایتی کپڑے کو بالکل ہاتھ نہیں لگیں گے۔ یہی پریسڈنسی کے مختلف مقامات میں اس غرض سے انجمنیں گھڑت سے بن رہی ہیں کہ سوائے اس پارچہ جات کے جو سمیٹی کے کارخانوں میں تیار ہوتا ہے انگریزی کپڑے کو استعمال میں نہ لائیں نہ اس کی تجارت کریں۔ لاہور میں بھی ”سودیٹی و ستوپر چارک“ کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی ہے۔ اس نے ایک ماہوار پرچا بھی نکالا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اگر لوگ اس عہد پر پورے طور پر قائم رہ سکیں تو مانچسٹر کے حملے کا دندان شکن جواب ایسی حالت مایوس میں جب کہ گورنمنٹ نہیں سستی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں یہ پالیسی گورنمنٹ کی ہے کہ وہ اپنی انگلستان کے نفع کے لیے ہندوستانیوں کے عوام کی ناراضی کی پروا نہیں کرتی۔ دور اندیشی سے بعید ہے لیکن ایسے خلاف قانون تدبیر قوانین کے اجرا اور ہندوستانیوں کے

حقوق کے فروگزاشت ہر نیا معاملہ اپنی ہندوستان کو اتنا فائدہ دیتا ہے کہ ان میں ایک نیا دلول پیدا کر دیتا ہے جس سے انہیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ بغیر ایجنسی ٹیکس کے انہیں کچھ نہیں ملے گا۔

ہندوستان کی ساری چیزوں پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی ساری آبادی عیسائی ہو جائے۔ اس ضمن میں وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ملک میں کسی اور مذہب کی تبلیغ کی جائے۔ اگر کوئی ہندوستانی عیسائی ہو جاتا تو مشنری طبقہ جشن مناتا، لیکن اگر کوئی عیسائی مسلمان ہو جاتا یا کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیتا تو اس کے خلاف انتقامی کارروائیاں ہونے لگتیں۔ اس تنگ نظری کے خلاف منشی محبوب عالم نے 15 فروری 1896ء کے شمارے میں حسب ذیل مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا:

اپنی آنکھوں کا شہر نظر نہیں آتا۔

قوم انگریز کو بہت بڑا دعوہ اپنے آزاد اور بے تعصب ہونے کا ہے۔ انگریز اپنی سلطنت کو آزادی کا گھر اور اپنی قوم کو انصاف پر در کہنے کے عادی ہیں۔ مسلمانوں پر "ناریشن" نہ کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ یہ لوگ خود سب سے بڑے ان ناریشن ہیں۔ کچھ عرصہ گزرا ہندوستان کے حکمہ تار برقی میں ایک یورپین افسر نے اسلام قبول کر کے سراج الدین نام اختیار کر لیا تھا۔ اس تصور پر اس غریب کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ حال ہی میں ایک انگریز بادی نے عیسائی مذہب چھوڑ کر خود اسلام قبول کر لیا اور عبدالمجید نام رکھ لیا۔ اسلام کی شرع کے مطابق دوسری شادی کر لی۔ جو انگلستان کے ایک اعلا خاندان کی لڑکی تھی۔ مشرعیہ المجید کی گزشتہ بیس برس سے گورنر سیلون کے اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ ان کے مذہب تبدیل کرنے پر گورنر سیلون نے سیکرٹری آف اسٹیٹ سے اجازت حاصل کر کے انہیں ملازمت سے معطل کر دیا۔

ان کی بیس سالہ خدمات کا کوئی لحاظ نہ کیا۔ اس بیچارے کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور دوسری شادی کر لی۔ آج کل برہما میں اکثر انگریز افسران نے ناجائز طور پر برہمی عورتوں کو گھر میں ڈال رکھا ہے، جس کے لیے سال گزشتہ میں صاحب چیف کمشنر نے ایسے افسران کو تنبیہ بھی کی تھی مگر ان کی ملازمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ واقعی گورنمنٹ انگریزوں کی تنگ نظری ہزار نفیس کے قابل ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ پیسہ اخبار کے مدفن منشی محبوب عالم کو شعر و شاعری شائع کرنے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے اس میں غزلیں اور نظمیں دکھائی نہیں دیتیں۔ 7 مارچ 1896ء کے شمارے میں مولوی فضل الرحمن راج مراد آبادی کی وفات پر سات قطعات درج ہیں۔ زیادہ تر فارسی کے ہیں۔

اس زمانے میں اخبارات چھوٹے سائز پر شائع ہوتے تھے۔ اور عام اخبار کے علاوہ ان کی سالانہ قیمتیں سو پچاس روپے سے کم ہوتی تھیں۔ اس وقت کے اخبارات میں عجیب و غریب قسم کے مضامین ہوتے تھے تاکہ لوگ چونک جائیں اور ہمیشہ اخبار خریدتے رہیں۔ گاڑی پر مضمون ہے۔ تگوار اور قلم کا مناظرہ ہے۔ بھی سردی اور گرمی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ بھی ریاستوں کی مدح سرائی ہے۔ گویا اخبارات کے کالم پر کرنے سے غرض تھی۔ مگر ہر کی دو میں اور بچے کی پانچ آنکھیں۔ آگ کی بارش قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ مگر پیسہ اخبار میں ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جو عام افراد کے لیے معلوماتی اور دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ ان میں سسٹنی خیزی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی قیمت بھی کم تھی، اس لیے بچے بوڑھے یکساں پڑھنا پسند کرتے تھے۔

دوسرے اخبارات میں اشتہارات نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ ان کی پالیسی نہیں تھی، بلکہ انہیں اشتہارات نہیں ملتے تھے۔ تجارت پیشہ پیسہ اخبار میں اشتہار دینا پسند کرتے تھے۔

پیسہ اخبار میں اشتہار دینے سے سیکڑوں افراد جنہیں کوئی جانتا تک نہ تھا اپنی اشتہار بازی سے نام پیدا کر لیا اور لاکھوں روپے کمائے۔ ایڈیٹروں کی ایک بڑی تعداد نے اسی اخبار میں تربیت حاصل کی اور بعد میں کسی اور اخبار کے ایڈیٹر بن گئے۔

پیسہ اخبار اور اس جیسے دوسرے اردو اخبارات کا مکمل ریکارڈ کہیں میسر نہیں ہے البتہ اس کا بیشتر ریکارڈ گوجرانوالہ کی لائبریری میں رکھا ہوا ہے۔

جن کتابوں سے مدد لی گئی

نقوش۔ لاہور نمبر جامع اردو انسائیکلو پیڈیا۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا۔ سید قاسم محمود پاکستانیکا۔ سید قاسم محمود انسائیکلو پیڈیا فیروز سنز مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا

ازم

منظر امام

جب اس کرکڑا ارض پر تہذیب نے انسانوں کی صحیح راہ متعین کی تو وہ لوگ جو خود کو عقل مند بنا کر پیش کرنے والے تھے انہوں نے مزید قوانین متعارف کرنے شروع کر دیے ان قوانین کو ”ازم“ کہا گیا۔ یوں تو بے شمار ازم سامنے آئے لیکن ان میں جو زیادہ مشہور ہوئے ان کا ذکر خاص۔

ایک مختصر دلچسپ تحریر قصہ دل پذیر

ازم کیا ہیں۔
جب پڑھے لکھوں یا دانشوروں کی محفل میں بیٹھ جاتے ہیں تو ہمیں مختلف ازم کے ناموں سے واسطہ پڑتا ہے۔ دانش وارانہ اور فلسفیانہ اصطلاحات پر گفتگو ہوا کرتی ہے۔
کوئی مودمنٹ، کوئی تحریک، کوئی نظریہ، کوئی مکتبہ فکر، یہ سب ازم ہیں۔ مختلف قسم کی تجارت۔ پوری دنیا میں اس وقت اس قسم کی تجارت موجود ہیں۔
دانشوروں نے ان پر کتابیں لکھی ہیں۔ گفتگو کی ہے۔



ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ آرٹ کے مختلف شعبوں میں اس کا عمل دخل ہو گیا۔

Adamitism بے لباسی

مذہبی وجوہات کی بنا پر بے لباسی۔

بے لباسی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جب انسان کے پاس کپڑے نہیں ہوا کرتے تھے۔ جنگلوں میں رہنے والوں اور پتھروں کے عہد کے انسانوں کا تصور کریں۔

پھر انسان نے صدیوں بعد اپنے آپ کو ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔ پتوں سے۔ درختوں کی چھالوں سے اور جانوروں کی کھالوں سے۔

پھر مذہبی پیشواؤں نے دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے بے لباسی کا حکم دیا۔ مندروں میں داسیوں کو بے لباس کر کے رقص کروایا جاتا۔

ہندوستان میں آج بھی تنگے سادھو ہر جگہ گھومتے پھرتے ہیں اور ان کا بہت احترام بھی کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں اس قسم کے رسومات کی بھرمار ہے۔

پھر اس قسم کے رسومات آرٹ اور فیشن میں بھی داخل ہو گئے۔ خاص طور پر مصوری اور مجسمہ سازی میں۔ نیوڈ ازم آرٹ کے اظہار کا ایک ذریعہ بن گیا۔ دنیا کے بڑے بڑے مصوروں نے اس قسم کے آرٹ میں کمال حاصل کیا ہے۔ امریکا اور یورپ وغیرہ میں تو اس آرٹ کو بہت قیمتی تصور کیا جاتا ہے۔

Adoption ism (گود لینے کی تحریک)

یہ تو عام معنوں میں اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ لیکن خالص تحریک کی صورت میں یہ وہ نظریہ ہے جس کے نزدیک مسیح کو گود لیا گیا تھا وہ خدا کے بیٹے نہیں ہیں (عیسائیوں کی تحریک)

عیسائیت کے نظریہ تثلیث کو سمجھنے کے بعد ہم اس نظریے پر آتے ہیں۔ یروشلیم کی فتح کے بعد یہ تحریک اپنے پورے عروج پر تھی۔

یہ تحریک عیسائیوں ہی کے ایک چھوٹے سے فرقے نے شروع کی تھی۔ اور اس لحاظ سے بڑا حقیقت پسندانہ نظریہ تھا ان کا۔ عیسائیوں کا وہ گروہ جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتا تھا وہ یقیناً ان کے خلاف ہو گیا ہو گا۔ لیکن یہ تحریک آج بھی جاری ہے۔ (مخالفوں کے باوجود)۔

Aesthetic ism (تصور جمالیات)

اس تحریک کا مرکزی تصور یہ ہے کہ خوبصورتی ہی

تقریریں کی ہیں۔ ان کا پرچار کیا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ اصطلاحیں پوری دنیا میں پھیل گئی ہیں۔

(سیاست سے قطع نظر ہمارے ملک میں بھی ایک ازم کا بہت چرچا رہا ہے اور وہ ہے بھٹوازم۔ وہ کیا ہے کیوں ہے؟ اس کی تشریح و تعریف ایک الگ موضوع ہے۔ بتانا یہ تھا کہ پاکستان میں بھی ایک سیاسی تحریک بھٹوازم موجود ہے)

میرزاخیال ہے کہ ہر قسم کی عام سی تحریک کو جب ماننے والے لے لے جائیں تو وہ ازم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی تقلید کرنے والے، اس کی راہ پر چلنے والے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں سامنے آ جاتے ہیں۔

ویسے تو ان ازموں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن ہم اس مضمون میں صرف ان تحریک کا ذکر کر رہے ہیں جن سے کسی نہ کسی حد تک ہم بھی واقف ہیں اور جو کسی نہ کسی طور پر ہماری سماجی اور ثقافتی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

ہم ان ازم تحریک کے ناموں سے آگاہی کے ساتھ یہ کوشش کریں گے کہ ان کے حوالے سے کسی نہ کسی حد تک ان کا تعارف بھی کروا سکیں۔ اور ان کا پس منظر بھی سامنے لا سکیں۔

Absoluteism مطلقیت

آٹو کریسی۔ اس سے ملتا جلتا ڈکٹیٹر شپ بھی ہے۔ یعنی ایک حکمران کا تصور۔ اور یہ سوچ کہ اگر فیصلوں میں یا حکمرانی کے معاملات میں کسی اور کو شامل کیا گیا تو اس میں خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔

دنیا میں اس طرز حکومت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ بادشاہت کو بھی آپ اسی ضمن میں شامل کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ لوگ آتے ہیں جن کی حکمرانی موروثی تو نہیں ہوتی لیکن حادثاتی طور پر کسی ملک کے حکمران بن جاتے ہیں۔ اس کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے۔ اور یہ ازم..... عام طور پر لشکر

کے ذریعے آیا کرتی ہے۔

Academicism اکیڈمیسی ازم

اس کا یہ تصور ہے کہ کچھ نہیں جانا جاسکتا۔ اور کچھ جان لینے کا جو تصور ہے وہ کھوکھلا ہے۔ نسب سے پہلے یہ تصور پلوٹو نے پیش کیا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ ہماری بصیرت کمزور ہے۔ اور ہماری عقل محدود ہے۔ اسی لیے ہم مطلقیت کی طرف نہیں جاسکتے۔ بس جو کچھ سامنے ہے وہی سب کچھ ہے۔ بعد میں یہ اصطلاح

اس تحریک کو ملحدانہ تحریک کا نام بھی دیا گیا ہے (مذہبی حلقوں میں)
ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید میں بھی اس قسم کی
تھنیک موجود ہے۔ اس اصطلاح سے ملتی جلتی اور بھی کئی
تحاریک ہیں جیسے۔

Monotheism---Daimism __ Athe
ism __ opotheism وغیرہ۔

اس قسم کے ازم کے برعکس مذاہب میں خدا کے وجود کا
بھرپور اقرار ہے۔ مثال کے طور پر اسلام۔
اللہ۔ خدائے واحد کا مکمل تصور۔ اپنی تمام تر صفات
کے ساتھ۔ سورہ اخلاص سے اللہ کے تصور کو سمجھا جاسکتا ہے۔
یعنی وہ ذات جو اپنی تمام تر صفات میں مطلق ہے نہ وہ کسی
جنی کی اور نہ ہی اس نے کسی کو جنم دیا۔

یہودیت۔

ان کے یہاں بھی خدائے واحد کا تصور موجود ہے۔ اور
وہ بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ۔
وہ ایک کامل ذات ہے۔

عیسائیت۔

ان کے یہاں خدا کا تصور تو موجود ہے لیکن اس تصور کو
مثبت کے فلسفے نے آلودہ کر دیا ہے۔ The books
of facts اور گوپل میں بھی اس قسم کا تصور موجود ہے۔
ہندوازم۔

ہندو کے یہاں خدا کا تصور بہت پے چیدہ ہے۔
ہزاروں اقسام کے دیوی دیوتا اور ان کا پورا خاندان موجود
ہے۔

یہ خدا ایک دوسرے سے الجھتے رہتے ہیں۔ مار پیٹ
کرتے ہیں۔ آپس میں شادیاں کرتے ہیں اور بچے پیدا
کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے خداؤں کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے
ایک طویل عمر چاہیے۔ تب بھی شاید یہ کبھی حل نہ ہو سکے۔
بدھ ازم۔

مہاتما بدھ نے ایک بالکل الگ راہ نکالی۔ انہوں نے
نہ تو وجود خدا سے انکار کیا اور نہ ہی اقرار۔ بلکہ انہوں نے
مراقبہ اور گیان و حیان پر زور دیا ہے۔

Anarchism (انارک ازم)

انارکی۔ یہ ایک سیاسی نظریہ ہے۔ اس کا مطلب ہے
معاشرے میں سیاست اور ریاست کے وجود سے انکار۔
بسا اوقات انارک ازم سے انفرادی اور شورش زدگی

کائنات کا مرکز ہے۔
آرٹ کی یہ تحریک انیسویں صدی میں یورپ سے
شروع ہوئی۔ بعد میں یہ تحریک symbolism وغیرہ
کی تحاریک میں شامل ہوئی۔

اس تصور کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ آرٹ کو سکون دینا
چاہیے۔ خوشی دینی چاہیے۔ چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔
ایک تصویر بھی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ اور کوئی فرنیچر
بھی۔ جس چیز کو بھی سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کر دیں
وہ آرٹ ہے۔

1882 میں آسکر وایبلڈ نے ایک جگہ گھر کی خوبصورتی
پر ایک پیکچر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہی پیکچر اس آرٹ کی تحریک
کی ابتدا تھی۔

Agonistic ism اگناسٹک ازم

یہ تصور کہ ہم مادے سے باہر کچھ نہیں جان سکتے۔ یعنی
جو کچھ بھی ہے وہ اسی مادے میں ہے۔ مادے سے باہر کچھ بھی
نہیں ہے۔ لہذا اس کے لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت
نہیں ہے۔

یہ بے دینی اور دینی کے درمیان کی کیفیت ہے۔ نہ تو
اقرار ہے اور نہ ہی انکار۔ فلاسفر ولیم روئے اس پر بات کرتے
ہوئے کہا تھا کہ یہ دو انتہاؤں کے درمیان کی کیفیت ہے۔
یعنی کسی مذہب کو ماننے والے مجسم اقرار ہوتے ہیں اور
ان کا یہ رویہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کی دلیل بھی سننے کو
تیار نہیں ہوتے۔

جبکہ اس کے برعکس لامذہب ہوتے ہیں۔ اور یہ اپنی
جگہ سراسر انکار ہوتے ہیں۔ یہ بھی دلیل سننے کو تیار نہیں ہوتے
اور اپنی جگہ یہ بھی انتہا پسند ہوتے ہیں۔

جبکہ اس نظریے اگناسٹک ازم کے ماننے والے
درمیانی حالت سے دو چار رہتے ہیں۔
جن فلاسفر نے اس موضوع پر کام کیا ان میں نیچے بیلا کا
نام قابل ذکر ہے۔ یہ ہندوستانی فلاسفر پانچویں صدی بی سی
میں تھا۔

اسی طرح یونان کا مشہور فلاسفر فیثاغورث جو اپنے دور کا
بہت بڑا اگناسٹک تھا۔ اس زمانے میں معاشرہ بے شمار دیوی
دیوتاؤں کے درمیان ہوا کرتا تھا۔ فیثاغورث نے دیوی دیوتا
کے وجود پر شک کیا تھا۔

وائٹنچ ہو کہ اس نے مکمل انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ شک کا
اظہار کیا تھا۔

مراد لی جاتی ہے۔ جو درست نہیں ہے۔

اس نظریے کی رو سے مملکت بذات خود ایک حقیقی، آزاد اور فلاحی معاشرے کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور اس کے ادارے جیسے فوجی حکومتیں اور پارلیمنٹ وغیرہ سامراج کا کردار ادا کرتے ہیں۔

فلسفیانہ مباحث میں یہ تصور نیا نہیں ہے مگر صنعتی انقلاب کے بعد ہائیکس، ٹالسٹائی اور بال ٹونن وغیرہ نے اس تحریک کو نئی جہت دی ہے۔

آج کے دور میں امریکی مفکر چوم نمسکی اور لاطینی امریکا کی کئی تحریکیں انارکسٹ ہیں۔

Atheism (لامذہبیت)

ہمارے یہاں آتھی ازم دہریت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

لفظ دہریت اپنے مخصوص معنوں میں اور اسلامی اصطلاحوں میں بھی ایسے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جب کوئی خالق کی تخلیق سے انکاری ہو۔

لفظ دہر سکولر ازم کے زیادہ قریب ہے۔ حضرت امام غزالی اور البہادوی نے دہریت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ موجودہ دور میں اب سے پہلے کے بہت سے دانش ور اور مفکر اس ازم کے پیروکار رہے ہیں۔ اس دور میں ایک بڑا نام ٹران پال سارتر کا ہے۔

Dualism

فلسفے کی اصطلاح جو پہلی بار تھامس ہائیڈ نے اپنی کتاب ”تاریخ مذہب“ میں استعمال کی تھی۔ یہ مابعد الطبیعیات کا نظریہ ہے جو بیک وقت دو خود مختار اور ایک دوسرے سے غیر متعلق چیزوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔

مثلاً حواس ک دنیا اور ادراک کی دنیا۔ تنوعیت (فلاطونیت) سوچ کا مادہ اور خارجی دنیا کا مادہ (ڈیکارٹ) امکانی دنیا اور اصلی دنیا۔ مظہری دنیا اور عصری دنیا۔ (کائنات)

ایران کا قدیم ترین مذہب زرتشت بھی (پارسی) بھی دو طاقتوں پر یقین رکھتا ہے۔ خیر کا خدا ”اھورا مزدا“ اور شر کا خدا ”اہرمین“۔

capitalism (سرمایہ داریت یا سرمایہ دارانہ

نظام)

یہ ایک معاشی اور معاشرتی نظام ہے جس میں سرمایہ اور عامل پیدا کنی نجی شعبے کے پاس ہوا کرتا ہے۔

اشتراکی نظام کے برعکس سرمایہ دارانہ کی ترقی محکوس نہیں ہوتی۔ اس نظام کی کئی ایسی خرابیاں ہیں جن پر ہمیشہ گفتگو ہوتی رہی ہے۔

جملہ حقوق، منافع خوری اور نجی ملکیت اس نظام کی وہ خصوصیات ہیں جن کی مدد سے غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے مخالفین یہ خیال پیش کرتے ہیں۔ جدید دانش وروں کے مطابق آج یہ نظام اپنے اختتام کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی دو واضح وجوہات ہیں۔

نجی ملکیت بغیر حدود و قیود اور مکمل طور پر آزاد منڈی۔ شاید اسی لیے غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔

commonism (اشتمالیت یا کمیونزم)

یہ ایک انقلابی سماجی تحریک ہے۔ جس کے ذریعے درجہ بندی اور ملک سے بالاتر سماجی نظام کی تشکیل مقصود ہے۔

پیداوار مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔ (جو یقیناً ایک غیر فطری صورت حال ہے)

اشتمالیت، اشتراکیت کی ایک شاخ ہے۔ اس نظام کو ترویج دینے میں جرمن فلاسفر کارل مارکس کا بہت بڑا کردار ہے۔

اس سے پہلے افلاطون نے اپنی کتاب ”ری پبلک“ میں اس نظام کی نشان دہی کی ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ بیوی اور بچے بھی ریاست کی ملکیت ہیں۔ جو حد درجہ غیر فطری ہے۔

Deism (خدا کا اقرار۔ لیکن مذہب سے انکار)

اس تحریک کو ماننے والوں کا یہ کہنا ہے کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے کسی رہنمایا مذہب وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بڑے آتشاویز چاند، یہ ستارے، یہ سورج کا جلال،

یہ پہاڑوں کی بلندیاں، یہ طرح طرح کے پھل اور نعمتیں۔ یہ سب خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ہمارے جوش صاحب کا یہ شعر شاید اسی حوالے سے ہے۔ ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے۔ اگر رسول نہ ہوتے تو کج کافی تھی۔

خدا کی عبادت کے لیے ضروری نہیں کہ مذہب کو بیچ میں لایا جائے۔ ہم اس کے بغیر بھی ٹھیک ہیں۔

یہ فلسفہ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں بہت زور پکڑ گیا تھا۔ اس کی تقلید کرنے والے مجزوں وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے۔ لیکن ایسا اگر ہو ہی جائے تو وہ اس کو اتفاق قرار دیتے

10 جون 2000ء کو شام کے صدر حافظ الاسد انتقال کر گئے، تو ان کے بیٹے بشار الاسد کو صدر کے عہدے پر جب کہ محمود مصطفیٰ امیر کو وزیر اعظم کے عہدے پر نامزد کیا گیا۔ 2000ء میں شام نے 200 میٹرکلوٹک مار کرنے والے میزائل کا کامیاب تجربہ کیا، جس پر اسرائیل نے سخت تشویش کا اظہار کیا جس کے جواب میں شام نے امریکا اور اسرائیل کو زیادہ سخت جواب دیا۔ 2001ء میں شام نے سلامتی کونسل کی صدارت سنبھال لی۔

2003ء میں صدر نے محمد نجی الاوتاری کو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا جو اسرائیلی دشمنی میں مشہور تھے۔ چنانچہ اسرائیلی ایوان نمائندگان نے 2003ء میں شام کے خلاف پابندیاں عائد کرنے کی منظوری دے دی۔ شام پر دہشت گرد گروپوں سے مبینہ تعلقات کے علاوہ کیمیائی، ایٹمی اور حیاتیاتی ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کے الزامات بھی عائد کیے گئے۔ 2003ء میں شام کے خلاف اقتصادی پابندیوں کے بل پر امریکی صدر نے بھی دستخط کر دیے۔ 2004ء میں اسرائیل کے صدر نے شام کے ساتھ غیر مشروط طور پر بات چیت کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ 2004ء میں امریکا نے شام پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں اور اس کے اثاثے منجمد کر دیے۔ لیکن شام نے جھنجھنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر ملک میں خانہ جنگی کرا دی گئی۔

تھا کہ پیٹ بھر کر کھاؤ۔ رات دن خوبصورت عورتوں کی محبت میں رہو۔ زندگی کو خوشیوں سے بھر دو۔ قص کرو گیت گاؤ کیوں کہ یہی زندگی ہے۔ باہر نے بھی شاید اسی طرف اشارہ کیا تھا ”باہر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“

Agnorant ism (لامعرفت)

نفوی طور پر لامعرفت کے معنی لاعلم کے قریب تر ہیں۔ یہ اصطلاح دو الفاظ کا مرکب ہے۔ لاعنی نہیں اور عارف یعنی جاننا۔

انگریزی میں اس کو انورنٹ ازم کہا جاتا ہے۔ پہلی بار 1869ء میں ٹی ہلسے نے استعمال کیا تھا۔

یہ تحریک کلیسا کی تاریخ عرفانی یا معرفت کی ضد میں شروع ہوئی تھی۔ اس نظریے کے تحت حقیقی یا مطلق علم کا حصول ناممکن ہے۔ اسی لیے تمام علوم و آگہی اضافی ہیں۔ دوسرے

ہیں۔

برطانیہ میں یہ اصطلاح پہلی بار 1624 میں لارڈ برکٹ کی کتاب کے ذریعے سامنے آئی۔

Edol ism

بھوتوں اور روحوں پر یقین رکھنے والے۔ جی ہاں۔ یہ پورا ایک مکتبہ فکر ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں اس قسم کی باتوں پر یقین رکھنے کے لیے کسی ازم وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں ہر دوسرا شخص اس یقین میں مبتلا ہے۔

(اسی لیے عامل باباؤں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔) اس ازم کے باقاعدہ فلاسفرز ہیں جو اپنے مباحث میں بھوتوں روحوں کے وجود پر دلائل دیا کرتے ہیں۔ یورپ میں کسی کی سوسائٹیز ہیں جو بھوتوں اور روحوں کو بلایا کرتی ہیں۔

Fatal ism

یہ تصور کہ انسان بے بس ہے۔ وہ اپنی تقدیر یا مستقبل پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ہمارے یہاں بھی یہی تصور کیا جاتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ قدیم ہندو فلسفے کے مطابق بھی انسان کے ساتھ کرم کا چکر ہے۔

484 بی سی میں ایک فلاسفر گوسالامان نے یہ اصطلاح کی تھی۔ صدیوں بعد فریڈرک نطشے نے اس تصور کو fatal ism کا نام دیا۔

جبکہ ہمارا تصور یہ ہے کہ انسان کو خدا نے اچھائیوں اور رایتیوں میں انتخاب کی قوت دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ وہ اپنے کردار اور اعمال سے یا تو اپنی دنیا یا عاقبت فراہ کر سکتا ہے یا بہتر کر سکتا ہے۔

Heden ism

یہ تصور کہ خوشی میں سب کچھ ہے۔ اور انسان کو ایسی خوشی حاصل کرتے رہنا چاہیے جس میں دکھ کا کوئی عنصر نہ ہو۔ ہر شخص کو اپنی مرضی کی خوشی حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ ناچ سکتا ہے۔ گا سکتا ہے۔ محبت کر سکتا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دوسروں کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

یہ نظریہ سب سے پہلے سترط کے ایک شاگرد Aristippus نے پیش کیا تھا۔

سمیریوں کی تہذیب میں اس نظریے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ تحریر کے وجود میں آنے کے بعد بائبل تہذیب کے sidur نے اپنی کتاب میں اس نظریے کو عام کیا۔ اس کا کہنا

معتوں میں خدا کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ”اس کا انکار بھی جہل ہے اور اقرار بھی جہل۔“ اس مکتبہ فکر کے ماننے والوں میں مہلثن، ہکسلے، اسپنر اور رسل وغیرہ ہیں۔

Material ism (مادیت پرستی)

اس کے معنی ایسے نظریے کے ہیں جن کی رو سے سوائے مادے کے دنیا میں اور کوئی جوہر موجود نہیں ہے۔ یعنی مادہ پرستی۔

ان کا یہ ماننا ہے کہ ذہنی اور روحانی رجحانات بھی مادے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ تحریک قدیم چین میں بھی رہی ہے۔

یہ 800 سے 200 بی سی کے دوران کی تحریک رہی ہے۔ ہندوستان میں یہ نظریہ 600 عیسوی میں رائج ہوا تھا۔ (اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ علمی اور فکری تحریکیں ایک دوسروں کی کہانیاں نہیں ہوتیں بلکہ ان کے بیچ سینکڑوں سال پہلے پڑ چکے ہوتے ہیں)

موجودہ دور میں رہنے اور ڈیکارٹ جیسے فلاسفر اس نظریے کے حامی تھے۔

Monothe ism (توحیدیت)

یہ وہ عقیدہ ہے جس میں ایک خدا کے وجود پر یقین ہوتا ہے۔ اور یہی یقین اسے توحیدی بناتا ہے۔ دنیا کے سارے الہامی مذاہب اسی عقیدے پر قائم ہیں۔ اسلام کا تو یہ بنیادی عنصر ہے۔ مشرکت اس عقیدے کے برعکس ہے۔ توحیدیت کا نظریہ پہلی بار قدیم مصر میں مودار ہوا۔ چودہ سو سال پہلے مصر کے ایک فرعون امتحان نے ایک ہی دیوتا آتمن کو ماننے پر مجبور کیا تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں مصر میں دیوی دیوتاؤں کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔

positive ism

یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے تحت صرف واقعی علم کو علم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی positive science۔ ان کے نزدیک صرف وہی علم قابل بھروسہ ہے جو سائنس کی کسوٹی پر پورا اترے۔ وہی درست ہے۔ یہ اصطلاح کامیونے 1850 میں وضع کی۔ بعد میں اور بہت سے فلاسفر اس کی حمایت میں آگئے۔

Raci ism (نسلیت یا عصبیت پرستی)

اس تحریک یا جذبے کا ذکر بہت ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جذبہ انسان کے اندر ہمیشہ سے موجود ہے۔

اپنے آپ کو دوسروں سے الگ یا برتر سمجھنے کا جنون۔ اور یہی جنون نسلیت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور نسل فسادات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی ابتدا اپنے خاندان برادری یا مسلک والوں کی بے جا حمایت سے ہوئی ہے۔ اتو طرز فکر میں ممکن ہے کچھ اچھائیاں بھی ہوں۔ لیکن بنیادی طور پر یہ ایک منفی طرز فکر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ادب اور آرٹ زندگی کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے فلسفہ وغیرہ سے ہٹ کر ادب اور آرٹ نے بھی کئی قسم کی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ اس قسم کی تحریک کی کتنی بہت طویل ہے۔ یہاں میں دو تین مکتبہ فکر کی بات کروں گا۔

Expression ism

اسے باطن نگاری یا اظہاریت سمجھ لیں۔

مصور، ہنک تراشی وغیرہ کی وہ صف جس میں ظاہری رنگ و روپ اور دیگر قدرتی صفات کو مٹی نیز طور پر مخ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ ایک خاص منظر کی خارجی حقیقت کو تاہ کیا جاسکے اور اس طرح اس کی صداقت یا جذباتی ماہیت تک رسائی ہو سکے۔

یہ تحریک وسطی یورپ کی ایک مضبوط تحریک رہی ہے۔ اس نے جرمنی اور آسٹریا میں جنم لیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور تحریک ماڈرن ازم اور پاپر ماڈرن ازم وغیرہ بھی ہیں۔ اس مضمون میں اس قسم کی چند تحریک کا تعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا واسطہ عام انسانوں سے نہیں ہوتا۔ بلکہ دانشورانہ مباحث میں ان اصطلاحات سے واسطہ پڑتا ہے۔ چند مکتبہ فکر کا یہ ایک اجمالی سا جائزہ تھا۔ ویسے دنیا بھر میں اس قسم کے بے شمار مکتبہ ہائے فکر ہیں۔ اور اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ انسان نے ابھی سوچنا ترک نہیں کیا۔

وہ زندگی کا نجات، ہونے نہ ہونے اور خدا کے وجود اور عدم وجود کے بارے میں سوچنا رہتا ہے اور طرح طرح کے سوالات اٹھاتا ہے۔ یہی سوالات اس کے زندہ ہونے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

”میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں۔“ یہ ہے انسان۔ اگر وہ سوچنا بند کر دے تو اس میں اور دیگر جانداروں میں کیا فرق رہ جائے کچھ بھی نہیں۔

امید ہے کہ اس قسم کے مضامین ذہن کے در پہنچے کو کسی حد تک کھولنے میں کامیاب رہیں گے۔

لہذا سوچیں اور سوچتے رہیں۔

بطوطہ کی کتاب کی تلاش شروع ہوئی اور بالآخر کراچی کے اردو بازار میں رئیس احمد جعفری صاحب کا اردو ترجمہ مل گیا۔ تقریباً 683 سال پہلے ابن بطوطہ برصغیر پاک و ہند سیاحت کے لیے آیا تھا۔ اس کی آمد 12 ستمبر 1333 عیسوی بنتی ہے۔ سفر کے دوران وہ یادداشتیں مرتب کرتا رہا۔ جب 25 سال بعد وطن واپس پہنچا تو گوشہء عافیت میں بیٹھ کر ان کی مدد سے اپنا سفرنامہ لکھا۔ اس دلچسپ سیاحت کے عربی زبان سے فارسی اور پھر اردو میں کی تراجم ہوئے۔ جناب رئیس احمد

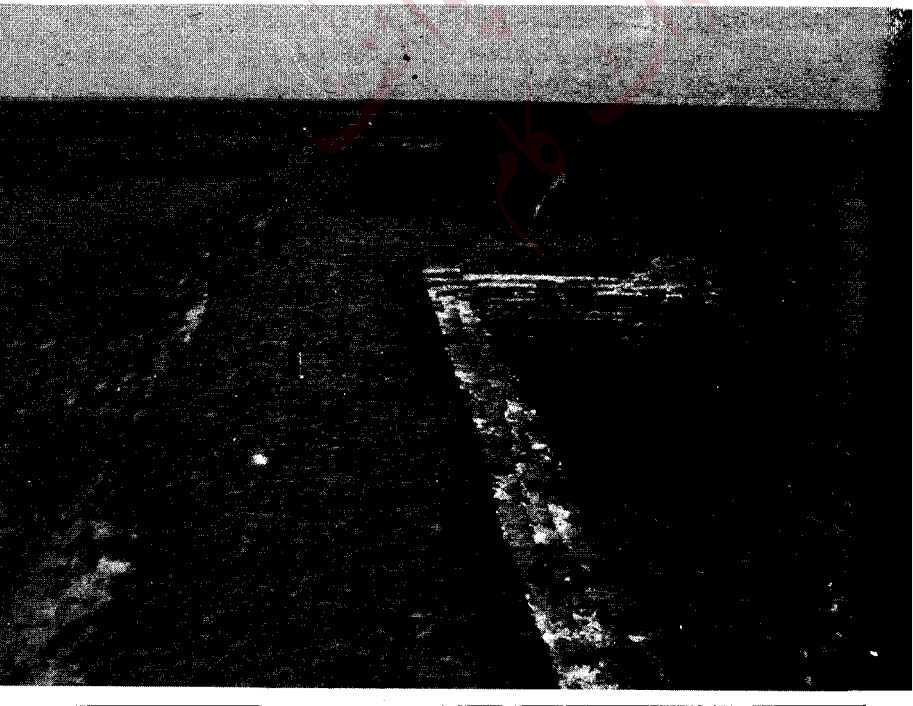
90 کی دہائی میں میرے ایک دوست، جن کا تعلق پاکستان کشمیر سے ہے، جنہیں تاریخی چیزیں اور کھنڈروں دیکھنے کا بہت شوق تھا، کہنے لگے کہ ”لہائی بندر“ چلنے کا پروگرام بنا لو۔ پوچھا کہ یہاں کیا ہے؟ تو جواب دیا کہ یہاں ہمیں قریب ایک ہستی کے آثار بہت اچھی حالت میں ہیں اور سنا ہے کہ کچھ مکان ادندھے بھی ہیں؛ جن کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ پروگرام تو بنانا نہیں لیکن تاریخ کا طالب علم ہونے کے ناتے میرے اندر شوق اور بحس نے سراٹھایا، ابن

ادندھی بستی

شاہد لطیف

کئی سو سال قبل ابن بطوطہ نے اس ارض پاک کی سیاحت کی تھی۔ اس نے اپنے سفر نامے میں ایک ادندھی بستی کا ذکر کیا تھا۔ وہ بستی اب پاکستان کا حصہ ہے۔ لیکن ہم میں سے لاتعداد لوگ اس قہرزدہ بستی سے واقف نہیں۔

اس کی احوال ہمارے ادندھی پڑی ہے



جعفری صاحب کے سفرنامہ ابن بطوطہ کے ترجمے میں ایک ایلی (اوندمی) بستی کا ذکر ہے جس میں ابن بطوطہ نے بعض مکانات اوندھے دیکھے تھے گویا کسی طاقتور ہاتھ نے انہیں اٹھا کر الٹا کر دیا ہو۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے ”پانچویں دن ہم لاہری پہنچے۔ یہ خوبصورت شہر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ قریب ہی دریائے سندھ، سمندر میں گرتا ہے۔ شہر سے سات کوس کے فاصلے پر ایک میدان ہے جس کو ’نارنا‘ کہتے ہیں۔ وہاں جا بجایے شمار آدمیوں اور حیوانات کی پتھری بنی سورتیاں، ثابت اور ٹوٹی پھوٹی نظر آتی ہیں۔ غلہ، گیہوں، چنا اور مسری وغیرہ پھرائے ہوئے پڑے ہیں۔ کھنڈر میں پتھر کا بنا ہوا ایک گھر ہے، جس کے وسط میں ایک ہی طویل پتھر کا بنا ہوا چوترہ ہے۔ ایک جگہ نہایت بدبودار پانی کھڑا ہوا تھا۔ دیواروں پر سنسکرت زبان کے کتبے نظر آئے۔ مقامی لوگ اور یہاں کے مؤرخ خیال کرتے ہیں کہ یہ شہر مخموگیا تھا۔ چوترے پر بادشاہ کا بت ہے۔ چنانچہ اب بھی اس کو راجا کا محل کہتے ہیں۔ یہاں کی دیوار کے کتبے سے پتا لگتا ہے کہ یہ بربادی، میرے یہاں آنے سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہوئی تھی۔“

آج کا ’لہائی بندر‘ جس کا طول بلد اور عرض بلد $29^{\circ}11'N$, $68^{\circ}13'E$ ہے، غالباً کل کالاہری بندر تھا جس کے قریب دریائے سندھ، طاس (ڈیلٹا) کی صورت سمندر میں گرتا ہے۔ یہاں پر آج بھی یہ کھنڈر اچھی حالت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ سفرنامہ پڑھنے کے بعد دل میں آیا کہ کیوں نہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس سلسلے میں سوچا کہ سرکاری سروے کرنے والے اداروں سے رابطہ کیا جائے۔ سب سے پہلے رانم ’کے ڈی اے‘ کے ایک افسر کے پاس گیا۔ وہ بولے کہ بالکل ایسی بستی موجود ہے اور انہوں نے خود اس مقام کا سروے بھی کیا ہے۔

اس بات نے مجھے تقویت دی اور اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ شہید ملت روڈ اور شاہراہ فیصل کے سنگم سے کچھ پہلے واقع، محکمہ آثار قدیمہ کے مرکزی دفتر گیا۔ ہمارے ملک کی سڑکوں یعنی شاہراہوں کو کہیں قابری میں شاہراہ اور کہیں عربی میں شارع لکھا جاتا ہے جو ایک الجھن کا باعث ہے۔ بہر حال، رانم نے جناب رئیس احمد جعفری صاحب کے ’سفرنامہ ابن بطوطہ‘ کے اردو ترجمہ کے متعلق صفحات کی فوٹو کاپی، شعبہ کے ذمہ دار افراد کو دکھائی جن میں لاہری بندر کا ذکر تھا۔ وہ اس جگہ کو جانتے تھے۔ رانم نے تجویز

پیش کی کہ اگر ان کے محکمہ کا کوئی ذمہ دار فرد ساتھ چلے اور اس تاریخی مقام کے پس منظر میں چند جملے قلم بند کروادے تو اس کام کو سرکاری سند حاصل ہو جائے گی۔ تو جواب ملا۔ ”یہاں تو موجودہ ڈوکے لیے فنڈ مشکلوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ لاہری بندر ہماری ترجیحات میں ہے ہی نہیں۔ آپ ہماری جیب کو قابل استعمال کروا کر اس میں تیل پانی ڈلوادیں تو پھر ہمیں وہاں جانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ اس جواب نے ہمیں لا جواب کر دیا۔

انہی دنوں اتفاق سے کراچی انرپورٹ کے کلثوم بائی ولیکا اسکول کے ہم جماعت اور برائے محلہ دار سے ملاقات ہوئی جو اس وقت پاک فوج میں ٹیفینٹ کرنل تھے۔ باتوں باتوں میں سفرنامہ ابن بطوطہ اور لاہری بندر کا ذکر ہوا۔ وہ بھی یہ کھنڈر اور اوندھی بستی دیکھنے کے لیے بہت پر جوش ہو گئے۔ رانم نے ان کو رئیس صاحب کے ترجمے کی فوٹو کاپی دی جس سے اس مقام تک رسائی میں مدد مل سکتی تھی۔ اس خاکسار کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اس وقت آری ایوشن سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ یہ حضرت میری طرح، اس قسم کی جگہوں پر جانے کے شوقین تھے۔ فرمانے لگے کہ جلد وہاں جانے کی کوشش کریں گے۔

کرنل صاحب نے اگلی ہی شام یہ خوش کن خبر سنائی کہ وہ ہیلی کاپٹر سے مطلوبہ مقام دیکھ آئے ہیں۔ نیز یہ کہ جیسا رئیس صاحب نے ترجمہ میں بیان کیا تھا، انہوں نے اس بستی اور کھنڈرات کو دیباہ پایا۔

اس اوندھی بستی اور کھنڈر کے مقام اور وجود کی تحقیق صحیح سمت میں اور صحیح رفتار سے ہو رہی تھی۔ اس تاریخی مقام کا وجود ثابت ہو گیا، اب خود دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

شوق کو ہمیز ملی اور رانم نے اپنے ذہن کو چاروں جانب دوڑانا شروع کیا۔ سوچ بچار کے بعد ایک صاحب کا خیال آیا جو اس وقت پاکستان کسٹمز کے شعبہ اینٹی اسمگلنگ آف گرانٹز اینڈ ٹریڈ میں تھے۔ یہ صاحب بھی دور دراز تاریخی کھنڈر دریافت کرنے کے شوقین تھے۔ رانم نے ان سے لاہری بندر / لہائی بندر کا ذکر کیا۔ انہوں نے مختلف افراد سے اس مقام پر جانے کی صورت دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ مختصر راستہ تو زینی ہے مگر اس میں خطرات کچھ زیادہ ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو دلہلیں ہیں۔ اگر کسی مقامی جانور، جیسے گدھایا گائے کی دم پکڑ کر اس کو زبردستی دلہلی میں لے جائیں تو وہ آپ کو بحفاظت دلہلی

کیمائس (Chamois)

ہرن کی طرح کا ایک جانور۔ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔ قد میں بکری کے برابر لیکن پھرتیلا اس قدر کہ مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ بیشتر پہاڑوں میں رہتا ہے اور چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں کو آسانی سے پھلانگ جاتا ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور اس کی کھال سے کیمائس چڑا جاتا ہے۔ جس سے وحاشی چیزوں کو پالش کر کے چمکا جاتا ہے۔ نر اور مادہ اکتوبر اور نومبر میں اختلاط کرتے ہیں اور مئی اور جون میں بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دن کے بعد ہی بچے اپنی ماں کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ اس عجیب جانور کی عمر طبعی 20، 25 برس ہوتی ہے چونکہ اس کے گوشت اور چمڑے کی مانگ زیادہ ہے۔ اس لیے اس کے شکار پر پابندیاں لگائی گئی ہیں تاکہ کہیں معدوم نہ ہو جائے۔ شمالی ایران اور روس کا کیمائس عمدہ قسم کا ہوتا ہے۔

مرسلہ: حسین فرجاد، لاہور

جانے کن کن انتخابات کے فلیکس، جا بجا ان کا اور اپنا نوحہ پڑھتے نظر آئیں گے۔

لہری بندر کے کھنڈر ایک تو عوام کی دسڑس سے دور ہیں، دوسرے تو ہم پرستی کہ وہاں کوئی نہ جائے، جو وہاں جاتا ہے مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نے بہت حد تک اس مقام کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ تیسرے وہاں پہنچنا قطعاً کوئی آسان کام نہیں۔

ان آثار میں سب سے عمدہ اور دلچسپ چیز پتھر یا ہوا (فوسل) غلط ہے: جیسے گیسوں، چٹا اور شاید کسی قسم کی کوئی وال وغیرہ۔ یہ ایک چبوترے پر بکھرا ہوا ہے۔ چبوترے کے ساتھ ہی ایک پتھر کا بنا ہوا اوندھا مکان ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی زبردست قوت نے پکڑ کر اوندھا کر دیا ہو۔ یہ اوندھا پن بالکل صاف محسوس ہوتا ہے۔ قرب و جوار میں کچھ مورتیاں بھی سر کے بل ہیں۔ تھوڑی سی محنت سے ایک سنگی کتبے پر قدیم

میں سے نکال کر ان کھنڈرات تک لے جائے گا۔ شاید قدرت نے اس علاقے کے چوپایوں میں ان کی حفاظت کے لیے یہ جہت رکھی ہو۔

دوسرا اور زیادہ بہتر ذریعہ سمندری سفر تھا، جو کسی قریبی بستی سے بادبانی بستی کے ذریعے بہ آسانی طے کیا جاسکتا تھا۔ ان کھنڈر کے تین طرف دلدل اور سامنے کی جانب سمندر تھا۔ پانی کی گہرائی اکثر جگہوں پر کافی کم تھی لہذا بڑی یا چھوٹی لالچ کا وہاں لے جانا مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے بادبانی کشتی کا مشورہ دیا گیا۔

لہائی یا لہری بندر کبھی ایک بڑا تجارتی مرکز ہوا کرتا تھا مگر زمانے کے سرد گرم نے آج کل اسے گمنا کر دیا۔ اب ان کھنڈرات تک، سمندری کھاڑی کے راستے جایا جاتا ہے۔ سمندر کے خشکی میں اندر تک جانے کے آبی راستے کو کھاڑی کہتے ہیں۔ کئی تک اور چھوٹی بڑی کھاڑیوں سے گزر کر چاک نظروں کے سامنے یہ کھنڈرات آگئے۔ پہلی نظر میں ایسا لگا جیسے کہ کسی تاریخی فلم کا سیٹ لگایا گیا ہو کیوں کہ ان کھنڈرات میں مٹی اور دھول کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ تین اطراف میں دلدل اور کچڑ ہے اور سامنے سمندر اور اس کی کھاڑیاں۔ لہذا لاکھ ہوا چلے، مٹی تو دور دور تک ہے ہی نہیں۔ بالکل صاف تھرے کھنڈرات، جب ہی تو فوجی سیٹ کا گمان ہوا تھا۔ دوسرا سب قریبی بستیوں میں نسل در نسل چلی آنے والی ماسر اور داستانیں اور لوگوں کی توہم پرستی بھی ہو سکتی ہے۔ دور نزدیک کی بستیوں والے ادھر کارخ کرتے ہی نہیں تھے۔ اسی لیے اتنے قیمتی تاریخی خزانے اب تک قریباً اسی حالت میں ہیں جیسے ابن بطوطہ نے دیکھے۔

دیکھنے والوں کو یوں لگتا ہے گویا ایک چھوٹے سے مخصوص علاقے میں کوئی قدرتی آفت آئی اور دیرانیاں پھیر گئی۔ ممکن ہے بستی کا ایک خاصا بڑا حصہ ابھی دلدلی زمین کے نیچے ہو۔ یا سمندر برد ہو گیا ہو۔ ممکن ہے وہ کوئی ہلکا پھلکا زلزلہ ہو..... حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ایک بات طے ہے کہ یہاں ایک مجموعی ہیبت طاری تھی۔

کرنل صاحب کا کہنا تھا کہ جب انہوں نے اور ان کے ساتھی نے پہلی کا پٹر سے یہ کھنڈر دیکھے تو وہ ششدر رہ گئے۔ اتنی اچھی حالت اور صاف تھرے!! آپ پاکستان کے کسی بھی آثار قدیمہ میں چلے جائیے، وہ آثار سے زیادہ اشتہار گاہ لگتے ہیں، ہر طرف پینٹروں کے لکھے ہوئے اشتہارات، وال چانگ، جیتنے اور ہارنے والے دونوں امیدواروں کے نہ

سنسکرت کی تحریر بھی مل گئی۔ شاید اسی کو دیکھ کر ابن بطوطہ نے بستی کی قدامت کا اندازہ لگایا تھا۔ کم از کم اس خاکسار کو ایسا لگا جیسے میں قبل ابن بطوطہ کی آنکھ سے ہی یہ سب دیکھ رہا ہوں۔

☆☆☆

ایک تو ویسے ہی کھاڑیوں میں سمندر کا پانی آتا جا رہا تھا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی وہاں صرف کچھ ہی رہ جاتا ہے، دوسرے موسم کی اونچ نیچ سے دلدلی پانی اور خود دل بھی خشک ہونے لگتی ہے ایسے میں تاریخ سے دل چسپی رکھنے والوں اور محققوں کو ایسی جگہوں سے گئی تہذیبوں کے روزمرہ استعمال کی اشیاء مل جایا کرتی ہیں جو آج کے نو اور ہوتے ہیں۔

راقم کے دوست، جن کا تعلق پاکستان کشنر سے تھا، ان کو پتا نہیں کیوں اس بات کا یقین تھا کہ ہم لوگ اگر کچھ محنت کریں اور کچھ روز ادھر ہی رہیں تو ہمیں بھی پرانے زمانے کی اشیاء مل سکتی ہیں۔ ان کے پاس اپنی بات کو پُر اثر بنانے کو صرف ایک ہی دلیل تھی کہ کھاڑی میں پانی اترا ہوا ہے لہذا کسی نہ کسی تاریخی چیز کے ملنے کا روٹن امکان ہے۔ ہمارے ایک اور ساتھی نے مشورہ دیا کہ تاریخی چیزیں دلدلی کچھڑ میں ضرور ہوں گی کیوں کہ یہاں کسی کا کچھ تلاش کرنے کی نیت سے آنا محال ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ تو ہم میں سے کوئی ہم جو ہونے کا دعویٰ دار تھا نہ ہی کبھی ایسا تجربہ پہلے کر چکا تھا۔ ہم لوگ تو یہاں تفریحاً آئے تھے کہ گھٹنے دو گھٹنے بعد واپسی کی راہ لیں گے۔ یہ جنگل تو تھا نہیں کہ شام ہوئی نہیں اور درندے آئے نہیں۔ لیکن یہ سطور لکھنے میں کوئی شرم نہیں کہ اس جگہ ٹھہرنے سے خوف محسوس ہوتا تھا، ابھی تو رات بھی آنا تھی۔ شاید ماحول کے اثر کے ساتھ ساتھ اس بستی سے متعلق گردش میں رہنے والی داستانوں نے دہشت طاری کر دی تھی۔ یہ بھی لکھنے میں کوئی قیاحت نہیں کہ ہم سب کو وہاں سے پرانے زمانے کی کسی شے کے ملنے کی زبردست آرزو تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ معمولی بحث و تکرار کے بعد ہم چاروں وہاں رات بسر کرنے پر تیار ہو گئے۔

☆☆☆

کھاڑی کے کناروں کناروں اچھی طرح دیکھ بھال کی لیکن کوئی چونکا دینے والی چیز نظر نہیں آئی۔ پھر سوچا کہ ابھی سورج کی خاصی روشنی ہے، کیوں نہ دلدلی زمین کو بھی دیکھ لیا جائے۔ یہ کہنا آسان تھا مگر کچھڑ میں اترنا کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا۔

کچھڑ اور دلدلی زمین کے آس پاس کافی باریک بینی سے چھان بین کی مگر نتیجہ صفر رہا۔ پھر خیال آیا کہ ابن بطوطہ نے انہی کھنڈر کے پاس کہیں بدبودار پانی کھڑا ہونے کی بات لکھی تھی کیوں نہ اسے تلاش کیا جائے۔ ہم نے اب تک جو باتیں اس کے سفر نامہ میں پڑھی تھیں من و عن ویسی ہی پائی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان آثار کی بالکل ویسی ہی حالت میں رہنے کی کچھ تو وجوہات ہوں گی ہمیں زیادہ اس بات سے دل چسپی تھی کہ چونکہ اب تک نہ تو کسی چیز کو پھینکا گیا نہ ہی عوام یا کھڈا آثار قدیمہ والے کوئی شے یہاں سے اٹھالے گئے چنانچہ اس بدقسمت بستی والوں کی کوئی نہ کوئی چیز ہم بہ آسانی دریافت کر سکتے ہیں۔

اب تک تو ہم کھنڈر کے آس پاس ہی تھے، کھاڑی کے کنارے اور کچھڑ زدہ زمین پر بھی نظر ڈالی تھی اور اب بدبودار پانی کی تلاش میں بہت پر جوش ہو گئے۔ ایک ساتھی نے مشورہ دیا کہ کھڈا پانی کھاڑی کے علاوہ کہیں اور تلاش کیا جائے۔ دلدلی زمین پر بھی بدبودار پانی نہیں ملا۔

باہم مشورے سے ہم کھنڈر کے اندر داخل ہو گئے۔ کچھ ہی آگے گئے ہوں گے کہ وہی مخصوص بو آنے لگی جو کھڑے پانی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہم نے بو کی سمت چلنا شروع کیا۔ کچھ آگے ایک جوہڑ نظر آیا۔ جوں جوں آگے بڑھے تو توں نقص کی بو بڑھتی گئی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ مقام وہی ہو سکتا ہے جس کو ابن بطوطہ نے بیان کیا۔ قریب جانے پر واضح ہوا کہ اس مقام پر زمانے پہلے بھی پانی کھڑا رہا ہوگا۔ اب جوہڑ بالکل خشک تھا اور بدبو ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ ہر طرف ستانا تھا، ہمارے چاروں طرف کھنڈرات اور بت بکھرے پڑے تھے۔ مکالوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ہم سب کی نظر ایک ساتھ مغرب کی جانب بھٹکتے ہوئے سورج کی طرف اٹھی۔ وہ اسی مکان کے پیچھے غروب ہو رہا تھا جو اوندھا تھا۔ اس کی ہیئت نے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہم سب ایک ساتھ پلٹے اور تیزی کے ساتھ اپنی کشتی کی طرف بڑھے۔ دس منٹ میں ہم اپنی کشتی کے اندر تھے۔ اس دوران ہم میں سے کوئی بھی ایک لفظ نہ بول سکا۔ کشتی والوں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھوکوں نے اوسان بحال کیے تو ہم بات کرنے کے قابل ہوئے۔

پڑھنے والوں کو دعوت ہے کہ وہ سفر نامہ ابن بطوطہ کا مطالعہ کریں اور اگر ہو سکے تو خود بھی وہاں تک جائیں۔



شمشال ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر اشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ ستر کہانی کا سونھواں حصہ

تھے۔ ان کے علاوہ طارق کے پانچ چھ دوست اور بھی تھے۔ کڑا ہی گوشت بنانے کا آرڈر دیا گیا تھا۔ کڑھائی گوشت سب پاکستانیوں کی طرح میری بھی پسندیدہ ڈش ہے۔ آرڈر دے کر ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔ دیک ڈے

جمیل صاحب کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ ٹورنٹو میں رہتے ہیں۔ انہوں نے گروسری اسٹور کھول رکھا ہے۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اس دن ہم ان کے ساتھ ایک ریستورنٹ میں آ بیٹھے

جسم درد اور تھکاوٹ سے نڈھال ہوتا ہے۔ بقول طارق، واقعی امریکا، امریکا ہے۔

ہم جس ریٹورنٹ میں بیٹھے تھے وہاں بھی یہی کردار کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ کوئی میز صاف کر رہا تھا تو کوئی کسٹر کے سامنے پانی رکھ رہا ہے۔ ریٹورنٹ میں سب سے زیادہ عزت کک کی ہوتی ہے اور وہی کنگ بنا ہوا ہوتا ہے۔ ریٹورنٹ کا مالک بھی اس کے سامنے زیادہ بول نہیں سکتا کیونکہ اگر کک چھوڑ جائے تو ریٹورنٹ بند ہونے کو آ جاتا ہے۔

آپ امریکا کے کسی ریٹورنٹ میں کچھ دیر کو بیٹھ جائیں تو کئی کہانیاں آپ کے سامنے کھلی کتاب کی طرح آنکھڑی ہوتی ہیں۔ وہ جو کام کر رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی جو میزوں کے گرد بیٹھے چائے پی رہے ہوتے ہیں، ہر ایک اپنی ذات میں ایک عمل داستان ہوتا ہے۔ سب نڈھال اور تھکے ہارے۔ اپنوں کی محبت اور خیال سے بہت دور اور اپنی ذات میں تنہا۔ سال میں ایک چھٹی عید پر بھی مل جائے تو غنیمت جانی جاتی ہے۔

پاکستان میں بیٹھے لوگوں کو امریکا یا کینیڈا ایک خواب سا لگتا ہے۔ حقیقت دیکھنی ہو تو شکاگو کی ڈیوان اسٹریٹ چلے جائیں یا لندن کے ٹونگ یا ساؤتھ ہال یا پھر ٹورنٹو کی جیرالڈ اسٹریٹ یا پھر نیو یارک کے کوئی آئی لینڈ اور جیکسن ہائیٹ۔ سب جگہ کسی بھی کام کرنے والے سے بات کر لیں تو ایک پوری کتاب لکھ جائے گی۔ دکھوں کی چادر پر خوش نما رنگ سجائے یہ لوگ اسے اوڑھے جی رہے ہوتے ہیں۔ یہاں زندگی اس کی بہتر ہوتی ہے جو قانونی طریقے سے آیا ہوا اور پھر پروفیشنل ڈگری رکھتا ہو۔

آٹھ ایسپلائی ہیں اور ایک ایسپلاز ہے۔ ایسپلاز سیٹھ بن کر رہتا ہے اور پانی کارندے۔ قدرت کا نظام بھی ایک خاص ترتیب سے چلتا ہے۔ جو بلیٹس شروع میں تھا وہ ابھی تک قائم ہے۔ اس کڑے عرض پر ہر جگہ، ہر ملک میں 83 فیصد کارندے ہیں اور 17 فیصد سیٹھ۔ بل کیس کہتا ہے کہ اگر سترہ فیصد سیٹھوں سے دولت لے کر سب کارندوں میں بانٹ دی جائے تو دس سال بعد پھر سے وہی سترہ اور تریاسی فیصد کا تناسب قائم ہو جائے گا۔ شاید دنیا میں یہی ہوتا آ رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔

جیکسن ہائیٹ کے ماحول نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ میں کرب میں بیٹھا تھا۔ ہم کڑھائی گوشت کھا رہے

کی وجہ سے زیادہ رش نہ تھا۔ ہمارے علاوہ ایک اور میز پر دو بندے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ میں طارق اور ان کے دوستوں کی وہ باتیں سن رہا تھا جو جیکسن ہائیٹ میں ہر وقت ہوتی رہتی تھیں۔ ایک لڑکا ان کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ وہ وزٹ دیزے پر آیا ہوا تھا اور اب یہاں مستقل طور پر رہنے کا پلان بنا رہا تھا۔

ان دنوں جو بھی ایک بار وزٹ دیزے پر آیا تو وہ واپس اس وقت جاتا تھا جب اسے گرین کارڈ مل جاتا۔ اس میں بھلے اسے دس سال ہی کیوں نہ رہنا پڑ جائے۔ جو اسپانسر ہو کر آتے تھے وہ بھی اس طرح سے جیکسن ہائیٹ کے ریٹورنٹ میں بیٹھے نظر نہ آتے تھے۔ ایک صاحب اس لڑکے کو کسی گروسی اسٹور میں جاب دلانے کی امید دلا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ تمہیں ہفتے کے سات دن صبح سے شام تک کام کرنا ہوگا، تنخواہ ہفتے میں ڈھائی یا تین سو ڈالر ملے گی۔ رہائش کے لیے مل کر رہنا ہوگا۔ دو بیڈ کے اپارٹمنٹ میں آٹھ آٹھ لڑکے رہتے ہیں۔

”جی میں رہ لوں گا۔“ لڑکے نے جواب دیا۔
”مینیج کا چار سو ڈالر کھانے سمیت پڑے گا۔ کھانا بنانے اور برتن دھونے کی باری ہوتی ہے۔“
”جی میں کر لوں گا۔“ لڑکے کے لہجے میں لجاجت تھی کہ میں ہر طرح کا کام کروں گا بس مجھے کوئی جاب دلو اور دیں۔“ وہ اسے تسلیاں بھی دے رہے تھے اور ساتھ ہی یہاں کی مشکلات بھی بتا رہے تھے۔

سب مشکلات سن کر بھی وہ یہی کہہ رہا تھا۔ ”مجھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ بس مجھے کوئی بھی جاب دلو اور دیں۔“
وہ لڑکا شکل سے پڑھا لکھا لگتا تھا۔ نام لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ نام میں کیا رکھا ہے۔ نام کوئی بھی ہو یہاں آنے والے بیشتر اسی طرح سے رہا کرتے۔ میں ایک گروسی شاپ میں کچھ دیر پہلے گیا تھا۔ وہاں اسی قسم کے کردار کام کر رہے تھے۔ کوئی فرش پر ماپ کر رہا تھا اور کوئی سامان شیلوں میں لگا رہا تھا۔ برابر میں ایک کمر تھا، اس میں چار چار لڑکے فرش پر گدے بچھائے آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ کچن میں ایک بڑا دیکھا سا لٹن سے بھر رکھا تھا۔ وہ کھانا شاید کل بنایا گیا تھا۔ کسی کو بھوک لگی تو فریج سے روٹیاں نکال کر گرم کیں۔ پلیٹ میں کچھ ساکن ڈالا اور خاموشی سے کھا لیا۔ اور لیٹ گئے تاکہ صبح تیار ہو کر جاب پر پہنچ سکیں۔ واپس آئے تو رات کی تاریکی پھیل چکی ہوتی ہے

تھے اور ہماری تعلیم کے برابر لوگ ہماری میزیں صاف کر رہے تھے۔

یہاں ایک واقعہ ضمنی طور پر آگیا ہے کہ کیسے نئے آنے والوں کے لیے مشکلات ہوتی ہیں اور پاکستان میں ان کے جانے کی خوشی میں گلی میں دھپیں چڑھی ہوتی ہیں۔ ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ جس کو بیچ کر وہ اپنی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں وہ کس عذاب میں مبتلا ہیں۔

سلیمان بھی اسی طرح اپنی یونیورسٹی کی جاب چھوڑ کر ٹورنٹو آگیا۔ اس کی بیوی ایک اسکول ٹیچر تھی۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ انٹرپورٹ پر اس بندے نے پک کیا جس کے اپارٹمنٹ میں اس نے رہنا تھا۔ اپارٹمنٹ پہنچا تو دیکھا کہ دو کمرے ہیں اور آٹھ بندے رہائش پذیر ہیں۔ سب دیواروں سے ٹیک لگائے چھت کو کھورے جارہے ہیں۔ اسے بھی ایک لائن میں بیٹھا کرسی کام پر لگا دیا گیا۔ کسی ایک کے پوچھنے پر جب اس نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی میں اس جاب پر کام کرتا تھا تو سب نے مل کر اس کو کنا شروع کر دیا اور سب دم بدمش بھی کہتے تھے کہ اپنی جاب کیوں چھوڑ آئے ہو؟ یہاں تو صبح سے شام تک مزدوری کرنی ہوتی ہے۔ تم نے ایک اندھے کنویں میں چھلانگ لگائی ہے۔ وہ تب تک چپ نہ ہوئے جب تک باقاعدہ وہ رونے نہ لگا۔ پھر دوسرے دن ایک بندہ اس کو پکڑ کر لے گیا اور اس کا اکاؤنٹ کھلوا یا۔ سوشل کارڈ بنوانے کی درخواست ڈال دی۔ واپس آ کر پھر اسے اسی لائن میں بٹھایا اور سب مل کر چھت کو کھورنے لگے۔

دوسرے دن اپارٹمنٹ کی دیوار پر ایک اشتہار چسپاں تھا۔ جس کے مندرجات یہ تھے کہ اس ہفتے کس دن کھانا کس نے بنانا ہے۔ برتن کون دھوئے گا اور صفائی کس دن کون کرے گا۔ سلیمان کا نام سب سے اوپر کھانا بنانے والوں میں لکھا تھا۔ اس کا بنایا لوبیا سب نے پسند کیا اور پھر وہ اگلے کئی ماہ تک ان کے لیے لوبیا بنانے لگا۔ پھر کسی طرح سے اسے کے ایف سی میں جاب ملی جہاں وہ چکن فرائی کرتا تھا اور ساتھ میں خود بھی فرائی ہوتا رہتا تھا۔ اپارٹمنٹ واپس آ کر لوبیا بنانا۔ اس نے پکا پروگرام بنایا کہ وہ واپس پاکستان چلا جائے گا۔ اس کے ایک رشتے دار کو اندازہ تھا کہ اس کا پاسپورٹ ضبط کر رکھا تھا۔ سلیمان پاسپورٹ مانگتا اور وہ اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دیتا۔ سلیمان پاؤں پڑنے پر آگیا تھا مگر اس کا پاسپورٹ اس کو نہیں دیتے تھے۔

یہ سب باتیں اس وقت سلیمان میرے سامنے بیٹھ کر مجھے بتا رہا تھا۔

ہم ابھی جیکسن ہائیٹ کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے کڑھائی گوشت کھا رہے تھے۔ یہاں کے گوشت میں وہ ذائقہ نہیں ہوتا جو اپنے ملک میں ملتا ہے۔ ایک باس ہی ہوتی ہے۔ پھر بھی کھانا کھاتے ہوئے سب کڑا ہی گوشت کی تعریف کر رہے تھے ماسوائے میرے۔ میں کیونکہ چار ماہ پہلے پشاور کی ٹمک منڈی سے یہ کھا کر آیا تھا اور میرے ساتھ بیٹھے نہ جانے کب سے پاکستان نہیں گئے تھے۔

واپسی پر گاڑی میں، میں خاموش بیٹھا تھا اور طارق مجھے یہاں آنے والوں کے واقعات سن رہا تھا۔ گھر پہنچے تو میں سونے کے لیے لیوگ روم میں کمبل لپیٹ کر صوفے پر لیٹ گیا اور طارق یہ کہہ کر سونے چلا گیا کہ کل میں جلدی آ جاؤں گا کیونکہ ہمیں املائنگ ٹی جانا تھا۔

میں صبح صوفے پر لیٹا تھا کہ شہروز اسکول جانے کے لیے بیدار ہو گیا۔ اپنے معمول کی طرح میری جانب بڑھا۔ میں بھی ایک طرح سے تمام رات اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ساری رات ٹائم دیکھتا رہا کہ کب شہروز اٹھے اور اس سے پہلے کہ میرا کمبل کھینچے تو میں نیچے تہ خانے کی اندھیری قبر میں اتر جاؤں۔ وہ میری جانب منہ پر ہاتھ رکھے، اپنی ہنسی دبائے آہستگی سے چلا آ رہا تھا۔ اس کے حملے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا کمبل لپیٹا اور تہ خانے میں اتر گیا۔

میں جا رہا تھا تو وہ حیرانگی سے کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ نیچے اپنے کانوں کے گرد بکلیے کو لپیٹے میں سونے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ اب اس کے کودنے کی آوازیں چھت سے نیچے آ رہی تھیں اور ساتھ مشین بھی متواتر چل رہی تھی۔ اس نیچے نے میرا سکون چھین لیا تھا اور مشین نے میرا جینا دو بھر کر دیا تھا۔

سونے کی کوشش میں دو گھنٹے گزر گئے اور آخر تھک ہار کراٹھ بیٹھا۔ جی چاہتا تھا کہ دروازے سے باہر گلی مشین کو اکھاڑ کر کہیں باہر پھینک آؤں، جو ایک طرح سے شہروزی ہمزاد تھی۔ شاور سے فارغ ہو کر اوپر آیا تو تنہا بھالی بولیں۔ ”جلدی کیوں اٹھ آئے، تمہیں بھی چین نہیں ہے۔“

کیا کہتا کہ میرا چین تو تمہارے لاڈلے نے چھین رکھا ہے۔ میزبان کی دلجوئی کی خاطر خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہا۔ ناشتا کرنے کے بعد شہروز کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں صوفے پر سکون سے بیٹھ گیا اور

خریداری اکتوبر میں شروع کی جاتی ہے اور نئے سال کے آغاز پر سارا سامان پہلے پچیس فیصد سیل پر لگایا جاتا ہے۔ پھر پچاس اور آخر کار مارچ میں تو بے فیصد سیل پر لگ دیا جاتا ہے۔ میری طرح بہت سے لوگ اگلے سال کی خریداری مارچ میں کر لیتے ہیں۔ مارچ کے بعد سردیوں کا سارا سامان اٹھایا جاتا ہے اور چیرینی میں دس کر اسٹوروں کی صفائی کر دی جاتی ہے۔ چیرینی والے اسے اونے پونے داموں گوداموں کو بیچ دیتے ہیں۔ پھر یہ نیا ٹیک لگا سامان دوسرے ملکوں میں شوبیسوں میں سجادوہری قیمت پر بک رہا ہوتا ہے۔ میرا اس طرح کے ایک گودام میں جانے کا اتفاق ہوا تو میں ششدر رہ گیا۔ وہاں سامان نہیں بلکہ کنٹینر کے کنٹینر بک رہے تھے۔ میرے ایک جاننے والے نے پاکستان ایک کنٹینر بیجا اور اس پر دس لاکھ کا منافع کمایا۔

ہم واپس گھر پہنچنے میں نے بی بی کے سامنے بیٹھ جانا پسند کیا۔ بی بی دیکھتے ہوئے طارق کا انتظار کرنے لگا۔ ہمیں اٹلانٹک سٹی جانا تھا۔ طارق کہہ رہا تھا کہ وہاں بہت بڑے بڑے کیسینو ہیں۔ لاس ویگاس کے بعد اٹلانٹک سٹی جوا خانوں کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ اٹلانٹک سٹی کی شہرت لاس ویگاس کی وجہ سے ماند پڑ رہی ہے۔ ابھی پچھلے سال ٹرمپ کو اپنے دو کیسینو اٹلانٹک سٹی میں بیچنے پڑے۔

میں اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ہر جگہ ایک بار ضرور گیا تاکہ اگر سفر نامہ نگاروں کو میرے پاس اپنی آنکھوں دیکھی معلومات ہوں۔ کئی کیسینوز میں تو پانچ چھ مرتبہ جا چکا ہوں۔ کروڑ شپ پر جب بھی گیا تو ان میں واقع کیسینو میں بیٹھ کر پوکر اور بلیک جیک کھیلی اور نت نئے تجربات سے روشناس ہوا۔ آج پہلی بار امریکی کیسینو میں جا رہا تھا۔

طارق آیا اور آتے ہی پوچھنے لگا۔ ”تم ابھی تیار نہیں ہوئے؟“ حالانکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ میں تیار بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ پہنی اور پھر ہم باہر گاڑی میں آ بیٹھے۔ وہاں طارق کا ملازم ”جے“ بھی اپنے منہ پر مفلراؤٹھے بیٹھا تھا۔ میں نے طارق سے کہا۔ ”اسے آج گھر نہیں چھوڑا؟“

طارق نے پہلے اس کی شان میں انتہائی ناشائستہ کلمات ادا کیے اور پھر جواب دیا۔ ”یہ اٹلانٹک سٹی جوا کھیلنے کیسینو جاتا رہتا ہے، اسی لیے اسے ساتھ لے لیا ہے۔“ جے خاموشی سے مفلر لپٹے بیٹھا تھا اور بی بی کی طرح سبز آنکھوں سے کسی اور جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ

چائے پینے لگا۔ اسی اثناء میں شہروز کا آٹھ مہینے کا چھوٹا بھائی، ارشیان، کہیں سے لڑکھتا ہوا آیا اور مجھ سے چائے کا کپ چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر ہماری ہاتھ پائی شروع ہوئی۔ خالص خوراک کھا کر اس نیک بخت میں بلا کی قوت بھری تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس سے بچایا تو وہ اپنی شکست پر لبلا کر رونے لگا۔ ماں نے آکر اسے دیوچا اور اندر لے گئی۔ میں بے بسی سے سر پکڑے بیٹھ گیا۔

پھر تنہا بھائی آکر بولیں۔ ”طارق تو دو بجے کے بعد آئے گا۔ تمہیں K-Mart لے جاتی ہوں۔ کے مارٹ بھی وال مارٹ کی طرح کا ایک پراسٹور ہے۔“

ان دنوں وال مارٹ میں سبزیاں اور پھل نہیں ملا کرتے تھے۔ لیکن کے مارٹ میں وال مارٹ کی طرح کے سامان کے علاوہ سبزی منڈی بھی تھی۔ میں شواری قیص کے آسان لباس میں اپنی طرف سے تیار تھا۔ مجھے اس ویسی لباس میں دیکھا تو چلا پڑیں۔ ”تم ڈیرہ میں نہیں ہو۔ یہ نیویارک ہے۔“ پھر ڈانٹ کر کہنے لگیں۔ ”جلدی سے پینٹ شرٹ پہن آؤ۔“

میں بھگم بھاگ تہہ خانے سے کپڑے تبدیل کر آیا۔ جب تک انہوں نے میرے کپڑے اوکے نہیں کر دیے، میں سانس روکے کھڑا رہا۔

تنہا بھائی نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھی ایک بے بی سیٹ میں ارشیان کو جکڑا۔ اس کی اسٹروں گاڑی کے پیچھے رکھی اور ہم کئی ایک سڑکوں سے ہوتے ہوئے، بہت بڑے اسٹور کے سامنے بنے ایک وسیع پارکنگ میں آ کر۔ ارشیان کو سیٹ سے آزاد کر کے اسٹروں پر رکھا اور پھر میں بھائی کے پیچھے پیچھے کے مارٹ میں گھس گیا۔ ٹورنٹو میں وال مارٹ کا احوال تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اس میں بس ایک اضافہ یہ تھا کہ ایک بڑا حصہ تازہ پھلوں اور رنگ برنگی سبزیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بھابی بھاگ بھاگ کر چیزیں خریداری کرتی رہیں اور میں سوئے ہوئے ارشیان کو اسٹروں میں لیے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔

میں نے کچھ کپڑوں کی قیمتیں دیکھیں تو مجھے ٹورنٹو سے سستی لگیں۔ وہاں تو ٹیکس بھی سولہ فیصد تھا مگر یہاں چھ فیصد تھا۔ کپڑوں کا معیار بھی کینیڈا سے بہت بہتر تھا۔ جو جیکٹ کینیڈا میں ڈیڑھ سو ڈالر میں نہ ملے وہ یہاں سیل پر پچاس ڈالر میں مل رہے تھے۔ تنہا بھائی نے ایسی ہی جیکٹ خرید کر تختے میں مجھے دی۔ یہاں سردیوں کے کپڑوں کی

طارق نے اچھا کیا کہ اسے لیتا آیا۔ اس طرح ہے سے ضروری معلومات بھی حاصل کرتا رہوں گا۔ میں نے اسے ”ہائے“ کہا اور اس نے سر اثبات میں ہلا کر مجھے جواب دیا۔ ہم روانہ ہوئے تو نیلے آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔ سردی کا زرد ٹوٹا شروع ہو گیا تھا۔ ہمارا ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا۔ طارق گاڑی چلا رہا تھا اور جے پیچھے اداس اور گم مسم بیٹھا تھا۔ ہم نیو یارک سے نیو جرسی اسٹیٹ جا رہے تھے۔ اٹلانٹک سٹی بحراوقیانوس کے کنارے آباد تھا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بنیادی معلومات تھیں۔ کسی شہر میں جانے سے پہلے اگر اس شہر کی جان پہچان ہو جائے تو دل چسپی بڑھ جاتی ہے۔

میں نے طارق سے پہلے فاصلے کا پوچھا تو اس نے بتا دیا۔ پھر پوچھا۔ ”اٹلانٹک سٹی کی وجہ شہرت کیا صرف کیسینو ہیں؟“

میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”پورے امریکا سے لوگ جوا کھیلنے یہاں آتے ہیں۔ بہت بڑی بڑی اور خوب صورت عمارتیں ہیں، جن میں یہ کیسینو ہیں۔“ یہ اس کی ساری معلومات تھیں جو اس نے میرے گوش گزار کر دی تھیں۔

جب میں نے پوچھا۔ ”یہ کیسینو کب بنے؟“ اس نے مجھے غور کر دیکھا۔ اپنا تالیہ گود میں رکھا اور بولا۔ ”مجھے کیا معلوم؟ یہ میرے آنے سے پہلے ہی یہاں تھے۔“ اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ”اب یہ نہ پوچھنا کہ کتنے کیسینو ہیں، کتنے لوگ آتے ہیں اور کیوں آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”پھر جے کو پتا ہوگا۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اس جی کو کیا معلوم؟ یہ کون سا ابن بطوطہ ہے؟“

طارق کو معلوم نہ تھا کہ میں آج انٹرنیٹ سے اٹلانٹک سٹی کی بہت سی معلومات پہلے ہی لے چکا ہوں۔ میں تو بس اسے اور جے کو چھیڑ رہا تھا۔ میں اکثر کہیں بھی جانے سے پہلے اس مقام کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کر لیتا ہوں۔

میں نے جے سے جب یہ سوال پوچھے تو وہ حیرانگی سے مجھ دیکھنے لگا کہ میں اس سے کس طرح کے مشکل سوال پوچھ رہا ہوں۔ مجھے انٹرنیٹ پر سر فٹنگ سے پہلے تک معلوم نہ تھا کہ کیسینو کیا ہوتے ہیں اور کس طرح کا جوا کھیلا جاتا ہے۔ میرے علم میں یہی تھا کہ جوا تو ناش کھیل کر لگایا جاتا ہے یا

بیر لڑا کر۔ اس سے زیادہ معلومات میرے پاس نہ تھیں۔ ناش کا بھی ایسے ہی معلوم ہوا تھا کہ ہمارے محلے میں ایک بہت بڑی جگہ تھی جسے ”عبدالرحمن کی جھا“ کہتے تھے۔ شہر کے جواری وہاں آتے اور ٹولیوں میں بیٹھ کر ناش کھیلتے تھے۔ جھا کی یاد آئی تو بچپن کا دور ذہن کے پردہ سیمیں پر رقصاں ہو گیا۔ جھا کے دو تین دروازے ایک ساتھ تھے جو ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ ہمیں وہاں سے گزرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ جب بھی گزرتے تو بھاگ کر گزرتے کیونکہ ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ یہ بد معاش لوگ ہیں اور بھاگ کر گزرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک بہت بڑا اکٹا وہاں بندھا رہتا تھا۔ عبدالرحمن خود جوا نہیں کھیلتا تھا بلکہ پستول لگائے ایک طرف بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہاں ریچھ اور کتے کی لڑائی بھی ہوتی مگر ہمیں وہ دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی لیکن ہم کہاں ماننے والے تھے۔ گھر والوں سے چھپ کر لڑائی دیکھنے ضرور جایا کرتے۔ بیر بازی اور ان کی لڑائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں بیر لے کر کھومتا ایک رواج تھا جو ان ”بد معاشوں“ کی پہچان ہوتی تھی۔

وہ ایک سردیوں کی تاریک رات تھی۔ میں سو کر اسکول جانے کے لیے بادل غواستہ اٹھا تو گھر میں یہ چہ میگوئیاں تھیں کہ رات کو گولی چلی ہے۔ معلوم ہوا کہ کل رات پولیس نے ”جھا“ پر چھاپا مارا۔ عبدالرحمن نے اپنے پستول کی گولی تھانیدار کے سینے میں اتار دی تھی۔

تھانیدار نے کہا تھا کہ آج میں چھاپا مارنے آؤں گا اور عبدالرحمن نے کہا تھا کہ تو زندہ واپس نہ جائے گا۔ دونوں نے اپنی اپنی لاج رکھی اور پھر عبدالرحمن چودہ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ علایقے کے اسکول اس دن بند ہو گئے کیونکہ ایک خوف کی فضاء تھی۔

بس میرے علم کے مطابق یہی جوا تھا اور اس کے خوفناک انجام سے میں سہا ہوا تھا۔ جوئے کے نام کی ایک دہشت لیے میں بڑا ہوا تھا مگر آج ایک جوا خانے بڑے اشتیاق سے جا رہا تھا۔ انٹرنیٹ پر سر فٹنگ سے پہلے میرے خیال میں ایسا ہی کوئی جوا اٹلانٹک سٹی میں ہوتا ہوگا۔ بس ”جھا“ کی جگہ کئی ایک بڑی عمارتیں ہوں گی اور پولیس کا کوئی ڈرنہ ہوگا۔

ہماری گاڑی ہائی ویز پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں طارق کو چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔ اسے تپا کر میں اس کی سنتا اور سیریس بیٹھ کر اس کی باتوں کے مزے لیتا تھا۔ میں اس

سے انجان اور سادہ لوح بن کر سوال کرتا اور وہ میری سادگی پر کڑھتا رہتا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”تم اتنے سالوں سے امریکا میں رہ رہے ہو اور اٹلانٹک شئی کی تاریخ بھی نہیں جانتے؟“ ہمیشہ کی طرح پہلے اس نے ایک دوزور دار چھٹکیں ماریں اور پھر تپ کر بولا۔ ”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہاں میں نے بہت محنت کی ہے۔ دن رات کام کیا ہے۔ برف ہٹائی ہے۔ کالنگ کارڈ بیچے ہیں۔ کوئی چھوٹے نہیں بیچے۔ تمہاری طرح جغرافیہ اور تاریخ کے چکروں میں نہیں پڑا۔“ پھر آج کے دن کی دوسری چھینک ماری۔

کچھ دیر تک ناک صاف کرتا رہا اور پھر ذرا خاموش ہوا تو مجھے الجھن ہونے لگی۔ اس سے پہلے میں اپنا کوئی اور داؤ آزما تودہ خود ہی بولنے لگا۔ ”مجھے تمہاری فکر ہے۔ معلوم نہیں تم کس طرح سے یہاں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرو گے۔ یہ امریکا ہے امریکا۔ کوئی پاکستان نہیں۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے اور تم ہو کہ میوزیم دیکھتے پھر رہے ہو۔ ان جگہوں پر پاگل لوگ جاتے ہیں جن کو کوئی اور کام نہیں ہوتا۔“ اس کے بعد بہت دیر تک میں اس کی نصیحتیں سنتا رہا۔ جب تھا کتب وہ چپ ہوا۔

میں نے پھر اسے اکسایا۔ ”وہیے تم نے امریکا کو ٹھیک پہچانا ہے۔ تم تو مجھے اس کی رگ رگ سے واقف لگتے ہو۔“

اس بات پر اس نے پہلے تو شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا شرارت کر رہا ہوں۔ ادھر میں بے تاثر اور مصوم چہرہ بنائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر مجھے بغور دیکھنے کے بعد اس نے سڑک پر نظریں نکائیں اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”بہت محنت کی ہے۔ برف، کالنگ کارڈز، چھوٹے۔“ اور وہی سب کچھ پھر سے دہرایا۔

اسی طرح تمام راستے اسے تپاتا اور پھر رام کر تا رہا۔ سامنے نیلے سمندر کے ساتھ ساتھ انتہائی شاندار، دکش اور بڑی بڑی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ شام اتر چکی تھی اور ہم اٹلانٹک شئی میں داخل ہو رہے تھے۔ تاریکی سے پہلے ہی روشنیوں کا سیلاب تھا جو پورے منظر کو منور کر رہا تھا، ہر عمارت جگمگا رہی تھی۔ سڑکیں خالی تھیں۔ میں نے خالی سڑکوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا لوگ رات گئے آتے ہیں؟“

پہلی بار بے بولا۔ ”رش اندر ہوتا ہے۔ باہر لوگ نہیں

نکلتے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اتنی بلند و بالا اور دیدہ زیب عمارتوں کے اندر لوگ بھرے ہوئے تھے۔ میں تو ان طلسمانی عمارتوں کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ تعمیراتی حسن کا نمونہ تھیں۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ عمارتیں، کیسینوز، ہوٹل اور رزارٹ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ فن تعمیر کا شاندار مظاہرہ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ آج میں بیٹھا اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بعد میں لاس ویگاس گیا تو وہاں بھی جو دیکھا تو کہیں اور نہیں دیکھا۔

جے، طارق سے کہہ رہا تھا کہ سیدھا ”سیزر“ چلتے ہیں۔ اس نے جے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر تعجب صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک بے چینی سی پھیلی تھی۔ سارے راستے وہ سوتا آیا تھا مگر اب پہلو بدل رہا تھا۔ اس نے سیزر کا نام لیا تو میرے ذہن میں جولیس سیزر کا خیال آیا میں پوچھتا کہ طارق خود ہی بول پڑا۔ ”سیزر ایک بڑے کیسینو کا نام ہے۔“

طارق نے پہلے مجھے تاج محل دکھایا۔ یہ شاہ جہان کا تاج محل نہیں تھا بلکہ اس پر لکھا تھا۔

”ٹرمپ تاج محل“ ٹرمپ جوان دنوں امریکا کا صدر ہے، اس کے امریکا کے مختلف شہروں میں کئی کیسینوز ہیں۔ تاج محل کیسینو کا مالک بھی وہی ہے۔ اس کو مغل طرز تعمیر کا رنگ دے کر اسے انتہائی جاذب نظر بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر اور سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ میں نے ”جے“ سے کہا کہ کیوں نہ تاج محل کے اندر چلیں مگر وہ جلدی سے بولا۔ ”سیزر اس سے کہیں بہتر ہے۔“

ایک لائن میں آگے پیچھے کھڑی دیویدکل عمارتیں رہائشی یا کاروباری نہیں، سب کے جو خانے تھے۔ جو ہوٹل ہیں ان میں ہزاروں کمرے ہیں۔ لوگ دنوں کے حساب سے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ ٹھہرنے والے دن سچ پر گزارتے ہیں اور شام کیسینو میں۔ یہ ایک الگ انداز کی دنیا ہے۔ یہاں ان کا طرز رہائش اور طرز زندگی ایک مختلف مزاج کا ہوتا ہے۔ جب میں لاس ویگاس اپنے پڑھنے والوں کو لے جاؤں گا تو ان کو اس دنیا کی سیر کرواؤں گا۔ فی الحال تو سیزر کی سیر کریں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ عام طور سے امریکا کا یہ چہرہ دکھایا نہیں جاتا اور سفر نامہ نگار اس دنیا کے بارے میں بتانے سے گریز کرتے ہیں۔

ہم سیزر کے سامنے آئے تو میری آنکھیں روشنیوں کی

جگہ گھٹ سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ بڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ میں روشنیوں کی بہتات کو بیان کرنے کے لیے ”خیرہ“ کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ میں لفظوں میں کس طرح بیان کروں کہ ایسا نظارہ تو میں نے منہمکن میں بھی نہ دیکھا تھا۔ یہ کس طرح کی جگہ تھی جس کو میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ہر کیسینو دوسرے سے بڑھ کر جگہ گارہا تھا۔ ست رنگی روشنیوں میں گہرا اٹلانٹک سٹی پہلی بار کسی کو بھی محو حیرت میں ڈال سکتا ہے۔

بیزر کیسینو کے سامنے آتے ہی میں گنگ ہو گیا تھا۔ روسن طرز تعمیر کا یہ شاہکار میرے سامنے تھا۔ چار سفید گھوڑوں کے مجسمے اس کے سامنے ایستادہ تھے اور پس منظر میں سینکڑوں گزروں میں پھیلی ایک بلند عمارت تھی۔ اس کے سامنے اور گھوڑوں کے پیچھے چار بڑے اور بلند ستون تھے جو نازخی روشنیوں میں نہائے کھڑے تھے۔ ان ستونوں کے اوپر ایک پلیٹ فارم سائنا تھا جس پر قدیم روسن ایمپائرز کے مجسمے ایستادہ تھے۔ میں منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مجھے حیرت کے جھکے لگ رہے تھے۔

طارق نے ایک بڑی پارکنگ میں گاڑی پارک کی اور ہم کیسینو کے اندر داخل ہوئے۔ لابی میں برقی زینے اوپر نیچے چلے جا رہے تھے۔ اونچائی پر محرائیں بنی تھیں جس میں روسن طرز کے مجسمے کھڑے تھے۔ چھت انتہائی دیدہ زیب تھی۔ ایک آسمان سائنا تھا جس پر جیسے بادل گھرائے ہوں۔ میں انسانی تخلیقات کو دیکھ کر مسحور ہو رہا تھا۔

زینوں سے اوپر پہنچے تو سامنے ایک اور رنگ برنگی دنیا نظر آئی۔ سامنے ایک چب تھا۔ اسٹولوں پر لوگ بیٹھے منہ نوش کر رہے تھے۔ بائیں جانب ریسپشن تھا اور دائیں جانب کیفے اور لیسنورٹ تھے۔

جب اب موج میں تھا۔ طارق بھی پہلی بار سبز آیا تھا اور وہ بھی میری طرح حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔ بے سیدھا چب کی جانب گیا، اور ہم بھی اس کے ہمراہ چلے۔ اس نے ڈرافٹ بیر کا آرڈر دیا اور ہماری سی سے بڑے سائز کا گلاس چڑھا گیا۔ ایک ختم کیا تو ایک اور پی گیا۔ طارق کہنے لگا۔ ”اب یہ کام سے گیا۔“

پینے کے بعد اس کی سبز آنکھیں سرخ ہونا شروع ہوئیں اور پھر مجھ سے کھل کر بولنے لگا۔ وہ یہاں آتا جاتا رہا تھا۔ وہ مجھے ریسورٹ، شاہیں، کیفے دکھا کر ان کے بارے میں بتاتا تھا۔

پکا فرش ایسا لگ رہا تھا کہ پتھروں سے بنا ہے۔ اس کیسینو کو ایسے سجایا گیا تھا کہ جیسے ہم ایک پرانے مگر روشن ماحول میں داخل ہو گئے ہوں۔ فوارے لگے تھے اور روشنیوں میں ڈوبے پانی بہہ رہے تھے۔ آگے گئے تو دیکھا کہ سیزر کا مجسمہ لگا ہے اور بہت سے لوگ اس کی تصویریں بنا رہے تھے۔ مجھے کے نیچے پانی کا تالاب تھا جس میں بے تحاشا کئے پڑے تھے۔ آس پاس دکانیں تھیں، لوگ تھے جن کو اپنے علاوہ کسی کی پرواہ نہ تھی۔ دونوں جانب بلند ستون تھے اور اوپر مجسمے تھے۔ ہر ایک جو اکیلے سے زیادہ ارد گرد اور اوپر دیدہ زیب چھتوں کو دیکھ رہا تھا۔ مصنوعی درخت تھے اور رنگ برنگی ٹانگوں سے سجے فرش تھے جو ایسے چمک رہے تھے کہ جیسے آئینہ ہوں۔ کہیں کہیں دیز اور شوخ رنگوں اور خوش نما ڈیزائنوں کے کارپٹ بچھے تھے۔

ہم آگے بڑھے تو ایک گول چکر آیا جہاں فرش پر مہنگا ماربل لگا تھا جس طرح سے بے چل رہا تھا، مجھے دھڑکا کہ کہیں لڑکھا کر گرنے پڑے۔ میں نے اسے سہارا دینے کے لیے اس کے بازو کو تھام لیا پہلے حیران ہوا اور پھر خفا ہو گیا۔ یہاں آپ کسی کو تھام نہیں لگا سکتے۔ یہ بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ میں تو ابھی کھینچنے کے مراحل میں تھا تو مجھے اس چیز کا پتا نہ تھا۔ ہر جسم کی اپنی برائیوں کی ہوتی ہے اور کوئی بھی اس میں بلا وجہ مداخلت پسند نہیں کرتا۔ میں نے اب بے کواس کے حال پر چھوڑا اور ہم ان سلاٹ مشینوں کو دیکھ رہے تھے جو ایک ترتیب سے ہمارے دونوں جانب لگی تھیں۔ اس سلاٹ مشینوں سے رنگ برنگی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ اب فرش مکمل طور پر کارپٹ سے ڈھکا تھا جن پر خوش نمائش پھول بنے تھے۔

میں نے ایک جگہ سے سیزر کے بارے میں پمفلٹ اٹھالیا تھا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ یہاں ساڑھے تین ہزار سلاٹ مشینیں ہیں۔ ایک ہزار سے زائد کمرے ہیں، ٹائٹ کلب، سینما، مساج، سینٹرز، ریسورٹ، بارز اور بھی بہت کچھ ہے جو یہاں بتانا مناسب ہے۔

ہم سلاٹ مشینوں کی جانب آئے۔ میرے لیے نئی چیز تھی۔ جے تو یہاں کا ماسٹر تھا اور طارق بھی کچھ سوچ بوجھ رکھتا تھا۔ سلاٹس کے آگے لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی نظریں گھومتے ہندوستان یا کچھ الفاظ یا پھر تصویریں پر لگائے بیٹھے تھے۔ مشین میں کچھ سکے ڈالتے، ایک ٹنن دکا سانس روک کر بیٹھ جاتے اگر چار نمبر ایک جیسے آجاتے تو ایک ڈالر

ہزاروں سال پرانی کھانی

ہم نے اپنے بچپن میں آج سے کوئی ستر بہتر سال پہلے ایک کتاب پڑھی تھی۔ ”منتخب الحکایات“ جس میں تقریباً ساری کہانیاں جانوروں سے متعلق تھیں۔ جیسے شیر آیا، شیر آیا، پیاسا کوا، انکور کھٹے ہیں، بھیڑیا اور مینا اور کچھو اور خرگوش وغیرہ۔ یہ اور اس کی دوسری کہانیاں ہمیں بڑی اچھی لگی تھیں۔

ہم نے اس زمانے میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کہانیاں ہمارے ہی کسی کہانی کار نے اردو میں لکھی ہیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ان میں سے کچھ کہانیاں ہمارے کورس کی کتابوں میں بھی شامل ہیں۔

پھر جب ہم بڑے ہوئے اور دنیا بھر کی باتیں کتابوں اور اخباروں میں پڑھنے لگے تو ہمیں معلوم ہوا۔ یہ ساری کہانیاں تو دنیا بھر میں سنی سنائی اور پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔ جس ملک میں جوزبان بولی جاتی ہے اس میں یہ کہانیاں کتابوں کی صورت میں موجود ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کہانیوں پر کارٹون فلمیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ اس طرح ہمارے بچپن کا یہ خیال رد ہو گیا کہ یہ کہانیاں ہمارے ملک کے کسی کہانی نویس نے لکھی ہے۔ تو پھر کس نے لکھی ہے؟ اور کب لکھی ہے؟ جب اس بات کی کھوج لگائی تو پتا چلا۔ یہ کہانیاں تو ہزاروں سال پرانی ہیں۔ ان کہانیوں کا کہانی کار ایک غلام تھا، افریقی غلام۔ جس نے چھٹی صدی عیسوی قبل۔ سچ میں یہ کہانیاں تخلیق کی تھیں۔ وہ یونان میں رہتا تھا۔ یونانی زبان میں اسے ”ایسوپس“ کہا جاتا تھا جسے بانی دنیا ”ایسوپ“ کے نام سے جانتی ہے۔ اس کی کہانیوں کے خاصے مجموعے موجود ہیں۔ جن میں سے بہت سوں کو یکجا کر کے ”ایسوپ کی حکایات“ کے نام سے شائع کیا گیا ہے اور مختلف ممالک دنیا بھر کے پرائمری اسکولوں اور کنڈرگارٹن کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔

یائیں۔ کھیلنے والے اناڑی بھی ہوتے ہیں اور کھلاڑی بھی۔ ایک طارق تھا جو بلاسوے سمجھے کھیل رہا تھا۔ کچھ ایک مشین پر بیٹیں ڈال رہا تھا۔ اگر پچیس بن گئے تو دوسری مشین پر جا کر پانچ ڈال رہا دیتے ہیں۔ میں ادھر خدا خواست آپ لوگوں کو جو انہیں سکھلا رہا اور نہ آپ کو جفا دیوں کے وہ کرتوت بتاتا جو پورا دن لگا کر ڈیڑھ دو سو ڈال رہا کر لے جاتے ہیں۔ میں بہت غور و خوض سے سب کو کھیلنے دیکھ کر کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلاٹ مشین پر کسی کا جیک پاٹ نکل آیا تو اس نے بہت بڑی رقم بھی بنالی۔

جوے کی یہ لت زیادہ تر بوڑھے مرد و زن کو پڑی تھی۔ ایک مشین سے اٹھے اور دوسری کے سامنے کرسی پر جم گئے۔ اگر جیت رہے ہوں تو اور گرد و جمع لگ گیا۔ جیتنے پر تالیاں اور ہارنے پر واہ واہ کی آواز سنائی دیتی تھیں۔ میں مغربی دنیا کے اس سنے روپ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کیسینو صرف مغربی ممالک میں نہیں بلکہ مشرق بعید کے ممالک کے علاوہ دنیا کے ہر ملک میں پھیلے ہیں۔ صرف اٹلانٹک سنی میں اربوں ڈالر کا جو ہر سال ہوتا ہے۔

روشنیوں کا راج تھا اور ہارے ہوئے بچھے دل تھے۔

کے بیٹے ملتے۔ اگر تین ایک جیسے جاتے تو کچھ کم جیت پاتے۔ کچھ لوگوں کے پاس کیش نہ تھا۔ انہوں نے کیسینو کے کارڈ لیے ہوئے تھے۔ گلے میں بندھے ایک پنے کے ساتھ وہ کارڈ بندھا تھا اور کارڈ مشین کے اندر ڈالا ہوا تھا۔ وہ اب ایک ڈالر لگائیں یا پانچ۔ پے منٹ کارڈ کرتا تھا۔ کیش بھی استعمال ہو رہا تھا۔ اب جو ہار رہا ہوتا وہ بھی خوش نہ تھا اور جو جیت بھی رہا تھا وہ بھی منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ ہارنے والا مغموم اس لیے تھا کہ وہ ہار کر اپنا نقصان پورا کرنے کی کوشش میں غرق تھا اور جیتنے والا زیادہ جیتنے کے چکر میں تھا۔ طارق کچھ ایک اور پانچ ڈالر کے نوٹ لایا تھا۔ کئی ایک مشینوں پر پرائی کی مگر ہارنا چلا گیا۔

جیک پاٹ ہر ایک کا نہیں لگتا مگر ہر ایک جیک پاٹ لگنے کا منتظر تھا۔ کئی ایک طرح کی مشینیں تھیں۔ ہر مشین میں کمپیوٹر چپ لگی ہوتی ہے۔ یہ چپ ایک طرح سے پروگرام ہوئی ہے کہ کتنے فیصد آپ کی لگائی رقم پر آپ کو ادائیگی کرے گی۔ ہر مشین اوسط پچاسی سے پچانوے فیصد ادائیگی کرتی ہے۔ ہر اسٹیٹ کا یہ بینک کیسٹن ہوتا ہے جو جو خانوں پر نظر رکھتا ہے کہ ان کی مشینیں صحیح ادائیگی کر رہی ہیں

اس کے علاوہ ان کہانیوں پر فلمیں اور کارٹون بنا کر بھی بچوں کی اصلاح کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ”کچھو اور کچھو“ کی کہانی۔ ایک کچھو ایک کچھو سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اسے دریا کے پار کرادے۔ کچھو اسے اپنی کمر پر بٹھا کر دریا پار کرانے لگتا ہے۔ اس دوران کچھو بار بار اس کی کمر پر ڈٹک مارتا ہے۔ کچھو اس سے کہتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے تو کچھو کہتا ہے۔ ”میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔“

اس پر کچھو نے کوغصہ آجاتا ہے اور وہ کہتا ہے۔ ”تو پھر میں بھی اپنی عادت سے مجبور ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دریا میں غوطہ کھا دیتا ہے اور کچھو دریا میں ڈوب کر مر جاتا ہے۔

اس کہانی کو سن کر یا پڑھ کر بچے آسانی سے سمجھ جاتے ہیں احسان فراموشی کا انجام برا ہوتا ہے۔ ایسوپ نے نہ صرف انسانوں کو اخلاق سکھانے کے لیے جانوروں کے کرداروں کی مدد سے کہانیاں بیان کرنے کا فن تخلیق کیا اور لاتعداد کہانیاں تخلیق کیں بلکہ جانوروں کے ذریعے کہانیاں بیان کرنے کا فن بھی ہمیں دیا۔

اس وقت ایسوپ کی حکایات کے نام سے جو مرتب شدہ کہانیاں موجود ہیں، ان کو مختلف ذرائع سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں بہت سی کہانیاں ایسوپ سے بہت پہلے کے مصنفین سے اخذ ہیں۔ سقراط جب قید میں تھا تو افلاطون نے اس سے کہا۔ ”آپ اپنا وقت گزارنے کے لیے ایسوپ کی کہانیوں کو سن کر پیرائے میں ڈھالیں۔“

ایک اور یونانی فلسفی دیمتھر فلا ریس نے 300 قبل مسیح میں ان کہانیوں کا پہلا مجموعہ مرتب کیا۔ بعد ازاں 25 قبل مسیح میں ایک اور غلام فیدرس نے ان کو لاطینی زبانی میں ترجمہ کیا۔ ان دونوں مجموعوں کی حکایات کو جلد ہی اکٹھا کر دیا گیا اور آخر کار 230ء میں سیرس نے ان کو یونانی زبان میں ترجمہ کیا۔

جے کو مشینوں پر کھیلنے سے کوئی زیادہ دل چسپی نہ تھی۔ وہ صرف میرے سوالوں کے جواب دیتا اور مجھے کھیلنے کے طریقے بتاتا رہا تھا۔ طارقی زیادہ تر ہار گیا تھا۔ ایک دو جگہ جیتا تو پھر اپنے پیسے پورے کرنے کی حسرت جا گئی۔ پھر کھیلا اور دوبارہ ہار گیا۔

آگے بڑھے تو ایک بڑا سا پہیلا تھا۔ اس میں ڈالر ڈالیں اور اگر سوئی زیرو پر رکے تو چالیس گنا پیسے ملتے ہیں۔ کچھ ہندسوں پر کم جیت ہوتی ہے اور کچھ پر رقم ڈوب جاتی ہے۔ جے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں ایک بار تو کچھ کھیلوں۔ طارقی بار بار کب کسی نصیحت کی پوزیشن میں نہ تھا۔ میں نے پیسے والی مشین میں دس ڈالر لگائے۔ پہیلا گھمانے کا بٹن دبایا اور تیر کا نشان زیرو پر آگیا اور مجھے چار سو مل گئے۔ میرے چاروں جانب تالیوں کی گونج تھی اور میں مڑ مڑ کر سب کو خوش ہوتے دیکھ رہا تھا جو میری اس ناکہانی جیت پر حیرت منہ رہے تھے۔ جے نے کہا۔ ”اور لگاؤ، تم جیت رہے ہو۔“

میں بولا۔ ”کیا یا گل سمجھا ہے۔“ میں جیت کر اور جیتنے کی خواہش رکھنے والوں کا انجام دیکھتا آ رہا تھا۔ جے کے ساتھ کاؤنٹر پر جا کر چار سو ڈالر کیش کروائے تو جے

بولا۔ ”بیزری پلوادو۔“

میری مسلمانی غیرت نے جوش مارا اور بولا۔

”شراب ہمارے مذہب میں ممنوع ہے۔“

وہ بولا۔ ”ایسا کیوں؟“

میں نے کہا۔ ”بس حرام ہے۔“

جے حیران ہو کر بولا۔ ”یہ حرام کیا ہوتا ہے۔“

میں جوئے میں جیتے ہوئے پیسے بٹوے میں رکھتے

ہوئے بولا۔ ”شراب پینے اور پلانے سے روکا گیا ہے۔“

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلانے لگا اور میں جوئے

کی کمائی پر اوپر کی طور پر مسرور تھا۔

اسنے میں طارقی بھی ڈولتا ہوا آہنچا۔ حیرت ناک

طور پر اس کی جھٹکیں کیسیٹو میں رک گئی تھیں۔ جے بولا۔

”نیل پرتے ہیں۔“

نیل پرتے چلتے تھے۔ مشینوں پر تو لک چلتی ہے مگر

نیل پر ٹرک بھی چلتا ہے۔ اب میں ارد گرد کی روشنیوں اور

روشن میلے سے لائق ہو چکا تھا۔ نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ چھتیس

کیسی ہیں یا فرشوں پر قالین بچے ہیں۔ کوئی مجسمہ لگا ہے... یا

کوئی فوارے چل رہے ہیں؟ میری جیب میں جوئے کی

اس مجموعے کا عربی اور عبرانی زبان میں ترجمہ ہوا اور یوں ان حکایات میں ان دونوں تہذیبوں کا رنگ اور اضافی حکایات بھی شامل ہو گئیں۔

ایسوپ جس کی کہانیوں کی شہرہ آفاقیت کے بارے میں اب تک اتنی باتیں بتا چکا ہوں، اس کے بارے میں یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ اس نے اپنی کہانیوں کو کبھی تحریری شکل نہیں دی تھی۔ روایت ہے کہ وہ زبانی کہانیاں سنایا کرتا تھا جو عام طور پر منظوم ہوتی تھیں۔ وہ تقاریب یا ملاقاتوں کے دوران محظوظانہ رنگ میں جو باتیں کرتا تھا ان میں یہ منظوم کہانیاں بھی ہوتی تھیں۔ سقراط نے قید کے دوران اس کی کچھ حکایتوں کو نثر کے انداز میں تحریر کیا تھا جبکہ فیلامنکے دیمتھرس نے (283-345 B.C) کے دوران اس کی حکایتوں کو نثر کی شکل میں دس کتابوں میں جمع کیا۔ تاہم یہ مجموعات تاریخ میں نہیں کھو گئے۔ سیرس نے تیسری صدی عیسوی میں ان حکایتوں کو نظموں کی شکل میں تحریر کیا۔ ان حکایتوں کو لاطینی زبان میں ڈھالنے والا مصنف فیدرس تھا جو آکسنس کا آزاد کردہ ایک غلام تھا۔

زمانہ قدیم سے ہی ایسوپ کی کہانیاں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر مختلف تہذیبوں میں ڈھلتی گئیں۔ یوں یہ کہانیاں عالمی کہانیوں میں تبدیل ہوئیں۔ جن کو آج دنیا بھر کے بچے نہایت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کو مختلف انداز میں پیش کر کے بچوں کو اخلاقیات سے مزین کیا جاتا ہے۔

ایسوپ کے آباؤ اجداد کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ اس کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی اتفاق رائے موجود نہیں۔ امکان ہے کہ ایسوپ کا نام ایجیویائی زبان سے اخذ کیا گیا۔ کیونکہ عام طور پر یونانی لوگ اندرون افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کے لیے ایسوپ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ ایسوپ کی زندگی کے بارے میں بھی زیادہ تر معلومات تاریخ کے دھندلوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 550 صدی قبل مسیح میں غلام کے طور پر

ہمارے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ بے نے مجھے بنیادی تربیت دی اور خود کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ اب میں کھیل کی تفصیل میں نہیں جاتا۔ بے بانٹنے والے کو ڈیلر کہتے ہیں۔ دس یا شاید اس سے زیادہ گڈیاں ایک وقت میں استعمال ہوتی ہیں۔ ڈیلر کی پھرئی ناقابل یقین تھی۔ وہ ہر ایک کے آگے تین پتے پھینکتا تھا۔ پتے پکڑ کر کچھ بلائیںڈ کھیلنے اور کچھ دیکھ کر چال چلتے۔ ٹیبل پر کیش نہیں چلتا۔ کھیلنے والا ڈیلر سے ڈالر دے کر ایک سے سو ڈالر کا چس لے سکتا ہے۔ بے نے دو ڈالر کے چس میز پر رکھ کر لگائے۔ پتے کام کے نہیں تھے اس نے پتے پھینک دیئے۔ میز پر تین عورتیں اور دو مرد اور بیٹھے تھے اور سب میز پر بیٹھے تھے۔ ایک عورت نے دس لگا کر پچاس ڈالر جیت لیے۔ خوشی سے چہرہ چمک اٹھا اور دو ڈالر کے چس ڈیلر کو ٹپ میں دیے اور اپنے لیے ایک اور بوتل منگوالی۔

میں بڑی دلچسپی سے یہ سب ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ایک گیم دومنٹ میں ختم ہو جاتی۔ بے ہارتے ہارتے جیتنے لگا۔ اس کی چال پانچ سے بڑھ کر پندرہ ڈالر تک آ پہنچی۔ اب بے سو ڈالر سے پانچ سو بتا چکا تھا اور تین میز بھی چڑھا چکا تھا۔ بے کے علاوہ وہی عورت جیت رہی تھی۔ پھر ایک اور ڈیلر آیا اور

کمانی آئی اور میں گرد و نواح سے بیگانہ ہو گیا۔ یہ اس چار سو ڈالر کا جادو تھا جو میں اپنے علاوہ سب کچھ فراموش کرتا جا رہا تھا۔ بے نے ٹیبل پر جانے کا کہا اور میں بخوشی چلا آیا۔ FortuneOfWheel سے تو چار سو ڈالر بچا کر لے آیا تھا اور اب کسی ٹیبل پر اسے دو گنا کرنے کی خواہش دل میں ایسے اٹھی جیسے کالا ناگ اپنا چمن اٹھاتا ہے۔

ہم ایک بہت بڑے ہال میں آئے، جہاں بہت سی میزیں کچھ فاصلوں پر رکھی تھیں۔ ارد گرد جمع کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کچھ ایسی میزیں بھی تھیں جن کے گرد ایک قسم کی زنجیر لگی تھی یا کوئی احاطہ سا بنادیا گیا تھا۔ بے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہاں بڑی رقمیں لگتی ہیں۔“

میں نے دאش مندی سے اپنا جیتا ہوا سر ہلایا۔ پھر ہم مختلف میزوں کے قریب جا جا کر صورت حال کا جائزہ لینے لگے۔ پوکر اور بلیک جیک مختلف میزوں پر کھیلی جا رہی تھی۔ ہر ٹیبل کا فرق یہ تھا کہ کسی پر زیادہ سے زیادہ پندرہ ڈالر لگا سکتے تھے اور کسی پر سو ڈالر سے زیادہ نہیں لگا سکتے تھے۔ ایک میز کے گرد دو اسٹول خالی تھے۔ ہر ایک پر سات یا آٹھ کھیلنے والے منہبک بیٹھے نظر آرہے تھے۔

ہم ان دو اسٹولوں پر بیٹھ گئے اور طارق منہ لٹکائے

جزیرہ ساموس میں رہتا تھا۔ وہ ڈاکٹور نامی کسی شخص کا غلام تھا۔ سامی زعماء کے لیے اپنی خدمات اور ان کے عوامی دفاع پر ایسوپ کو غلامی سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ وہ کروالیس کے دربار میں رہنے لگا جہاں اس نے خاصا نام اور بڑی عزت کمائی۔

شاہوں کے دربار میں شاہوں کے گن گانے والے ہی رہ سکتے ہیں۔ ایسوپ نے اپنی کہانیوں کے ذریعے جب ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی تو شہنشاہ وقت پمیسس اسرارش بھڑک اٹھا جو آزادی رائے کے خلاف تھا۔

ایسوپ کی موت بڑے پر تشدد اور المناک انداز میں ہوئی۔ اسے ڈیلی کے باشندوں نے ایک بلند چٹان سے دھکا دے کر نیچے پھینکا تھا۔ اس پر بہت سے الزامات لگائے گئے۔ قدرت کا کرنا یوں ہوا کہ اس کی موت کے بعد طاعون کی وبا پھیل گئی۔ جس کے بارے میں سمجھا گیا کہ قدرت کی طرف سے ایسوپ جیسے پیغمبر اخلاق کے قتل کی سزا ہے جس پر ڈیلی کے باسیوں نے اعلان کیا کہ وہ ایسوپ کی موت کا کفارہ ادا کریں گے۔ کیونکہ ایسوپ کا کوئی قریب ترین رشتہ دار موجود نہیں تھا اس لیے یہ کنارہ ایسوپ کے سابق آقا تے پوتے لیزمن نے وصول کیا۔

روایت کے مطابق ایسوپ نہایت بد صورت اور بد وضع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روم میں دلا البانی کے مقام پر اس کا سنگ مرمر کا جو مجسمہ ”ایسوپ کا پورٹریٹ“ کے نام سے لگایا گیا وہ بھی دیکھنے میں مٹھکے جیز ہے۔

ایسوپ کی تخلیق کردہ ہزاروں سال پرانی کہانیاں آج بھی تروتازہ ہیں اور شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ دنیا بھر کے بچے آنے والے زمانے میں بھی ان کہانیوں سے اخلاقیات کا سبق حاصل کرتے رہیں گے۔ کیونکہ اچھی کہانی بھی پرانی نہیں ہوتی۔

مرسلہ: عاشقہ انور۔ کراچی

میں پھرتے سپروائزر کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس ٹیبل کا ڈیل تبدیل کر کے اس کو لگا دو۔ اب وہ لڑکی چتے بانٹنے لگی۔ بے اور میں خوش تھے کہ لڑکیاں نرم دل ہوتی ہیں۔ میرے پاس سو کی جگہ آٹھ سو تھے اور بے ہزار اس کر چکا تھا۔ لڑکی کے ہاتھوں پہلے ہم تھوڑا سا ہارے اور پھر زیادہ ہارتے گئے۔ ہاری ہوئی دولت کو دوبارہ پانے کے لیے میں زیادہ لگا گیا اور سب لٹا تا رہا۔ ایک گھنٹے میں اس ہار جیت کے درمیان میں وہ چار سو بھی ہار چکا تھا جو قیل پر جیت کر آیا تھا۔ بے کے پاس اپنے سو کے علاوہ ایک سو ادھار تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں بھی خالی ہاتھ کھڑا تھا۔

ہر ہارے ہوئے انسان کی طرح میں بھی پشیمان کھڑا تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ وہی جیتے ہوئے چار سو ہی رکھ لیتا۔ بے کے کہنے پر نہ کھیلتا؟ مگر اب سب جیتے ہوئے ڈالر جا چکے تھے۔ پہلے انسان ہو کر پچھتا یا تھا اور اب مسلمان بنا شرمندہ کھڑا تھا۔ کیوں میں نے نگاہی کمایا اور ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔ مجھے جوئے کے پہلے دن ہی معلوم ہو چکا تھا کہ جتنا زیادہ آپ جیتتے ہیں اتنا ہی کسی دلدل میں گرتے جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانے کی ہوس آپ کو اندھا کر دیتی ہے۔ پہلے جیت کر زیادہ بتانے کا لالچ اور پھر ہار کر داپس

پہلے والے کو چلنا کیا۔ اس کے جانے پر سب نے احتجاج کیا۔ ایسا احتجاج علامتی ہوتا ہے اور جس نے جانا ہوتا ہے وہ رکتا نہیں۔

دوسرا آیا تو کھیل پھر شروع ہو گیا۔ بے اب پانچ سو سے بڑھ کر اپنی جیت کو ہزار ڈالر پر لا چکا تھا۔ طارق میرے کان میں بولا۔ ”اتنی تو اس کی چندہ دن کی تنخواہ بھی نہیں ہے۔“

اب جوئے کے آکٹوپس نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ بس بے کے یہ کہنے کی دیر تھی۔ ”چار سو میں سے صرف سو ہی لگا لو۔“

میں نے سوڈا لے لیا اور ڈیلر سے چپس لے لیے۔ کچھ دیر میں میرے پاس سو سے تین سو زیادہ ہو چکے تھے، اب میں طارق کی بھی نہ سنتا تھا جو میرے پیچھے کھڑا کچھ کہہ رہا تھا اور میں صرف برف، کالنگ کارڈ، بحث، رات دن اور چھو لے ہی سن رہا تھا۔ میں جیتنے لگا تو وہ والا ڈیلر بھی تبدیل ہو گیا۔ اب ہنسی شکرانی لڑکی ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ہر ٹیبل کے اوپر کمرے لگے ہوتے ہیں۔ بہت باریک بینی سے ہر ٹیبل کو دیکھا جا رہا ہوتا ہے۔ جہاں ڈیلر ہارتا ہے تو اوپر سے فرش پر کالے سوٹ

کہیں کہیں پختہ اینٹوں میں تبدیل ہو چکی ہے اور بہت سا حصہ لکڑی کے ٹکٹوں سے بنا ہے۔ ایک شاندار منظر تھا مگر اس میں بڑا تاتا ہوا طارق اور نشے میں ڈولتا ہے بھی تھا۔ میں یہاں کچھ دیر ٹھہرتا مگر ان دونوں کی موجودگی سمندر کو بھی ناگوار کر رہی تھی۔ بھی تو وہ اب باقاعدہ غرائے لگا تھا۔

ہم نے پارکنگ سے گاڑی نکالی اور واپس روانہ ہو گئے۔ جے پیٹھے ہی اوٹھنے لگا۔ ہم زیادہ روشنیوں سے نکل کر کم روشنیوں میں آ گئے۔

طارق نے مجھ سے پوچھا۔ ”کل کتنے بجے واپسی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”رات کو کوئی بھی بس پکڑ کر صبح نورنٹو بیچ جاؤں گا۔“

اس کی کل چھٹی تھی۔ کہنے لگا کہ میرے ایک دوست کی والدہ پاکستان میں وفات پا گئی ہیں۔ ان کی دوپہر کے بعد فاتحہ خوانی ہے اور وہیں سے کھانا کھا کر میں تمہیں مہنگن میں گرے ہاؤس کے ٹریٹل پر چھوڑ دوں گا۔ پھر کہا کہ پاکستان سے ایک بہت بڑے عالم بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ دعا کروائیں گے۔ میں سن کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر یہی خاموشی رہی اور پھر اچانک اسے کچھ یاد آیا اور مجھے گھور کر بولا۔ ”یہ بورڈ واک کا تمہیں کہاں سے معلوم ہوا؟“

میں نے بتایا۔ ”1853ء میں یہاں پہلا ہوٹل اور ریزارٹ بنا تھا۔“ یہ سن کر وہ پہلے حیرت زدہ ہوا اور پھر اسے ایک زوردار چھینک آئی۔ کہنے لگا۔ ”تمہیں کس نے بتایا؟“ اور پھر اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی دیا۔ ”میوزیم والوں نے بتایا ہوگا۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ ریزارٹ جھ سو کمروں پر محیط تھا اور دو ہزار لوگوں کے ٹھہرنے کی گنجائش تھی اور ان دنوں امریکا کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔“

کہنے لگا۔ ”پہلے یہ بتاؤ، یہ سب تمہیں کس نے بتایا ہے۔ مجھے اتنے سال ہو گئے ہیں اور کسی نے مجھے آج تک نہیں بتایا۔“

میں نے پیچھے اوٹھتے جے کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس نے بتایا ہے۔“

یہ سن کر وہ بولا۔ ”اسے اپنے باپ کا پتا نہیں، یہ تمہیں کیا بتائے گا؟“

میں اسے بتانے لگا کہ پہلے ایک ریزارٹ بنا اور پھر

لینے کی جستجو۔ میں اس کیسینو میں آنے سے پہلے ایک کھلے اور روشن دباغ والا انسان تھا جو ہر نئی چیز کو بغور دیکھتا تھا اور اب ہارنے کا غم اور گناہ کا بوجھ لیے ایک پریشان دماغ سوچوں میں گھرا کھڑا تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے سوچا کہ ایک تو مجھے ہر نیا تجربہ کرنے کا شوق ہے اور یہ بھی کر لیا۔ پھر سوچا کہ میں جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس جا رہا ہوں۔ اپنے پلے سے تو نہیں گیا۔ یہ بھی سوچتا کہ اگر میں جیت کر ڈالر اپنے ساتھ لے آتا تو خرچ کہاں کرتا؟ اپنے کھانے پر، بچوں کے لیے اپنی اور ضرورتوں کے لیے؟ کس منہ سے خرچ کرتا کیونکہ ایک بوجھ سادل میں رہتا۔ ان پیسوں کی تو میں خیرات بھی نہ کر سکتا تھا۔ جب ایسا سوچتا گیا تو دوبارہ سے اپنی پہلے والی حالت میں آتا چلا گیا جو غبار و دماغ پر چھایا تھا وہ نکل گیا اور پھر سے میں اپنے ارد گرد کے لوگوں اور ماحول کو دیکھنے لگا۔

طارق نے گھڑی پر ٹائم دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ٹائم دیکھ کر بولا۔ ”اب واپس چلنا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”ایک بار بیچ کر کوڈ کچھ لینے دو۔“ یہ سن کر طارق بھڑک اٹھا اور ڈالٹے لگا۔ ”اس وقت کون بیچ پر ہو گا جس کو تم نے دیکھا ہے؟“

میں نے سرجی کی طرح بڑی نفاست سے کہا۔ ”مجھے بورڈ واک کو ایک نظر دیکھنا ہے۔“

یہ سن کر وہ پہلے تو اچھا خاصا حیران ہوا اور پھر اسی حالت میں بولا۔ ”یہ کیا ہے؟ اور تمہیں کس نے بورڈ واک کے بارے میں بتایا؟“

میں نے کہا۔ ”سب بتاؤں گا، پہلے لے تو چلو۔“ سردی اب کانٹے جا رہی تھی۔ طارق بڑبڑا رہا تھا۔

جے کا نشہ خراب ہو رہا تھا، وہ بادل خواستہ ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔

بیچ کے کناروں پر روشنیاں تھیں۔ کیسینو، کلب اور بہت سی جگہوں سے روشنیاں سمندر میں کودنے پر آپس میں لڑبھڑ رہی تھیں۔ پانی دور تھا مگر اس کی لہریں بیچ سے سرکرا کر واپس جھاگ چھوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ بیچ کے بعد سمندر میں ابھارتا تھا اور لہروں کا شور تھا۔ بورڈ واک دراصل لکڑی کا ایک چوڑا پلیٹ فارم ہے جو کئی میل لمبا ہے۔ گرمیوں میں اس پر ہزاروں لوگ ٹپکتے ہیں اور سمندر کو مختلف منظر میں دیکھنے یہاں آتے ہیں۔

یہ بورڈ واک بیچ سے چند فٹ اوپر ہے۔ اب

تو ڈیڑھ دو ہفتے ٹھہر جاتے۔ اپنی گاڑیوں سے آنا شروع ہوئے تو دو تین دن بعد واپس ہو جاتے مگر اسی دوران میامی اور بہاماس کی گرم بچیں آباد ہو گئیں۔ ایئر لائن والوں نے وہاں کے لیے سستے ٹکٹ دینا شروع کر دیے۔ میامی یہاں سے سستا تھا اسی لیے لوگ اٹلانٹک سٹی کو چھوڑ کر وہاں جانے لگے۔ پھر یہاں کے ہوٹل دیران ہونے لگے۔

طارق اب دل چسپی لے رہا تھا اس نے پوچھا۔ ”یہ پھر دوبارہ کیسے آباد ہوا؟“

1974ء میں ریفر غم ہوا کہ یہاں کیسینو کھولے جائیں یا نہیں۔ لوگوں نے کیسینو کھولنے کے حق میں ووٹ دیا۔ پہلا کیسینو 1978ء میں بنا۔ پھر تو کیسینو بنتے چلے گئے۔ سینکڑوں کلب بن گئے۔ بورڈ واک کو نئے سرے سے بنایا گیا۔ اس طرح لاس ویکاس کے بعد سب سے زیادہ کیسینوز یہاں بن گئے۔ گو پہلے والی چہل چہل نہیں ہے پھر بھی سالانہ تین ارب ڈالر کا کاروبار ہوتا ہے۔

طارق سنثار ہا اور جب میں نے اپنی باتیں ختم کیں تو کہنے لگا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آرہا، آخر ان معلومات کا مجھے یا تجھے فائدہ کیا ہوا؟“

میں نے کہا۔ ”تم بتاؤ نقصان کیا ہوا؟“
 یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اب اسے بھی جگہ جگہ کی تاریخ اور جغرافیہ سے دل چسپی ہو رہی ہے۔ جے کو گالی دے کر بولا۔ ”اس بھنگی کو بھی اس کے گھر اتارنا ہے۔“

ہم جے کو اتار کر گھر پہنچے تو صبح کے تین بج رہے تھے۔ فریج سے کھانا نکال کر گرم کیا اور لیوگ روم میں پہڑے تبدیل کیے بغیر صوفے پر سو گیا۔

پھر آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ یہ میرا نیو یارک میں آخری دن تھا۔ بہار کی چھٹیاں تھیں اور بچے ابھی سو رہے تھے۔ مجھے رات کو بس سے ٹورنٹو پہنچنا تھا۔ چند دن بعد میری ہیوسال میں جاب شروع ہو رہی تھی۔ مجھے نیو یارک دیکھنا تھا کہ کیا لیا اس دوران میں نے جتنا کچھ دیکھا تھا وہی میرے لیے بہت تھا مگر مجھے ویسا کچھ محسوس نہ ہوا جو میں سوچ کر آیا تھا۔ دیکھا جائے تو مجھے نیو یارک کی زندگی پسند ہی نہیں آتی تھی۔ میں اس شور کا بھی عادی نہیں تھا جو یہاں ہر وقت بلند ہوتا رہتا تھا اور نہ اس رفتار کے ہم آہنگ ہو سکا تھا جو یہاں دوڑتی پھرتی تھی۔ مجھے دھیرے سے چلتی ہوا میں پسند نہیں نہ کہ تیزی سے چلتے شور مچاتے جھگڑ۔ مجھے ٹورنٹو لوٹ جانا تھا

کچھ اور بننے لگے۔ ہوٹل والے بیچ کی ریت سے ہوٹل کی لابی کو بچانے کے لیے پہلے بیچ کے کنارے لکڑی کے پلیٹ فارم بنادیا کرتے تھے۔ لوگوں نے اس پر کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ ہوٹل والوں نے ساحلوں کی دل چسپی دیکھی تو یہاں آٹھ میل لمبی بورڈ واک بن گئی۔ اس نے اتنی شہرت پائی کہ 1874ء میں یہاں ایک سال میں پانچ لاکھ سیاح ملک کے مختلف علاقوں سے آنے لگے۔ دن میں بیچ میں نہاتے اور شام کو بورڈ واک کرتے۔ بورڈ واک کرنے والوں کا ایسا ہجوم ہوتا جیسے کوئی بڑا جلسہ ہو رہا ہو۔

طارق حیران تھا کہ مجھے آئے ہوئے تین ماہ ہوئے ہیں اور میں اسے بتا رہا ہوں کہ اٹلانٹک سٹی کی تاریخ کیا ہے مگر اب وہ غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی اور اسے بتایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اٹلانٹک سٹی امریکا کی بہترین تفریح گاہ بن گئی۔ سول وار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ سرمایہ داروں کے ہاتھ دولت کے انبار لگنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ جوق در جوق اٹلانٹک سٹی آنا شروع ہو گئے۔ شروع میں یہاں شراب ممنوع تھی مگر مقامی پولیس کی ملی بھگت سے یہاں الکحل چوری چھپیل جایا کرتی تھی۔ جب مشرقی یورپ کے بھوکے ننگے لوگ نیو یارک میں بحری جہازوں سے لٹے پٹے آرہے تھے تو پیسے والے ہزاروں کی تعداد میں یہاں رنگ رلیاں منایا کرتے تھے۔

یہ سن کر وہ بولا۔ ”بیچ پر رنگ رلیاں نہ مناتے تو کیا نمازیں پڑھتے؟“

میں اپنی معلومات کے دریا بہاتے ہوئے اسے بتا رہا تھا کہ جنگ عظیم دوم شروع ہوئی تو یہاں کچھ ٹھہراؤ آیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد یہ پھر سے آباد ہونا شروع ہوئی۔ 1947ء میں یہاں ایک بڑا سمندری طوفان آیا۔ بورڈ واک اسی کی نظر ہوئی اور پانی شہر میں آ گیا۔ بہت کچھ تباہ ہوا اور ہمیشہ کی طرح انہوں نے دوبارہ اسے آباد کر لیا مگر پھر یہاں ہوٹل انڈسٹری بیٹھنا شروع ہو گئی۔

”کیا سمندری طوفان کے ڈر سے؟“ طارق بولا۔
 پھر خود ہی بڑبڑایا۔ ”یہ لوگ اندر سے بہت بزدل ہوتے ہیں۔ کوئی خطرہ ہو تو فوراً بھاگ جاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔ وجہ یہ تھی کہ جنگ کے بعد موٹر انڈسٹری نے بہت ترقی کی۔ لوگ ٹرین کے لیے سفر کی بجائے اپنی گاڑیوں سے آنا شروع ہوئے۔ ٹرین سے آتے

کیونکہ وہاں کی زندگی مدھم مدھم سروں میں بہتی تھی۔

دن نکل چکا تھا۔ تمنا بھابی صبح کی نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھیں۔ طارق اپنا قدیم تولیہ ہاتھ میں پکڑے برآمد ہوا۔ بڑا بے ہنگام سوال کیا۔ ”چائے پیو گے؟“ پھر ایک زوردار چھینک ماری، ذرا سا ڈمکایا اور پھر سنبھل کر کچن میں چائے بنانے چلا گیا۔ واپس آیا تو بولا۔ ”آج دوست کے گھر قرآن پاک کے ختم پر جانا ہے، پھر وہیں سے میں بس تک تمہیں چھوڑ آؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو تم نے کل بھی بتایا تھا؟“

اس نے جواب نہیں دیا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بہت سنجیدگی سے چائے بنا رہا تھا۔ چائے تیار ہوئی تو وہ دو گ لے آیا۔ ایک میرے حوالے کر کے خود صوفے پر کھل اوڑھ بیٹھ گیا۔ تولیہ گود میں رکھا تھا اور سرخ آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبی تھیں۔

میں نے پوچھا۔ ”رات تم نے کچھ پیا بھی نہیں مگر آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟“

انہی آنکھوں سے وہ مجھے کھورتے ہوئے بولا۔ ”اب تو میں حاجی بھی ہو گیا ہوں۔ نہ پیتا ہوں اور نہ پلاتا ہوں۔“ مجھے یاد آگیا کہ وہ دو سال پہلے اکیلا جج بھی کر آیا ہے۔ میں نے جج کی مبارکباد دی۔ وہ خاموش بیٹھا چائے کی چکیاں لیتا رہا۔

”جج کا سفر ہی سادہ۔“ اسے خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ یوں بھی مجھے اس وقت تک جج یا عمرہ کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ہر ایک سے جو بھی وہاں سے آتا تھا۔ اس سے میں مکہ اور مدینہ کے سفر کا حال پوچھا کرتا تھا۔ اس نے بتانا شروع کیا تو میں ان میں کھوسا گیا۔ چونکا تب جب اس نے یہ بتایا کہ وہاں میری جیب کٹ گئی تھی۔ میرا گرین کارڈ، کریڈٹ کارڈز اور نقدی بھی کوئی لے اڑا تھا۔ پھر جو کچھ اس نے بتایا وہ میرے لیے بہت انوکھی بات تھی۔

کہنے لگا۔ ”جب مکہ میں جب کئی تو میں بہت پریشان ہوا۔ سوچتا تھا کہ اب امریکا میں داخل کیسے ہوں گا؟ پیسے بھی نہ تھے اور سفر کی کاغذات بھی کھو چکے تھے۔ گروپ کے ایک بندے سے ڈالر لیے۔ پھر تمنا کو فون کیا اور اسے ہدایات دیں کہ میری فلائٹ کے دن تمہارے پاس جو کچھ بھی میری شناخت کا ہو، لیتی آنا۔ میں دوسووں کا شکار تھا۔ ذرا ہوا تھا کہ کہیں واپس پاکستان نہ بھیج دیں۔“

میں نے پریشانی سے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”جب نیو یارک ایئر پورٹ پر پہنچا تو انہوں نے میری کہانی سنی۔ میرا اٹیرو پولیا اور مجھے جانے دیا۔“

یہ سنا کر اس کی آنکھوں میں پانی پہنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”اب روکیں رہے ہو؟“

گالی دے کر کہنے لگا۔ ”روکون رہا ہے؟ یہ تو کینٹ الری ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اسٹوری میں قہرل نہیں ہے؟“

وہ بولا۔ ”کون سا قہرل؟“

میں نے کہا۔ ”تمہیں پکڑ لیتے۔ ہولڈنگ سینٹر میں ڈالتے۔ پولیس اور ایمریشن والے تمہاری ناک رگڑتے اور تم کو بعد میں تینہسکر کے چھوڑتے۔“

یہ سن کر وہ بولا۔ ”اللہ اس مصیبت سے بچائے۔ جب پریشانی آتی ہے تو یہ گورے حشر کر دیتے ہیں، تمہیں تو اندازہ بھی نہیں۔“

میں اس کی بات پر فنس رہا تھا کیونکہ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے ساتھ آج رات کیا ہونے والا ہے۔

تمنا بھابی نے ناشتے میں جو کچھ تیار کیا وہ ہم حلق سے اتار رہے تھے۔ طارق کہنے لگا۔ ”اب تمہیں امریکا کے فارماسٹ لائسنس کی امتحان کی تیاری کرنی ہے۔ بیہوش سال کی جاب پر نہ بیٹھ جانا اسے وقتی طور پر رکھنا۔“ پھر اس نے ایک بھاری بیک میں اپنی ساری کتابیں مجھے بھر کر دے دیں اس بیک کا وزن پندرہ کلو سے کم نہ ہوگا۔ اسے اٹھانا بھی جان جو کھوں کا کام تھا۔

کچھ دیر میں شہر و بھی اٹھ آیا۔ میرے تیار بیک دیکھے تو ان پر چڑھ بیٹھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں آج واپس جا رہا ہوں تو گود میں آکر لیٹ گیا۔ بار بار تقاضا کرنے لگا۔ ”چاچا! ابھی مت جاؤ۔“

طارق نے تمنا بھابی سے پوچھا۔ ”وہ فریڈہ کے کیس کا کیا بتا؟“

بھابی نے جواب دیا۔ ”اس کینٹ کو کچھ پیسے تو مل ہی جائیں گے مگر ہمارا انشورنس کا پرییمیم بڑھ جائے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”ماجرہ کیا ہے؟“ تب اس نے مجھے جو کہانی بتائی تو امریکا کے نظام کی خوبی یا خرابی میرے سامنے آئی۔ چند ماہ پہلے میں بھی اپنا ایک واقعہ بیان کر چکا ہوں جب میرا روڈ پر کار کا اکیڈنٹ ہوا تھا اور پھر میں کیلوں کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ وکیل مجھے کہتے تھے کہ

میں دوسری گاڑی والے کی انشورنس پر کیس کر دوں اور یہ کہوں کہ میں تو کام کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ وکیل مجھے ایک ٹکڑی رقم دلانے کا وعدہ کر رہے تھے اور میں نے اپنے آپ کو اپنا بیس کر کے انکار کر دیا تھا۔

اب تمنا بھائی نے جو بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ فریدہ کے پاس شہرزد بے بی سنگ کے لیے جاتا تھا۔ ایک دن تمنا شہرزد کو اسکول لینے گئی اور ساتھ میں فریدہ کو بھی لے لیا۔ اسکول پہنچنے سے پہلے تمنا بھائی نے گاڑی کسی دیوار میں یا کہیں اور مار دی۔ گاڑی تو ٹوٹل تباہ ہو گئی۔ لیکن ایشیان بیچ گیا کیونکہ وہ بے بی سیٹ پر بندھا تھا۔ تمنا بھائی نے ایک فلک شگاف بیچ ماری ان کی بیٹی پر فریدہ اچھل کر گر گئی، اس کا ایک ہاتھ فریجر ہو گیا۔ فریدہ کے ہاتھ پر پٹی باندھ دی گئی۔ تمنا نے کہا کہ جب تک تمہارا ہاتھ ٹھیک نہیں ہوتا، بے بی سنگ کے پیسے تمہیں ملتے رہیں گے۔ فریدہ خوش خوش شکر یہ ادا کر کے گھر چلی گئی۔ گھر پہنچ کر فریدہ نے شوہر کو تمنا کی سخاوت کے قصے سنائے۔ ڈھیر ساری دعائیں دیں مگر شوہر نامدار کے دیسی دماغ میں کوئی خیال پکٹنے لگا۔ اس نے اٹارنی کو فون کیا۔ ایسے اٹارنی تو کمبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اٹارنی نے کہا کہ ایک لاکھ ڈالر انشورنس کمپنی سے دلو دوں گا مگر سودا فٹنی فٹنی ہوگا۔ پچاس ہزار ڈالر کون چھوڑتا ہے اس نے تمنا بھائی کی انشورنس پر تسلیم کر دیا۔ فریدہ کو اپنا بیچ بتایا گیا اور یہ بھی کہا کہ مینٹل شکاب بھی لگا ہے جس کی وجہ سے وہ اب بچن کا کام بھی نہیں کر سکتی۔ انشورنس کمپنی نے رات دن کے کھانے کے پیسے تو پہلے ادا کر دیے کہ ہوٹل سے منگوا لو۔ مینٹل شکاب اور ہاتھ کے فریجر کے علاج کا بندوبست بھی کر دیا اور اب کیس کورٹ میں ہے۔ (میرے واپس آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کو ایک لاکھ ڈالر مل گئے ہیں۔) تمنا بھائی نے فریدہ کا سوشل بائیٹاک کر دیا ہے اور فریدہ کو کوئی پروا بھی نہیں کیونکہ اسے پچاس ہزار ڈالر مل چکے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تمنا بھائی شہید غم کی کیفیت میں ہیں کیونکہ ان کی گاڑی کا پریسٹیم بڑھ چکا ہے۔

طارق کے دوست کے گھر دوپہر کا کھانا تھا۔ میں آرام سے آٹھ یا نو بجے کی بس سے اگلی صبح سات بجے۔ ٹورنٹو پہنچ سکتا تھا۔ ہم روانہ ہوئے اور معلوم نہیں کن کن راستوں سے ہوتے ہوئے اس کے دوست کے گھر پہنچے۔ اب میں راستوں پر نظر نہیں رکھتا تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اپنا سامان اور کتابوں سے بھرا ایک میں کس طرح اٹھا پاؤں گا۔

ایک بڑے گھر کے بڑے کپڑے میں گاڑی رکی تو پہلے ہی سے کئی گاڑیاں وہاں پارک تھیں۔ پورا گھر درختوں میں گھرا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک روحانی ماحول تھا۔ کارپٹ پر سفید چادریں پھٹی تھیں اور مرد حضرات تلاوت کر رہے تھے۔ ہم بھی خاموشی سے ایک کونے میں سیارے لے کر بیٹھ گئے۔ تمنا بھائی گھر کے اس حصے میں چلی گئیں جہاں تمام عورتیں جمع تھیں۔ ہمارے بیچ کچھ چادریں لٹکی تھیں اور وہاں سے متواتر بولنے کی آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

میں نے قرآن پاک کا پارہ پڑھا اور سب کے ساتھ کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا کہ یہاں آکر پیٹ بھلر لوں گا۔ کارپٹ پر پھٹی چادر پر ہم اکڑوں بیٹھے تھے جس کی وجہ سے اب کمر میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ دیواروں سے ٹک لگائے ذرا آرام سے بیٹھے تھے۔ اب انتظار کی کیفیت میں بیٹھنا دو بھر ہو رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ پاکستان سے آئے مولانا صاحب تشریف لارہے ہیں۔ وہ دعا کروائیں گے پھر کھانا ملے گا۔ کچھ دیر بعد مولانا صاحب سفید لباس پر سیاہ عبا پہنے تشریف لے آئے۔ سر پر سفید ٹوپی اور سیاہ واڈھی ان کی بھاری جسامت کے ساتھ انہیں معتبر بنا رہی تھی۔ ہم سب احترام کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ وہ بیٹھے اور ہم بھی حلقہ بنا کر ان کے گرد بیٹھ گئے۔ انہوں نے طائرانہ سی نظر سب پر ڈالی۔ اپنی سیاہ واڈھی پر ہاتھ پھیرا اور مراقبے میں چلے گئے۔ وہ کسی اور جگہ سے دعا کروا کر آرہے تھے۔ انہوں نے میزبان سے چائے بنانے کا کہا۔ ایک کپ ان کے لیے بن کر آیا۔ چائے پی اور دوبارہ سوچوں میں پڑ گئے۔

میں مولوی صاحبان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ جنہوں نے مسجد کو بغیر کسی دنیاوی لالچ کے آباد کیا ہوا ہے۔ جاڑوں کے سرد موسموں میں بھی صبح سویرے اٹھ کر مسجد کا دروازہ کھولتے ہیں، جب کہ اس وقت ہم سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ لائٹیں ہو یا لیپ، مولوی صاحب اسی سے مسجد کو روشن کرتے ہیں۔ اذان دے کر ہمیں بتاتے ہیں کہ نماز نیند سے بہتر ہے، آؤ نماز کی طرف، آؤ فلاح کی جانب۔ اللہ اکبر کی گونج رات کے سناٹوں میں تیرتی، ہم تک پہنچتی ہے۔ خوش قسمت کلمہ گو بیدار ہوتے ہیں اور اپنا سر اللہ کے آگے زمین پر لگا کر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ پاک ہے وہ ذات جو سب سے برتر

ہے۔

قدرت اللہ شہاب اپنی نوکری کے سلسلے میں ہندوستان کے ایک دور دراز علاقے میں تعینات ہوئے۔ وہاں آدمی واپسی یعنی جنگی لوگ رہتے تھے۔ کوئی سواری بھی وہاں نہ جاتی تھی۔ ہر مذہب کے لوگ مگر اپنے مذہب سے نا آشنا لوگ وہاں رہتے تھے۔ وہ گئے تو انہوں نے مسجد کا پوچھا۔ ایک مسجد پائی جس کو تالا لگا تھا۔ پوچھنے پر بتانے والوں نے بتایا کہ ایک مولوی صاحب شاید ایک ماہ میں ایک بار کہیں دور سے یہاں آتے ہیں۔ تالا کھولتے ہیں، مسجد کی صفائی کرتے ہیں۔ اذان گوئی ہے اور ہم اس دن نماز پڑھتے ہیں۔ شادی ہو تو نکاح پڑھواتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی مسائل بتاتے ہیں۔ معاوضہ کچھ نہیں لیتے اور کچھ دن ٹھہر کر کسی اور گاؤں یا مقام کی جانب چلے جاتے ہیں۔ اس مولوی نے اجازت لوگوں کو اسلام کے ایک اُن دیکھے دھاگے سے باندھ رکھا تھا۔

میں آج ایک مولانا صاحب کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ چائے پی کر سوچوں میں گم تھے۔ ہم سب ان کے رعب اور دبدبے سے خاموش بیٹھے تھے۔ وہ کھانا کھا کر آئے تھے اور اب چائے پی کر ہم سب سے دعا کروانے والے تھے سب کی نظریں ان پر تکی تھیں کہ ان میں پھل پیدا ہوئی اور ایک بیان شروع ہوا۔ پھر ایک گھنٹا گزر گیا اور بیان جاری رہا۔ سب کمزور ایمان کے لوگ پہلو بدل رہے تھے۔ میں بھی پہلو بدل کر دوبارہ اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ ارد گرد کے صاحبان نے دیواروں سے ٹپک لگائیں اور کچھ غنودگی کے عالم میں چلے گئے۔ کمرختہ بن گئی تھی۔ پیٹ میں بھی مروڑاٹھ رہے تھے۔ صاحب ایمان ہوتے تو ڈٹے رہتے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مولانا صاحب کیا فرما رہے ہیں۔ کیونکہ اب وہ ایک اہم کھول کر اس مدرسے کی تصویریں دکھلا رہے تھے جو پاکستان کے ایک شہر میں زیر تعمیر تھا۔ وہ چندے کی اپیل کر رہے تھے بلکہ نہ دینے پر جہنم کی منظر کشی بھی کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ سب ایک جہنمی ماحول میں رہ رہے ہیں۔ اپنی اور اپنے بچوں کی بقا چاہتے ہیں تو دل کھول کر مدرسے کے لیے چندہ دیں۔ سب ڈر گئے اور اپنی حیثیت کے مطابق جو کچھ تھا وہ ان کو نوازا دیا۔ ایک صاحب نے مدرسے کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے تو بہت غضب ناک ہوئے۔ سوال کو کافرانہ سوچ قرار دے دیا۔ میز بانوں نے معافیاں مانگیں، سوال کرنے والے نے

کچھ چندہ دیا تو کچھ مرد ہوئے۔

پھر فردا فردا سب سے پوچھا کہ آپ کو اپنے لیے دعا کروانی ہے؟ پھر پردے کے پیچھے خواتین سے با آواز بلند ہو کر کہا کہ میں اتنے دن نئی یارک میں ہوں۔ جس نے گھر پر دعا رکھوائی ہو تو اپنا نام، ایڈریس اور فون نمبر بتا دے۔ کچھ کاغذ لکھے ہوئے ان تک پہنچے۔ انہوں نے تعویذ بنا کر جیب میں رکھ لیے۔

شام اترنے والی تھی اور مجھے مہلن بھی جانا تھا جو کم از کم یہاں سے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ مولانا صاحب نے چٹکس اور کچھ کمیش اپنے سامنے فرش پر رکھا اور بہت رقت آمیز دعا کروائی۔ ان کو جنت کے سند لیے دیے جنہوں نے چندہ پیش کیا تھا۔ مجھے جنت نہ مل سکی کیونکہ میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ تھا۔ پھر مجھے بغور دیکھا۔ نام پوچھا اور پھر پوچھا کہ کیا یہیں نئی یارک سے ہوں۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ ”کینیڈا سے آیا ہوں۔“

ایک چمک ان کی آنکھوں میں آئی۔ سوالیہ نظروں سے پھر سب کو دیکھا اور آخر کار اجتماعی دعا کی جو لگ بھگ آدھا گھنٹہ جاری رہی۔

دعا خیر کے بعد کھانے کا تقاریر بجا اور ہم تیزی سے اٹھے۔ پلیٹیں بھریں اور روزہ داروں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ایک خالی کرسی دیکھی اور اس پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد مولانا صاحب بھی میرے ساتھ والی کرسی خالی کروا کر اس پر براجمان ہو گئے۔ فرمایا۔ ”آپ ٹورنٹو میں رہتے ہیں؟“

میں نے ادب سے جواب دیا۔ ”جی حضور۔ خادم وہیں رہتا ہے۔“

اس پر وہ بولے۔ ”میرا کینیڈا کا ویزا ہے۔ اگر تم وہاں میرا کچھ انتظام کرواؤ تو میں دعا کروانے وہاں آسکتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”دراصل ہمارے ساتھ ایک صاحب کشف بزرگ رہتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کرتے بلکہ رات دن ہمارے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔“

پہلے وہ چونکے اور پھر بولے۔ ”ناشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ ان مولانا صاحب کا نام کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”سرجی۔“

برایانی کا بھرا جج ان کے منہ کے پاس جاتے جاتے رک گیا۔ بے یقینی سے میری جانب دیکھا اور میں یقین کے

عالم میں اب کوئی کھارہ تھا۔ مجھ سے اسی عالم میں پوچھا۔
”یہ ان کا اصلی نام ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”اصلی نام شاید کوئی اور ہوگا مگر عقیدت مندوں نے انہیں یہ نام دے رکھا ہے۔“

اب مولانا صاحب کھانا چھوڑ کر مجھے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں ان کی تشویش کو سمجھ گیا۔ اسی لیے پہلے ان کی توجہ کھانے کی جانب مبذول کروائی اور پھر کہا۔ ”وہ تعویذ نہیں دیتے مگر جب پاؤں پکڑ لیں تو دے بھی دیتے ہیں۔“

مولانا صاحب ایک سدا بہر کر بولے۔ ”ان تعویذ اور گنڈے کرنے والوں نے لوگوں کا ایمان خراب کیا ہوا ہے۔ سب جعلی کام ہے۔“ پھر بریانی کا کچھ بھر کر اپنے حلق مبارک میں ڈالا اور فرمایا۔ ”بہت سے جعلی پیر لوگوں کے ایمان سے کھیل کر مفت کے پیسے پورے ہیں۔“

میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”واللہ وہ پیسے نہیں لیتے۔ بس پاؤں پاؤں جلیبیاں لیتے ہیں اور وہ بھی گرم دودھ میں ڈال کر۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”جلیبیاں کھا کر ان کی طبیعت بھی جلائی ہو جاتی ہے اور بھی کبھی تو حال پڑنے لگتے ہیں۔“

مولانا صاحب کو وہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا تو وہ وہاں سے اٹھ کر کہیں اور جا بیٹھے۔

واپسی پر جب طارق مجھے گرے ہاؤس کے ٹرمینل چھوڑنے جا رہا تھا تو میں نے ان مولانا صاحب کے بارے میں پوچھا۔ وہ بتانے لگا کہ ان کا ملٹی پل ویزا لگا ہوا ہے۔ سال میں دو مرتبہ آتے ہیں۔ مدر سے کا چندہ لیتے ہیں اور اس کے بدلے گھر گھر جا کر دعا کروا دیتے ہیں۔ سب کو یہی کہتے ہیں کہ تم لوگ کافروں کے ملک میں رہتے ہو تمہارا اور بچوں کا ایمان خطرے میں ہے اور دعا کروانا ضروری ہے اور وہ بھی ان سے۔ عورتیں اپنا عقیدہ بچانے کے لیے ان سے دعا کرواتی ہیں۔ چندہ وغیرہ بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح سے ہم سب کا ایمان بھی محفوظ ہے اور جہنم جانے کا خوف بھی نہیں رہتا۔

میں ان کا اہم دیکھ کر مشکوک ہو گیا تھا لیکن طارق کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں ان کے ساتھ کیا کر آیا ہوں۔ کیونکہ تنہا بھابی بھی ساتھ بیٹھی تھیں اور انہوں نے بھی اپنا ایمان اسی طرح سے محفوظ کیا ہوا تھا۔

طارق نے مجھے منہ نہیں میں گرے ہاؤس بس سروس

کے ٹرمینل پر اتارا۔ شہروز بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ ”آپ دوبارہ کب آئیں گے؟“

میں نے طارق اور تنہا بھابی کا شکریہ ادا کیا۔ طارق نے کچھ نصیحتیں کیں۔ تنہا بھابی نے نمازیں پڑھنے کی تاکید کی۔ کچھ وظائف بھی دیے اور پھر وہ چلے گئے۔

میں بھاری بیگوں کا بوجھ اٹھائے ٹرمینل کی عمارت کی جانب بڑھ گیا۔

جہاں پر اترا تھا آج وہیں واپس آ لوٹا تھا۔ پہلے سرجی اور شہباز ساتھ تھے اور آج بھاری بھر کم بیک ساتھ تھا جو اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ ایک بریف کیس کے علاوہ مزید دو بھاری بیک تھے جو میرے دو ہاتھوں کے بس کا روگ نہ تھے۔ کسی طرح سے میں نے دس بجے والی بس کا ٹکٹ لیا اور پھر اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا وہاں آ کھڑا ہوا، جہاں سے بس نے آدھے گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ سردی تھی مگر ٹکٹ نہ کرتی تھی۔ میں باہر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک بندہ جوائے خدوخال اور چلے سے دیسی لگتا تھا، میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ شکیں اور رنگ ہمارے جیسا تھا، ہم نے ہاتھ ملایا۔ یہاں ایک مسئلہ یہ رہتا ہے کہ کوئی اپنے خدوخال جیسا ملے تو سلام نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ انڈیا کا رہنے والا کوئی غیر مسلم ہو۔ اسی طرح ہندو خستے کہنے سے پہلے نام یا ملک ضرور پوچھتا ہے۔ اس نے سیدھا سلام کیا اور میں نے جواب دے کر سوچا کہ یہ کوئی ٹورسٹ ہی ہوگا۔ عمر کی تھی اور نام بھول گیا ہوں، اسی لیے فرض کر لیتے ہیں کہ رشید تھا۔ ناتھ امریکا میں رہنے والے پاکستانی ایک دوسرے سے زیادہ کھلتے ملتے نہیں ہیں۔ دوسرے ایک بار دیکھ کر ابھی بن جاتے ہیں۔ رشید صاحب نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تو پاکستانی ہو گیا کہ یہ امریکا میں نہیں رہتا۔ تعارف ہوا تو معلوم پڑا کہ موصوف کی دینی میں ایک کمپنی ہے۔ امریکا اور کینیڈا کا سیاحتی ویزا پاس ہے۔ امریکا کوئی چندہ دن پہلے آیا تھا اور اب ٹورنٹو جا رہا تھا۔ میں بھی زیادہ پرانا نہ تھا اسی لیے اس کے ساتھ گھل مل گیا۔

اتنے میں بس آئی اور ہم ایک دوسرے کے برابر اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ رشید مجھے بتا رہا تھا کہ اس کی دینی میں بہت بڑی کمپنی ہے جہاں سو کے قریب لوگ کام کرتے ہیں۔ وہ امریکا یہ دیکھنے آیا تھا کہ یہاں بھی کوئی کاروبار شروع کر سکے۔ امریکا کا جائزہ لینے کے بعد وہ اب کینیڈا جا کر حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا، کسی نے اس کے کان میں

یہ بات ڈال دی تھی کہ کینیڈا میں امیگریشن بہت آ رہی ہے اور یہ اچھا موقع ہے کہ وہاں کوئی کاروبار شروع کر دیا جائے۔

ہماری بس روانہ ہو چکی تھی۔ منہشن سے نکل کر اب ہم بائی وے پر آ گئے تھے اور بیفلو کی جانب رواں دواں تھے۔ کچھ لوگ سو گئے تھے اور کچھ جاگ رہے تھے مگر خاموش بیٹھے تھے۔ بس میں ہم دونوں کے علاوہ کسی جانب سے کوئی آواز نہ آتی تھی۔

رشید کچھ پریشان بیٹھا تھا اور بار بار مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”کیا کینیڈا والے مجھے داخل ہونے دیں گے؟“

میں حیران تھا کہ اسے ڈر کس بات کا ہے۔ جب وہ امریکا آ چکا ہے اور کینیڈا کا ویزا بھی ہے تو اسے روکنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میں اسے تسلی دیتا اور وہ مطمئن ہو جاتا ہم دوبارہ سے باتیں کرنا شروع کر دیتے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنا سوال دوبارہ دہراتا اور میں پھر اسے تسلی دیتا۔

میں نے اس کی بے چینی کو دیکھا تو پوچھا۔ ”آخر آپ اتنا گھبرا کیوں رہے ہیں، کینیڈا میں آپ کو داخل ہونے سے کوئی کیوں روکے گا؟“

درحقیقت اس کی الجھن دیکھ کر میں خود گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا کہ کہیں مجھے یہ نہ روک لیں۔ کینیڈا نہ ہو کہ کوئی جنت ہو گئی جس میں داخل ہونے کے کڑے معیار اور بڑے تقاضے ہیں۔ رشید کہنے لگا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ کینیڈا میں کاروبار کروں۔ مجھے ہر ایک بھی کہتا ہے کہ کینیڈا رہنے کے لیے بہت خوب صورت اور پرسکون جگہ ہے۔“

جو سکون میں پچھلے چار ماہ میں دیکھ چکا تھا، وہ تو میں ہی جانتا تھا مگر اس کے منہ سے یہ سن کر میں بھی اپنے آپ پر ناز کرنے لگا۔ پہلے میں اس کی دولت اور کاروبار پر رشک کر رہا تھا اور وہ میرے کینیڈین ہونے پر، مجھے کسی اونچے مقام پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اس کے کینیڈا کے بارے میں ان تحریریں الفاظوں کے بعد ہم دونوں کینیڈا پر رشک کر رہے تھے۔

مجھ سے میرا فون نمبر مانگا اور میں نے حسب عادت دے دیا بلکہ اس کا لکھا پھر سے دیکھا کہ کہیں اس نے غلط تو نہیں لکھا ہے۔ ہماری بس اپنی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ سفر کے ایک گھنٹے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ صدیوں سے اس سفر میں ہوں۔ گزرا کل ماضی بن جاتا ہے اور آنے والا کل منزل بن کر ذہن پر عکس بنا ہوتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کون کون سے ملک گھوم چکے ہیں؟“ وہ ذرا اترا کر بولا۔ ”دہلی، شارجہ، ابوظہبی، الحین کے علاوہ مکہ، مدینہ اور امریکا گھوم چکا ہوں۔“ پھر سے دوبارہ پریشان ہوا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ ”اگر قسمت میں ہو تو کینیڈا بھی۔“

میں نے اب کی بار اس کی پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”پاکستان کے کس کس شہر میں جا چکے ہیں؟“ کہنے لگا۔ ”لاہور، فیصل آباد، جڑانوالہ اور شیخوپورہ۔“ میں نے سنا کئی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”ماشاء اللہ آپ پوری زندگی تک کر نہیں بیٹھے۔“

میری اس بات کو وہ تعریف سمجھ کر بہت خوش ہوا اور ایک بار پھر جیب سے کاغذ نکال کر میرا فون نمبر چیک کیا۔ ہماری بس یکساں رفتار سے چل رہی تھی کہ اتنے میں قانون نافذ کرنے والوں کی گاڑی نے ہماری بس کو روکا۔ رشید کے ساتھ ساتھ میں بھی بلا وجہ پیلا پڑ گیا۔ دو تین ریسٹر نما باوردی افراد بس پر چڑھ آئے۔ ہم سب کے کاغذات چیک کیے اور پھر اتر گئے۔ یہ امیگریشن والے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ راستے میں بھی روک لیتے ہیں۔ بس روانہ ہوئی تو اب ہم دونوں خاموش تھے۔ وہم کے بچھو میرے بدن پر رینگ رہے تھے۔ بس چلتی رہی اور میں ان بچھوؤں کے ڈنک محسوس کرتا رہا۔

میں نے تاؤ کی کیفیت کو نارمل حالت میں لانے کے لیے اس سے پوچھا۔ ”آخر آپ کے ذہن میں کس قسم کا کاروبار ہے جو آپ کینیڈا میں کرنا چاہتے ہیں۔“ ”کوئی پیئروں پمپ، گروسری اسٹور یا پھر کچھ ٹیکسیاں لے لوں گا۔ پیسوں کی کمی نہیں ہے۔“ پھر اپنی جیب کی جیب سے چیونٹ نکالی۔ تو ذکر آدمی مجھے دی اور بقیہ خود چبانے لگا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ بس ایک سروس اسٹیشن پر رکی۔ ہمارے اترنے سے پہلے امیگریشن پیئروں کی ایک اور گاڑی آرکی۔ ہم سیٹوں سے اٹھ چکے تھے مگر ڈرائیور نے اسٹیکر سے اعلان کیا۔ ”آپ سب لوگ دوبارہ سے سیٹوں پر بیٹھ جائیں۔“

ہم دونوں بھی سب کی طرح بیٹھ گئے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یا تو رشید پکڑا جائے گا یا پھر میں۔ مجھے معلوم نہیں کیوں بے چینی ہو رہی تھی۔ یہ بار بار کی تلاشی مجھے سمجھ میں

نہیں آرہی تھی۔ پھر سے کچھ اہلکار سوار ہوئے۔ میں نے اپنے لینڈنگ ہیپز اور پاسپورٹ دکھایا۔ رشید نے اپنی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کاغذات دکھائے۔ انہوں نے سب مسافروں کو چیک کیا اور پھر اتر گئے۔ اس کے بعد ہم کو بھی نیچے اترنے کی اجازت ملی۔

میں نے رشید سے کہا۔ ”آتے ہوئے تو ایک بار بھی تلاشی نہیں ہوئی اور اب کی بار.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ مجھے خود معلوم نہ تھا کہ آگے کیا کہنا ہے۔ رشید ماتھے پر سلوٹس رکھے خاموش تھا اور ہم سروس اسٹیشن کی عمارت کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بعد کے سالوں میں معلوم ہوا کہ ایسی تلاشیاں معمول کی بات ہوتی ہیں۔ یہاں کے ادارے ہر دم چوکس رہتے ہیں۔

اسٹیشن کے اندر وہی کافی، آئس کریم اور برگر بک رہے تھے۔ صاف سحرے واش روم اور چمکتے فرش۔ کئی اور بیس بھی رکی تھیں۔ ایک رش سالگ تھا۔ لوگ دھڑا دھڑا کھانی رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مفت میں چیزیں پائی جارہی ہیں۔ ایک شاپ کے سامنے لائن لگی تھی۔ ہم رنگ برنگی کرسیوں پر ایک بڑے ہال میں بیٹھے تھے۔ واش روم سے ہاتھ منہ دھو کر ایک بار پھر سے میں فریش ہو گیا تھا اور چمک لگی رہا تھا۔ کافی سے مجھے چڑھتی اور کچھ کھانے کو دل بھی نہ کر رہا تھا۔

میرے لیے یہ عالی شان سروس سینٹر جو ہائی دیز کے کنارے مسافروں کے لیے بنے ہوتے ہیں، ہمیشہ سے پھیکے اور بد مزہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ میں عادی تھا کہ بس رکے اور ہم لوٹے اٹھائے بھاگے بھاگے کھیتوں میں جا گھسیں۔ پھر ساتھ کسی چھوٹی سی مسجد میں کوئی نہ کوئی نماز ادا کریں۔ نماز پڑھ کر باہر رکھی چار پائینوں پر بیٹھے پہلے تندور کی گرم روٹیوں کے ساتھ دال یا کچھ اور کھائیں پھر گرم چائے کا لطف لیں۔ چائے کے بعد استاد (ڈرائیور) کا انتظار کریں جو کسی انتہائی کمرے میں کڑا اسی گوشت بڑی رغبت سے کھا رہا ہو۔ استاد اگر کچھ شوقین حجاز ہو تو کھانے کے بعد سگریٹ بھی پی لیتا ہے لیکن یہاں پھیکے برگر، کھولتی کافی یا آئس کریم کا لطف کیسے آسکتا ہے۔ جب تک قریب میں گرم پکڑے کڑا ہی سے نہ نکل رہے ہوں تو سفر کا رنگ بھی چمکنا نہیں ہوتا۔ یہاں لوگ کافی لاتے یا پھر برگر تو چینی، دودھ، بیج اپ باہر میزوں پر رکھا ملتا ہے۔ ہر ایک اپنی مرضی سے استعمال کرتا ہے اور پھر ٹرے کو ایک بڑے ڈسٹ

بن میں خالی کر کے اسے ایک میز پر رکھ دیتا ہے۔ نہ کوئی گند اور نہ دھکم پیل۔ اس سفر میں کوئی خاک لطف آئے گا جہاں ایک آدھ لڑائی بھی نہ ہو۔

میں اندر کے روکے ماحول سے باہر نکل آیا۔ رشید بھی میرے ہمراہ چلا آیا۔ ہماری بس کا ”استاد“ ایک دراز قد گورا تھا۔ سفید شرٹ پر نیلا کوٹ پہنے کسی پائلٹ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اس کے ساتھ کھڑا کش لے رہا تھا۔ رشید بس میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے جو پوچھا وہ مجھے ہرگز نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ غیر ممالک کے سفر میں آپ ہمیشہ خاموش ہی رہیں تو بہتر ہے۔ ایک اور چیز میں نے یہ بھی سیکھی ہے کہ رستہ معلوم کرنے کے علاوہ کبھی کوئی غیر ضروری بات نہ کریں۔

میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”کیا آگے بھی کوئی اور تلاشی ہوگی یا یہ آخری تھی؟“ میرا یہ فضول سا بے محل سوال میرے لیے کیا مصیبت لاسکتا تھا مجھے اس کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔

ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔ ”نہیں! اب کوئی اور تلاشی نہ ہوگی اور ہم کینیڈا کے بارڈر پر جا کر بریک لگائیں گے۔“ میں نے یہ سن کر سکون کا سانس لیا اور سگریٹ کا کھرا کش لے کر دھواں فضاء میں چھوڑ دیا۔ اب ڈرائیور بڑے غور سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

بس روانہ ہوئی تو ساتھ بیٹھے رشید کو نیند کے جھوکے آنے لگے۔ سب سو رہے تھے اور میری بھی ڈرائیور کو آنکھ لگ گئی۔ میں اس وقت بیدار ہوا جب محسوس ہوا کہ بس رکی ہوئی ہے۔ یہ کینیڈا کی امیگریشن کا آفس تھا۔ اب ہم بارڈر پر رکے ہوئے تھے بلکہ بارڈر کراس کر کے کینیڈا میں داخل ہو چکے تھے۔

سب مسافر ایک ایک کر کے نیچے اتر رہے تھے۔ میں سیٹ سے اٹھا تو رشید بھی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا۔ ”کہیں کینیڈا امیگریشن والے مجھے واپس ہی نہ کر دیں؟“

میں نے پہلی طرح اسے تسلی دی۔ ہم نیچے اترے تو ہمیں اپنا سارا سامان بھی ساتھ اندر لے جانا تھا۔ رات کے شاید دو بجے ہوں گے۔ سردی اپنے اپنے جوبن پر تھی۔ حالانکہ مارچ کا مہینا شروع ہو گیا تھا مگر ان علاقوں میں بہار اپریل کے آخر یا مئی میں آتی ہے۔

ہم ایک لائن میں کھڑے تھے اور ڈرائیور بیج باکس

جنید بن عبدالرحمان

جنید بن عبدالرحمان ایک نامور سپہ سالار اور والی۔ جنید کو ہشام نے 105ھ/724ء میں بڑے عظیم پاک و ہند کے ان مسلم مقبوضات کا جنہیں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا والی مقرر کیا۔ یہ مقبوضات 96ھ/711ء سے 94ھ/713ء میں فتح کیے گئے تھے۔ جنید 110ھ/729ء تک سندھ کا گورنر رہا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں کئی مرتبہ فوج کشی کی۔ جنید نے کیراج کے راجا کے خلاف فوج کشی کی جو مجبور ہو کر فرار ہو گیا اور اس طرح کئی شہر جنید کے ہاتھ آئے۔ 110ھ/729ء میں جنید کو گورنری کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ اس وقت تک جنوبی ہند کی سب سے بڑی مسلمان گجرات کے اندر تک اور مشرق کی جانب مالوہ کی سرزمین تک یعنی وسطی ہند تک پہنچ چکے تھے۔ جنید شمال میں غزوں کے علاقے تک پہنچا نیز چین کی ایک باجی اور ریاست کا ایک شہر اور قلعے پر بھی قابض ہو گیا۔ 111ھ/730ء میں جنید خراسان کا والی مقرر کیا گیا۔ بعد میں اسے باور انہر کی طرف بھیجا گیا تاکہ اس کی حالت کو درست کر سکے۔ جو ترکوں کے حملوں کی وجہ سے ناقابل اطمینان ہو گئی تھی۔ نیز اس اشرس بن عبداللہ سلمی سابق والی خراسان کی مدد کرنا بھی مقصود تھی جو ترکوں سے برسرا پیکار تھا۔ چنانچہ جنید ایک فوج کے ساتھ بخارا میں اشرس کی فوج سے جاملاد اور ترکوں سے کئی لڑائیاں لڑیں اور زمان کے مقام پر

میں نے اپنی جانب سے خوشگوار اور ہوشیار بننے کی کوشش کی تھی۔ اصولی طور پر رشید کو میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ وہ امیگریشن بھگتا چکا تھا اگر مجھے کوئی چیز چھانی ہوئی تو میں اسے وہ سامان دے سکتا تھا۔ رشید چھپتا ہوا اس کی جانب چلا گیا اور میں لائن میں رہنے لگا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد میں آفس میں داخل ہوا تو بس کا آخری مسافر تھا۔

میں نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ رکھی اور ایک ڈیسک پر امیگریشن آفیسر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ آفیسر اٹھا اور دو مرتبہ بھی میری جانب بڑھے وہ میرے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ ایک نے بڑی تہذیب سے کہا کہ اس میز پر اپنا سارا سامان رکھ دوں۔ میں نے سامان رکھا تو دوسرے نے کہا۔ ”اپنی ساری جیبوں میں جو کچھ ہے وہ بھی نکال کر میز پر رکھ دوں۔“

میں اپنے ساتھ اس خصوصی سلوک پر حیران تھا کہ یہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ بہر حال میں نے جیکٹ اور پینٹ کی ساری جیبوں کو کھنگالا اور ساری چیزیں جو ان میں موجود تھیں، میز پر رکھ دیں۔ میرا ہتھوڑا اور معلوم نہیں کیا کچھ تھا وہ اب اسے اپنے قبضے میں کر چکے تھے۔

میں ذرا اسامٹ بنا اور ان سے کہا۔ ”کیا یہ سب صرف میرے ساتھ ہو رہا ہے یا سب کی ایسے تلاش لی گئی ہے۔“ ان میں سے ایک آفیسر نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

سے ہمارا سامان نکال رہا تھا۔ میرا سامان اس نے وزن کی وجہ سے بے دلی سے نکالا۔ رشید کے پاس ایک چھوٹا بیگ تھا جو اس نے سیٹ کے اوپر رکھا تھا اور اب وہ اسے پکڑے امیگریشن کی لائن میں سب سے آگے کھڑا تھا۔ دور سے مجھے اشارہ کیا کہ اس کے لیے دعا کروں۔

میں نے سامان لیا اور گھینٹا ہوا لائن میں لگ گیا۔ کچھ مسافر میرے پیچھے کھڑے تھے۔ جب لائن آگے بڑھی تو میں اپنا سامان اٹھا تا اور دو قدم بڑھ کر پھر زمین پر رکھ دیتا۔ میرے پیچھے کے مسافر میری وجہ سے چہروں سے پریشان لگے۔ میں انہیں سہولت دینے کی خاطر اپنا سامان لے کر سب سے پیچھے لائن میں جا کھڑا ہوا۔

میں پیچھے کھڑا تھا کہ میں نے رشید کو سب سے پہلے واپس نکلتے دیکھا۔ اس نے وکٹری کا نشان بنایا ہوا تھا اور خوشی خوشی میری جانب اس طرح آیا کہ جیسے کرکٹ ورلڈ کپ کا کپتان وہ تھا۔ مجھے آ کر اپنی خوش خبری سنائی کہ اسے کینیڈا میں داخلگی کی اجازت مل گئی ہے۔ میں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور اس سے گرم جوشی سے ہاتھ بھی ملایا۔ اتنے میں امیگریشن آفس کی کھڑکی کے شیشوں سے ایک آفیسر مجھے ہاتھوں کا چھپا اپنے چہرے کے گرد بنا کر مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہنس کر اس کو اشارہ کیا اور کہا۔ ”فکر نہ کرو، میں اسے اپنا سامان نہیں دے رہا ہوں۔“

انہیں شکست دی۔ خراسان واپس آ کر جنید نے طхарستان پر حملہ کیا لیکن اسے جلد ہی وہاں سے ماورائے نہر کے لیے واپس آنا پڑا جہاں اسے سرقد کے حاکم سورۃ بن حرا تیسوی کی مدد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جنید نے دریائے جیحون عبور کر کے کش سے سرقد جانے کے لیے پہاڑی راستہ منتخب کیا لیکن جب وہ الشعب نامی گھاٹی میں پہنچا تو صفد، شاش اور فرغانہ کے لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ماری گئی۔ جنید نے یہاں سے سورۃ کو پیغام بھیجا کہ وہ سرقد چھوڑ کر اس کی مدد کے لیے آجائے چنانچہ سورۃ جنید کی مدد کے لیے رواں ہو گیا لیکن جیسا کہ وہ اس بات کا نتیجہ جانتا تھا۔ ترکوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ سورۃ خود اس لڑائی میں مارا گیا اور اس کی فوج بھی اس لڑائی میں ختم ہو گئی۔ جنید الشعب سے نکل کر سرقد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے چار ماہ تک صفد میں قیام کیا اور یہیں سے اس نے بخارا کو جس کا ترکوں نے محاصرہ کر رکھا تھا، بچانے کے لیے قطن بن قیسہ کی مدد کے لیے ایک فوج تیار کی اور بالآخر طوطیس کے قریب ترکوں کو شکست دے کر بخارا میں داخل ہوا۔ 116ھ 736ء کے آغاز میں خلیفہ نے اسے واپس بلا لیا کیونکہ وہ جنید سے اس بنا پر ناراض ہو گیا تھا کہ اس نے خلیفہ کے باغی یزید بن مہلب کی بیٹی فاصلہ سے شادی کر لی تھی۔ خلیفہ نے اس کی جگہ عاصم بن عبد اللہ کو خراسان کا والی مقرر کیا لیکن ابھی عاصم راستے ہی میں تھا کہ جنید مرو میں ایک بیماری سے انتقال کر گیا۔

مرسلہ: نوازش علی، استور، بلوچستان

”یہ ہم پر منحصر ہے کہ کس کی چھان بین کس طرح سے کریں۔“

میں خاموش ہو رہا۔

میرا سارا مال انہوں نے رکھ کر اب میرے بیک کھولنا شروع کر دیے۔ ایک بیک میں ساری کتابیں تھیں جو طارق نے مجھے فارما سسٹم کے امتحان کے لیے دی تھیں۔ اس کو ایک سائیڈ پر رکھا اور دوسرا بیک کھولا۔

پاکستان میں جب ہمیں کسی میڈیسن کی ضرورت پڑتی ہے تو ہم سیدھا میڈیکل اسٹور پر جاتے ہیں اور اس سے کوئی بھی دوا بغیر ڈاکٹر کے نسخے کے خرید سکتے ہیں۔ کینیڈا اور امریکا میں ایسا نہیں ہو سکتا اگر آپ کا گلابی خراب ہے تو پہلے آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے گا۔ وہاں ایک دو گھنٹے انتظار کر کے اپنا معائنہ کروا کر اس سے نسخہ لیتا ہوتا ہے۔ پھر آپ فارمیسی جاتے ہیں جہاں پر آپ کے کوٹائف لیے جاتے ہیں۔ انہیں کمپیوٹر میں ڈالا جاتا ہے۔ پھر میڈیسن کا لیبل پرنٹ ہوتا ہے اور دوائی ایک وائل میں ڈال کر اس پر لیبل لگایا جاتا ہے۔ پھر فارما سسٹم سے چیک کرتا ہے اور آخر میں اگر آپ کے پاس میڈیسن کی انشورنس نہیں ہے تو ہماری قیمت ادا کر آپ وہ میڈیسن حاصل کر پاتے ہیں۔ اسی طرح فارمیسی میں بھی کم از کم آدھ گھنٹا اور آپ کا لگ جاتا ہے۔ یہ ایک لمبا گورکھ دھندا ہوتا ہے اور اکثر لوگ پاکستان سے اپنے لیے اینٹی بائیوٹک اور دوسری بخار اور نزلہ کی دوائیں

ساتھ لے آتے ہیں۔ میں آیا تو میرے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک بار میرا لگہ خراب ہوا اور میں پورا دن ضائع کرنے کی بجائے گھر میں بخار سے تپتا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی انشورنس تو تھی مگر میڈیسن کی نہ تھی۔ ایک عام اینٹی بائیوٹک کے لیے پندرہ بیس ڈالر مجھے ادا کرنا گوارہ نہ تھا۔ یہاں آپ کو ہلکا بخار بھی ہو جائے تو پورا دن میڈیسن لینے میں لگ جاتا ہے۔

جب میں طارق کے پاس اس کی فارمیسی گیا تو اس سے کہا کہ مجھے کچھ اینٹی بائیوٹک اور بروفین کی گولیاں دے دے۔ پہلے تو وہ خاموش ہوا اور پھر کہا۔ ”ٹھیک ہے، لے جاتا۔ میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔“ میرے لیے اس کا انتظام یہ تھا کہ کمپیوٹر وائل میں ڈالنے تھے اور مجھے پکڑا دینا تھا۔ طارق فارمیسی میں اپنے کمپیوٹر پر بیٹھا اسٹاک مارکیٹ چیک کر رہا تھا تو میں نے کچھ اینٹی بائیوٹک اور درد بخار کے لیے بروفین کی گولیاں ایک بڑی وائل میں ڈالیں اور پھر ان دو وائلز کو اپنے ہینڈ بیک میں ڈال دیا تھا۔ اس کے علاوہ طارق سے میں نے کیلشیم اور وٹامنز کے دو بھرے ڈبے بھی لے لیے کیونکہ ان کے لیے ڈاکٹر کے نسخے کی ضرورت نہ تھی۔

اور اب ایک امیگریشن آفیسر اپنے ہاتھ میں دونوں بغیر لیبل کی وائلز اور دو ڈبے لیے کھڑا تھا۔ مجھ سے پوچھا۔

”یہ میڈیسن کس کی ہیں۔“

میں نے یہی جواب دینا تھا کہ میری ہیں۔ میرا

جواب سنا اور کہا۔ ”ان پر لیبل کیوں نہیں ہے؟“ اس کا میرے پاس جواب نہ تھا اور اسی لیے خاموش کھڑا رہا۔
ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ضرور پوچھیے۔“

انہوں نے کہا کہ یہاں نہیں آفس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

پھر مجھے اور میرے سامان کو ایک کیمین میں شفٹ کر دیا گیا جہاں ایک میز پڑی تھی اور پیچھے ایک بڑی کرسی رکھی تھی۔ مجھے میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا دیا گیا اور خود غائب ہو گئے۔ میں اطمینان سے بیٹھا تھا کیونکہ مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس تک نہ تھا۔ مجھے صرف یہی فکر تھی کہ کہیں میری بس نہ چلی جائے۔

پھر چار امیگریشن اور کسٹم کے آفیسر کیمین میں آئے۔ ایک جو عہدے میں برتر تھا، وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور باقی تین میں ایک میرے پیچھے اور دو کیمین کی دیوار سے لگے مجھے تیر نظروں سے گھورنے لگے۔ میں پریشان ہوا مگر زیادہ نہیں ہوا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”آپ جلدی سے بات کریں، کہیں میری بس نہ نکل جائے؟“

کیمین کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے ایک آفیسر نے جواب دیا۔ ”بس کی فکر نہ کرو، وہ کہیں نہیں جانی۔“
میں بھی مطمئن تھا کہ یہ اتنے ترقی یافتہ ملک ہیں اور یہاں بس اپنے مسافر کو چھوڑ کر کبھی جاسکتی ہے۔

میں نے پچھلے دنوں اپنی فیملی کو اسپانسر کیا تھا۔ ایک پیپر پر اسپانسر کرنے کے لیے جن جن دستاویزات کی ضرورت پڑتی ہے، ان کی فہرست لکھی تھی۔ جن میں لکھا تھا پاسپورٹ، برتھ سٹوفیکٹ، آئی ڈی کارڈ اور بہت سے قانونی کاغذات کا نام درج تھے۔ ایک آفیسر میرے بنوے میں سے نکلے چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے اس کاغذ کو پڑھنے کے بعد پوچھا۔ ”یہ لسٹ آپ نے اپنے پاس کیوں رکھی ہوئی ہے۔“

میں نے وجہ بتائی کہ اپنی فیملی کو اسپانسر کرنا تھا اور یہ ان سب کاغذات کی لسٹ میں نے اپنی سہولت کے لیے بنائی تھی۔ یہ بتا کر میں ایک بار پھر مطمئن ہو گیا۔

مجھے میز کے سامنے کرسی پر بیٹھنے ان کے پاس نے جو کچھ کہا اسے سن کر تو جیسے میرے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یہ کہہ رہا تھا۔ ”آپ

میڈیسن اسٹڈنگ کے الزام میں زیر حراست ہیں اور ہم نے آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔“ پھر چھٹی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ اگر جواب نہ دیتا چاہیں تو اپنے وکیل کو فون کر کے بلا سکتے ہیں۔“

زیر حراست اور وکیل کاسن کر میں ایک دم سے شاک میں آ گیا۔ مجھے کوئی اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ میڈیسن کو بارڈر کے پار لانا غیر قانونی بھی ہو سکتا ہے۔ اور خاص کر جب لیبل بھی اس پر موجود نہ ہو۔ ان ملکوں میں بغیر لیبل کے میڈیسن اپنے ساتھ رکھنا بھی سخت ممنوع ہے۔

کچھ دیر تو میں منہ کھولے سکتے میں بیٹھا رہا۔ اب مجھے خلافت آنا شروع ہوئے۔ ایک تو میں نے ڈرائیور سے امریکن امیگریشن والوں کی تلاش اور بار بار کی تلاشی کے بارے میں اپنے تحقیقات کا اظہار کیا تھا۔ دوسرا میں نے لائن میں کھڑے ہو کر رشید سے بات کی تھی اور پھر شیشوں سے جھانکتے امیگریشن آفیسر کے ساتھ اسمارٹ بننے کی کوشش کی تھی۔ ڈرائیور نے بس روک کر سب سے پہلے انھیں میرے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ یہی تو وہ مجھے شیشے سے جھانک کر دیکھ رہے تھے اور میں نے خوش دلی سے کہا تھا کہ فکر نہ کرو، میں اپنا سامان اسے نہیں دے رہا ہوں۔ اسی طرح سے میں اپنے لیے گڑھے کھودتا چلا گیا تھا۔ میری ان ہی حرکات کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اب میں پریشان حال بیٹھایہ سن رہا تھا کہ میں زیر حراست ہوں اور چاہوں تو اپنا وکیل بلا سکتا ہوں۔

مجھے اب حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اگر مجھے وہ چارج کر دیتے تو اس کے نتیجے میں کوئی سزا ہوئی تو کینیڈا سے ڈی پورٹ ہونا لازمی تھا۔ ادھر میں تین دن بعد ہی ہمسال کی جاب جوائن کرنے والا تھا۔ اگر یہ مجھے اپنے پاس رکھ لیتے تو وہ جاب تو ہاتھ سے دیے ہی گئی تھی۔ جاب سے زیادہ مجھے ڈی پورٹ ہونے کا خدشہ تھا۔

میں خاموش بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ سامنے والا آفیسر بولا۔ ”اگر تم ہمیں مطمئن نہ کر سکتے تو تم سیدھا ہولڈنگ سینٹر جاؤ گے اور پھر واپس اپنے ملک کو ڈی پورٹ کر دیے جاؤ گے۔“ یہ سن کر تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ جس ہولڈنگ سینٹر میں، میں جاب کرتا تھا اور اب وہاں قیدی بن کر جاؤں گا۔ گرتام اور باجوہ سمیت سب مجھے ایک قیدی کے روپ میں دیکھ کر کیا سوچیں گے؟ کچھ بھی سوچیں وہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا مگر میں کس طرح سے ان کے

میں نے تیزی سے بہت کچھ سوچا۔ وہ سب میری

جانب عقاب نظر میں رکھے کھڑے تھے۔ میں نے پہلے کہا
”مجھے ایک گلاس پانی چاہیے۔“

میں کچھ سوچنے کا وقت مانگ رہا تھا۔ ایک آفیسر پانی
پینے چلا گیا۔ میں خاموش بیٹھایا سوچ رہا تھا کہ اب جواب
کیا دوں؟ اگر یہ کہتا کہ طارق نے یہ میڈیسن دی ہے تو اس
پر نزہہ کر سکتا تھا اور حقیقت بھی یہ نہ تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ
جی ہاں یوں گا، بھلے کچھ بھی ہو جائے۔ ایک بات بعد میں یہ
سکھئی کہ ان ملکوں میں پہلے تو زیادہ نہ بولو اور جب بھی بولو تو
جی ہاں بولو۔ سچ یہاں کیا ہر جگہ پر اپنی قوت ظاہر کرتا ہے۔

میں نے آٹھ گھنٹہ کی آنکھوں کے سامنے پانی کی بوتل
ساری کی ساری پی۔ دل میں کچھ آیات کا ورد کیا۔ اپنے جسم
کو ڈھیلا چھوڑا اور دماغ میں چلتی خدشوں کی آگندگی کے
آگے اللہ کے بھروسے پر خود اعتمادی کا بند باندھا اور ریلیکس
ہو کر سامنے آفیسر سے کہا۔ ”پہلے تو میں کوئی وکیل نہیں بلاؤں
گا اور آپ نے جو کچھ پوچھا ہے وہ سچ سچ بتاؤں گا۔ پھر جو
آپ کی مرضی آئے وہی کرتا۔“

میری آنکھوں میں ایک دم اٹھتی خود اعتمادی کو دیکھ کر
سامنے بیٹھا آفیسر حیران ہو رہا تھا۔ میں اب مسکرا رہا تھا۔ پھر
اپنی نظریں اس آفیسر کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ آنکھوں میں
آنکھیں ملا کر بات کرنے کا سبق ویکلم ٹو کینیڈا والی کتاب
سے ملا تھا۔

اس نے گہرا سانس لیا اور سوالات کی بھرمار شروع کر
دی۔ پاکستان سے شروع ہوا اور کرید کرید کر پوچھنے لگا کہ
کہاں پیدا ہوئے۔ کتنے بہن بھائی ہیں۔ وہاں کیا کرتے
تھے اور کینیڈا کب آئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے
بارے میں سب معلومات کمپیوٹر سے نکال کر سامنے رکھے
بیٹھا ہے۔ میں نے وہی کہا جو مجھے از رہا تھا۔ کیونکہ امیگریشن
کے فارم کو بھرتے ہوئے میں نے سو مرتبہ اسے پڑھا ہوگا۔
اور وہ میرے بارے میں سوالات کر رہا تھا جن کو مجھ سے
بہتر کوئی اور نہ جانتا تھا۔

پھر سوال کیا کہ امریکا کیوں اور کس کے پاس گیا تھا۔
میں نے وجہ بتائی کہ کزن سے ملنے گیا تھا کیونکہ وہ اور میں
بھی یہی چاہتا تھا کہ اپنی نئی جاب شروع کرنے سے پہلے
اس کے پاس چکر لگاؤں۔ وہ کہنے لگا کہ تم فارماسسٹ ہو
اور تمہیں ہی معلوم نہیں کہ بغیر نسخے کے تم نے اپنے کزن کی

مصری سائنسدان

کا منفرد کارنامہ

جاپان میں خدمات انجام دینے والے ایک
مسلمان مصری سائنسدان ڈاکٹر شریف الصنحی نے
ماحول، پانی اور مٹی سے تابکاری کو علیحدہ اور ختم
کرنے کی ٹیکنالوجی ایجاد کر کے ایٹمی ترقیات کے
شعبے میں اہم کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وہ دنیا کے
پہلے سائنسدان ہیں جنہوں نے اس گراں ترین اور
مشکل ترین کام کو اپنی ٹیم کے ساتھ صرف چند مفتوں
میں مکمل کر کے ایٹمی ٹیکنالوجی کی دنیا میں انقلاب
برپا کر دیا ہے۔ (بحوالہ: ”فیلی“ 28 اگست تا 3
ستمبر 2011ء)

فارمیسی سے بچانے کے کپسول Amoxil کے لے آئے۔
میں نے کہا کہ میں پاکستان میں فارماسسٹ تھا، جہاں کسی
فارمیسی پر کوئی بھی میڈیسن لینے کے لیے نہ تو نسخے کی
ضرورت ہوتی ہے اور نہ فارمیسی کو فارماسسٹ ملازم رکھنے
کی کوئی قانونی ضرورت ہے۔

میری اس بات پر وہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے ممکن
ہے؟

میں نے کہا کہ مجھے کینیڈا آئے زیادہ وقت نہیں ہوا۔
ہم جاب کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں۔
میڈیسن اتنی مہنگی ہیں کہ میری جیب انہیں خریدنے کی
اجازت نہیں دیتی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا کہ
مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ ایک عام سے ایٹمی بائیونک
کپسول کے لیے مجھے ڈاکٹر سے نسخے کی ضرورت ہوگی۔
اگر مجھے اس بات کا ذرا بھی ادراک ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ
میں اسے اپنے ساتھ لیے پھرتا۔ میں نے اپنی تقریر جاری
رکھی اور کہا کہ میں تو بہت سے خواب لے کر کینیڈا آیا تھا۔
ڈھائی سال اپنی امیگریشن کا انتظار کیا کہ یہاں اپنی زندگی
سنے انداز سے شروع کروں گا۔ پھر اپنے بچوں کو بلاؤں گا
اور یہ کیسے ممکن ہے کہ میں جان بوجھ کر ایسی سنگین غلطی کرتا
جس کا نتیجہ یہاں سے ڈی پورٹ ہونا تھا۔ میں اپنی کرسی پر
ذرا سا آگے کھسکا اور اپنے دونوں بازو میز پر رکھے اور بولا
”آفیسر کیا آپ نے اپنی زندگی میں انجانے میں کوئی غلطی
نہیں کی ہوگی؟ اگر کی ہوگی تو کیا آپ کو ایسی سزا دی جانی

کہ آپ اور آپ کی فیملی کا مستقبل تباہ ہو جاتا تو کیا یہ انصاف ہوتا؟“

پھر میں نے اس سے سوال پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بندہ جس کے پاس ماسٹر کی ڈگری ہو اور تین دن بعد اس نے اپنی جاب چھوڑ کر کرنی ہو اور وہ ان میڈیسن کے لیے اپنے پورے مستقبل کو داؤ پر لگا دے گا؟ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا بیسویس سال کا اپائنٹمنٹ لیٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔

میں نے شروع میں اپنے پڑھنے والوں سے کہا تھا کہ میں نے بے خیالی میں آکر بیسویس سال والوں سے کہا تھا کہ مجھے کل لیٹر چاہیے اور دوسرے دن میں خود جا کر لے آیا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ یہ لیٹر مجھے کس مصیبت سے بچائے گا؟

آفسر نے وہ لیٹر دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا۔ اسے سوچتے دیکھ کر کہا۔

”آفسر، یہ ایک انسانی غلطی (Human Error) ہے اور آپ بھی اسے اسی طرح لیں تو آپ کو میری بات سمجھ میں آجائے گی۔“ یہ سب میں بڑے اعتماد کی حالت میں کہہ رہا تھا۔ جب کچھ وقفہ اتنا تو دل ہی دل میں کلام پاک کا درود شروع کر دیتا۔

ایک بات پر میں خود حیران ہو رہا تھا کہ میری انگلش بولنے کی صلاحیت ایک دم کیسے بڑھ گئی ہے۔ مجھے اب ایسا لگ رہا ہے کہ میں اپنی صفائی میں اس دن کوئی بھی زبان روانی سے بول لیتا اگر اس کی ضرورت پڑتی۔

پھر میرا کتابوں سے بھرا ایک کھولا گیا۔ اس میں وزنی کتابیں تھیں۔ میں نے کہا۔ ”یہ کتابیں پڑھ کر مجھے اپنا امتحان پاس کرنا ہے۔“ پھر میز پر رکھی کپسول کی وائل کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ”جو شخص میرٹ پر کینیڈا کی ایمریشن لے اور اس کے سامنے ایک شاعر مستقبل ہو اور وہ اپنے بچوں کو بھی اسپانسر کر چکا ہو تو وہ کس طرح چند کپسول جانتے بوجھتے بارڈر پراسسنگ کرنے کا سوچ سکتا ہے؟“

وہ بھی بال کی کھال اتارنے پر تھکا۔ اسے سوالات کرتے اور مجھے جوابات دیتے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میری جس چلی گئی ہوگی۔ وہ اب میری ڈائری اور ایس آئی لینڈ کے وہ کاغذات لیے بیٹھا تھا جن کو سر جی وہاں کی انتظامیہ سے

میرے کسی تھیس کا حوالہ دے کر ان سے لے آئے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”یہ امریکن ایمریشن کے اسٹے سارے پیپر ز کیوں ساتھ لیے پھر رہے ہو۔“

دراصل ہر قانون نافذ کرنے والے کی پہلی تربیت ہو یہی ہوتی ہے کہ ہر چیز کو پہلے شک کی نظر سے دیکھے۔ وہ بھی اپنی تربیت کے عین مطابق وہی کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا ”میں آگے چل کر کینیڈا اور امریکا کی ایمریشن پر کتاب لکھنا چاہتا ہوں، اسی لیے ان کی لائبریری سے یہ نوٹس کا پی کر والا ہوں۔“

میرا جواب سن کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ہم نے تمہیں ڈی پورٹ کر دیا تو تم ہمیں بھی اپنی کتاب میں رگیدو گے۔“

میں نے کہا۔ ”ہرگز نہیں! بلکہ یہ لکھوں گا کہ میں نے غلطی کی اور مجھے اس کی سزا ملی۔“

یہ سن کر اس کے چہرے کا تناؤ کم ہوتا گیا اور پہلی بار مسکراہٹ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھی۔ آس پاس کھڑے دوسرے آفسر بھی مسکرانے لگے۔

پھر مجھ سے پوچھنے لگا ”اگر تمہیں معلوم تھا کہ اس طرح سے میڈیسن بارڈر کے پار لے جانا جرم ہے تو تم کیا پھر بھی لے آتے۔“

اس کے سوال میں میں بھی شرارت تھی اور میں نے جواب بھی ایسے ہی دیا۔ ”پہ تو ایسے ہی ہے کہ میں پہاڑ کے اوپر کھڑا ہوں اور آگے کھاتی ہے۔ پھر کوئی مجھ سے کہے کہ کھائی میں چھلانگ لگانے سے تم فوت بھی ہو سکتے ہو، کیا تم پھر بھی اس کھائی میں چھلانگ لگاؤ گے؟“

یہ سن کر سب نے مل کر ایک بلند ہتھکڑیا لگایا اور پھر ماحول میں چھایا تاؤ اللہ اللہ کر کے ٹوٹا۔ اب مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس مصیبت سے میری جان چھوٹ جائے گی مگر اس نے میری امیدوں پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا۔ ”میں تو تمہارے سوالات سے مطمئن ہوں مگر یہاں پولیس کا آفسر بھی آ رہا ہے اور اگر تم اس کو مطمئن کر سکو تو ہم تمہارے بارے میں کچھ اچھا سوچ سکتے ہیں۔“

میں نے دل میں کہا کہ اس ڈھائی گھنٹے کی تفتیش سے جو میں نے حاصل کیا ہے، کہیں وہ مٹی میں نڈل جائے۔ مگر اس نے بڑے اچھے انداز میں کہا۔ ”نو پرابلم.....“ لیکن میں اندر سے دوبارہ دہل گیا تھا۔

(باقی آئندہ)



فلم ساز

کاشف زبیر

امریکی شہر ہالی ووڈ فلم سازی کے لیے اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس شہر کے ایک معروف ہدایت کار کا عکس زیست جو تابش آفتاب و تابیدہ ماہ کامل تھا۔ اس نے بہت کم فلمیں بنائیں لیکن اس کی فلمیں کامیابی کی ضمانت ٹھہریں۔

وہ حوادث کا منہ موڑنا جانتا تھا اور یہی بات کامیابی کی ضمانت ٹھہری

سام میس اپنے دفتر میں آرام کرسی پر جھول رہا تھا۔ ان دنوں اس کے پاس سوائے آرام کرسی پر جھولنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس کے ساتھی بلکہ اس سے کہیں جونیئر بھی ان دنوں اس طرح مصروف تھے کہ ان کے پاس سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ ان دنوں کوئی فلم ساز اور ہدایت کار اپنے دفتر میں نہیں پایا جاتا تھا سوائے سام میس کے۔ سام ایک فلم ساز و ہدایت کار تھا اور اس کا شمار انڈسٹری کے چوٹی کے لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ بیس سال پہلے

بہ حیثیت نائب ہدایت کار سے ہالی ووڈ کے اس بڑے فلم ساز ادارے اور اسٹوڈیو میں ملازم ہوا تھا۔ دو سال تک وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا اور اس دوران میں اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا سوائے چند چھوٹی چھوٹی فلموں میں تیسرے درجے کی ہدایت کاری کرنے کے جن میں اس کا نام بھی نہیں آیا تھا۔

پھر اسے چانس ملا ہوا یہ کہ ایک درمیانے درجے کی فلم کا ہدایت کار شوٹنگ کے دوران ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ کئی مہینے تک اس کے دہاں سے نکلنے کے امکانات نہیں تھے۔ ادارے کے کرتا دھرتا پریشان تھے کہ اب اس فلم کا کیا کریں جو تیس فی صد مکمل بھی ہوئی تھی اور تکمیل کے بعد اسے دوسرے زائد تھیزز میں ریلیز ہونا تھا۔

کوئی یہ خاص فلم نہیں تھی اور اس کا شمار ان فلموں میں ہوتا تھا جو محض خانہ پوری کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ تاکہ نئے فن کاروں اور فلم ساز عملے کی جانچ ہو جائے اور نیا ٹیلنٹ بھی سامنے آتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ ادارے کے چار ہزار سے زیادہ مووی تھیزز میں ریلیز کرنے کے لیے مناسب تعداد میں فلمیں موجود ہوں۔ اس قسم کی فلموں کے فلاپ ہونے سے عام طور سے ادارے کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ ان فلموں کی لاگت کو ہمیشہ نقصان والے لکھا توں میں جگہ ملتی ہے۔ لیکن یہ اتنی غیر اہم بھی نہیں ہوتی ہیں کبھی بھی ان میں سے کوئی فلم غیر متوقع طور پر غیر معمولی کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ پھر ان کا تیار ہو کر ریلیز ہونا بھی لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے ادارے کے مالکان بہر صورت اس فلم کی تکمیل چاہتے تھے۔ بڑے ہدایت کاروں نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ درمیانے درجے کے تمام ہدایت کار بے حد معروف تھے اس لیے قرعہ فال سام کے نام نکلا۔

سام خوشی سے اچھل پڑا تھا کہ اسے کوئی کام تو ملا۔ لیکن جب اس نے فلم کا اسکرپٹ اور اس کی شوٹ ہونے والی ریلیس دیکھیں تو اس کی خوشی ماند پڑ گئی۔ یہ ایک اچھے موضوع کو لے کر بنائی جانے والی نہایت بکواس فلم تھی۔ اسکرپٹ میں ہی اس کا حلیہ بگاڑ دیا گیا تھا اور ریسی سٹی کسر شوٹ میں پوری کردی تھی تھی۔ بے شک سام نے اب تک کوئی فلم نہیں بنائی تھی لیکن اسے اتنا تو معلوم تھا کہ ایک اچھی فلم کیسی ہوتی ہے۔ یہ خراب سے بھی آگے کی کوئی فلم تھی

اور اسے بنانے کا مطلب تھا سام آغاز میں ہی اپنے نام کو بٹا لگا لیتا۔ جو تیس سال کی عمر میں اس کے پاس ترنی کے لیے بہت وقت تھا اور اسے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی کہ وہ اس فلم کے ساتھ برا آغاز کرتا۔ لیکن وہ ادارے کے مالکان کو انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ڈپلومی سے کام لیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اسے فلم میں اپنی مرضی سے تبدیلیاں کرنے کی اجازت دی جائے۔ نیز وہ اسکرپٹ بھی نئے سرے سے لکھوائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا جائے گا لیکن اس وقت اسے حیرت ہوئی جب اس کے تمام مطالبات مان لیے گئے۔ اصل میں ادارے کے ایک بڑے نے سام کے اندر چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے سام کے مطالبات دیکھے اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی اس فلم کے لیے یہی شرائط عاید کرتا ورنہ انکار کر دیتا۔ اس لڑکے میں صلاحیت ہے اس لیے میں اس کی حمایت کروں گا۔“

یوں سام کے مطالبات مان لیے گئے۔ لیکن جب اس نے فلم شروع کی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس نے ایک جنجال اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔ فلم میں سب ہی دوسرے درجے کے اداکار تھے جن کو اداکاری نہیں آتی تھی۔ تکنیکی عملہ اور سامان تیسرے درجے کا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اسے جو اسکرپٹ رائٹر ملا تھا۔ وہ سرے سے کسی بھی درجے میں نہیں آتا تھا۔ اس نے اتنے اچھے خیال پر اتنا واہیات اسکرپٹ لکھا تھا کہ سرپیٹ لینے کو دل چاہتا تھا۔ جب سام نے اسے سمجھایا کہ اسے اسکرپٹ کس قسم کا چاہیے تو اس نے ترمیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اسکرپٹ تبدیل کیے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ اب سام کے پاس اس کے سوا اور کوئی حل نہیں تھا کہ اسکرپٹ خود لکھے۔ اس نے آستینیں جڑھاں اور اپنے ٹائپ رائٹر میں جت گیا۔ اس وقت ان کو کمپیوٹر فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ وہ سارا دن دفتر میں اسکرپٹ لکھنے کے ساتھ وہ فلم کے اداکاروں اور تکنیکی عملے سے بھی سر کھپاتا رہتا تھا۔ وہ شوٹنگ کے آغاز سے پہلے ان کا کام ان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں اسے کچھ دشواری پیش آرہی تھی کیونکہ وہ نو آموز تھا اور یہ دوسرے درجے کے اداکار و تیسرے درجے کا تکنیکی عملہ بھی اسے اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ سارا دن ان سے سرمارنے کے بعد وہ شام کو اسکرپٹ اپنے ساتھ لے جاتا اور ایک ٹھنڈا کلاس موٹیل کے

کمرے میں رات گئے تک اس پر کام کرتا جہاں وہ ہالی ووڈ آنے کے بعد سے ٹھہرا ہوا تھا۔

دن رات محنت کر کے اس نے پہلے اسکرپٹ مکمل کیا اور پھر اس کے مطابق شوٹنگ کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھی اسے اہمیت نہیں دے رہے تھے لیکن جب اس نے پہلا سین شوٹ کیا اور اس کا نتیجہ پردے پر دیکھا گیا تو سب ہی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ ایک نواآموز ہدایت کار نے پہلا ہی سین بہت اچھا شوٹ کیا ہے۔ یہ کسی بھی بڑے ہدایت کار سے کم معیار کا کام نہیں تھا۔ اداکاروں نے اسکرپٹ پر غور کیا تو ان کو کہانی میں جان نظر آئی اور انہوں نے اپنی اداکاری میں جان مارنا شروع کر دی کیونکہ فلم بہت ہو جاتی تو وہ سب ہٹ ہو جاتے۔

ادارے کے بڑوں نے سام کی ایک بات نہیں مانی تھی۔ اس نے فلم کا بجٹ بڑھانے کا مطالبہ کیا تھا اسی مطالبے پر اسے بتایا گیا کہ اسے اسی بجٹ میں فلم تیار کرنی ہے اور سابق ہدایت کار جو خرچ کر چکا تھا وہ بھی نہیں ملے گا یعنی اسے مزید ٹینک فی صدمہ بجٹ ملا تھا اور اس میں فلم کی تیاری بہت مشکل تھی۔ لیکن سام نے اس بات کو مسئلہ بنانے کی بجائے کام شروع کر دیا۔ توقع کے عین مطابق ابھی نصف شوٹنگ ہوئی تھی کہ بجٹ ختم ہو گیا۔ اس نے اوپر والوں کو اطلاع کر دی کہ بجٹ ختم ہو گیا ہے اب جب تک مزید رقم نہیں ملے گی شوٹنگ ممکن نہیں ہے۔ اس پر اس کی طلبی ہو گئی اور اس سے کہا گیا کہ اس نے اب تک جو کچھ شوٹ کیا ہے وہ بھی ساتھ لے کر آئے۔

سام ریلوں کے ڈبے بغل میں دبائے ڈائریکٹرز کے پاس پہنچ گیا جو اس کی گوشمالی کے لیے تیار تھے۔ سب نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور اسے بہت کچھ سنتا پڑا تھا۔ وہ منتہا رہا جب انہوں نے اپنی بات ختم کر لی تو سام نے اٹھ کر پروجیکٹر پر اپنی نامکمل فلم کی ریل لگا دی۔ فلم شروع ہوئی۔ پہلے ہی منظر سے اس نے مینگ ہال میں موجود تمام افراد کو متوجہ کر لیا۔ یہ کوئی ایک گھنٹے کی مووی تھی اور اس میں آواز اور ساؤنڈ منسکٹ بھی نہیں تھی۔ بلکہ اب تک انٹنلٹس بھی نہیں ڈالے گئے تھے۔ اس کے باوجود فلم کا ایک ایک سین دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک گھنٹے تک کسی نے آواز بھی نہیں نکالی تھی البتہ جب فلم اچانک ادھوری ختم ہو گئی تو ایک ڈائریکٹر نے اعتراض کیا۔ ”باقی فلم کہاں ہے؟“

”باقی فلم کے لیے ہی تو بجٹ کی ضرورت

ہے۔“ سام نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس کے بعد بجٹ کی منظوری میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اور اگلے روز سے سام نے شوٹنگ شروع کر دی۔ مقررہ وقت پر تکمیل کے بعد جب فلم کی ریلیز کا مرحلہ آیا تو اسے بی کے بجائے اے کی ٹیکری دے دی گئی اور اسے بہترین ٹیکریز میں ریلیز کیا گیا۔

فلم نے شاندار کامیابی حاصل کی اور اس سے منسلک افراد راتوں رات پیرا سٹار بن گئے۔ سام کو فلم کی کامیابی پر صف اول کے ہدایت کاروں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں نے سب کو چونکا دیا تھا اور ادارے والے اب اس سے کام لینے کے لیے بے چین تھے۔

ٹیکساس کے ایک چھوٹے سے قصبے سے اٹھ کر ہالی ووڈ میں کامیابی حاصل کرنا کسی دیوانے کے خواب سے کم نہیں تھا۔ سام نو عمری سے ہدایت کار بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا جب کہ اس کا زمیندار باپ چاہتا تھا کہ وہ فلم نگری کے خواب دیکھنا چھوڑ دے اور گریجویٹیشن کر کے اس کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن سام اپنی ذہن کا پکا تھا اس نے باپ کے دباؤ پر گریجویٹیشن کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا سوسٹ کیس اٹھایا اور گھر سے رخصت ہو گیا۔ اس کی جیب میں معمولی سی رقم تھی۔ لیکن اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے وہ محنت مزدوری کرنے کو بھی تیار تھا۔ پھر اسے سچ سچ دو سال ہالی ووڈ میں محنت مزدوری کر کے اپنا گزرا کرنا پڑا تھا تب کہیں جا کر اسے اس فلم ساز ادارے میں ملازمت ملی تھی۔

سام کو فوری طور پر کسی نئی فلم کے آغاز کا کہا گیا لیکن اس نے ادارے کے مالکان پر واضح کر دیا کہ وہ اس طرح سے فلم سازی نہیں کرے گا۔ جب تک اسے کسی اچھی فلم کا خیال نہیں سوجھ جاتا۔

وہ اب ان لوگوں کی مجبوری بن گیا تھا اس لیے وہ سام کے جواب کو کڑوا کھونٹ سمجھ کر پی گئے اور صبر سے انتظار کرنے لگے کہ کب سام ان کو کوئی دوسری فلم تیار کر کے دیتا ہے۔ صف اول کے ہدایت کار فلم ساز بھی ہوتے تھے اور وہ اپنی اگلی فلم خود منتخب کر کے اوپر والوں سے صرف اس کی منظوری لیتے تھے۔

سام نے اگلی فلم بنانے میں دو سال لگا دیئے اور اس نے خوب چھان پھینک کر ایسا موضوع لیا جس پر پہلے کم ہی فلمیں بنی تھیں اور اس نے اسے اس طرح بنایا کہ یہ اس کی

سے نکل گئی۔

ان کے درمیان کیا ہوا تھا اس کا کسی کو علم نہیں تھا کیونکہ نہ تو نیٹ نے اور نہ ہی سام نے کبھی اس بارے میں اپنی زبان کھولی تھی۔ دونوں ہی اندر کی باتوں کو پنی گئے تھے۔ خود کو قماش بنانے سے گریز کیا تھا۔

اس کے بعد سام نے کئی سال تک کسی عورت سے راہ و رسم بڑھانے سے گریز کیا۔ حالانکہ اس کے قرب کی خواہش مند عورتوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور ان میں نامور سلی بریٹز بھی شامل تھیں۔ سام اپنے کام میں مگن رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی فلمیں بنانے کا قائل نہیں تھا۔ وہ عام طور سے دو سال میں جا کر ایک فلم مکمل کرتا تھا۔ کسی فلم سے فارغ ہونے کے بعد وہ پہلے نئے آئیڈیے کی تلاش کرتا تھا اور پھر اسے اپنے ذہن میں پکا کر رہتا تھا۔ جب وہ پوری طرح تیار ہو جاتا تو اسے اسکرپٹ کی صورت میں لاتا تھا۔ پہلی فلم کے بعد وہ اسکرپٹ بھی خود تیار کرنے لگا تھا البتہ معاونت کے لیے وہ ادارے کے کسی اچھے اسکرپٹ رائٹر کو ساتھ رکھ لیتا تھا۔

سام کی تیسری اور پھر چوتھی فلم بھی بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ اس کی کامیابی کے بعد سام کا شمار آل ٹائم گریٹ ڈائریکٹرز میں ہونے لگا تھا۔ اس کی تیسری فلم پر اسے آسکر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا اور اسے بہترین ہدایت کاری پر یہ اعزاز ملا تھا۔ چوتھی فلم کے بعد وہ چھٹیاں گزارنے آسٹریلیا چلا گیا اور وہاں کئی مہینے تک مقیم رہا تھا۔ آسٹریلیا سام کا پسندیدہ ملک تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ مستقبل میں یہیں رہائش اختیار کرے گا لیکن فی الحال تو وہ ہالی ووڈ سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

اپنی پانچویں فلم کے لیے اس نے زیادہ ہی وقت لگا دیا تھا اور اس بار اس نے تیس سال بعد اگلی فلم کا آغاز کیا۔ حسب معمول اس کا آئیڈیا اور اسکرپٹ بھی اسی کا تھا۔ اب تک سام واقعات پر فلمیں بناتا آیا تھا پہلی بار اس نے ایک کردار لیا اور یہی اس کا تخلیق کیا ہوا تھا۔ اس کا کردار ایسا دس ماسٹر تھا جو صرف دوسروں کے کام آسکتا تھا۔ اگر وہ اپنے لیے کوئی خواہش کرتا یا کوئی ایسی خواہش کرتا جس میں اس کا مفاد بھی ہوتا تھا تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ دس ماسٹر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو کوئی خواہش کرتا ہے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔ مغربی کا کس میں ایسے کئی کردار تھے۔ لیکن سام کا تخلیق کیا ہوا دس ماسٹر پیگ منفرد تھا۔ اس

پہلی فلم سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئی تھی جب کہ اس کی پہلی فلم ابھی تک بزنس کر رہی تھی۔ سام کی شہرت، عزت اور مرتبے میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ دوسری فلم نے پوری کردی اور اس پر دولت کی بارش ہو گئی۔ اگرچہ اسے پہلے ہی شاعرانہ تنخواہ کے ساتھ ادارے کی طرف سے مراعات بھی مل رہی تھیں لیکن اس فلم میں اسے منافع میں بھی حصہ ملا تھا اور وہ دوسری فلم سے ملینیر بن گیا تھا۔

سام اب تک کرائے کے مکان میں رہتا آ رہا تھا۔ دولت ہاتھ آئی تو اس نے بیوری ہلز میں جہاں چوٹی کے فن کاروں کے گھر تھے ایک عالی شان ولا خرید لیا۔ اس کے پاس وہ سب آگیا تھا جس کی ہالی ووڈ میں خواہش کی جاسکتی ہے۔ اس کے پاس بہترین گاڑیاں تھیں اور عورتیں اس کے آس پاس منڈلانے لگی تھیں۔ ان میں پرانی اداکارائیں بھی تھیں اور ابھرتی ہوئی اداکارائیں بھی۔ وہ جانتی تھیں کہ سام ایک ایسا فلم ساز تھا جو ایک ہی فلم میں ان کو آسمان کی بلندیوں تک لے جاسکتا تھا۔

سام نے پہلی محبت ایک اداکارہ سے کی تھی۔ نیٹ پارس نامی یہ اداکارہ صرف حسین و جمیل ہی نہیں بلکہ بے حد ذہین بھی تھی اور اس کی ذہانت کا اندازہ تو اس بات سے بھی لگایا جاسکتا تھا کہ اس نے سام کو اپنی محبت پر قائل کر لیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ نظر آنے لگے اور اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے گھر میں پائے جاتے تھے۔ سام نے ہالی ووڈ کے رواج کے برعکس اپنی محبت چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے ایک صحافی سے کہا۔ ”ہم ٹیکساس والے کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے۔ ہاں میں نیٹ سے محبت کرتا ہوں۔“

شادی کے معاملے میں دونوں ہی سنجیدہ نہیں تھے۔ نیٹ سام کی طرف آئی تو اس کا خیال تھا کہ سام اسے اپنی آنے والی فلم میں کاسٹ کرے گا۔ لیکن جب سام نے ایک سال بعد تیسری فلم کا آغاز کیا تو نیٹ اس میں نہیں گئی۔ ایک سوال کے جواب میں سام نے بڑی سادگی سے اس کی وضاحت کر دی۔ ”اس فلم میں کسی کردار کے لیے نیٹ موزون نہیں ہے اس لیے وہ اس فلم میں نہیں ہے۔“ جب یہ خبر شائع ہوئی تو سام اور نیٹ کے تعلقات میں پہلی دراڑ آئی۔ اس کے باوجود یہ تعلقات جاری و ساری رہے تھے۔ ان کا خاتمہ اس وقت ہوا جب سام نے اپنی اگلی فلم میں بھی نیٹ کو نہیں لیا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی

فاس

مراسش کا ایک شہر اور سلطان کا مقام سکونت۔ آبادی دولاکھ سے زائد۔ محل وقوع انتہائی اہم اور شاندار ہے۔ فاس درحقیقت دو شہروں پر مشتمل ہے۔ فاس الجدید (نیا شہر) اور فاس البالی (پرانا شہر) فاس الجدید سرکاری دفاتر کا شہر ہے۔ صرف دارالحکومت ہی نصف سے زیادہ شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ دارالحکومت ان عمارتوں اور احاطوں کا مجموعہ ہے جہاں حکومت مراسش کے مرکزی دفاتر واقع ہیں۔ وزراء دفاتر اور کوشک سلطانی بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ محلات ہیں، جہاں سلطان اپنے کنبے کے ساتھ سکونت رکھتا ہے اور جو راہنی سبز رنگ کے ٹائلوں کی چھتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کے لیے ایک مخصوص کوشک، شاہی چٹیا گھر، اسلحہ خانہ اور باغات ہیں۔ متعدد مساجد ہیں، جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر مسجد جامع، جامع احمر اور جامع اخضر ہیں۔ یہ مساجد اپنے میناروں کے رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ فاس الجدید، دراصل فاس البالی کا ایک ذیلی قصبہ ہے۔ فاس البالی کا نقشہ نئے شہر کی نسبت بہت متنوع اور دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ یہ شہر دیائے فاس کی تنگ وادی کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مکانات، مساجد اور باغات ان پہاڑیوں کی ڈھلوان چٹانوں پر واقع ہیں جو وادی کی گزرگاہ کو اس فاصل تک گھیرے ہوئے ہیں جو چٹانوں کے پستوں پر بنالی گئی ہے۔ فاس صرف اپنے محل وقوع کی خوبصورتی کی اہمیت کی بدولت بھی سارے مغرب یادگاروں کی امتداد میں معروف ہے۔ یہاں مختلف شاہی خاندان یکے بعد دیگرے سر پر آرائے سلطنت ہوئے۔ اور انہوں نے ہمیشہ اس قسم کی یادگاروں سے شہر کو مالا مال کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ شہر میں تمام سلسلوں کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی آٹھ سو چاس مذہبی عمارتیں، مساجد، مدرسے، عبادت خانے، زاویے یا معبد ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ کے مقبرے کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔

مرسلہ: سلطان محمد، کویت

کے دشمن اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسے ایسی خواہشات پر مجبور کرتے ہیں جن سے اسے نقصان اور دشمن کو فائدہ ہو۔ لیکن بینگ اپنی ہمت اور بہادری سے دشمن پر حاوی آجاتا ہے۔ سام کی یہ فلم اس کی سابقہ تمام فلموں سے زیادہ کامیاب رہی تھی اور فلم بین بینگ کے کردار کے دیوانے ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بینگ برانڈ کی درجنوں اشیاء مارکیٹ میں آگئیں۔ اس کامیابی کو دیکھتے ہوئے ادارے کے مالکان نے بینگ کے کردار پر فلم کی سیریز بنانے کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ سام کے دل کو لگا تھا اور فلم کی کامیابی نے بھی اسے اسکیا تو اس نے فوراً ہی بینگ کی اگلی فلم کی تیاری شروع کر دی۔

بینگ کا ہیرو ایک معمولی سا اداکار تھا لیکن سام نے بھانپ لیا کہ وہ بینگ کے کردار میں یوں فٹ ہوگا جیسے انگوٹھی میں گنبد۔ یہ ایک معصوم صورت اور بھولا بھالا نوجوان ہوتا ہے جسے اس کے دشمن چالاک بناتے ہیں۔ سام نے بینگ کو عام لوگ کرداروں کے برعکس معاشرے کا حصہ دکھایا جو ہر اس مسئلے سے دوچار ہوتا ہے جو ایک عام آدمی کو پیش آتے ہیں۔ وہ صرف خواہش کرنے کے معاملے میں دوسرے انسانوں سے منفرد ہے اور اسی بات نے بینگ کو مقبول عام بنا دیا۔ بینگ کا کردار ادا کرنے والا اداکار ایک ہی فلم سے دنیا بھر میں جانا پہچانا بن گیا تھا۔

سام نے پہلی فلم میں کوئی ہیروئن نہیں ڈالی تھی لیکن دوسری فلم میں اس نے ایک نئی لڑکی کو متعارف کرایا۔ یہ ایک سماجی کارکن تھی اور بینگ کی پرستار بھی تھی۔ بینگ کا دشمن نئے انداز میں سامنے آتا ہے اور وہ لڑکی کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ خود لڑکی کو بھی پتا نہیں چلتا ہے۔ وہ آخر میں بینگ پر قاتلانہ حملہ کرتی ہے اور بینگ مرنے والا ہو جاتا ہے۔ وہ خواہش کر کے اپنی جان بھی نہیں بچا سکتا تھا کیونکہ اس کی ایسی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی جو اس کی ذات کے بارے میں ہو۔ اس موقع پر پھر بینگ کی ذہانت کام آتی ہے۔ ہیروئن بینگ پر قاتلانہ حملہ کر کے پشیمان ہے اور رو رہی ہے۔ تب بینگ خواہش کرتا ہے کہ لڑکی جو خواہش کرے وہ پوری ہو جائے۔ لڑکی خواہش کرتی ہے کہ بینگ ٹھیک ہو جائے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یوں بینگ ایک بار پھر اپنی ذہانت سے اپنے دشمن کو شکست دے دیتا ہے۔ یہ فلم پہلے سے بھی زیادہ کامیاب رہی تھی۔ بینگ اب فلم بین طبعی کی جان بن چکا تھا۔

کا کردار بہت کم تھا جب کہ ربیکا اب ایسی اداکارہ بن گئی تھی جس کو لے کر خاص کردار تخلیق کیے جاتے تھے۔ لیکن سام نے اسے پیش کش ضرور کی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق ربیکا نے انکار کر دیا۔

ربیکا سے تعلق نہ تو سام نے چھپایا اور نہ ربیکا نے البتہ انہوں نے ان افواہوں کو مسترد کر دیا کہ وہ چھپ کر شادی کر چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے تھے لیکن انہوں نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سام کا خیال تھا کہ ابھی ربیکا کے کیریئر کا آغاز تھا اور اسے شادی وغیرہ کے چکر میں پڑے بغیر اپنے کام پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

سام خود بھی بینگ پریسری فلم جلد بنانا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس کی کہانی کو اتنا جاندار کھنا چاہتا تھا کہ دیکھنے والے اسے پہلی دو فلموں سے کسی طرح بھی ہلکا نہ پائیں۔ اس سلسلے میں اس نے آسٹریلیا جانے کا فیصلہ کیا جہاں وہ تمام جھیلیوں سے آزاد ہو کر صرف کہانی پر غور کر سکے۔ ابھی وہ آسٹریلیا میں تھا کہ ٹائن ایون کا واقعہ پیش آ گیا اور ساری دنیا میں بھونچال آ گیا تھا۔ امریکا پر حملہ غیر معمولی تھا اور اس واقعے نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خود سام اتنا پریشان ہوا تھا کہ اس نے کچھ عرصے کے لیے کہانی پر کام ملتوی کر دیا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ سب معمول پر آتا چلا گیا۔ سام نے بھی اپنی کہانی پر کام مکمل کیا اور امریکا واپس آ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ ادارے کے مالکان سے منظوری لے گا اور فلم پر فوری کام شروع کر دے گا۔ لیکن جب اس نے اپنی کہانی مالکان کے سامنے رکھی تو انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ اس کے بجائے انہوں نے سام سے کہا کہ وہ بینگ پر عالمی دہشت گردی کے حوالے سے کوئی کہانی بنا کر اسے فٹائے۔ سام نے وجہ دریافت کی تو اسے جواب ملا۔ ”اس وقت ہمیں مورل سپورٹ کی ضرورت ہے۔“

سام کو حیرت ہوئی کہ دنیا کی واحد سپر ہیرو کو بھی مورل سپورٹ کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا۔ ”تھیک ہے امریکیوں کو مورل سپورٹ کی ضرورت ہے لیکن میرا کردار صرف امریکا کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک یونیورسل کریکٹر ہے۔“

”اس وقت امریکی بن کر سوچو۔“ اسے مشورہ دیا گیا۔

سام نے اس کی کوشش کی لیکن وہ خود کو قائل نہیں کر

فلم کی شوٹنگ کے دوران سام ہیر وٹن ربیکا کے خاصا قریب آ گیا تھا۔ حالانکہ وہ صرف بیس سال کی تھی اور سام اب بیس کا ہونے والا تھا لیکن دونوں میں ذہنی ہم آہنگی تھی اس لیے وہ جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ فلم کی تکمیل کے دوران سام کے مخالفوں نے اس پر الزام لگایا کہ اس نے ربیکا کو بھرتی کیا ہے اور اس میں اس کا اپنا مفاد ہے۔ جب شوٹنگ کے دوران سام اور ربیکا قریب آئے تو ان الزامات میں شدت آ گئی۔ سام نے میڈیا پر اسے ہل شٹ قرار دے کر اس بارے میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ربیکا سو فی صد میرٹ پر آئی ہے اور جب فلم ریلیز ہوئی تو سام کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ ربیکا نے فلم میں غیر معمولی اداکاری کی تھی اور پہلی ہی فلم نے اسے پراسرار بنا دیا تھا۔

سام نے سیریز کی دوسری فلم کی کامیابی کے بعد فیصلہ کیا کہ ابھی وہ آرام کرے گا۔ جب کہ ادارے کے مالکان اور ربیکا کا اصرار تھا کہ وہ جلد از جلد بینگ پریسری فلم بنائے کیونکہ ابھی یہ کردار مقبول تھا اور نئی فلم بھی کامیاب ہوتی۔ لیکن سام کا کہنا تھا کہ اتنی جلدی وہ فلم بنا کر اپنے کردار کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔ جب تک اس کے ذہن میں کوئی بہترین آئیڈیا نہیں آجاتا وہ نئی فلم کا آغاز نہیں کرے گا۔ اس کے جواب نے مالکان اور فلم کے لوگوں کو مایوس کیا تھا۔ ربیکا اور بینگ کا کردار ادا کرنے والا اداکار ہیلر دوسری فلموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی کامیابی کی وجہ سے فلم سازان پر ٹوٹ کر گرے تھے۔

ربیکا کی مصروفیات بڑھیں تو سام اور اس کا ملنا جلنا کم ہو گیا لیکن ان کا تعلق اور اس کی نوعیت برقرار تھی۔ ربیکا نے دوسری فلموں میں بھی کامیابی حاصل کی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مالی ووڈ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ بن گئی تھی۔ اس وجہ سے میڈیا کی توجہ کا مرکز بھی بن گئی اور آئے دن اس کا نام کسی نہ کسی اداکار کے ساتھ لے کر خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ شروع میں تو وہ پریشان ہو گئی تھی لیکن سام نے اسے تسلی دی کہ یہ معمول کی بات ہے اور سلی ریٹیز بننے کی قیمت بھی ہے اس لیے وہ پریشان نہ ہو۔ سام کو اس پر اور اس کی محبت پر پورا اعتماد تھا۔ سام نے ربیکا کی کامیابی کو اس کی صلاحیتوں کی مرہون منت قرار دیا۔ اس نے ربیکا پر دباؤ نہیں ڈالا تھا کہ وہ بینگ سلسلے کی تیسری فلم کے لیے بھی کام کرے کیونکہ اس فلم میں اصل کردار بینگ کا تھا، ہیر وٹن

سکا۔ اس نے مالکان کو جواب دے دیا۔ ”میں اپنے کردار کو تبدیل نہیں کر سکتا۔“

”تب ہمیں اس کی مزید ضرورت نہیں ہے۔“

سام مایوس ہوا تھا کیونکہ اس نے کہانی پر بہت محنت کی تھی اور اب موقع تھا تو یہ مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ جلد اسے معلوم ہو گیا کہ ادارے والوں کی حب الوطنی نے جوش نہیں مارا تھا بلکہ فلم ساز اداروں کو حکومت کی طرف سے حکم آیا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ فلمیں تیار کر کے عوام کا ذہن بنائیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس موضوع پر تواتر سے فلمیں سامنے آنے لگی تھیں۔ سام نے شروع میں اس بارے میں کچھ سوچا نہیں تھا لیکن جیسے جیسے وہ حالات دیکھتا رہا اسے اپنے حکمرانوں کی پالیسیوں سے اختلاف ہونے لگا۔ وہ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے پورے ملک کو استعمال کر رہے تھے۔

سام کو ایک فلم کا خیال آیا۔ یہ جنگ کے موضوع پر طنزیہ فلم تھی۔ کیونکہ بینگ والی کہانی مسترد ہو گئی تھی اس لیے اس نے اس خیال پر کام شروع کر دیا اور بڑی عرق ریزی کے بعد اسکرپٹ مکمل کر کے ادارے کے کرتا دھرتا کو پیش کیا۔ لیکن اس کا اسکرپٹ پھر مسترد کر دیا گیا۔ عملہ اسکرپٹ اس کے منہ پر دے مارا گیا۔ ادارے کے ایک مالک جو عرف عام میں بگ برادر کہلاتا تھا اس نے اسکرپٹ کی فائل سام کی طرف بھیجی۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟“

”یہ ایک فلم کا خیال ہے۔“

”ہمیں اس قسم کی فلموں کی ضرورت نہیں ہے۔“ بگ برادر نے غر کر کہا۔

”میرے خیال میں ضرورت ہے۔“ سام نے اصرار کیا۔ ”کیونکہ لوگ پریشان ہیں ان کو تفریح کی ضرورت ہے۔“

”لوگوں کو کس چیز کی ضرورت ہے تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ تم کسی جنگی موضوع پر کام کرو جس میں ملک کے مفاد کو اجاگر کیا گیا ہو۔“

”ایسی فلمیں تو آج کل درجنوں کے حساب سے بن رہی ہیں۔ خود ہم ایسی کم سے کم تین فلموں پر کام کر رہے ہیں۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔“

”سوری بگ برادر میں تقریبی فلمیں بناتا ہوں

پروپیگنڈہ فلمیں نہیں۔“ سام نے انکار کر دیا۔

”تب تم جا کر آرام کرو۔“

جلد سام کو اندازہ ہو گیا کہ اسے صرف مشورہ ہی نہیں دیا گیا تھا بلکہ اسے آرام کرانے کا بندوبست بھی کر لیا گیا تھا۔ اس کے پاس فی الحال کوئی فلم نہیں تھی اور اس کے دو آئیڈیئے مسترد کیے جا چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد سام نے ایک رومانی اور حساس کہانی کا اسکرپٹ تیار کر کے منظوری کے لیے پیش کیا جسے پڑھے بغیر ہی مسترد کر دیا گیا کیونکہ اسے جتنی جلدی مسترد کیا گیا تھا اسے پڑھنے کے لیے اس سے دو گنا وقت درکار تھا۔ تب سام سمجھ گیا کہ اسے اس کے انکار کی سزا دی جا رہی ہے۔ اس نے مزید کسی آئیڈیئے پر کام کرنے کے بجائے بہتر سمجھا کہ اپنے تیار اسکرپٹ کے لیے کوئی سرمایہ لگانے والا تلاش کرے۔ اگرچہ وہ ادارے کا ملازم تھا لیکن اسے نجی طور پر کام کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ یہ شرط کہ وہ ادارے کی سرگرمیوں میں غلط نہ ڈالے۔ وہ فارغ تھا اس لیے اس چھوٹے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

لیکن جب سام نے ہالی ووڈ میں آزادانہ کام کرنے والے سرمایہ کاروں سے رجوع کیا تو ان میں سے کبھی کسی نے اسے لفٹ نہیں کرائی۔ حالانکہ وہ سب جانتے تھے کہ سام کس پائے کا فلم ساز ہے اور اس کی بنائی کوئی بھی فلم ناکام نہیں ہوتی ہے۔ یہ وہی سرمایہ کار تھے جو اس کے آگے پیچھے کھومتے تھے اور فلم بنانے کے عوض اسے منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار رہا کرتے تھے۔ اب وہ اسے انکار کر رہے تھے اور ظاہر ہے ان کے انکار کے پس پشت سام کے پاس بگ برادر کا ہاتھ تھا۔ ورنہ کوئی بھی سرمایہ کار کم سے کم بینگ کی فلم میں سرمایہ کاری سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر سام بیٹھ گیا تھا۔ وہ اب استعفا دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ادارے والے اسے خالی ہٹھا کر ذلیل کر رہے تھے اور وہ اس دوران میں سوائے کھیاں مارنے کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ یہاں سے جان چھڑائے گا تو اسے کسی اور اسٹوڈیو کی طرف سے پیش کش ہوگی۔ فیصلہ کر کے اس نے استعفا دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی جب اس نے استعفا بگ برادر کے سامنے رکھا تو اس نے سر دلچھ میں کہا۔ ”اس کا مطلب جانتے ہو؟“

”نہیں۔“ سام نے جواب دیا۔

”اب تم ہالی ووڈ میں کوئی کام نہیں کر سکو گے۔“

”تم بگ برادر ضرور ہو لیکن گاؤں فادر نہیں ہو۔“ سام نے طنز کیا۔ ”میں کہیں نہ کہیں کام حاصل کر لوں گا۔“
”اگر کر سکو تو ضرور کر لیتا؟“ بگ برادر نے طنز یہ انداز میں کہا اور اس کا استعفا منظور کر لیا۔

سام نے کوشش کی کہ اسے کسی اور ادارے میں ملازمت مل جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن اس وقت اسے دھچکا لگا جب اس کی درخواستوں کا کہیں سے جواب نہیں آیا۔ اس کے میجر نے ہر ممکن کوشش کر لی لیکن کوئی مستند فلمی ادارہ اسے رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ میڈیا میں بھی اس کے حق میں کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کے بارے میں خبریں ضرور آتی تھیں کہ سام نے اسٹوڈیو سے استعفا دے دیا یا سام کی فلاں اسٹوڈیو میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش ناکام رہی لیکن ان میں اس کے لیے ہمدردی کا عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔ خبر براے خبر ہوتی تھی۔
پھر ہالی ووڈ کے جنٹی جنون میں جتلا کر وہ اس کے خلاف مہم شروع کر دی اور اس پر الزام لگایا کہ امریکا سے کمانے اور عزت و شہرت حاصل کرنے کے بعد وہ ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔

سام نے ان الزامات کی تردید کی اور وضاحت کی کہ وہ صرف حکمرانوں کی پالیسیوں کے خلاف ہے جو ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کی وضاحت نہ تو کسی نے سنی اور نہ ہی اسے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ اس پر پیکنگڈ مہم کے ذرائع رائے عامہ بھی اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ کئی بار سام کے گھر کے سامنے لوگ پلے کارڈ اٹھا کر کھڑے ہو گئے جن میں اسے ملک کا عدا اور دشمن تک قرار دیا گیا تھا۔

سام کے لیے یہ مشکل وقت تھا اور اس کے پاس سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اس معاملے میں جتنا بھی بولے گا اور وضاحتیں پیش کرے گا وہ سب اس کے خلاف جائیں گی۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ خاموشی سے ملک کے اس جنونی دور سے گزر جانے کا انتظار کرے۔ سام کو آخری فلم بنائے ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے۔ اس کے بعد اسے کوئی فلم بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس کے لوگوں میں برداشت کا مادہ نہیں ہے۔ سارتر نے فرانسیسی ہوتے ہوئے بھی الجوزا کی تحریک آزادی کی حمایت ہی نہیں کی تھی بلکہ وہ

اسے ملک سے لڑا بھی تھا اس کے باوجود کسی نے اسے خدا قرار نہیں دیا بلکہ اس دقت کے صدر ڈیگال نے اس عظیم فلسفی کی گرفتاری کے مشورے پر حیرت سے کہا تھا کہ کیا میں فرانس کو گرفتار کر لوں۔ سارتر فرانس ہے اور میں پورے فرانس کو گرفتار نہیں کر سکتا۔ اور یہاں سام کو عدا قرار دیا جا رہا تھا۔

سام کے جاننے والے اور فلمی دنیا کے ساتھی رفتہ رفتہ اس سے دور ہونے لگے۔ انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ سام سرکاری عتاب میں آیا ہوا ہے اور اس کے قریب جانے والے یا اس سے ہمدردی رکھنے والے ہر شخص کا انجام سام جیسا ہی ہو سکتا تھا۔ سام کا خیال تھا کہ شاید ربیکا اس سے یہ سلوک نہیں کرے گی لیکن اسے دھچکا لگا جب ربیکا بھی اس سے دور ہونے لگی۔ سب کی طرح ربیکا کو بھی اپنا کیرئیر عزیز تھا۔ لیکن اس نے دوسروں کی طرح منافقت کرنے کے بجائے سام سے صاف کہہ دیا۔ ”سام میں اب تم سے نہیں مل سکتی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ سام نے جواب دیا۔ ”یہ تمہارے کیرئیر کا سوال ہے اور مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔“

”میں ساری عمر تمہاری شکر گزار رہوں گی۔“ ربیکا نے انفرنگ سے کہا۔ ”بیری بزدلی پر مجھے معاف کر دینا۔“
ربیکا نے جرات کر کے اپنی بزدلی کا اعتراف کر لیا تھا لیکن سام کے دوسرے جاننے والوں کو جواب اس سے منہ چھپائے پھرتے تھے اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس سے اعلانیہ قطع تعلق کر لیتے۔ استنف کے بعد سام زیادہ تر گھر میں وقت گزارنے لگا تھا۔ کبھی کبھی کسی فلمی تقریب میں شرکت کر لیا کرتا تھا جہاں کیمروں کے سامنے تو فلم والے اس کا گرم جوش سے استقبال کرتے تھے لیکن آف دی کیمرا ان کا رویہ ویسا ہی تھا۔ دوسری محبت میں ناکامی نے اسے تنہائی پسند بنا دیا تھا اور وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ قوم کا جنٹی بخارا ترنے لگا اور حقائق منظر عام پر آئے تو لوگوں میں ایک مخالف جذبہ نظر آنے لگا۔ اس کا اثر ہالی ووڈ کی انڈسٹری پر بھی پڑا تھا اور اب جنگ کے خلاف بھی فلمیں بننے لگیں۔ اگرچہ یہ بڑی محدود اور مختاطم کی فلمیں تھیں جن میں ڈھکے چھپے انداز میں جنگ کے منفی پہلو کو سامنے لایا گیا تھا۔ فارن بائیٹ نائن الیون جیسی فلمیں کم تھیں اور ان کو بھی فچر فلم کے بجائے ڈاکو میٹری کا درجہ

اسے قرض کے لیے بات کرنے میں آسانی رہتی۔ اس نے اپنے گھر پر فلمی میڈیا کی ایک پریس کانفرنس رکھ لی۔ اگرچہ اس نے زیادہ صحافیوں کو نہیں بلایا تھا صرف گئے چنے لوگ تھے لیکن ان میں سے بھی کم ہی آئے تھے۔ مشکل سے ایک درجن افراد تھے اور یہ سب وہ تھے جو سام سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن محل کر اپنی ہمدردی کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ بات ان کے اخبارات اور چینل والوں کو گوارا نہیں تھی۔ سام نے فلم کے مختصر سے خیال کے ساتھ ان کو بتایا کہ وہ اس فلم کو خود بنانا چاہتا ہے اور اسے فنانسنگ کی تلاش ہے۔ ایک صحافی نے سوال کیا۔

”کیا فلم کا خیال برانا نہیں ہے؟“

”کوئی خیال نیا نہیں ہوتا ہے۔“ سام نے جواب دیا۔ ”دیکھنا یہ چاہیے کہ اس خیال کی ضرورت ہے یا نہیں ہے۔“

”تمہارے خیال میں اس کی ضرورت ہے؟“

”بالکل ہے آج کی دنیا چھوٹی ہوئی جا رہی ہے۔ گلوبل وچ کا سب سے زیادہ شور مچاتے ہیں اور اتنی زحمت نہیں کرتے ہیں کہ اپنے پڑوسی کے گھر جھانک کر دیکھ لیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔“ سام کا لہجہ کسی قدر تنگ ہو گیا تھا۔

”فلم کے لیے تم نے اپنے پرانے دوستوں سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

سام مسکرایا۔ ”اگر پرانے دوست کچھ کرنے کے لیے تیار ہوتے تو کیا میں اس وقت اپنے گھر میں پریس کانفرنس کر رہا ہوتا۔“

سام کی یہ پریس کانفرنس میڈیا میں نمایاں جگہ تو حاصل نہیں کر سکی تھی لیکن اس نے بالکل ضرور مچا دی۔ بہت سارے لوگ جو سام کو ریڈیٹر سمجھ چکے تھے ان کو پتا چلا کہ سام میں ابھی دم خم ہے اور وہ ان کے مقابلے پر آ سکتا ہے خاص طور سے بگ برادر کاروینہ منشی تھا اس نے سام کے ارادے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔“

سام نے اشتہاری تکنیک استعمال کی اور بگ برادر کے بیان کے جواب میں ایک صحافی کو بیان دیا۔ ”حیرت ہے ستر سال کا بگ برادر چالیس برس کے سام کو ماضی کا حصہ قرار دے رہا ہے۔ حالانکہ وہ خود ماضی میں جی رہا ہے اور اسے بدلتی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ مجھے یقین ہے چند سالوں میں بگ برادر کو حیرت کے کئی جھٹکے لگیں گے۔“

دے دیا گیا تھا۔ کسی ایک فلم میں بھی واضح نہیں تھا کہ اس ملک کے حکمران دوسرے ملکوں میں کیا کر رہے تھے۔ سام یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس کے اندر ایک لاوا سا پک رہا تھا۔

بالآخر اس کے ذہن میں ایک فلم کا خیال پختہ ہو گیا۔ اس فلم میں تیسری دنیا کے ایک فرضی ملک کا ذکر ہے جہاں قیمتی معدنیات اور قدرتی وسائل کی بہتات ہوتی ہے اور جہاں کے لوگ پسماندہ لیکن پُرامن اور انسان دوست ہوتے ہیں۔ ایک استعماری ملک اس ملک کے وسائل پر قبضے کے لیے منصوبہ بناتا ہے اور اس ملک میں انتشار پھیلا کر خانہ جنگی کروا دیتا ہے۔ پھر اس خانہ جنگی کی آڑ میں اپنی فوج اس ملک میں داخل کر دیتا ہے۔ لیکن اس ملک کے حریت پسند اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بے پناہ قربانیوں کے بعد استعماری ملک کی فوج کو اپنے ملک سے نکال دیتے ہیں۔ سام نے استعماری ملک کا نام بھی فرضی رکھا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا اگر اس نے اصل نام استعمال کیے تو اس کی کہانی بھی فلم کا روپ نہیں دھار سکے گی۔

سام کے ساتھ فلمی دنیا کی لا تعلقی برقرار تھی۔ اسے ابھی بھی کہیں سے ملازمت کی یا کسی فلم پر کام کرنے کی پیش کش نہیں ہوئی تھی۔ سام جانتا تھا وہ اس معاملے میں اکیلا ٹھکانہ نہیں تھا بلکہ اس جیسے کئی باضمیر افراد تھے جو عتاب میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو جنگ کے لیے فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب وہ بیکاری کا عذاب بھگت رہے تھے۔ سام یہ بھی جانتا تھا کہ نہ تو اسٹوڈیو اور نہ ہی کوئی فنانس اس کی فلم پر سرمایہ لگانے کے لیے تیار ہوگا اسے جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔

یہ بڑے بجٹ کی فلم تھی اور اس پر کم سے کم بیس کروڑ ڈالر زکی لاگت آتی۔ سام کا کل اثاثہ ایک کروڑ ڈالر کا بھی نہیں تھا۔ اسے لازمی فلم سازی کے لیے گیمیں سے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی۔ اس نے بینکوں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان دنوں بینکوں پر بھی بحران آیا ہوا تھا اور اسٹاک مارکیٹ کریش ہونے کے بعد بینک تیزی سے دیوالیہ ہو رہے تھے۔ لاکھوں لوگ اپنے سرے بائے سے محروم ہو چکے تھے اور دیوالیہ بینک بند ہونے سے رقم کی واپسی کی امید بھی نہیں رہی تھی۔ بحران کی وجہ سے بینکوں کے قرض دینے کی صلاحیت بھی کم ہو گئی تھی اور ان کی طرف سے شرائط سخت ہوتی جا رہی تھیں۔

سام نے پہلے فلم کا اعلان کرنا مناسب سمجھا اس طرح

کرنا پڑا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی مکمل ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ کسی اعلیٰ درجے کے اسٹوڈیو میں اس کی فلم کے لیے کوئی فلور دستیاب نہیں ہے۔ دوسرے تیسرے درجے کے اسٹوڈیوز میں جگہ تھی لیکن سام ان کے معیار سے مطمئن نہیں تھا اور نہ اس نے اس قسم کے اسٹوڈیوز میں کام کیا تھا۔ اس لیے اس نے ایک انوکھا فیصلہ کیا اس نے کینیڈا میں ایک فلم اسٹوڈیو والوں سے بات کی اور اپنی فلم کی تمام انڈور شوٹنگ وہیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی ساری کاسٹ سمیت وہاں پہنچ گیا تھا۔

یہ ایک طویل فلم تھی اور اس میں بے شمار مناظر تھے اس لیے شوٹنگ کے اسپیل بھی بڑے تھے۔ نئے اداکار لینے کا فائدہ یہ ہوا کہ یہ اداکار ہر وقت اسے دستیاب تھے۔ ایک سال میں انڈور شوٹ ختم ہوئی اور سام نے واپس آ کر فلم کے بقیہ حصوں کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن اس دوران میں ایک مسئلہ ہوا کینیڈا جا کر شوٹنگ کرنے سے اخراجات اس کی توقع سے بڑھ گئے تھے اور اب اسے فلم مکمل کرنے کے لیے مزید رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے بینک کنسورٹیم سے بات کی لیکن انہوں نے اسے مزید رقم دینے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے دو بینکوں کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ دیوالیہ پن کی طرف جا رہے تھے۔ اگر وہ دیوالیہ ہو جاتے تو سام کے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا کیونکہ اسے رقم ایک مخصوص انداز میں ملتی تھی۔ وہ بیس کروڑ ڈالرز میں سے پندرہ کروڑ ڈالرز لے چکا تھا اور ابھی مزید پانچ کروڑ ڈالرز لینے تھے جب کہ سام کو مزید رقم کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس نے شوٹنگ تیز کر دی تاکہ باقی رقم جلد حاصل کر سکے۔

لیکن قسمت کی خرابی زیادہ تیز نکلی تھی۔ ابھی دو کروڑ ڈالرز کی آخری قسط ملنا باقی تھی کہ کنسورٹیم کے دو بینک دیوالیہ ہو گئے۔ ان کے معاملات دوسرے بینکوں کے سپرد کر دیے گئے اور قسط کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ سام پریشان ہو گیا۔ فلم کی لاگت اندازے سے بڑھ گئی تھی اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا وہ ان پروڈیوسرز میں سے تھا جن کی فلموں پر ہمیشہ معمول سے زیادہ لاگت آتی تھی کیونکہ وہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتا تھا لیکن اس کی فلمیں اندازے سے زیادہ کم کر بھی دیتی تھیں اس لیے جب تک وہ بگ برادر کے لیے کام کرتا رہا اسے فنانس کا مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

ابھی فلم کا تقریباً بیس فی صد کام باقی تھا اور رقم ختم ہو چکی تھی۔ سام نے دوسرے بینکوں سے اس سلسلے میں بات کی

اس بیان نے ایک جنگ سی چیئر دی اور بگ برادر کے بہت سارے حامی بھی میدان میں آ گئے اور ان کی طرف سے سام پر تنقید کی شدید بو چھاڑ ہونے لگی تھی۔ سام ان سب کو جواب دینے کی بجائے بگ برادر کو نشانہ بناتا تھا کیونکہ اس کے خلاف اس ساری مہم کے پس پشت وہی تھا۔ بگ برادر نے سام کی فلم اور اس کے خیال کو بھی احمقانہ قرار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آج کل ایسی فلموں کی کوئی منجائش نہیں تھی۔ سام اسے برابر کا جواب دے رہا تھا اور اس جنگ کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اب لوگوں کی توجہ حاصل کر رہا تھا۔ امریکا میں کامیابی کا نسخہ یہی ہے جو لوگوں کی توجہ حاصل کرتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے۔

سام نے رقم کے لیے بینکوں سے بات چیت شروع کی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے آسانی سے رقم نہیں ملے گی کیونکہ اس کے پاس کوئی گارنٹی نہیں تھی اور رقم کی بھی تو سخت شرائط کے ساتھ ملے گی۔ لیکن وہ اس وقت کسی بھی قیمت پر قرض لینے کے لیے تیار تھا۔ اس فلم کی تکمیل اس کی زندگی کا مقصد بن گئی تھی۔ بالآخر تین بینکوں کے ایک کنسورٹیم نے اس کی فلم کے لیے رقم فراہم کرنے کی ہامی بھری لیکن وہ چاہتے تھے کہ نفع میں بھی شامل ہوں۔ سام نے اس سلسلے میں سخت مزاحمت کی کیونکہ وہ کنسورٹیم سے کمرشل ریٹ پر قرض لے رہا تھا اور انہوں نے اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ سخت شرائط کے ساتھ وہ نفع میں بھی حصے دار بننا چاہ رہے تھے۔ آخر معاملہ نفع میں پانچ فی صد شراکت پر طے ہو گیا۔

رقم ملتے ہی سام نے فلم کی تیاری شروع کر دی اور یہاں سے اس کے لیے مشکلات کا آغاز ہوا۔ اس نے فلم کے کرداروں کے لیے جن اداکاروں کا سوچ رکھا تھا انہوں نے اس کی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ فلم کے تین مرکزی کردار ہیرو، ہیروئن اور ولن تینوں نے انکار کر دیا تھا۔ اب اسے ان کرداروں کے لیے دوسرے اداکار تلاش کرنے تھے اس نے مزید کسی پرانے کو آزمانے کے بجائے نئے اداکاروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اشتہار دے کر نئے اداکار طلب کر لیے اور پھر ان میں سے تین افراد کو چن لیا۔ ان میں نئے ہونے کے باوجود اداکاری کی صلاحیت تھی۔

کاسٹ مکمل کرنے کے بعد جب اس نے ٹیکنیکی عملے کی تلاش شروع کی تو یہاں بھی اسے خاصی دشواری کا سامنا

ڈارفور کا بحران (Darfur Crisis)

سوڈان کا مغربی شورش زدہ علاقہ، مغربی
2003ء میں اس علاقے میں وہ سیاہ فام افریقی باغیوں
کے بائیں ڈارفور میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور اس
قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے باہمی تنازعہ اٹھ کھڑا
ہوا اور یہ دونوں گروپ مسلح تصادم پر اتر آئے۔ طالع
آزماعناصر نے سوڈانی حکومت کے مخالف عناصر نے
اسے عرب قبائل اور سیاہ فام افریقی قبائل کے مابین محاذ
آرائی کی کسی کیفیت پیدا کر دی اور 1989ء میں جنجاوید
(Janja Weed) تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔

دونوں قبیلوں کی باہمی لڑائی کے نتیجے میں ایک
لاکھ افراد سے زائد ہلاک ہو چکے ہیں۔ جب کہ دو لاکھ
ہمسایہ ملک چھ کے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ فریقین کے
مابین اپریل 2004ء میں جنگ بندی کا معاہدہ بھی طے
پایا تھا لیکن فریقین نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور
مصالحات کنندگان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا کیونکہ وہ
فرانس کے ساتھ کے برابر علاقے میں خورد و نوش کی اشیاء
فراہم نہ کر سکیں۔ علاقے میں خوراک کی عدم دستیابی کے
باعث وہاں کے لوگوں کا جینا مشکل ہو گیا۔ 30 جولائی
2004ء میں اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی، جس
میں سوڈان کی حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ 30 دنوں کے
اندر ڈارفور کے بحران کو حل کرے ورنہ اقتصادی
پابندیوں کے لیے تیار ہو جائے۔ سوڈانی وزیر خارجہ نے
اقوام متحدہ کی دی گئی مدت کو نا کافی قرار دیتے ہوئے کہا
کہ سوڈان کو اس سلسلے میں 120 دن درکار ہیں، کیونکہ
ڈارفور کا بحران بڑا پیچیدہ ہے، تاہم اگست 2004ء میں
سوڈانی حکومت اور اقوامی متحدہ کے مابین ڈارفور کے
بحران کے حل کے لیے لائحہ عمل کے معاہدے پر غلط
میں دستخط کر دیے۔ جس کی رو سے سوڈانی حکومت تین
دن کے اندر مہاجر کیمپوں کے علاقوں کو محفوظ بنائے گی
، تاکہ شہریوں کو خوراک اور پانی کے حصول کی سہولت
حاصل ہو سکے اور وہ کسی حملے کے ڈر کے بغیر بھیتی بازی
کر سکیں، نیز سوڈانی پولیس ڈارفور میں چوکیاں اور محاصرے
بھی قائم کرے گی اور عرب لیڈیاشا کے حملے روکنے کے
لیے پولیس اور فوج مل کر کام کر سکیں گے۔

مرسلہ: مبطلین صدیقی، شوروٹ

لیکن کئی جگہ بینکنگ قوانین کی وجہ سے انکار کر دیا گیا اور بعض
کی شرائط اتنی سخت تھیں کہ سام نے ان سے قرض لینے سے
انکار کر دیا۔ مالی مشکلات کے باوجود اس نے فلم شوٹنگ کا
کام جاری رکھا کیونکہ اس شعبے میں وہ ادائیگی موثر بھی کر سکتا
تھا۔ اس نے رقم کے لیے اپنا ولا اور اپنی گاڑیاں بیچ
دیں۔ اب اس کے پاس صرف ایک معمولی سی دین تھی۔ بد
قسمتی سے جاہلادی قیمت گر گئی تھی اور اسے ولا کی قیمت کا
صرف ستر فی صد ملا تھا۔ حالانکہ شو بزنس سے وابستہ مشہور
افراد کی رہائش گاہیں اصل سے زیادہ قیمت پر کھتی ہیں۔ لیکن
کساد بازاری نے اس شعبے کو بھی گرفت میں لے لیا
تھا۔ حاصل ہونے والی رقم بے سام نے شوٹنگ جاری
رکھی۔ فلم دو سال سے بن رہی تھی۔ جاہلاد اور گاڑیوں کی
فروخت سے حاصل شدہ رقم بھی ختم ہو گئی۔ ابھی اسے ایک
کروڑ ڈالر کی مزید ضرورت تھی اور اسے کہیں سے رقم ملنے
کے آقا نظر نہیں آرہے تھے۔

بگ برادر سے اس کی جنگ جاری تھی اور بگ برادر
نے ایک بڑے بجٹ کی فلم شروع کر دی۔ اسے اسٹوڈیو کا
ایک نامور ڈائریکٹر پروڈیوسر بنا رہا تھا۔ یہ اشارہ کی فلم تھی
اور بگ برادر کا ارادہ اسے سام کی فلم کے مقابل ریلیز
کرنے کا تھا۔ گویا وہ پوری طرح اس کی مخالفت پر اتر آیا
تھا۔ اس کی اور سام کی بیانات کی جنگ جاری تھی اور اب
بگ برادر نے ایک بیان دیا کہ اس صدی میں سام کی فلم کی
ریلیز کا کوئی امکان نہیں۔ سام نے جوابی بیان میں کہا۔
”بگ برادر فکر نہ کرے یہ فلم اس کی زندگی میں ہی
ریلیز ہوگی۔“

لیکن حقیقت یہ تھی کہ سام بہت پریشان تھا اسے ایک
کروڑ ڈالر نہیں ملتے تو اس فلم کی ریلیز ناممکن تھی اور وہ
تقریباً مکمل ہو کر بھی تھیٹر کی زینت بننے سے رہ جاتی۔ اس
نے ہر ممکن ذریعے سے کوشش کر لی تھی لیکن اسے کہیں سے رقم
نہیں ملی تھی۔ صرف ایک شخص اسے رقم دینے کے لیے تیار ہوا
تھا۔ یہ ہالی ووڈ کا ایک بڑا فن سریری ایڈورڈ تھا لیکن اس کی
شرط نا قابل قبول تھی۔ وہ فلم گروی رکھواتا چاہتا تھا اور اگر
سام مقررہ تاریخ تک اس کی رقم واپس نہ کرتا تو فلم پیری کی
ملکیت بن جاتی۔ درحقیقت پیری کو بگ برادر نے آگے کیا
تھا کیونکہ پیری اس کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ سام
اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جب کہ فلم کی شدید
ضرورت تھی۔ فلم کا کام مکمل کرنا تھا اور بہت سارے لوگوں کو

ہجرت حبشہ

جب مکہ میں کفار کے ظلم و ستم حد برداشت سے گزر گئے تو آپؐ نے حضرت جعفر بن ابی طالب کی قیادت میں اسی مرد اور عورتوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ واقعہ تاریخ میں ہجرت حبشہ کے نام سے مشہور ہے۔ جو ماہ رجب 5ھ میں پیش آیا۔ یہ دو بار ہوئی۔ پہلی بار کی ہجرت کرنے والوں کی تعداد پراخلاف ہے۔ ایک رائے میں یہ گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل ہے۔ تاہم ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ اسی طرح ہجرت اولیٰ میں دس مرد شامل تھے۔ اس میں حضرت عثمانؓ بن عفان، ان کی زوجہ محترمہ رقیہؓ حضرت ابو جہلہؓ ان کی زوجہ سہلہؓ بنت سہیل، مصعب بن نبیر، عبدالرحمان بن عوف وغیرہ شامل تھے۔ یہ دو تجارتی جہازوں کے ذریعے حبش پہنچے۔ وہاں کے بادشاہ نجاشی نے انہیں پناہ دی۔ کفار بھی ان کے پیچھے گئے اور واپسی کا مطالبہ کیا۔ نجاشی نے وفد کے قائد حضرت جعفر بن ابی طالب کو طلب کیا اور معاملہ پوچھا۔ آپؐ نے کہا ”اے بادشاہ! ہم جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، کمزوروں کے ساتھ برا سلوک کرتے، ان کا حق مارتے، خدا نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا۔ ہم اس کے حسب و نسب سے واقف ہیں۔ اس نے

ادا نیکیاں کرنا تھیں اس کے بغیر اسے فلم ریلیز کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔

سام نے ہالی ووڈ میں دفتر لینے کے بجائے ایک عام عمارت میں ایک چھوٹا سا دفتر لے لیا تھا اور وہیں سے اس

پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ فلم ختم ہونے سے سارے کام ٹھپ ہو چکے تھے اب نہ فلم کی ممکنہ ممکن تھی اور نہ ایڈیٹنگ

اور انجی انٹرنل اینٹرفیس کا کام بھی باقی تھا۔ اس روز سام

اپنے دفتر میں سر تھا۔ بیٹھا تھا اب اس کے پاس کچھ باقی

نہیں رہا تھا وہ اپنا سارا اثاثہ بھی اس فلم پر لگا چکا تھا اور اس کا

بینک اکاؤنٹ صرف کے قریب پہنچ گیا تھا اگر یہ فلم مکمل ہو کر

ریلیز نہ ہوتی تو اس کی مالی تباہی میں کوئی شبہ نہیں تھا اس کے

بعد شاید اسے واپس ٹیکس میں اپنے باپ کے فارم پر جانا

پڑتا جو آج بھی زمیندار تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو سام چونکا تھا۔ یہ ایک ہی

کمرے کا دفتر تھا اس نے آواز دی۔ ”آ جاؤ۔“

دروازہ کھلا اور بیک اندر آئی تو سام بے اختیار رکھڑا ہو

گیا۔ ”تم؟“

وہ سکرائی۔ ”ہاں میں۔“

”شاید تم میری ناکامی کا تماشا دیکھنے آئی ہو؟“

ریکارڈی سے بولی۔ ”سام کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟“

سام کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ”سوری.... میں تمہیں

ایسا نہیں سمجھتا شاید حالات کی وجہ سے مجھے اپنے خیالات پر

قابو نہیں رہا ہے۔ آؤ بیٹھو۔“

ریکارڈ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”میں تمہاری فلم

سے کہا۔

کے بارے میں سچی ریتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ یہ دنیا کی بہترین مودی ثابت ہو۔“

سام نے ہاتھ پھیلائے اور مایوسی سے بولا۔ ”اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔“

”کیوں تمہاری فلم مکمل تو ہو گئی ہے۔“

”نہیں ابھی کچھ کام باقی ہے مسئلہ یہ ہے کہ میں مالی

لحاظ سے بالکل خالی ہو چکا ہوں۔ اس لیے فلم ڈبے میں بند

ہو جائے گی۔“

”ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ ریکا نے بے ساختہ

کہا۔ ”ایسا ہوا تو یقین کرو مجھے اور بہت سارے لوگوں کو

شدید دکھ ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں بہت سارے لوگ میرے خیر خواہ

ہیں لیکن ان کی خیر خواہی فلم کی تکمیل میں میری کوئی مدد نہیں کر

سکتی ہے۔“ سام نے مایوسی سے کہا۔ ”خیر چھوڑو تم اتنے دن

بعد آئی ہو اور میں نے تمہیں اپنے مسئلے میں الجھا لیا۔ یہ بتاؤ

کیا پیوگی۔ میرے پاس پورٹ کی ایک بوتل ہے۔“

”یہی نکال لو۔“

سام نے بوتل اور گلاس نکالے۔ ”اس سال تمہاری

دونوں فلمیں بہت کامیاب گئی ہیں۔“

”ہاں میری قسمت کا ستارہ فی الحال عروج پر

ہے۔“ ریکا نے اپنا گلاس اٹھایا۔ ”میں یہ بات کبھی نہیں

بولوں گی کہ تم نے فلمی دنیا میں مجھے متعارف کرایا تھا۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ سام نے بے پروائی

سے کہا۔

ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور سکھایا کہ اللہ ایک ہے۔ ایمان لاؤ، عبادت کرو اور بتوں کو پوجنا چھوڑ دو۔ اس نے ہمیں نمازوں کا حکم دیا اور تلقین کی کہ سچ بولیں، دیانت دار رہیں، اقارب و عسایوں سے اچھا سلوک کریں۔ خونریزی سے بچیں، ہم اس پیغمبر پر ایمان لائے۔ اسی وجہ سے یہ ہمارے دشمن ہوئے۔ یہ ہمیں واپس بتوں کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہم بری باتوں کو جائز سمجھیں۔ نجاشی نے کہا کہ وہ شخص جو پیغام وحی لا پائے اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے۔ اس پر آپ نے سورہ مريم کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔ اس پر پادری رو پڑے۔ نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور کلام موسیٰ دونوں ایک ہی چشمہ نور سے نکلے ہیں۔ وہ متاثر ہوا اور قریش کے دونوں سفیروں عیرو بن العاص اور عمارہ بن ولید سے کہا کہ میں انہیں واپس نہیں کر سکتا، تم جاؤ اور مسلمانوں سے کہا تم میری زمین پر امن سے رہو۔ پھر تین بار کہا کہ ”جو کوئی تمہیں گالی دے گا اسے تادان لگے گا۔“ اس واقعے کے بعد کفار نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا۔ اس پر مہاجرین نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔ حضرت زبیرؓ جو اس وقت کسبن تھے انہوں نے بھی خود کو پیش کیا۔ اللہ نے نجاشی کو فتح دی۔

مرسلہ: ربیعہ قادری عطاری، جہلم

یا کیرا مین نظر نہیں آیا۔ ورنہ ربیکا جیسی مشہور شخصیت کا تو باقاعدہ تعاقب کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر نکلتے ہوئے احتیاط کی گئی تھی۔ ربیکا کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے اندر آیا تو میز پر ایک لفافہ رکھا تھا اسے نہیں معلوم کہ یہ لفافہ کب اور کہاں سے آگیا تھا۔ سام نے لفافہ اٹھایا تو اس میں سے ربیکا کی مخصوص مہک آئی تھی۔ وہ کھولے بغیر جان گیا تھا کہ اس میں کیا تھا۔ لفافے میں ایک پینک ڈرافٹ اور ایک چھوٹا سا رقعہ تھا جس پر ربیکا کے طرز تحریر میں لکھا تھا۔

”یہ میری طرف سے ایک محبت کرنے والے بے غرض انسان کو ایک چھوٹا سا تحفہ ہے اسے ٹھکرا کر میرے جذبات کی توہین مت کرنا۔“

سام نے دھندلائی آنکھوں سے ڈرافٹ دیکھا۔ اس پر ایک کروڑ ڈالر کی رقم درج تھی۔ اس رقم کی مدد سے وہ اپنی فلم مکمل کر سکتا تھا۔ اس میں ربیکا کا تحفہ ٹھکانے کی ہمت نہیں تھی۔ اگلے دن اس نے ڈرافٹ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر لیا اور چیرے ہی رقم اس کے اکاؤنٹ میں آئی اس نے فلم کا بقیہ رہ جانے والا کام مکمل کرنا شروع کر دیا۔ شوٹنگ تو دو ہفتے میں منٹ گئی تھی اور رش پرنٹ تیار تھے۔ سام کے ساتھ کوئی ادھار کام کرنے کو تیار نہیں تھا اور وہ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ لوگ رقم لے کر اس کا کام کر رہے تھے ورنہ حالات اس کے خلاف تھے۔

جس دوران میں فلم کی مکینک اور آپٹیکل انجینئرنگ کا کام جاری تھا سام نے فلم کی نمائش کے لیے ڈسٹری بیوٹر

”اب تم کیا کرو گے؟“

”ممکن ہے میں واپس چلا جاؤں اور اپنے باپ کی زمینوں پر کام شروع کر دوں۔ جب میں یہاں آ رہا تھا تو میرے باپ نے کہا تھا کہ یہ دھوکے کی دنیا ہے جو مجھ سے بے وفائی کرے گی۔“

”تمہارے باپ نے درست کہا تھا۔ یہاں صرف چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے اور کوئی زوال کا شکار ہو جائے تو لوگ اس سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔“

”خدا کرے تمہارے لیے وہ وقت بھی نہ آئے۔“

سام نے خلوص سے کہا اور اپنا ہاتھ ربیکا کے نرم و نازک ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”اگر چہ اب میں تمہارے لائق نہیں ہوں لیکن میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“

ربیکا کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ ”مجھے بھی کہنے دو سام میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔“

”میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔“ سام نے کہا اور پھر سر آدھ بھری۔ ”کاش کہ میں اور تم عام مرد و عورت ہوتے۔“

”اگر ایسا ہوتا تو...؟“

”تو میں کبھی تمہیں خود سے دور جانے نہیں دیتا۔“

سام نے جواب دیا۔ ربیکا سر جھکائے بیٹھی رہی تھی پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اب میں چلوں گی۔“

قلم میں بیان کیے حقائق سے واقف ہوں۔ دوسری طرف عوام بے چینی سے اس فلم کے منتظر تھے کیونکہ سام کے ساتھ ہونے والے سلوک اور پھر فلم کی راہ میں روڑے اٹکانے سے ان کا تجسس بھڑک اٹھا تھا۔ پھر مخالفین کے پروپیگنڈے نے فلم کو مزید شہرت دی تھی۔ مگر فلم ریلیز ہوتی تو لوگ دیکھتے۔ سام کے مخالف اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

سام پریشان تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فلم کی ریلیز کس طرح ممکن بنائے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ڈسٹری بیوٹر کمپنیوں کے رویے کے خلاف عدالت میں چلا جاتا۔ دوسرا طریقہ اسے ایک اسٹوڈیو کے مووی تھیٹر کمپنی کے منیجر نے سمجھایا۔ اس نے فلم ریلیز کرنے سے انکار کرتے ہوئے مسخرانہ انداز میں کہا۔ ”جیسے تم نے فلم خود بنائی ہے اب اسے ریلیز بھی خود کرو۔“

مذاق اڑانے کے انداز میں دیئے گئے اس مشورے نے سام کو تنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی ڈسٹری بیوٹ کمپنی بنالے اور اس کے بینر تلے فلم ریلیز کرے۔ جیسے جیسے وہ اس پر غور کرتا رہا اسے لگا یہی واحد حل ہے۔ اس نے اس بارے میں معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ کسی بھی کاروباری فرم کی طرح فلم ڈسٹری بیوٹ کمپنی قائم کرنا بھی بہت آسان ہے۔ ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے فوراً اپنی کمپنی رجسٹر کرائی اور اس کے ذریعے فلم ریلیز کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ امریکا میں بڑی کمپنیوں اور فلم اسٹوڈیوز کے مووی تھیٹرز کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں ایسے تھیٹرز بھی ہیں جو چھوٹی کمپنیوں یا فرد واحد کی ملکیت ہیں اور یہ براہ راست فلمیں ریلیز کرنے کی بجائے ڈسٹری بیوٹرز سے لے کر ریلیز کرتے ہیں۔ سام نے اشتہارات کے ذریعے ان چھوٹی کمپنیوں اور انفرادی مووی تھیٹرز کو دعوت دی کہ وہ اس کی فلم ریلیز کریں۔

اس اشتہار کا رد عمل سام کی توقعات سے بڑھ کر آیا اور دو دن میں اسے فلم کی ریلیز کے لیے آٹھ سو سے زائد درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر انفرادی مووی تھیٹرز کی طرف سے درخواستیں تھیں۔ ان مووی تھیٹرز کو کوئی بڑی فلم عام طور سے ریلیز کے ایک مہینے بعد ملتی ہے جب اکثر لوگ اسے دیکھ چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کو زیادہ بزنس نہیں ملتا ہے۔ یہ پہلی بار تھا کہ ان کو ایک بڑی مووی ریلیز کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ایک

سے بات شروع کر دی۔ لیکن بد قسمتی سے یہاں بھی وہی سارے لوگ چھائے ہوئے تھے جو سام کو کسی صورت کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بڑے ڈسٹری بیوٹر اسٹوڈیوز کے تھے اور زیادہ تھیٹرز ان کے پاس تھے۔ کچھ آزاد اور چھوٹے ڈسٹری بیوٹر تھے لیکن ان کے پاس زیادہ تھیٹرز نہیں تھے اور ان کو فلم دینے کا مطلب تھا کہ اس کی آدمی لاگت بھی نہیں پوری ہوگی۔ سام کم سے کم ایک ہزار تھیٹرز میں بیک وقت اس کی نمائش چاہتا تھا۔ اس نے ہالی ووڈ میں بگ برادر کے واحد حریف اسٹوڈیو کے مالکان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اگر وہ اس کی فلم ریلیز کرنے کو تیار ہو جاتے تو سام کو فلم کے لیے مطلوبہ تعداد میں مووی تھیٹرز مل سکتے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جب الٹونی اور جنگلی بچار میں وہ بگ برادر سے بھی بڑھ کر تھے اور ٹائٹل یون کے بعد جنگلی موضوعات پر سب سے زیادہ فلمیں اسی اسٹوڈیو نے بنائی تھیں۔

سام نے اسٹوڈیو مالکان سے بات کی لیکن ان کی طرف سے انکار ہو گیا۔ ہالی ووڈ والوں کی طرف سے مایوس ہو کر سام نے سب سے بڑی فلم ڈسٹری بیوٹ کمپنی سے بات کی جس کے پاس کوئی پانچ سو مووی تھیٹرز تھے۔ سام کے خیال میں اگر وہ پانچ سو سے ہی آغاز کرتا تب بھی برائیاں تھا مگر ہوا یہ کہ اس کمپنی نے فلم ریلیز کے لیے نہایت کڑی شرائط پیش کر دیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ فلم لے کر سام پر احسان کرنے جا رہے تھے۔ انہوں نے بہت معمولی سی پیشگی رقم کی پیش کش کی اور باقی رقم فلم کی کامیابی کی صورت میں دی جانی۔ پیشگی رقم صرف دو کروڑ الٹرنیٹ یعنی کل لاگت کا دسویں سے بھی کم۔

سام سمجھ رہا تھا کہ فلم مکمل ہونے کے بعد اس کی مشکلات کم ہو جائیں گی لیکن یہاں تو مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔ گرتائیزی سے قریب آ گیا تھا اور بگ برادر کی بنائی ہوئی فلم بیک وقت ملک کے ڈھائی ہزار مووی تھیٹرز میں ریلیز ہونے والی تھی۔ جب کہ سام کی فلم کو کوئی گھاس ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ حالانکہ میڈیا نے اسے غیر معمولی فلم قرار دیا تھا جس میں فلم بینوں کی دل چسپی کی تمام چیزیں تھیں۔ اس کا میڈیا پر بیزیر نہایت کامیاب رہا تھا۔ سام سمجھ رہا تھا کہ یہ سب اوپر والوں کی مخالفت ہے اور وہ اس کی فلم کی نمائش میں ہر ممکن روڑے انکار ہے تھے کیونکہ سام نے ان کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ امریکی عوام اس

پنڈت برجموہن ناتاریہ

کیفی-1866-1955ء

اردو کے نامور ادیب، شاعر۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سینٹ ایلین کالج دہلی سے فارغ التحصیل ہو کر ریاست کشمیر میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر زندگی کا زیادہ حصہ لائل پور (حالیہ فیصل آباد) اور لاہور میں گزارا۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ اردو زبان کی تحقیق، محاورات کی چھان بین اور اغلاط کی تصحیح کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ علم اللسان پر بھی کافی کام کیا۔ فارسی، عربی، انگریزی، سنسکرت، اردو اور ہندی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ کل ہند انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب ہوئے اور آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ تصانیف (نثر)، عورت اور اس کی تعلیم، چراغ ہدایت، پریم دیوی، راج دلاری، مراری دادا، ہتھارتا، کیفی، منشورات کیفی۔ (نظم) مرآۃ خیال، آئینہ ہند، صدائے کیفی، بھارت درپن، پریم ترنگی، جنگلی نظمیں، توڑک قیسری، نچھانہ کیفی، واردات۔

مرسلہ: نیاز حسن کراچی

ہفتے میں کوئی دو ہزار ممووی تھیٹر ز فلم کی ریلیز کے لیے درخواست جمع کرا چکے تھے۔ یہ تعداد سام کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔

پھر ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے اس کی فلم کا لندن میں پری میئر کرنے کی پیش کش کی جس میں دنیا جہاں سے فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے لوگ آتے۔ سام کی خوش قسمتی تھی ورنہ وہ سوچ رہا تھا کہ فلم کا پری میئر کہاں کرے کیونکہ امریکا میں اسے اس معیار کا تھیٹر ملنا مشکل تھا۔ اب یہ ڈے داری ملٹی نیشنل کمپنی نے لے لی تھی اور وہ اس پری میئر کے عوض سام کی ڈسٹری بیوشن کمپنی کو سولین ڈالر ادا کر رہی تھی۔ پری میئر میں فلم کی مکمل کاسٹ شامل تھی اور تقریب نہایت کامیاب رہی تھی۔ کئی ورلڈ ٹی وی چینلوں نے اسے نشر کیا تھا۔ فلموں اور شو بزنس سے تعلق رکھنے والا کوئی چینل ایسا نہیں تھا جس نے اس کی کوریج نہ کی ہو۔

اس وقت تک ہالی ووڈ کے بڑے جان چکے تھے کہ وہ جنگ ہار گئے ہیں اپنے حکمرانوں کی طرح اور سام بازی جیت گیا تھا۔ وہ اسے فلم بنانے اور پھر ریلیز کرنے سے نہیں روک سکے تھے لیکن وہ ہار کر بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے بالکل اپنے حکمرانوں کی طرح اور انہوں نے سام کی جیت کو چروپیگنڈے سے ہار دکھانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا زرخریڈ میڈیا فلم برمنگھم سے کرنے لگا اور خیال ظاہر کیا جانے لگا کہ یہ باکس آفس برہہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے گی جو اس سے پہلے سام کی فلمیں حاصل کرتی رہی تھیں۔

لیکن فلم بیٹوں کے ردعمل نے ہالی ووڈ کے بڑوں کے اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔ فلم نے پہلے ہی ہفتے میں بزنس کا ریکارڈ قائم کر دیا اور یہ سارا بزنس اسے چھوٹے ممووی تھیٹر ز سے ملا تھا۔ اس ایک ہفتے میں سام کی فلم نے بائیس کروڑ ڈالر کا بزنس کیا تھا، یہ اس کی لاگت کے مساوی تھا۔ فلم کی جنوبلیت دیکھ کر درمیانی درجے کی ڈسٹری بیوشن کمپنیاں بھی میدان میں آ گئیں اور انہوں نے سام کی منہ مانگی قیمت ادا کر کے فلم کی ریلیز کا حق حاصل کیا۔ یہی کمپنیاں پہلے سام کو شراکتہ پیش کر رہی تھیں۔

پہلے مہینے میں فلم نے امریکا میں ریکارڈ بزنس کیا تھا اور یہ سام کو مجموعی لاگت سے تین گنا زیادہ کم کر دے چکی تھی۔ جب کہ آنے والے ایک مہینے میں یہ ہر اس تھیٹر ز میں بک ہو چکی تھی جہاں اس کی نمائش جاری تھی۔ اس کامیابی کا خود سام نے بھی نہیں سوچا تھا۔ بگ برادر نے

مقابلے کے لیے جو فلم بنائی تھی اگرچہ اس نے اپنے اخراجات نکال لیے تھے لیکن اسے کسی طرح بھی کامیاب فلم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ پھر فلم کو عالمی نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔ ایک ایک ملک سے سام کو بے تحاشہ رقوم موصول ہونے لگیں اور چھ مہینے میں اس کی فلم ایک ارب ڈالر کا خالص نفع کما چکی تھی۔ سام ایک ہی فلم سے ارب پتی بن گیا تھا۔ ایسی بے مثال کامیابی اس سے پہلے کسی کو نہیں ملی تھی۔ سب کا خیال تھا کہ سام اب ہالی ووڈ کا کنگ بن جائے گا اور ہر کام اس کے اشارہ اور پروہ ہوا کرے گا۔ پرانی کمپنیاں اس کے اثر میں آجائیں گی۔ لیکن سام کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ایک سال بعد اس کی فلم بزنس کے لحاظ سے ٹائی ٹینک کا ریکارڈ توڑ کر اس سے بہت آگے جا چکی تھی۔ سام نے ایک بریس کانفرنس بلائی۔ اس بار اس نے ایک بڑا ممووی تھیٹر منتخب کیا تھا جس میں دو ہزار افراد کی نمائش تھی لیکن وہاں آنے والوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہو گئی تھی اور

ہماری اور دنیا کی بھلا ہے۔

میں کل بھی ایک عام فلم پروڈیوسر تھا اور آنے والے کل بھی میں ایک عام فلم پروڈیوسر ہوں گا۔ کیونکہ یہ دولت کی طاقت ہے جس نے میرا راستہ روکا۔ ہالی ووڈ کے بڑے دولت پا کر مغرور ہو گئے۔ میرے مقابلے میں خدا بننے کی کوشش کی لیکن وہ بھول گئے خدا کوئی اور ہے۔ اس لیے میں کامیاب رہا۔ میری یہ کامیابی ان پے ہوئے لوگوں کی کامیابی ہے جو تیسری دنیا میں رہتے ہیں جو امریکا اور مغرب کے استحصال کا شکار ہیں۔ اس لیے میں اپنی فلم سے کمائی دولت ان لوگوں کے لیے وقف کرتا ہوں جن کو میرے وطن سے کبھی نقصان ہوا ہے۔ میں تلانی کرنے کی اپنی سی محدود کوشش کروں گا۔ مجھے اُمید ہے میرے کچھ نہ کچھ ہم وطن میرا ساتھ ضرور دیں گے۔ میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا آپ میری تقریر پر تبصرہ کرنے کے لیے آزاد ہیں شکریہ۔“

جب سام ڈاؤس سے اترا تو تالیاں بجانے والوں کی تعداد بہت کم تھی اس نے جو کھانا وہ غیر متوقع تھا اور ناپید نہ ہوا۔ لیکن وہ اسی چیز کی توقع لے کر آیا تھا اس لیے خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے پہلے بھی اپنے بل بوتے پر کامیابی حاصل کی تھی اور آئندہ بھی ایسی ہی کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ نیچے اپنی نشست تک آیا تو اس کے کچھ جاننے والوں نے اسے گھیر لیا وہ اس کی تقریر کی مبارک باد دے رہے تھے۔ سام ان کو بتانے لگا کہ وہ فلم سے حاصل شدہ دولت سے ایک آرگنائزیشن بنائے گا جو ان ملکوں میں روزگار، صحت اور تعلیم کے لیے کام کرے گی۔ جو امریکی پالیسیوں کا براہ راست نشانہ بنے تھے۔

”سام۔“ عقرب سے ربیکا کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے پاس ہی ٹھہری تھی۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

سام مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔ ”میں تو پہلے ہی تمہارا مقروض ہوں۔“

ربیکا اس کے پاس آگئی۔ ”تم فکر مت کرو وہ قرض میں تمہارے پاس رہتے ہوئے وصول کر لوں گی۔“

سام نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میری کامیابی کو اگر کوئی انعام دیا جاسکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔“

وہ دونوں ایک ساتھ باہر کی طرف بڑھ گئے تھے۔

لوگ دیواروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ کئی چینل اس کی پریس کانفرنس کو لائیو دکھا رہے تھے۔ سام ڈاؤس پر آیا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ آج وہ اس کی عزت کر رہے تھے جس کے بارے میں کل تک خبر لگانے کو بھی تیار نہیں تھے۔ سام نے کہنا شروع کیا۔

”میرے دوستوں آپ جانتے ہیں میں کل معتبور تھا بلکہ آج بھی معتبور ہوں لیکن کل میں ناکام تھا اور آج میں کامیاب ہوں۔ میری کامیابی یہ نہیں ہے کہ میں نے ایک سپر بلاک بسٹر مووی بنائی ہے جس نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں بلکہ میری کامیابی یہ ہے کہ میں نے امریکا کے کردار کے بارے میں اپنے احساسات اور جذبات امریکی عوام تک پہنچانے کی کوشش کی اور مجھے اس میں کامیابی ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی اس بات کا ثبوت ہے۔“

جب نائن الیون کے واقعے کے بعد میں نے اپنے کامک کردار بینک کو انسانیت کے بجائے امریکی مفادات کا محافظ بنانے سے انکار کیا تو مجھ پر فلم اسٹوڈیو کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ میں نے فلم بنانا چاہی تو مجھے اس سے روک دیا گیا۔ میں سیاست دان نہیں ہوں اور نہ ہی میں نظام کی اندھی تقلید پر یقین رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔ یہاں کے لوگوں سے محبت ہے۔ لیکن مجھے اتنی ہی محبت انسانوں سے بھی ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے ملک کا سپاہی کسی اور ملک میں جا کر محض حکمرانوں کے کہنے پر اندھا دھند عمل کرتا ہے اور وہ ذرا بھی نہیں سوچتا کہ وہ انسانوں کے ساتھ کیا کر رہا ہے تو میں ایسے نظام کا حامی نہیں ہو سکتا۔ کسی اور ملک کی فوج آکر امریکا پر قبضہ کر لے اور یہاں قتل عام کرے تو ہم میں سے کوئی برداشت نہیں کرے گا۔ ہمیں اسی روپے کی توقع دوسروں سے بھی کرنی چاہیے۔ حملہ آوروں کو کوئی خوش آمدید نہیں کہتا ہے۔ حریت انسان کے لبو میں شامل ہے۔ میرا ایمان اس پر ہے۔

مجھے معلوم ہے بہت سارے لوگوں کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں گی کیونکہ جنگوں سے اور دوسرے ملکوں کے استحصال سے ان کے کاروبار چل رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہے جلد میرے ملک میں ایسا وقت آئے گا جب ہم دنیا کے دوسرے خطوں میں مداخلت کے خلاف مضبوط آواز اٹھائیں گے۔ ہمیں بالآخر جنگ بند کرنا ہوگی۔ اسی میں



حسن مزاح

ثنا ثاقب

حسن مزاح ہر ایک میں نہیں ہوتی لیکن جس میں ہوتی ہے وہ میرے محفل بن جاتا۔ لوگ ایک لمحے میں اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی صحبت پسند کرتے ہیں۔

اسی حس کا مختصر سا بیان

حسن مزاح یا سنس آف ہیومر کا ذکر ہمیں اکثر سننے کو ملتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہے کیا چیز ہے اور کہاں ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہمیں سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی تعلیم و تربیت سے آتی ہے۔ بلکہ یہ حس انسان کے اندر ہی ہوتی ہے۔ اس کے مزاح میں ہوتی ہے یا پھر ماحول پیدا کرتا ہے۔

یہ ایک زبردست انسانی خوبی ہے۔ انسان دو ہی باتوں سے جانوروں سے افضل ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے اور ہنس سکتا

دل کھول کر ہنستے ہیں۔ ”اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں۔“

اس سے کیا ہوتا ہے؟ ذہن کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ اس کو ایک طرح کا کھٹار کس سمجھ لیں۔ ڈپریشن سے نجات مل جاتی ہے۔

ساجیات میں بھی اس خوبی کی بہت اہمیت ہے۔ آپ سفر میں ہوں اور کسی اجنبی کو مسکرا کر دیکھ لیں تو وہ آپ کا دوست بن جائے گا کیوں کہ آپ کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی مسکراہٹ اس تیر کی طرح ہوتی ہے جس کا نشانہ بھی خالی نہیں جاتا۔

اور اگر آپ میں بزلہ منجی ہے۔ آپ مزاح پیدا کرنا جانتے ہیں۔ آپ کی گفتگو چٹکے چھوڑنے والی ہے تو کیا کہنے۔ وہ اجنبی آپ کے قریب ہوتا جائے گا۔

ظرافت ایک بہت بڑی انسانی خوبی ہے اور یہ خوبی جن میں ہوتی ہے وہ جان محفل بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کی باتیں سننے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ ”وہ ہنس دے تو جان سی لکیوں میں پڑ گئی۔ وہ لب کشا ہوئے تو گلستاں بنادیا۔“

تو آپ بھی ایسے بن جائیں کہ جب بات کریں تو لوگ آپ کی باتوں سے محظوظ ہوں۔ بوریت محسوس نہ کریں۔ آپ بھی ماحول کو گلستاں بنادیں۔

مزاح ایک طرف اگر جہالت ہے تو دوسری طرف یہ ایک فن بھی ہے۔ اس کی بے شمار قسمیں ہیں۔

جہاں ایک طرف کسی محفل کو گلستاں بنانے والے ہوتے ہیں وہاں دوسری طرف ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کے مسلک میں ہنسنا منع ہوتا ہے۔ وہ منہ بنائے اس طرح بیٹھے

رہتے ہیں جیسے پیٹ میں درد ہو رہا ہو۔ ایسے لوگوں سے بوریت ہونے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ زبردستی انہیں گدگدایا جائے تاکہ ان کا قبضہ سنا جاسکے۔ ایسے لوگ اگر ذرا سا مسکرا بھی دیں تو ان کا احسان سمجھیں۔ یہ لوگ خود نمائی کا لباس پہنے رہتے ہیں اپنے آپ کو باوقار ظاہر کرنے کے چکر میں ماتم زدہ سے ہو جاتے ہیں۔

ایسے چہروں پر کرختگی سی آ جاتی ہے۔ آپ ایسے لوگوں کو دیکھ کر ہی جان لیں گے کہ ان کے دل سخت ہیں۔ یاد رکھیں دل کی کیفیت کا اظہار چہرے سے ہوتا ہے۔ اگر دل سخت ہوتا ہے تو چہرہ بھی سخت ہو جاتا ہے۔

دنیا کے ہر دور میں ہر تہذیب میں ہنسنا یا مسکرا نا ایک انسانی خوبی سمجھا گیا ہے۔

ہے۔ اسی لیے انسان کو حیوان ظریف کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انسانوں اور جانوروں کی جنٹلمین ایک جیسی دی گئی ہیں جیسے جنس کی خواہش (Instinct) کھانے پینے کی خواہش۔

اسے بھی بھوک لگتی ہے۔ انسان کو بھی لگتی ہے۔ اسے بھی خوف محسوس ہوتا ہے۔ انسان بھی خوف محسوس کرتا ہے۔ انسان کو بھی سردی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ اسے بھی گرم سرد موسم سے پناہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی درد تکلیف محسوس کرتا ہے۔ انسان بھی محسوس کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ مسکرا نہیں سکتا، انسان مسکراتا ہے، قہقہے لگاتا ہے۔ خود بھی ہنستا ہے دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔ وہ لطیفہ سنتا بھی ہے اور سناتا بھی ہے۔

آپ نے کبھی کسی کتے یا شیر یا بلی کو ایک دوسرے کو لطیفہ سناتے ہوئے نہیں سنا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ خود حضرت انسان نے ان جانوروں کے حوالے سے ان پر لطیفے بنا رکھے ہیں جیسے ایک دادا چھرنے اپنے پوتے سے کہا کہ تم خوش نصیب ہو کہ تم عورت کو بھی کاٹ سکتے ہو۔ ہمارے وقت میں عورت اتنے کپڑے پہنتی تھی کہ ہمیں کانٹے کے لیے کئی دن انتظار کرنا پڑتا تھا۔

اسی طرح کے اور بھی لطیفے ہیں۔ یاد رکھیں کسی کو ہنسنا ایک مشکل کام ہے۔ گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں ہی سہی۔ کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسیا جائے۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانا ایک عبادت ہے۔ کسی کے دکھ درد کو اپنی باتوں کے ذریعے کم کرنا ثواب ہے۔ ورنہ تو ہر طرف روتے سکتے ہوئے لوگ ہی دکھائی دیں گے۔

انسان جب سے پیدا ہوا ہے یا تو ہنستا رہا ہے یا روتا رہا ہے۔ ویسے رونے کا تناسب زیادہ ہے۔ ہنسنے کا کم ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ محرومی دوام بھی دے جائے گی خوشی۔ یہ سوچ کر ہنسو کہ بہت دیر ہو رہی ہے۔

ہنسیں، جی کھول کر ہنسیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اپنے آپ پر بھی ہنسا جاتا ہے۔ طنز کا اشاری اسی ضمن میں ہوتا ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ جو قوم اپنے آپ پر ہنسا جانتی ہے اس میں سدھار کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خوب صورت مستقبل کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتی ہے۔ یہ عالی ظرفی کی پہچان ہے۔

ہنسنے کا بہت گہرا تعلق صحت سے بھی ہوتا ہے۔ آپ نے لافتر تھراپی کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا۔ اس میں

مغرب میں جس مزاح کی تھیوری افلاطون سے شروع ہوتی ہے۔ سقراط نے بھی اس کی تقلید کی ہے۔ اس زمانے کے تھیز میں ایسے مکالمے بھی ہوتے تھے جن میں مزاح کا پہلو ہوتا تھا۔ اسے مزاح میں ظرافت پیدا کرنے کے لیے آپ کو بازار میں کوئی کتاب نہیں ملے گی اور نہ ہی اس کی تکنیک سکھائی جاسکتی ہے۔ یہ چیزیں سکھانے سے نہیں آتیں۔ تہذیب نفس سے پیدا ہوتی ہیں۔

بعض علاقوں میں جگت بازی تہذیبی اور سماجی رویہ ہے۔ ہر ایک آپ کو جملے کستا ہوا نظر آئے گا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ چاہے بندہ ضائع کر دو لیکن جملہ ضائع نہ کرو۔ دنیا بھر کے ادب میں طنز اور ظرافت کے اعلیٰ نمونے مل جاتے ہیں۔

قدیم سنسکرت ادب میں آٹھ بنیادی جہتوں میں ایک جس مزاح بھی ہے۔ یہ ہاستر، ٹونگی کے ذریعے سامنے آتی یا بیان کی جاتی تھی۔ ایک بات یاد رکھیں کہ کامیڈی انسان کو ہنسانے کا نام ہے۔ دل آزاری کا نام نہیں ہے۔ مذاق کرنا ایک فن ہے لیکن مذاق اڑانا ایک الیہ ہے۔ پریشانیوں کے حل کا ایک آسان طریقہ مزاح بھی ہے۔ اس کا تجربہ گھر کے ماحول میں کیا جاسکتا ہے۔ ماحول اگر ٹینس ہوگا تو گھر کے ماحول میں دل نہیں لگے گا۔ ہر وقت ایک بو جھل پن سوار ہوگا۔ A sense of humor is a major defence against minor trouble. اور اگر گھر کے لوگ ایک دوسرے سے بلکہ جملوں کا تبادلہ کرتے رہیں۔ تو گھر کے ماحول میں تناؤ کی کیفیت نہیں رہے گی۔

اسی لیے قابلِ تائب کے افراد اس خوبی یعنی جس مزاح سے عام طور پر محروم رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی جبلت میں سختی ہوتی ہے۔ مذاق کرنے والے عام طور پر نرم مزاح کے ہوا کرتے ہیں۔

مزاح کو سمجھنے کے لیے بھی ایک خاص قسم کے تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو ایک بہت اچھا لطیفہ سن لینے کے بعد پوچھتے ہیں۔ ”اچھا تو پھر کیا ہوا۔“ یا ”مجھے سے اچھا لطیفہ ان کے سر سے گزر جاتا ہے۔ یا بہت دیر میں اس وقت ہنستے ہیں۔ جب وہ لطیفہ ان کی سمجھ میں آچکا ہے اور وہ خود اکیلے ہنسنے لگتے ہیں۔

جیسے ایک صاحب نے بازار میں ایک آدمی کو مارنا

شروع کر دیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ تم کیوں مار رہے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ ”اس نے مجھے پچھلے سال گینڈا کہا تھا۔“

”پچھلے سال کہا تھا تو آج کیوں مار رہے ہو؟“

”میں نے زندگی میں پہلی بار گینڈا اکل دیکھا ہے“ انہوں نے بتایا۔

پوری دنیا کوسرتوں سے بھرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا کر لیں۔ مزاح کرنٹ اپنے آپ میں محسوس کریں۔ اس کے بعد اس نعت کو دوسروں میں بانٹ دیں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

1- کتاب یا تحریر کے ذریعے۔ لکھنے والوں نے مزاحیہ ادب تخلیق کیا ہے اور پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہیں۔ اس کے بھی دھجے ہیں۔ نثر اور نظم۔ شاعری۔

2- سماعت کے ذریعے۔ یعنی آپ کوئی مزاحیہ جملہ سنیں یا خود کہیں۔ لطیفہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

3- بصارت کے ذریعے۔ اس کی ٹیکری میں تھیز، فلم ڈراما وغیرہ آجاتے ہیں۔ اس کی بھی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اب ان شعبوں کے بھی کئی شعبے ہیں۔ جیسے اگر آپ کامیڈی کو لیتے ہیں تو کئی اقسام کی کامیڈی آتی ہے۔ جیسے۔ Slapstick comedy۔ اس کو ایکشن کامیڈی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اچھل کود اور بے معنی حرکتیں۔

بچے اس قسم کی کامیڈی سے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ اسی لیے کارٹون تخلیق کیے گئے۔ ہر دور کے عظیم فنکار چارلی چپلن کو اس کامیڈی کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ تھری اسٹو جیو بھی قابلِ ذکر ہیں۔ موجودہ دور میں مسٹر بین بھی اپنی حرکتوں سے ہنساتا ہے۔

ڈائلاگس کامیڈی۔ اس میں دلچسپ، بامعنی، طنزیہ، موقع کی مناسبت سے جملے ہوتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ہمارے یہاں لہری صاحب اور منور ظریف ہوا کرتے تھے۔

رنگیلا کے یہاں سلاپ اسنک کامیڈی تھی۔

ایک اور قسم ہے اور وہ ہے پوٹیشنل کامیڈی۔ اس میں نو تھو سلاپ اسنک کی حرکات ہوتی ہیں اور نہ ہی جملوں کو مزاحیہ بنانا پڑتا ہے۔ بلکہ حالات ایسے Creat ہو جاتے ہیں کہ کامیڈی خود بخود ہوتی چلی جاتی ہے۔ سٹ کام اسی کو کہا جاتا ہے۔ یعنی پوٹیشنل کامیڈی۔ ٹی وی پر آپ نے بے شمار سٹ کام دیکھے ہوں گے۔

ایک ہوتی ہے Standing comedy اس کو

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں اب اس میں تھوڑی سی تبدیلی کی تو شعر کیا سے کیا ہو گیا۔

شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں دنیا بھر کے ادب میں طنز و مزاح کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسے تحریر کی خوبی کہا جاتا ہے۔ سنسکرت میں اس کی ابتدا بھارتیہ تاہم سے ہوئی۔ عربی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ جدید عربی ادب میں مصر کے ہسم رفعت محمد یوسف کا نام بہت مستند ہے۔

ہجو یہ شاعری عربی ہی سے فارسی پھر اردو میں آئی ہے۔ فارسی میں طنز و مزاح کا ایک رسالہ نکلتا تھا جس کو جاوید علی زادہ نکالا کرتے تھے۔

انگریزی ادب میں بے شمار نام ہیں۔ جو طنز و مزاح کے لحاظ سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔ جیسے ڈکس آڈم، ولیم شکسپیر، جین آسٹن، مارک ٹوین، آسکر ڈامیلڈ، مارٹن لیوس، کرٹسوفر بکلے وغیرہ۔ ادب کے علاوہ فلم تھیٹر اور ٹیلی ویژن بھی ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس پر بہت کام ہوا ہے۔

کیسے کیسے مزاحیہ کردار ادا کرنے والے پیدا ہوئے۔ انہوں نے کمال کر دکھایا۔ چارلی چپلن کا حوالہ دے چکا ہوں۔ اس کے علاوہ نارمن وزڈم، جیری لوئیس، پیٹر سیکر وغیرہ۔

ہندوستان میں گوپ، یعقوب، جانی واکر وغیرہ۔ یہ بہت باکمال لوگ تھے۔

کیسی فلمیں کامیڈی کی آئیں؟ The great diictator چارلی چپلن کی یہ بے مثال فلم تھی۔ اس کو خود چارلی چپلن نے لکھا اور ڈائریکٹ کیا تھا۔ italian style. Doctor strange love..the milky way وغیرہ۔

اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت سی مکمل مزاحیہ فلمیں بنیں۔ جیسے بڑوں، انداز اپنا اپنا، انکور، چلتی کا نام گاڑی، ہاف ٹکٹ، گول مال، ہیرا پھیری وغیرہ۔

پاکستان میں بھی ایسی فلمیں بنی ہیں۔ بنیادی طور پر ہمارے یہاں کامیڈی تھیٹر پر بہت کام ہوا ہے۔ بہت بڑے بڑے نام آتے رہے ہیں، جیسے کمال

دن میں شو بھی کہا جاتا ہے۔ ایک آدمی اپنے مزاحیہ جملوں سے ہنساتا جاتا ہے جیسے عمر شریف۔ کچھ لوگ کرداروں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ (خاص طور پر ادب میں)۔

لیکن یہ کردار افسوس ناک پہلو نہیں رکھتے۔ بلکہ دلچسپ مزاح رکھنے والے ہوتے ہیں۔

ان کے علاوہ ایک بلیک کامیڈی بھی ہوتی ہے۔ اس میں منفی پہلوؤں سے مزاح پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں اس کا رواج بہت کم ہے۔

اس میں موت، مفلسی، دکھ، بیماری وغیرہ کو جو انسانی ایلے ہیں، ان سے مزاح کی آبیاری کی جاتی ہے۔ جیسے کوئی شخص شیو بنوانے ناکی کی دکان پر گیا۔ ناکی نے آؤشی شیو بنائی تھی کہ اس کا ہارٹ ٹل ہو گیا۔ اب اس کی لاش اس طرح پڑی ہوئی ہے کہ ادمے چہرے پر شیو ہے، آدھا بالکل صاف ہے۔ اس طرح ایک مزاحیہ چوہین پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی بلیک کامیڈی ہے۔

ایک چیز عیدوڑی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی اصل شاہکار کو اس انداز سے الٹ پھیر کر کے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ چیز انتہائی مزاحیہ ہو جاتی ہے۔ جیسے

آہ بھرتی ہوئی آئی ہو سلمنگ سینٹر
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
ڈاننگ ٹھیل نہیں چند دنوں کا بیگم
اک صدی چاہیے کمرے کو کمر ہونے تک
علامہ اقبال کی شکوہ تو آپ کے ذہن میں ہوگی۔ اب اس کی عیدوڑی سیں۔

ہے بجا حلقہ ازدواج میں مشہور ہوں میں
تیرا میرا تیرا دھوبی تیرا مزدور ہوں میں
زن مریدی کا شرف پا کے بھی رنجور ہوں میں
قصہ درد سناتا ہوں کہ مجبور ہوں میں
میری خندومہ میرے غم کی حکایت سن لے
ناز بردار سے تھوڑی سی شکایت سن لے
زچہ بن بن کے بجٹ میرا گھٹایا تو نے
ہر نئے سال نیا گل ہے کھلایا تو نے
اپنا شو روم میرے گھر کو بنایا تو نے
اس میں ہر رنگ کا ماڈل ہے سجایا تو نے
گورا کالا بھی ہے کانا بھی ہے کافی بھی
اس میں انگلش بھی ہے دیسی بھی جاپانی بھی
ایک مشہور شعر ہے۔

یوم آزادی کی مناسبت سے خصوصی تحریریں لے اگست 2017 کا جشن آزادی نمبر

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ماہرانہ قلم کی جولانیاں..... قسط وار ناول کی صورت

سحر ساجد نے من جاں بازم کا کیا لٹنیں اختتام

سیما رضا ردا اپنے نئی ناول..... ہم کو عبث بدنام کیا..... کو ایک لاکھ اندازیں آگے بڑھاتے ہوئے

14 اگست کی مناسبت سے ناہید سلطانیہ اختر، دردانہ دوادیں ہان،
منشا محسن علی اور نرمین سرہیولی

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے روں پرورہ ضامین

نامور مزاح نگاروں کے شہ پاروں سے انتخاب..... فکاہیہ کالم کی صورت

وہ آنے بزم میں.....

نزہت اصغر سے مصنفہ عذرا آفتاب

کی پُر لطف باتیں

(اس کی جلاں)

طیبہ عنصر مغل، فرح بختو، غزالہ عزیز، ہاجرہ ریحان،
افشین جہاں آرا کی خوب صورت کہانیاں

دیباغیہ میں بسنے والے اپنا یوم آزادی کیسے مناتے ہیں۔ یہ پڑھیے شائستہ زریں کے خصوصی سروے میں.....

اس کے ساتھ ساتھ مورخ شاعری خوش فائقہ کیوان قابل غور تفسیر اور پچھلے ماہز مستقل سلسلے صرف آپ کے ذوق کے لیے

احمد رضوی، ننھا، عمر شریف، معین اختر، بہر مال وغیرہ اور خواجہ معین الدین۔ جنہوں نے مرزا غالب بندر روڈ پر اور تعلیم بالغان جیسے ڈرامے لکھے۔ انور مقصود جن کے یہاں طنز بہت زیادہ ہے۔

اردو نثر میں کامیڈی یا مزاح لکھنے والے بہت کم سہی لیکن باکمال لوگ ہیں۔ جیسے رشید احمد صدیقی، پطرس، کرشن چندر، مرزا عظیم بیگ اور سب سے بڑھ کر مشتاق یوسفی صاحب۔ جن کے یہاں چٹکیاں بنی چٹکیاں ہیں جو کہ ایک لفظ کو جس انداز سے چاہیں استعمال کرتے ہیں اور ایک نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لیں کہ ان کی آپ بیتی کا نام زرگزشت ہے کیونکہ وہ ایک بہت بڑے بینکار رہ چکے ہیں۔ ابن انشا، ابراہیم جلیس، عطاء اللہ قاسمی، شفیق الرحمن اور بہت سے نام ہیں۔

اردو شاعری کا دامن اس لحاظ سے بہت بھرا ہوا ہے۔ مرزا غالب کے یہاں بے پناہ طنز اور چٹکیاں لیتا ہوا مزاح ملتا ہے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں میرا لیٹا ہوا بستر کھلا
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
جس کے پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے
غالب کی پوری شاعری اس قسم کے اشعار سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ سودا نے بھی ایسی شاعری کی ہے۔
علامہ اقبال نے بھی ایسی شاعری کی ہے جس میں طنز و مزاح کا عنصر شامل ہے۔

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے
طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا ایک بہت بڑا نام ہے اکبر الہ آبادی۔ انہوں نے اپنی طرفانہ شاعری سے نثر کا کام لیا ہے

عاشقی کا ہو برا جس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اسے بی میں رہے اغیار بی اسے ہو گئے
بوٹ ڈاؤسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

شیخ کہنے کو جائیں ہم تو انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے
ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بچے باپ کو ضبطی سمجھتے ہیں
ایک اور نام سید میر جعفری کا ہے۔

چند اشعار ان کے بھی سن لیں۔

سوچتا ہوں کہ اس زمانے میں
داری انان کا کیا کرے کوئی
دل اور دگر جن کا ایک شعر پرش کرنے والوں کا قومی
راندہ بن گیا۔

آج بٹلاؤں میں تدبیر رہائی مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا
میں آپ کو شاعری میں پیروڈی کے حوالے سے بتا چکا
ہوں۔ ایک صنف گرہ لگانا بھی ہے۔ اس میں کسی مشہور شعر پر
گرہ لگائی جاتی ہے۔ جیسے غالب کا مشہور شعر ہے۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
اب جو گرہ لگی ہے وہ بھی کمال ہے۔
نیگم بھی ہیں کھڑی ہوئی میدانِ حشر میں
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
خود میں نے بھی بے شمار مشہور اشعار پر گرہیں لگائی ہیں

جیسے

چاروں نے شیخ جی کے بارے میں یہ بتایا
کچھ اور تم نہ سمجھو یہ ہے میاں ہمارا
چکار گنجشقی ہے اس کے بدن میں اپنی
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گھٹاں ہمارا
تفریح کے لیے انہیں لائے تھے بیچ پر
واللہ اس میں اپنے ارادے دگر نہ تھے
ان کو اٹھا کر لے گئی موبائل کی پولیس
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے
بہر حال یہ موضوع ایسا ہے کہ ہر شعبے پر اپنی ایچ ڈی ہو
سکتی ہے۔

مزاح کی حس بے حس سے نہیں آتی۔ چہرے کی سختی سے
نہیں آتی۔ سمجھ سے نہیں آتی۔ دولت سے نہیں آتی بلکہ زندگی
سے پیار کرنے سے آتی ہے۔ زندگی کو برتنے سے آتی ہے۔
نری اور رحم دلی سے آتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اولاد کے لیے ماں اور باپ دونوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ماں اگر بچے کو پیار دیتی ہے تو باپ اس کی تربیت کرتا ہے۔ اس کے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

باپ کا سایہ گھنی چھاؤں کی طرح ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا واحد رشتہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس کی اولاد زندگی کے ہر میدان میں اس سے زیادہ کامیابیاں حاصل کرے۔

باپ کے بغیر

کشمالہ حسن

اس دنیا میں ایسے لاکھوں بچے ہوں گے جن کے باپ نہیں ہیں۔ وہ بن پتوار کی کشتی جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھے لیکن حوصلے اور انتھک محنت سے اوپر، بہت اوپر پہنچے ایسے ہی کچھ بنیر باپ کے بچوں کا ذکر جنہوں نے تاریخ عالم پر اتمت نقوش چھوڑے۔

ایک مختصر لیکن انتہائی دلچسپ تحریر



ہوں۔ کیونکہ آپ کی سیرت پر روشنی ڈالنا میرے لیے ممکن نہیں۔

لیکن یہ ذکر اس لیے ضروری تھا کہ یہ مضمون ایسی شخصیات کے بارے میں ہے جن کے سروں پر باپ نہیں تھے۔ پھر انہوں نے انسانی تاریخ کے صفحات کو اپنی روشنی سے روشن کر دیا۔

نیوٹن

جو ایک عظیم ترین سائنس دان تھا۔ اسے لوگ آئزک نیوٹن کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ 1642 عیسوی میں کرسٹن کے روز انگلستان کے وولز تھورپ کے مقام پر پیدا ہوا اور اسی برس گیلیو کی موت ہوئی تھی۔ یعنی ایک بڑے سائنس دان موت کی گود میں پہنچا تو دوسرا سائنس دان زندگی کی گود میں آیا۔

یہ بھی اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں ہونہار بردا کے چکنے چکنے بات کے مترادف اس کے اوصاف ظاہر ہونے لگے اس نے میکا کی مظاہر کی طرف اپنا رجحان ثابت کرتا شروع کر دیا تھا۔

اٹھارہ برس کی عمر میں وہ کیمبرج میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے سائنس اور ریاضیات کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ پچیس سے ستائیس برس کی عمر تک اس نے ان سائنسی نظریات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں، وہ تمام نظریات جو کبھی سائنس کی بنیاد بھی جا رہی تھیں انہیں غلط ثابت کرتا جا رہا تھا۔ اس کے مقالوں نے بعد ازاں دنیا میں انقلاب برپا کرنا تھا۔

نیوٹن اپنی تحقیقات کے ذریعے بنیادی نظریات کو 1669 عیسوی تک وضع کر چکا تھا لیکن اس کے زیادہ تر نظریات دیر بعد منظر عام پر آئے۔

اس کے شائع ہونے والے اولین تہلکہ مچا دینے والے نظریات روشنی کی ہیئت سے متعلق تھے محتاط تجربات کے ایک سلسلے کے بعد نیوٹن نے دریافت کیا کہ عام سفید روشنی قوس و قزح کے تمام رنگوں کا آمیزہ ہے۔

اس نے روشنی کے انکسار اور انعطاف کے قوانین کا بھی محتاط تجزیہ کیا۔ 1669 عیسوی میں روشنی منعکس کرنے والی پہلی دوربین کا نقشہ اور ڈھانچا تیار کیا۔ یہ خاص وضع کی دوربین ہے جو آج بھی بڑی فلکیاتی مشاہدہ گاہوں میں استعمال ہوتی ہے۔

اس نے اپنی دریافتوں کو جب برٹش رائل سوسائٹی کے سامنے پیش کیا تو اس کی عمر صرف اٹیس برس تھی۔

وہ بیٹے کو پروان چڑھتے اور ترقی کرتا دیکھ کر بے حد خوش ہوتا ہے۔ اس کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے مواقع نکالنے کی جدوجہد کرتا ہے۔

دنیا کے بہت سے نامور لوگ اپنے باپ کی بے پناہ شفقت ہی کی وجہ سے اس مقام پر پہنچے ہیں کہ ان کے نام زندہ ہیں۔ لوگ ان سے اور ان کے کارناموں سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن بہت سے لوگوں کے ساتھ صورت حال مختلف بھی ہوتی ہے۔ یعنی وہ بچپن ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے یا بہت کم عرصے جب ان کے باپ کا انتقال ہوا۔ پھر خدا نے انہیں اپنے سائے میں لے لیا اور انہوں نے کمال حاصل کیا۔ عروج حاصل کیا اور انسانی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئے۔

آئیں کچھ ایسی ہی عظیم شخصیات سے آپ کا تعارف کرواتے ہیں۔

سب سے پہلا نام تو خود ہمارے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔

حضرت محمدؐ کے والد کا انتقال آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور جب صرف چھ برس کے تھے تو والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔

تاریخ انسانی میں آپؐ سے بڑی اور عظیم شخصیت اور کس کی ہو سکتی ہے؟ آپؐ نے عاجزانہ طور پر اپنی مساعی کا آغاز کیا اور دنیا کے عظیم ترین مذہب کی بنیاد رکھ دی۔ وہ ایک انتہائی موثر سیاسی رہنما بھی ثابت ہوئے۔

دنیا کے بہت سے نامور لوگوں کی یہ خوش نصیبی رہی کہ وہ دنیا کے تہذیبی مراکز میں پیدا ہوئے اور وہیں ایسے لوگوں میں لیے بڑھے جو عموماً اعلیٰ تہذیب یافتہ یا سیاسی طور پر مرکزی حیثیت کی اقوام تھیں۔

اس کے برعکس آپؐ کی پیدائش جنوبی عرب میں مکہ شہر میں 570ء میں ہوئی۔ یہ علاقہ تب تجارت، فنون اور علم کے مراکز سے بہت دور تھا۔

شاید خدا نے اس لیے آپؐ کو اس خطے میں پیدا کیا تھا کہ آپؐ دنیا کے تندخو ترین لوگوں کو سدھار سکیں اور اس میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ پوری دنیا انگشت بدندان ہے۔ وہی صحرائے عرب کے بدو، اجڑ پن میں اپنی مثال آپؐ جب اسلامی تعلیم سے روشناس ہوئے تو اعلیٰ اخلاق و آداب کے پیکر کہلائے۔

میں اس مضمون میں آپؐ کے بارے میں کیا لکھ سکتا

پروفیسر حمید الدین شاہد

(1919-2001) اردو کے ممتاز

شاعر، ادیب، دانشور اردو زبان کے سب سے قدیم جریدے ”سب رس“ کے مدیر۔ وہ خواجہ شجاع الدین کے ہاں حید آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ 1943ء میں ایم اے اردو کیا اور اسکول آف کامرس اردو کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان سے قبل انہوں نے پروفیسر محی الدین زور کے رسالے سب رس کی ادارت سنبھالی۔ ترقی اردو بورڈ کراچی کے مشیر اور رکن رہے۔ اردو، فارسی، انگریزی، ہندی اور عربی کے عالم تھے۔ اردو لغت بورڈ کے قیام کے وقت 1959ء سے 1975ء کے دوران اردو زبان کے قدیم الفاظ کی تحقیق کے حوالے سے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

وہ اعلیٰ پائے کے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتب شامل ہیں۔ (۱) سرگزشت ادارہ ادبیات اردو (۲) شمس الامراء کے سائنسی کارنامے (۳) رباعیات امجد (۴) یادگار ماضی (۵) ادبی مطالعے (۶) نقوش ادب (۷) رسالہ محمود و خوشحال (۱۰) اردو میں سائنسی ادب (۱۱) لکھی (۲۱) نارتھ۔ وہ آخری دم تک سب رس کے مدیر اور بہادر یار جنگ اکیڈمی کے صدر نشین رہے، جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ ان کی علمی دادی خدمات کے اعتراف کے طور پر ساکنان شہر قائد ایوارڈ، بابائے اردو نشان سپاس، اردو فروغ ایوارڈ، دکن کالنی قطب شاہ ایوارڈ اور پاکستان رائٹر گلڈ کی جانب سے طلائی تمغہ ملا۔ کراچی میں انتقال کیا۔ مدفن پاپوش نگر میں ہے۔

مرسلہ: ناصر حسن، لاہور

کنفیوٹشس
عظیم چینی فلسفی۔ کنفیوٹشس پہلا آدمی تھا جس نے چینی عوام کے بنیادی اعتقادات کو ملا کر عقائد کا ایک مقام وضع کیا۔ کنفیوٹشس لیو کی مختصر ریاست میں 551 قبل مسیح پیدا ہوا۔ یہ شمالی چین میں شان تنگ کے موجودہ قصبے میں واقع تھی۔ بچپن ہی میں وہ باپ کے سائے سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کے مطابق دو عظیم اہم فیصلیں... Li اور SEN ہیں۔ عظیم انسان ان ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ SEN کو بعض اوقات محبت کے معنوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن اسے دیگر انسانوں سے ایک محبت بھر اعلق کے طور پر زیادہ بہتر سمجھا جاسکتا ہے۔ Li سے ادب، رسومات، رواج، اطوار اور خوش اخلاقی مراد لی جاتی ہے۔

کنفیوٹشس مت انفرادی حقوق کی نسبت انفرادی ذمے داریوں پر اصرار کرتا ہے۔ چینی تہذیب میں بری طرح پیوست کنفیوٹشس کے اعتقادات مشرق ایشیا میں اس درجہ موثر ثابت نہیں ہوئے لیکن کنفیوٹشس کی اہمیت سے کسی بھی دور میں انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

کلیو نیلیو (1564-1642 عیسوی)

عظیم اطالوی سائنس دان۔ سائنس طرز فکر کی ترقی میں اس کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ وہ 1564ء میں پیزا شہر میں پیدا ہوا اور باپ کچھ ہی دنوں بعد چل بسا۔

نوجوانی میں جب وہ پیزا یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو مالی بد حالی کے سبب اسے تعلیمی سلسلہ ختم کرنا پڑا تھا۔ تاہم 1589ء میں اسے اس یونیورسٹی میں پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ چند سال بعد اس نے پاؤڈا یونیورسٹی میں نوکری حاصل کی۔ 1610ء تک وہیں رہا۔ اس دور میں اس کی زیادہ تر سائنسی ترجیحات سامنے آئیں۔

اس کی اولین اہم دریافتیں میکائکس کے شعبے میں رونما ہوئیں۔ اس نے ارسطو کے خیال کے برعکس یہ ثابت کیا کہ وزنی اور ہلکے اجسام ایک ہی رفتار سے نیچے گرتے ہیں۔ گیلیلیو کی دریافتوں میں ایک اہم دریافت جمود کا قانون بھی ہے۔ Law of inertia اس نے فلکیاتی مشاہدے کے لیے عظیم دور بین تیار کی۔

دور بین کی ایجاد اور اس کی دیگر دریافتوں نے اسے

مقبول بنادیا۔ یہ اور بات ہے کہ کلیسا اس کے خلاف ہو گیا تھا۔
حضرت موسیٰ

ایک قد آور مذہبی شخصیت، خدا کے نبی، پیغمبر۔ قرآن نے جن کا تذکرہ بار بار کیا ہے اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ان کے ساتھ بچپن میں کیا ہوا۔

آپ کی والدہ نے فرعون کے ڈر سے آپ کو لو کر لی لٹا کر دریا کے سپرد کر دیا تھا اور خود فرعون کی بیوی نے آپ کی پرورش کی۔

یعنی آپ پیدا ہوتے ہی باپ کے سائے سے دور ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اگرچہ آپ کی والدہ آپ کو دودھ پلانے کے لیے آپ کے پاس خدا کی طرف سے بھیج دی گئی تھیں لیکن تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت موسیٰ کو کبھی باپ کا سایہ نصیب نہیں ہوسکا تو یہ بالکل درست ہوگا۔

آپ کے بارے میں زیادہ لکھنا اس لیے غیر ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو آپ کے بارے میں معلوم ہے۔ حضرت عیسیٰ

آپ کے بارے میں بھی ہر شخص یہ جانتا ہے کہ خدا نے آپ کو پیغمبر باپ کے پیدا کر کے یہ بتا دیا تھا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ کی والدہ بی بی مریم آپ کے ساتھ رہیں۔

جوزف اسٹالن (1879-1953 عیسوی)

اسٹالن جس کا اصل نام آئیوسف و ساریو نووچ زرگا شویلا تھا۔ کئی سال تک سوویت یونین کا آمر رہا۔

وہ جار جیا کے قصبے گوری میں 1879ء میں پیدا ہوا۔ اس کی پرورش انتہائی غریب ماحول میں ہوئی۔ اس کا بہار باپ ایک شرابی تھا اور بیٹے کو بے تحاشا مارا کرتا۔

اسٹالن جب سات یا آٹھ برس کا تھا تو باپ کا انتقال ہو گیا۔

اسٹالن نے گوری میں ایک کلیسائی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ پھر نوجوانی میں الہیاتی علوم کے مدرسے میں داخل ہوا۔

1899ء میں مخرب اخلاق خیالات کے پرچار کے الزام میں اسے مدرسے سے نکال دیا گیا۔ وہ خفیہ مارکس تحریک میں شامل ہو گیا۔

اسٹالن کی وضع کردہ معاشی پالیسیاں زراعت کے جبری ارتکاز پر مبنی تھیں۔ یہ پالیسی کسانوں میں انتہائی ناپسندیدہ

تھی۔ اس کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔

1930ء کی دہائی کے شروع میں اسٹالن نے فرمان کے تحت ہزاروں مزدوروں کو مار دیا گیا یا قاتلوں سے وہ خود مر گئے۔

اپنی زندگی میں اسٹالن نے روس کی سرحدوں میں توسیع کی۔ مشرقی یورپ میں ایک بڑی سلطنت قائم کی اور ریاست ہائے متحدہ سوویت روس کو ایک بڑی طاقت بنادیا۔

ولیم فاکس۔ ولیم دی گریٹ (1087-1027 عیسوی)

1066ء میں نارمنڈی کا نواب ولیم انگلستان کا حکمران بننے کی خواہش میں چند ہزار فوجیوں کے دستے کے ساتھ خلیج انگلستان عبور کر گیا۔

یہ انگلستان میں یورش کر کے داخل ہونے کی تاریخ نہیں آخری فوجی دستہ تھا۔ نارمن قوم کی اس فتح نے ولیم اور اس کے جانشینوں کو انگلستان کا تخت ہی نہیں دلویا بلکہ تمام برطانوی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ولیم فرانس کے قصبے نارمنڈی میں 1029 عیسوی کو پیدا ہوا۔ اس کا کوئی باپ نہیں تھا (نا جائز اولاد) اس کے باوجود وہ ترقی کرتا ہوا کہاں سے کہاں جا پہنچا۔

ژاں زیوکس روسو (1778-1772 عیسوی)

معروف فلسفی ژاں زیوکس روسو سوئٹزر لینڈ میں جینوا کے مقام پر 1712 عیسوی میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے کچھ عرصے کے بعد اس کی ماں چل بسی اور جب وہ سات یا آٹھ برس کا تھا تو باپ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اس طرح اس فلاسفر نے ماں اور باپ کے سایوں کے بغیر اپنی زندگی گزار دی۔ اس کی شہرت اس مضمون سے ہوئی جس کا عنوان تھا۔ ”انسان معاشرے اور اخلاقیات کے فنون لطیف اور سائنس سودمند ہے یا نہیں۔“

اس کے بعد اس کے کئی مضامین سامنے آئے جیسے عدم مساوات کے آغاز پر نظر، اہلی، عمرانی معاہدہ وغیرہ۔ بالآخر بغیر ماں اور باپ کے پروان چڑھنے والا یہ بچہ دنیا کے چند بڑے فلاسفر میں شمار ہوا۔

یہ میں نے چند نام درج کیے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے ہوں گے جنہیں باپ کا سایہ نصیب نہیں ہوا ہوگا لیکن انہوں نے اپنی مسلسل جدوجہد اور عزم سے دنیا میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔



زندگی جیت گئی

فرزانہ نکھت

اسے کیا خبر تھی کہ وہ صرف تفریح کے لیے نکل تو رہی ہے مگر یہ تفریح اسے بہت مہنگی پڑے گی۔ جان عذاب میں آجائے گی۔ زندگی کے لالے پڑ جائیں گے لیکن ابھی موت کا وقت نہیں آیا تھا، سو وہ زندہ سلامت گھر لوٹ آئی۔

ایک باہت دو شیرہ کے حوصلے کا بیان

ریاست ہائے متحدہ امریکا کے شمال مشرق میں واقع بیلز آئی لینڈ اور جونز پورٹ مین کے ساحلی علاقے کے باشندے آج بھی 25 جنوری 1991ء کے دن کو اس سال کے سرد ترین دن کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔ اس دن ٹمبر پچر منفی اٹھارہ ڈگری سینٹی گریڈ کو پہنچا ہوا تھا۔ لابسٹر اور مچھلیوں کے شکاری اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے لیکن چونکہ پیری فکلو تائی سدا بہار سمندری پودوں کی بلیں بڑی اچھی قیمت دے جاتی تھیں اس لیے راجر چیڈلر نے ایک



دس فٹ لمبی پلکی کشتی جو اس کے آنجنابی باپ کی ملکیت رہ چکی تھی لی اور اپنے دوست فل راس کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ بہت سی ایسی جگہوں کے بارے میں جانتا تھا جہاں اب تک ان کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ ان دونوں کو اس وقت رقم کی شد ضرورت تھی۔ اس لیے وہ تند و تیز چیرنے والی ہواؤں کی پروا کیے بغیر اس مہم پر جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

بیلز آئی لینڈ کے ساحل پر پہنچ کر اکتیس سالہ راجر اور تیس سالہ فل کشتی کو کھیت کرنفی سولہ ڈگری پنج بستہ پانی میں لے گئے۔ فل کا چہرہ شدید سردی سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے چھینچی چنگھاڑتی ہواؤں میں اپنی آواز راجر تک پہنچانے کے لیے حلق بھاڑتا پڑ رہا تھا۔ دوپہر کے قریب وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ سدا بہار سمندری بیلئیں اور گھونگھوں بھری چٹانیں ساحل سے پچاس گز کی دوری پر تھیں۔

دو گھنٹے بعد وہ دو مگروں کو چھاننے کے بعد تیسرے مگر پر پہنچے اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس جگہ سے سمندری بیلئیں اور گھونگھے اکٹھے کرنے کے بعد وہ واپسی کا سفر کریں گے۔ انہوں نے تقریباً سو پاؤنڈ کے قریب سمندری بیلئیں اکٹھی کر لی تھیں۔ شدید سردی سے انہیں اپنی کمرختہ محسوس ہو رہی تھی اور گھنٹے جواب دیتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ مزید برآں مدوجز بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ مگروں نے جلد ہی پانی میں ڈوب جانا تھا۔

جب فل اس مگر پر چڑھنے لگا تو راجر نے وہ بغیر بادبانوں والی کشتی پانی سے نکال لی۔ پھر دونوں آدی تیزی سے وہاں سے سمندری پودے اور بیلئیں اکٹھی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس مصروفیت میں وہ کسی کو بالکل فراموش کر بیٹھے۔ تیز و تند ہواؤں کے تھپیلے ان کے جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ اپنی بالٹی پودوں سے بھر چکنے کے بعد فل اسے خالی کرنے کشتی کی طرف مڑ گیا مگر کشتی اپنی جگہ سے غائب تھی وہ بدحواس اور سراسیمہ سا ہو گیا اور چلا کر راجر سے بولا۔

”راجر! تم نے کشتی کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

اسی وقت انہیں کشتی دکھائی دے گئی۔ بڑھتے ہوئے مدوجز نے اسے اپنی جگہ سے ہٹا کر سمندر میں ڈھیل دیا تھا۔ اب وہ تیز و تند ہواؤں میں دور سے دور تر ہوتی جا رہی تھی۔

صورت حال کی خطرناکی نے دونوں کو شدید پریشانی اور اضطراب سے دوچار کر دیا۔ وہ تیزی سے بلند ہوتے مدوجز میں بجمد کر دینے والی ہواؤں کے تھپیلے سے بہتے ان چٹانوں پر کھڑے تھے۔ انہیں اس تمام دن کوئی اور کشتی بھی دکھائی نہ دی تھی بالآخر راجر نے فل سے کہا۔ ”ہم تو مر گئے۔“

کشتی اب انہیں بمشکل ہی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔

”کشتی کو اب بھول جاؤ راجر۔“ فل بولا۔ ”وہ جا چکی ہے اب ہمیں تیر کر ساحل پر پہنچنا ہوگا۔“

”نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ راجر جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

لحہ بھر کے لیے فل نے سوچا کہ وہ اکیلا تیرتا ہوا ساحل پر جائے اور لوگوں کو مدد کے لیے بلالائے لیکن اگر وہ ساحل پر پہنچنے میں ناکام رہا؟ اس طرح راجر بھینا وہیں چٹانوں پر سردی اور انجماد سے مر جائے گا۔

”ہمیں ساحل پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے راجر، ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔“ اس نے کہا۔

لیکن چار دفعہ کی کوششوں کے باوجود وہ پانی میں چھلاگ نہ لگا سکے۔ ہر مرتبہ وہ جھجک کر رہ جاتے تھے۔ پانی تیزی سے اتر رہا تھا اور ساحل محض دو سو گز کی دوری پر تھا۔

”اب ہمیں ضرور چل دینا چاہیے۔“ فل حتی لہجے میں بولا۔

انہوں نے اپنے جسموں نے بھاری فالتو کپڑے اتارے، کپڑے اور بوٹ بھی اتارے۔ اپنے جمع کیے ہوئے پودے چٹانوں میں محفوظ کیے پھر دونوں نے گھنٹوں کے بل جھک کر اللہ سے دعا کی۔ ایک دوسرے سے بغلیں ہوئے۔

”تم ایک بہترین دوست ہو فل۔“ راجر نے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ تم یہ مشکل مرحلہ ضرور طے کر لو گے۔ اب میں تم تک کشتی کرتا ہوں۔ پھر ہم اکٹھے پانی میں چھلاگ لگا دیں گے۔ ایک..... دو.....“ اس کے تین کہنے سے پہلے ہی فل نے پانی میں چھلاگ لگا دی۔ پانی نے اس کے پیچھڑوں سے ایک دم ہی ہوا نکال دی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔ اسی وقت اس نے راجر کے پانی میں چھلاگ لگانے اور چھیننے کی آواز سنی۔ ”ایک شخص ایسے

ملا محمود فاروقی

1585-1652ء

ملا محمود بن محمد بن شاہ محمد جوہوری۔ ہندوستان کے ایک عظیم عالم اور منطقی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور اس کے بعد اساتذ الملک محمد افضل جوہوری سے حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں منطق اور فلسفہ کی تکمیل کی۔ جب ان کی شہرت شاہجہان بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے انہیں آگرے میں طلب کیا اور اپنے وزیر اعلیٰ سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ان کے شہر پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ بالآخر انہیں درباری علماء میں شامل کر لیا گیا اور سہ صدی کے منصب سے نوازا گیا۔ وہ مصاحب کی حیثیت سے سفر میں شہنشاہ کے ساتھ رہے۔ لاہور کے شاہی دورہ کے موقع پر ملاشاہ میر بدحسی نے انہیں سختی سے فہمائش کی کہ وہ دنیا داری میں بہت زیادہ الجھ گئے ہیں اور بادشاہ کی ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی۔ اس بات سے متاثر ہو کر ملا موصوف نے شاہی ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے گاؤں واپس جا کر تدریس کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہجہان کے دوسرے بیٹے اور اس وقت کے بنگال کے حاکم شاہ شجاع نے، جو ان سے فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھتا رہا تھا، انہیں ڈھاکہ بلالیا۔ فلسفہ اور علم البلاغت پر ایک عظیم سند کی حیثیت سے انہیں بلند عالم مانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے منہ سے کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جسے بعد میں واپس لینا پڑا ہو، اور نہ کبھی کسی حلفیہ بیان کی تردید کی۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان کا شمار قدیم شیعی فقہاء میں کیا ہے۔ جوہوری ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ ملا صاحب کی تصانیف یہ ہیں۔ 1۔ اشس البازغہ۔ 2۔ الفرائد فی شرح الفوائد۔ 3۔ الفرائد المحمودیہ۔ 4۔ حاشیہ علی الآداب الباقیہ۔

مرسلہ: نوازش علی، کراچی

مرد پانی میں آخر کتنی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے؟ پانچ منٹ یا شاید دس منٹ۔“

فل نے اپنے آپ کو سطح آب سے نیچے رکھنے کی کوشش کی کیونکہ سمندر ہوا کے مقابلے میں گرم تھا۔ تیرتے تیرتے وہ مڑ مڑ کر راج کو بھی دیکھتا جا رہا تھا وہ ڈر رہا تھا کہ راج کہیں ہمت ہی نہ ہار جائے اور ساحل تک پہنچنے سے پہلے فرقاب ہو جائے۔

ساحل سے آدھے فاصلے پر پہنچ کر راج نے اپنے بازوؤں ہوتے محسوس کیے اور مڑ مڑ کر اپنی ٹانگوں کو دیکھا کہ آیا وہ حرکت کر رہی تھیں یا نہیں۔ ”مجھ میں تو اب ساحل تک پہنچنے کی سکت نہیں۔“ اس نے مایوسی سے سوچا۔

اس دوران فل اٹھلے پانیوں میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے مڑ مڑ کر راج کو دیکھا اور پکارا۔ ”چلے آؤ راج! ہمت کرو۔“ اس کی کھال تیز و تند ہواؤں سے جی جا رہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دوست کو بچا لانے کے لیے دوبارہ سمندر میں جانے کے لیے تیار تھا۔

راج ساحل سے پچاس فٹ کی دوری پر پشت کے بل تیر رہا تھا کہ بہتر طور پر سانس لے سکے۔ وہ اس وقت اپنے باپ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو چند ماہ پیشتر انتقال کر گیا تھا۔ پھر اسے اپنی بیوی کا خیال آیا جسے وہ شاید اب کبھی نہ دیکھ سکتا۔ پھر اس نے سمندر کا سرد پانی اپنے منہ میں جاتے محسوس کیا اور اپنے پیروں کے نیچے زمین بھی محسوس ہوئی۔ آبی دھارے کی مدد سے وہ رینگتا ہوا چٹانی ساحل پر چڑھ گیا۔ اس نے لڑھک کر سمندر میں جا گرنے سے بچنے کے لیے سمندری گھاس اپنی گرفت میں لے لی۔ اس میں اب مزید آگے بڑھنے کی سکت نہیں تھی۔

ادھر ساحل پر اترنے کے بعد فل اس کاٹیج کی طرف روانہ ہو گیا جہاں انہوں نے اپنا ٹرک کھڑا کیا تھا۔ ”میں مدد لینے جا رہا ہوں۔“ اس نے زور سے چلا کر کہا کہ شاید راج اس کی آواز سن لے۔ اس کے کپڑے جم کر خف ہو چکے تھے۔ اس کے بازو اور ٹانگیں سن تھیں۔ اس لیے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا۔ برف کی وجہ سے ہٹائیں پھسلواں ہو رہی تھیں اور بار بار گر جاتا تھا۔ ایک جگہ وہ بری طرح سے پھسل گیا اور پشت کے بل گر گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چاہا کہ سورہے مگر پھر اسے راج کا خیال آ گیا وہ اگر کچھ نہ کرتا تو راج کو ہمیشہ

کے لیے کھودتا۔

وہ بالآخر ٹرک تک پہنچ ہی گیا۔ خوش قسمتی سے اس نے اس میں چابیاں لگی رہنے دی تھیں اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

نارم لیبی اور اس کی بیوی وہاں سے آدھ میل کی دوری پر سڑک کے کنارے رہتے تھے۔ ڈھائی بجے کے قریب ان کے کتے نے بھونکنا شروع کیا۔ جب نارم نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے عجیب سے رخ بستہ آدمی کو کھڑے پایا۔ اس کے بالوں اور داڑھی پر برف جمی ہوئی تھی۔ اس کی کھال سفید اور موم کی طرح چمک رہی تھی۔ ہونٹ نیلے پڑے تھے۔

”میرا دوست وہاں ساحل پر پڑا ہے۔“ اس نے چلا کر نارم سے کہا۔

”وہ کون ہے اس کا کیا نام ہے؟“ نارم نے کوئی خیال آتے ہی پوچھا۔

”راجر..... راجر جینڈل..... میں اسے ساحل پر چھوڑ کر مدد لینے یہاں پہنچا ہوں۔ ہم دونوں سمندر میں گئے تھے۔“

نارم نے اپنی بیوی کے رشتے دار کا نام پچان لیا۔ اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو آواز دی اور انہیں فل کو اندر لے جا کر بستر پر لٹانے اور ٹبل اوڑھانے کی ہدایت کر کے خود راجر کی تلاش میں ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔

فل کی بین سنڈی ٹیکنیکل چار سال سے ہیلز آئی لینڈ کے اسپتال میں ایمرجنسی میڈیکل ٹیم میں چلی آرہی تھی اور ہنگامی حالات کی صورت میں وہاں کے لوگ اسے گھر پر بھی فون کیا کرتے تھے۔ دو بج کر بیس منٹ پر ایک نوجوان خاتون نے اسے فون کیا۔ ”آپ کا بھائی، وہ سمندر میں گئے تھے، جلدی پہنچئے۔“ اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی۔ نارم لیبی کی بیٹی یہ بتانے میں ناکام رہی کہ فل کہاں تھا اور وہ خود کون تھی۔

سنڈی نے جونز پورٹ میں ایبویٹس کے عملے کو فون کیا لیکن لائن مصروف تھی۔ اس پر اس کا شوہر خود ان لوگوں کی طرف روانہ ہو گیا اور سنڈی کا ریش بینڈ کر فل کے ٹرک کی تلاش میں نکل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ فل اور جو کوئی بھی اس کے ساتھ تھا اگر ڈوب نہیں گئے تو جی ہائی پوٹر میا سے ان کے بیچ نکلے کے امکانات پچاس فیصد ہوں گے۔ انہیں ہارٹ ایکٹ بھی ہو سکتا تھا۔ بے ہوشی بھی۔ ان کے دماغ کو بھی نقصان

پہنچ سکتا تھا۔

سنڈی کو راستے میں ایبویٹس مل گئی۔ وہ اس میں سوار ہو گیا۔ وہ اور ڈرائیور مل کر فل کو تلاش کرنے لگے۔ جلد ہی انہوں نے اس کے ٹرک کو نارم لیبی کے گھر کے باہر کھڑے دیکھ لیا۔

گھر کے اندر اچھا خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ درجن بھر کے قریب افراد وہاں جمع تھے۔ لیبی نے راجر کو ساحل کے قریب درختوں میں پڑے دیکھ لیا تھا اب وہ اور فل دونوں تو لیں اور بھاری کمبلوں میں لپیٹے بستروں پر پڑے تھے۔ سنڈی نے ان کے داسٹل سائیز لیے، ان کی نبضیں بے ترتیب اور بلڈ پریشر گرا ہوا تھا۔ پیٹھے اکڑے ہوئے اور آنکھوں کی پتلیاں بے ترتیبی سے حرکت کر رہی تھیں۔ اس نے پہلے راجر کو ایبویٹس میں ڈالنا کہ اسے گرم آکسیجن دی جائے۔ پھر فل کو اندر لایا گیا۔ اس کے پیٹھے اس حد تک اکڑے ہوئے تھے کہ سنڈی کو ڈر تھا کہ اسے حرکت دینے کی صورت میں اس کی کوئی ہڈی ہی نہ ٹوٹ جائے۔

جب فل اور راجر کو اسپتال پہنچایا گیا تھا تو اس وقت فل کا ٹمبر پچر پینتیس ڈگری اور راجر کا چونتیس ڈگری تک پہنچا ہوا تھا۔ دونوں کو دوا دے کر گرم پانی کے کمبلوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ ان کے خطرے سے باہر ہونے کی پہلی علامت اس وقت نمودار ہوئی جب فل نے کپکپاتا شروع کیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کا جسم اس حد تک گرم ہو چکا تھا کہ سردی محسوس کر سکتا۔ ایک گھنٹے بعد راجر بھی کپکپانے لگا۔

اس رات کوسٹ گارڈز کی اطلاعات کے مطابق ان کی سسٹی کہیں بھی نظر نہیں آئی..... اس پر راجر کے بھائی اور بن نے اسے اپنے طور تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ تلاش بسیار کے بعد اسے کئی سمندری پودوں کی ایک لکڑی سے چند میل دور خشکی پر پہنچی ہوئی مل گئی۔ اور بن کو وہاں راجر اور فل کے بیچ کیے ہوئے گھونٹھے بھی مل گئے۔ وہ انہیں مارکیٹ لے گیا۔ پھر اگلے دن راجر اور فل کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ راجر نے اسپتال سے گھر پہنچنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ کسٹی پر بادبان لگا دیا۔

اس حادثے نے راجر اور فل کو عمر بھر کے لیے یک جان دو قالب بنا دیا۔





نام

عائشہ انور

اس کے والد نے ایک ایسا نام رکھا تھا جس میں کوئی جاذبیت نہ تھی، اسی لیے فلم ساز نے اسے نیا نام دیا اور یہ نام ایسا مقبول ہوا کہ اب اس کے اصل نام سے اسے کوئی بھی پہچانتا نہیں۔

یہ نام ایسے گھس نے دیا اب کسی کو گھسی یاد نہیں

”بھائی! تمہاری یہ بیٹی تو روتی بھی سر میں ہے۔“
 ”بدمسالو طنز کے تیز“ مدد علی دل ہی دل میں بولا۔ ”میں
 گاتا بجاتا ہوں نا، میرا پیشہ موسیقی ہے نا، اس لیے میری بہن
 مجھے جلا رہی ہے۔ مگر اس کی گود میں جو بچی روئی تو اس نے بھی
 چونک کر بچی کو دیکھا۔“ ارے یہ تو واقعی سر میں رو رہی ہے۔“
 وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔
 ”ہاں! میں کوئی غلط کہہ رہی تھی؟“ بچی کی پھوپھی
 مپرست لہجے میں بھائی سے بولی۔ ”اللہ اسے نظر بد سے
 بچائے۔“
 ”ہاں پر! اللہ اسے حیات دے اپنے امان میں رکھے،

آج سے 80 سال پہلے یعنی 1926ء کے ستمبر مہینے
 میں پنجاب کے شہر قصور کے محلے مراد میں ایک غریب خاندان
 میں ایک بچی پیدا ہوئی۔ پیدا ہونے کے بعد سارے بچے
 روتے ہیں۔ وہ بھی روئی۔ یہ چرچ فبی بی کے پاس اس کی نند اور
 نومولود کی پھوپھی بھی موجود تھی۔ اس نے بچی کو روتے ہوئے
 دیکھا تو چونکے بغیر نہیں رہی۔ ذرا دیر بعد اس نے بچی کو گود میں
 لیا اور اپنے بھائی مدد علی کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔ ”مبارک
 ہو ایک اور بیٹی کا باپ بننا۔“

غریب مدد علی جو دو بیٹیوں سمیت بارہ بچوں کا باپ
 پہلے ہی تھا یہ سمجھا کہ بہن اس پر طنز کر رہی ہے مگر بہن بولی۔

میرا تو دل کہے ہے یہ بچی اپنی آواز کی بدولت ایک دن بہت مشہور ہوگی بڑا نام کمانے گی۔“

اور پھر گھر کے تمام بڑوں کے مشورے سے اس کا نام اللہ وسائی رکھ دیا گیا۔ بچی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اس کے اندر چھپی صلاحیتیں سامنے آنے لگیں۔ چار پانچ سال کی عمر میں وہ ہر بات آسانی سے ذہن نشین کر لیا کرتی تھی۔ وہ کوئی لوک گیت ہو یا تھیٹر کا پاپلر گانا، اب اس کے باپ مدد علی اور ماں فتح بی بی کو احساس ہوا کہ ان کی یہ بیٹی غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اللہ نے چاہا تو دنیا میں کچھ خاص کام کرے گی۔ جس شخص کا جو پیشہ ہوتا ہے اس کی اولین خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد بھی اس پیشے سے وابستہ ہو جائے۔ میاں بیوی کے باہم مشورے سے اپنی بیٹیوں عیدیں بانی، حیدر باندی اور اللہ وسائی کو موسیقی اور فن کی تربیت دلوانا شروع کر دی گئی۔ لڑکیوں کا باپ مدد علی پیشہ ور موسیقار تھا اور گھروں میں ہونے والی فنی تقریبات کے علاوہ مقامی تھیٹر میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ تربیت کے دوران سب سے چھوٹی بہن اللہ وسائی بڑی بہنوں سے زیادہ تیزی سے سرتال کے مدارج طے کرتی گئی۔ لیکن بیگم جوان کی استاد تھیں انہوں نے بھی عیدیں بانی اور حیدر باندی سے زیادہ توجہ اللہ وسائی پر دینا شروع کر دی۔ وہ اسے روزانہ بارہ گھنٹے ریاض کرواتیں۔ اس کے باوجود بچی نہ گھبراتی نہ اتنی محنت کرنے سے کتراتے۔ اس کے شوق اور اس کی دلچسپی کو دیکھ کر لیکن بیگم بھی خوش ہوتیں اور ماں باپ بھی۔ اس کے شوق کو دیکھ کر لیکن بیگم نے مدد علی اور فتح بی بی کو مشورہ دیا کہ اب اس کی تربیت کے لیے استاد غلام محمود کی خدمات حاصل کرو۔ استاد غلام محمود نے اس بچی کو آواز کے اتار چڑھاؤ کے اسرار و رموز بتائے۔ انہوں نے اسے ٹھہری، خیال اور دادر میں مہارت دلائی۔ استاد نے مدد علی کو کہا۔ ”یہ غیر معمولی صلاحیتوں کی بچی ہے اگر اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہو تو اسے فن اور آرٹ کی دنیا سے متعارف کراؤ۔“

یہ بچی گانے کے ساتھ ساتھ ناچنے اور ٹونکی والوں کی نقلیں بھی اتارنے لگی تھی۔ اس کے موسیقار باپ نے استاد کے مشورے پر اس کو فن کی دنیا تک لے جانے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیا اس کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اسے بطور چائلڈ اسٹار خاموش فلم ”ہند کے تارے“ میں کاسٹ کر لیا گیا۔ یہ فلم 1930ء میں ریلیز ہوئی تو وہ ایک نئے روپ میں نمودار ہوئی تھی۔ اس کی آواز سے ہٹ کر اس کی یہ خوبی بھی کہ

اسے اس روپ میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ اسی زمانے میں کلکتہ آرٹ اور فن کا بہت بڑا اور ممتاز مرکز تھا۔ مدد علی دوستوں اور بیوی خاواہوں کے مشورے پر اپنے خاندان کے ہمراہ کلکتہ منتقل ہو گیا۔ وہاں بھی اس پیاری سی بچی کو کئی خاموش فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جس کے بعد اسے ایک کامیاب چائلڈ اسٹار تسلیم کر لیا گیا۔ کلکتے کے دوران قیام ناموں گلوکارہ مختار بیگم نے اس بچی کو دیکھا تو بے حد متاثر ہوئیں۔ انہوں نے اپنے محبوب شوہر آغا حشر کاشمیری سے بچی کی متعارف کرایا کہ ان کی وساطت سے یہ بچی کلکتے کے تھیٹر ورلڈ میں بھی چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

وقت گزرنے کے ساتھ یہ بچی بھی آہستہ آہستہ بڑی ہو رہی تھی اور اس کا فن بھی روز بروز ترقی پاتا جا رہا تھا۔ 1935ء میں ڈائریکٹر کے ڈی مہرا نے اس بچی کو اپنی فلم ”شیل عرف پنڈ دی کڑی“ میں بطور اداکارہ و گلوکارہ کاسٹ کیا۔ یہ اس کی پہلی فلمی گائیکی تھی۔ اس فلم کا ایک گانا ”لنگ آچا پنن دایار“۔ بعد مقبول ہوا۔ اس فلم کے بعد اس نے بہت سی فلموں میں چائلڈ اسٹار اور پھر سائیڈ ہیروئن کے طور پر بھی کام کیا۔ ان فلموں میں مسٹر اینڈ مسز بیگم (1936ء)، ہیر سیال (1937ء)، سسی پنڈ (1938ء)، بگل بکاؤلی (1939ء)، یہلا جٹ (1940ء) اور چودھری (1941ء) قابل ذکر ہیں۔ یادش بخیر، یہ ان دنوں کی بات ہے جب مختار بیگم نے آغا حشر کاشمیری سے اس بچی کا تعارف کرایا اور اس کی خداداد صلاحیتوں کا ذکر کیا تو آغا حشر کاشمیری نے بڑے پیار سے پوچھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا مٹی؟“

”اللہ وسائی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ کہنے کے ساتھ ہی آغا صاحب کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

”کیا بات ہے۔ یہ نام جناب کو پسند نہیں آیا؟“ مختار بیگم بولیں۔

”ارے بھئی! یہ بھی کوئی نام ہے؟ تم کہتی ہو کہ اس کے گلے میں بڑا نور ہے۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“

”پھر تو۔۔۔۔۔ پھر تو اس کا نام۔۔۔۔۔“ آغا صاحب پُر خیال انداز میں بولے۔

”پھر تو اس کا نام نور جہاں ہونا چاہیے۔“

”اور پھر۔۔۔۔۔ اللہ وسائی اللہ وسائی نہیں رہی، نور جہاں ہوگی اور اس کے گلے کا نور سارے جہاں میں پھیل گیا۔“



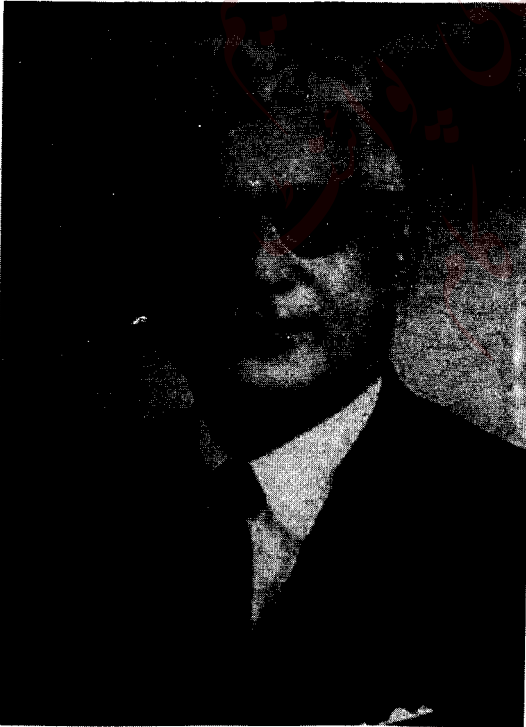
کہا جاتا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے۔ موسیقی تقریباً ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہے۔ مثلاً پرندوں کا چہچہانا، کوئل کی کوک، تیتھر کی بولی مرغ کی اذان، بہتی ندیا کی گنگناہٹ، جھرنوں کا ترنم، بارش کی رجم یہ سب قدرتی موسیقی کے مختلف پہلو ہیں چنانچہ اشرف المخلوقات کیوں کر اس سے عاری ہو سکتی ہے۔ سوانسان نے نہ صرف اسے اپنا بیا بلکہ اسے مختلف صورتوں میں ڈھالا، کئی روپ بخشے پرورش و پرداخت کی ترقی دی وحشی اور جسمانی تسکین کا ذریعہ بنایا۔ موسیقی کو باضابطہ اور باقاعدہ علم کا درجہ ہندو دھرم نے دیا جس کے پیچھے مذہبی عقیدت اور دیوی دیوتاؤں کو خوش رکھنے کا جذبہ کارفرما تھا اسی لیے سر، ٹھانڈھ، راگ اور راگینیاں وغیرہ۔ تقریباً سبھی نام ہندی اور سنسکرت زبان کے ہیں اور ان سب کے باقاعدہ اوقات مقرر اور مسلم ہیں۔ موسیقی

کی دیوی کو سروتی ماں یا سروتی دیوی کہا جاتا ہے۔ سروتی سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ بولنے کی طاقت، نطق، علم، عقل، گائے آسانی آواز، اچھی عورت، وہ ملک جس میں جمیلیں اور تالاب زیادہ ہوں۔ سروتی دیوی کا تہوار پانچ ماگھ کو ہوتا ہے جسے سروتی یوجا یا سروتی پوجن کہا جاتا ہے۔ عام لوگ اس تہوار کو بسنت پنچمی کا نام دیتے ہیں۔ سروتی دیوی برہما دیوتا کی استری (بیوی) ہے اور جملہ علوم و فنون کی موجد خیال کی جاتی ہے۔

موسیقی کی ابتدائی ایجاد بھی ہندی ہی ہے یعنی سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔ جو سا سے شروع ہو کے سا پر ہی ختم ہوتا یا رک جاتا ہے۔ وہی ہندو فلسفہ کہ وقت ایک دائرے کی صورت اپنا چکر مکمل کرتا ہے اور ہر دس ہزار برس بعد اپنا دور پورا

موسیقی سے رغبت رکھنے والوں کے لیے تحفہ خاص

سُرتان کی ایک الگ دنیا ہے۔ ایک وسیع علم ہے۔ ہر کوئی گنا سکتا ہے لیکن سرپیدا نہیں کر سکتا ہے۔ میان تان سین سے لے کر آج تک بے شمار اراہ داد نے اس فن کی خدمت کی ہے۔



سُر چھاگل

ایاز راہی

کرتا ہے۔ سرگیت کے آٹھ ابتدائی حروف مختلف طور رکھتے ہیں۔ انہی کو ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ۔ اور پھر اٹھ آٹھ سات چھ پانچ چار تین دو ایک۔ بار بار دہرا کے مشق کی جاتی ہے یعنی سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ لی۔ سا۔ اور۔ سا۔ لی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ گا۔ رے۔ سا۔ موسیقی کے ان آٹھ حروف کی مزید تفصیل کے سا (کھرج رے)۔ (رکھ) گا (گندھار) ما (راہم) پا (پنجم) دھا (دھی وت) لی (نکھا) سانی ور یہاں مزید گہرائی میں جانے سے طوالت کا خوف مانع ہے کہ دیگر علوم کی مانند علم موسیقی بھی ایک سمندر ہی ہے جہاں عمر بھر کی تیراکی اور غواہی کے بعد ابھی صرف قطرہ بھر ہی لے پا تا ہے۔ یہاں راگ راگنیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان گنت سُر اور سورتیں ہیں گو کہ کسی بھی دھن کو الفاظ کی شکل میں لکھا جاسکتا ہے لیکن موسیقی ساز و آواز کا ہی کلیتہاً عملی اظہار ہے اس کے لیے مسلسل ریاض کرنا پڑتا ہے۔

تب نظر آئی ہے اک مصرع ترکی صورت

خواہ وہ موسیقار ہو گلوکار یا سازندہ۔ لگاتار محنت شرط ہے کہ یہ تجربے اور مشق کی چیز ہے۔ جنوں کا پھل ہے ہندوؤں نے موسیقی کو اپنے دھرم کا انوث انگ بنایا اور لازم فرما دیا کہ دھرم کی بنیاد ہی فنون لطیفہ (ناچ، گانا، شاعری، مصوری، بت گری) پر مشتمل اور قائم ہے۔ مسلمان اس بزم رنگارنگ میں آئے تو ہندو موسیقاروں اور علما کے دیے مدغم پڑ گئے۔ مسلمانوں نے میدان رزم کے ساتھ ساتھ اس بزم رنگارنگ میں بھی وہ رنگ جمایا کہ بڑے بڑے ہندو گیانی۔ پنڈت اور گرو بھی مان گئے۔ انہیں سر جھکاتے ہی بن پڑی کہ مسلمان

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
کی عملی مثال تھے گو کہ آج زوال کا شکار ہیں۔ علم موسیقی کے حوالے سے برصغیر میں سب سے پہلے امیر خسرو کا نام آتا ہے یاد رہے کہ امیر خسرو ترکوں کے قبیلے لاجپن کے چشم و چراغ تھے انہوں نے فن موسیقی میں بہت سی نئی اختراعات کیں اور ہندو علما و موسیقاروں پر اپنی دھاک بٹھادی۔ کسی بھی علم کا عالم اگر تخلیق کار بھی ہو تو سونے پہ سہاگا ہوتا ہے امیر خسرو نے نہ صرف بڑے بڑے جغادری پنڈتوں موسیقاروں اور گیانیوں کو زیر کیا بلکہ موسیقی کے نئے آلات طبلہ، سہ تار، ستار ایجاد کیے نئی راگ راگنیوں کو بھی تخلیق کیا۔ قول قوالی قلبانہ خیال، ترانہ، ان ہی سے منسوب ہیں اسی بنا پر وہ طوٹی ہند کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ امر ہوئے۔ دوسری طرف ہندی شاعری میں بھی میر قافلہ بنتے ہیں۔ بلاشبہ امیر خسرو نقد و شعر دونوں کے عبقری تھے۔

تاتاریوں (چنگیزی فوج) کے خلاف میدان جنگ میں لڑے بھی گرفتار بھی ہوئے اور پھر رہائی بھی پائی یہ بلتان (پنجاب) کا واقعہ ہے۔ غالب خستہ حال ہند میں اگر کسی کو شاعر مانتے ہیں تو وہ صرف امیر خسرو ہی ہیں غالب جیسا نابھہ روزگار بھی سلجواں ترک ہے۔ دونوں عبقری (امیر خسرو غالب) ہندوستانی نہیں مگر فاتح علم و ادب ضرور ہیں اور مسلم ہیں۔ ان کے مقابل کوئی بھی ہندوستانی سپوت نہ آسکا۔ یہی نہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جید عالم دین اور حدیث پڑھانے کے علاوہ بہت بڑے عالم موسیقی بھی تھے۔ بڑے بڑے ہندو موسیقار اپنے علمی جھنڈوں کا آخری فیصلہ انہی سے کراتے۔ شاہ صاحب کا فیصلہ مستند اور بالکل درست ہوتا ہے کسی سر جھکا دیتے کسی بھی علم کا حاصل کرنا برا نہیں۔ ہاں اس پہ عمل سوچ سمجھ کر ہونا چاہیے۔ علم نافع کی آرزو اور اس پہ عمل ہی بندگی ہے۔ آج کی اس مختصر قلمی نشست میں ایک ایسے موسیقار کا ذکر و تعارف مقصود ہے جو پاکستانی قوم کا محسن بھی ہے اور اس کا یہ احسان رہتی دنیا تک پاکستانی قوم پہ رہے گا لیکن انہیں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ صحیح حق دار تھے اور جو ان کو بے ہر حال ملنا چاہیے تھا مگر نہ ملا۔ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو مشاہیر کا درجہ بدیتیں اور ان کے سر پہ دانگی شہرت کا تاج رکھتی ہیں لیکن وائے قسمت ”ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ“ نہ جانے خود کو نوچنے کھسوٹنے کی یہ بری خوب تنک ہم پہ مسلط رہے گی؟ کہاں تک ہم اپنا حلیہ بگاڑتے رہیں گے؟ یہ سب تعلیم، علم اور شعور کے فقدان کا ہی نال ہے۔ پتا نہیں ایسے کتنے مخلص اور باہل لوگ اب بھی کم نامی کی تہہ میں ڈوبے پڑے ہیں جو اسلام اور پاکستان کے جاں نثار تھے جنہوں نے دیں و ملت کی خاطر قرن من و دھن سب کچھ لٹا دیا لیکن ہماری غفلت نے ان پر کم نامی کی مٹی ڈال رکھی ہے۔ یقیناً کہ اللہ ان سے راضی ہوگا اور آخرت میں وہ بامراد، خوش اور مطمئن ہی ہوں گے۔ مگر کیا ہم نے ان کا حق ادا کیا؟ ان کا جائز مقام ان کو دیا؟ میری مراد تو یہ ترائے کے موسیقار احمد غلام علی چھاگہ مرحوم ہیں جنہیں ہم نے نہ بحیثیت قوم طاق نسیاں میں بٹھا رکھا ہے۔ دن میں کم از کم ایک بار تو ان کی تخلیق کردہ دھن۔

پاک زمین شاد باد
خوشبو مسکین شاد باد

ہمارے کانوں میں ضرور ہی گونجتی ہے چاہے وہ سازوں کے بغیر سادہ طرز ہو یا سازینے کے ہمراہ نقد و شعر کی شکل میں لیکن احمد غلام علی کا نام بھی کبھی ذہن میں نہیں آتا۔ بقول شاعر۔
وہ لوگ جن سے تیری بزم میں ہیں ہنگامے

پا گیا کہ ایران نے ہی سب سے پہلے پاکستان کو تسلیم کیا تھا چنانچہ شہنشاہ کے استقبال کے لیے ترانہ (مع شاعری یا بغیر شاعری) بہت ضروری تھا۔ کئی موسیقاروں نے دھنیں بنا کر پیش کیں لیکن احمد چھاگلہ کے آگے کسی کا چرانغ نہ مل سکا کہ

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشنده

کسی نے بہت سی دھنوں میں سے چھاگلہ صاحب کی دھن کا انتخاب کیا۔ احمد چھاگلہ صاحب نے اپنے ایک ساتھی اور مجری فوج کے سازینے (نیو پیڈ) کے ہمراہ دھن کو مکمل کیا اور شہنشاہ ایران کا استقبال صرف دھن بجائے کیا گیا یوں اک اہم قومی فریضے کو تکمیل تک پہنچایا گیا۔ چھاگلہ صاحب پاکستان کے دھن اور قومی ہیرو قرار پا گئے۔ وہ اپنی زندگی کا بڑا مقصد حاصل کر چکے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کی زندگی میں ہی حفیظ جالندھری مرحوم ترانے کے اشعار لکھ چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد چھاگلہ صاحب حفیظ جالندھری صاحب سے طے تو آب دیدہ ہو گئے کہنے لگے یا حفیظ! تم نے میرا مردہ خراب ہونے سے بچالیا ہے۔ یہ ایک بڑے تخلیق کار کا دوسرے بڑے تخلیق کو خراج عقیدت اور سانس گزاری تھا۔ بالآخر نقد و ترنم سے چھلکتی یہ سرچھا گل ہم سے ٹھوگئی۔ احمد چھاگلہ صاحب نے فردری 1953ء میں اس جہان رنگ و بو کو الوداع کہہ دیا۔ نصف صدی کی عمر پا کر وہ صدیوں بلکہ رہتی دنیا تک کے لیے ابر ہو گئے۔ زندہ ہیں اور رہیں گے۔ 1949ء میں دھن ترتیب دی۔ ان کی وفات کے بعد مکمل قومی ترانہ مع شاعری اگست 1954ء کو مرتب ہوا اور پہلی بار اگست 1955ء کو نشر کیا گیا۔ دھن کے بنانے میں انہیں ساز استعمال ہوئے دورانہ ایک منٹ بیس سیکنڈز ہے۔ پہلی مرتبہ جن گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے اس ترانے کے مکمل کرنے میں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں۔ احمد رشدی، کوکب جہاں، زوار حسین، شمیم بانو، اختر عباس، نجمہ آرا، غلام دہگیر، نسیم شاہین، انور ظہیر اور اختر وحی علی۔ احمد چھاگلہ صاحب کو قومی ترانے کی دھن تخلیق کرنے پر 1996ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی (پریڈیڈنٹ پرائیڈ آف پرفارمنس) کے لیے نامزد کیا گیا اور پھر مارچ یوم پاکستان کے موقع پر انہیں یہ تمغہ صدارت پاکستان (قانون لغاری مرحوم) نے دیا جو ان کے لواحقین نے وصول کیا۔ احمد غلام علی چھاگلہ مرحوم موسیقار ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ دان، صحافی اور مصنف بھی تھے۔ غالب اور اقبال پر کثیر مضامین لکھے۔

گئے تو کیا تیری بزم خیال سے بھی گئے؟
پہلے مصرع میں تھوڑے سے تصرف کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ روزانہ صبح ہر اسکول میں اس کی اور ترانے کے بعد یہ تو بتایا جاتا ہوگا کہ قومی ترانے کے خالق شاعر حفیظ جالندھری مرحوم ہیں لیکن قومی ترانے کے خالق موسیقار کا کوئی ذکر نہیں ہوتا ہوگا کہ غالباً سا تذکرہ بھی اس سے لاعلم ہوتے ہیں۔

احمد غلام علی چھاگلہ 31 مئی 1902ء کو کراچی کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے ان کے والد غلام علی چھاگلہ دو سال تک کراچی میں میونسپلٹی کے تیسرے منتخب صدر رہے۔ احمد غلام علی چھاگلہ نے تعلیم کا آغاز مدرس الاسلام سندھ سے کیا۔ موسیقی سے انہیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ ہندوستانی روایتی موسیقی اور مغربی روایتی موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ مشرقی اور مغربی دونوں اقسام کی موسیقی سے شغف گہرا ہوتا گیا۔ انہوں نے مغربی موسیقار دفن کا رچیمو کزنز کی شاکردی میں مغربی و مشرقی موسیقی کا درس لیا۔ اس سے انہیں مغربی اور مشرقی دونوں قسم کی موسیقی میں مشترکہ چیزوں کی جستجو ہوئی اور انہوں نے دونوں کو قریب لانے کی کوشش میں دلچسپی لی۔ دوسری طرف مشرقی موسیقی میں گہرائی حاصل کرنے کے لیے بہت سی جگہوں کا دورہ بھی کیا۔ 1923ء میں کراچی سے براستہ بلوچستان، عراق، ایران مع تہران بحیرہ پسنس، تبریز اور کرمان شاہ وغیرہ گئے واپسی میں بلرہ (عراق) سے ہوتے ہوئے کراچی لوٹے۔ لندن فرینش کانجے سے موسیقی کی ڈگری لی۔ کراچی سے یورپ تک گھومے یہ دیکھنے کے لیے کہ مغرب میں مشرقی موسیقی کا سراغ کہاں کہاں ہے؟ ان اصرار و دیار میں جرمنی، چیکو، سلواکیہ، ہنگری (بینلین) ترکی، شام، فلسطین اور عراق شامل ہیں۔ موسیقی کی عملی تعلیم بھی حاصل کی کہ پڑھانا آموختہ کیسے سامنے آتا ہے۔ مثلاً اوپیرا ہاؤس۔ سمفنی اور آرکسٹرا وغیرہ۔ اسی طرح روایتی مغربی موسیقی کے علاوہ جدید آرکسٹرا وغیرہ میں بھی پڑھنے پڑھانے کا عملی اظہار کیا۔ سفر بھی مسلسل کرتے رہے شوق کے لیے، دوبارہ یورپ کا دورہ کیا۔ آخر کار دورے میں واپس آ کر کچھ عرصہ کے لیے وہ کراچی سے بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہاں ہندوستانی موسیقاروں سے مل کر مزید معلومات حاصل کیں۔ فن موسیقی اور تہذیب کے حوالے سے کئی سلسلہ وار مضامین لکھے۔ انہیں پاکستانی قومی ترانے کا ممبر چنا گیا کسی کا مقصد پاکستان کے لیے مکمل قومی ترانہ بنانا تھا قومی ترانہ کسی بھی ملک کا چہرہ اور پہچان ہوتی ہے۔ ادھر شہنشاہ ایران (آریا مہر محمد رضا شاہ پہلوی) کا پاکستان کا دورہ طے



قسط: 7

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور انحرام آیا تھا احمد حسین پر اس برہم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ ذہیرہ کے ساتھ مل کر قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی پوچش میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ سندھی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر اٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر رہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو محتول کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر رہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہن کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا منہج آگیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن ذہیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سننے جس نے رخصت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ اس میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ڈرے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود گی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پائڈر میں برہمن لوگوں ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سنا رہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف محمد رنیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سننے ہی میں الجھ گیا۔ گنڈر سپورٹ کی گاڑیاں آتی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گنڈر کی آڑ میں غشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری حنا منسو خ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ اودلا اور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی ہائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری سے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ حوالا میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں بھی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

میں جیسے بالکل ڈھسے جانے کے انداز میں وہیں بستر پر گر گیا تھا۔ مجھے چکر سا آگیا تھا۔
”میرے چشم تصور میں خورشید خاں المعروف نے میاں کی بیٹی ثوبیہ کی شبیہ ابھرنے لگی۔ کیا حالت تھی اس کے بد نصیب باپ اور بھائی اختر کی جب وہ اپنے گھر سے اچانک غائب ہو گئی تھی، پھر اس کے کچھ ہی دن بعد ثوبیہ کی لاش مل گئی تھی..... تو کیا، عاصمہ کی بھی..... تھوڑے دنوں بعد.....“

”نن..... نہیں..... اللہ نہ کرے ایسا ہو۔“ میں چیخ اٹھا۔

یہ سب سوچ سوچ کر میرا اندر دھواں دھواں ہوئے جا رہا تھا۔

”کب تک ہم آہستہ بولیں گے بھائی جان؟ صبح تک یہ سب چلا کر کہا جا رہا ہوگا..... ایک پھانسی کے سزا یافتہ اور قاتل غلام حسین کی جوان بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔“

میں سناتے میں آگیا تھا۔ چھوٹے بھائی فہیم کے اس طرح مجھے پھڑ مارنے کا دکھ اپنی جگہ مگر بہن عاصمہ کی اس اطلاع نے مجھے سرتا بالرزادیا تھا، پہلے تو مجھے اپنی ساعتوں پر شبہ ہوا تھا مگر پتھر پڑنے مجھے یہ باور کرایا دیا تھا کہ فہیم کی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی تھی، ورنہ وہ کیوں بڑے بھائی کو اس طرح پھڑ مارنے کی بد تمیزی کرتا، یہنا غم و غصے نے اس کے بھی اوسان خطا کر دیے تھے۔
مجھے اس طرح گم غم سا پار کہ وہ میری طرف گھورتے ہوئے پھٹی پھٹی آواز میں چیخا۔

”بھائی جان! عاصمہ بہن بھاگ گئی ہے اب ادھر ہی آپ اپنی اور میری قبر کھودیں جس میں ہم دونوں خود کو دفن کر سکیں، تاکہ ہمیں صبح دیکھنا اور محلے والوں کی باتیں سننا نصیب نہ ہوں۔“

”ش..... شش..... آہستہ..... مم میرے بھائی! آہستہ۔“ میرے منہ سے بس یہی الفاظ برآمد ہو سکے تھے اور

فہیم اپنے آپ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اپنے کشیدہ پڑتے اعصاب اور خصل پڑتے حواس کو معمول پر لانے کی عبت سی کوشش کرتے ہوئے اور اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف اشارتا اٹھاتے ہوئے بمشکل کہا۔

”فہیم! میرے بھائی..... سب ٹھیک ہو جائے گا، اس طرح پریشان اور غم و غصے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔“

”کیا اسی طرح ہی سب ٹھیک ہو جائے گا بھائی جان! جیسا کہ آپ کے کہنے پر اب تک سب ٹھیک ہو گیا؟“ وہ طنز یہ دکھ سے بولا۔ ”اسی سب ٹھیک ہونے کے انتظار نے ہی تو آج ہمیں یہ دن دکھایا کاش! آپ میری بات کو اتنا ہلکا نہ لیتے، کاش..... آپ اسی روز کوئی سخت قدم اٹھا لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

وہ یہ کہہ کر اور غصے سے اپنا پاؤں شیخ کر کرے سے نکل گیا، مجھ میں اسے آواز دینے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔

میں چند ثانیے اسی طرح بستر پر گرا پڑا بیٹھا رہا، میرا حلق سوکھ کر کاغذ ہو رہا تھا۔ میں بھی ایک عام انسان تھا، روایتی انسانوں والی بعض کمزوریاں میرے اندر بھی ہو سکتی تھیں۔ کوئی دکھ کی خبر یا ایسا کوئی بحران مجھے بھی اندر سے توڑنے کا باعث بن سکتا تھا۔ تاہم میں نے کچھ سینکڑوں تک گہرے گہرے سانس لیے اور پھر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”فہیم! میرے بھائی! کہاں ہو تم؟“
اپنے بھائی کو پکارتے ہوئے میں کمرے سے نکلا مگر فہیم کی کوئی آواز مجھے نہ آئی تو میں نے لرزتی ٹانگوں کے ساتھ بہن عاصمہ کے کمرے کا رخ کیا۔

عاصمہ کا کمرہ مجھے بھائیں، بھائیں کرتا محسوس ہوا۔ اس کے بستر کی چادر کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ کچھ دیر پہلے یا شاید چند گھنٹوں پہلے یہاں سو رہی تھی۔ میں اب فہیم کو آوازیں دینے کی بجائے عاصمہ کو آوازیں دینے لگا۔

”عاصمہ..... بہنا..... عاصمہ بہنا! کہاں ہو تم؟“

ایسے نازک اور غیر یقینی سے حالات میں انسان کا دماغ باڈا لگتی ہو جاتا ہے۔ وہ خوش فہمیوں میں پڑ کر کچھ اور بھی سوچنے لگتا ہے، جیسا کہ میں اب سوچنے لگا تھا۔

”کیا خبر! عاصمہ ادھر ہی کہیں ہو..... ہاتھ روم میں ہو..... کسی کام سے یا کپڑے ڈالنے چھت پر چلی گئی ہو یہ

بھی تو ہو سکتا ہے کروہ..... کسی اور کمرے میں ہو۔“

دل ہی دل میں یہی دعا میں مانگتا ہوا میں نے عاصمہ بہنا کی تلاش میں سارا گھر چھان مارا، چھت دیکھ لی، ایک ایک ہاتھ روم دیکھ لیا۔ دہلی دہلی آوازیں دے کر اسے پکارا بھی..... مگر کوئی جواب نہ ملا۔

مجھے اپنے حلق میں تھوہر اگئے محسوس ہونے لگے۔ میں نے پانی کے دو گلاس پڑھائے..... اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا یا راحا حاصل ہوا تو میں نے غور کرنا شروع کر دیا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ عاصمہ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ ابھی کل رات ہی تو میری اس سے اس نازک اور حساس موضوع پر بات ہوئی تھی اور اس نے پورے یقین سے کہا اور قدرے شرما کر کہا تھا کہ وہ ایسا کوئی قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔“

نیز یہ کہ وہ جس لڑکے کو چاہتی تھی بقول اس کے وہ ایک شریف انسان تھا اور عنقریب شرعی طریقے سے اسے اپنانے اور رشتے وغیرہ کی بات چیت کرنے کے لیے اپنے والدین کو بھی ہمارے ہاں بھیجے والا تھا تو پھر..... تو پھر یہ سب کیسے ہو گیا تھا؟“

میرا دل ہی کیا ذہن بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ قیامت سی قیامت گھڑی میرے سر پر مسلط ہو چکی تھی۔ اس کے پیچھے کچھ اور تھا، کیا تھا؟ اس کا کھوج لگانے کے لیے ایک وقت درکار تھا اور اسی بات پر مجھے ہول آ رہا تھا کہ میرے پاس وقت صرف سورج کے ابھرنے تک کا تھا۔ اسی کے بعد طرح طرح کے سوالات ابھرنا شروع ہو جاتے اور مجھے ہی ان کا جواب دینا تھا۔

رات کی کالی جادر بھاری سل کی طرح سرکتی محسوس ہو رہی تھی مگر اچھی بھی لگ رہی تھی کہ یہ سب کچھ ڈھانپے رکھتی ہے۔

مجھے ایک پل کے لیے بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ میری سانسیں بھول رہی تھیں۔ یہ دھیرے دھیرے سرکتا ہوا وقت مجھے کسی عفریت کی طرح اپنی جانب بڑھتا ہوا لگ رہا تھا، جیسے مجھے، اس گھر کو ہڑپ کرنے کے لیے بڑھا چلا آ رہا ہو۔ میں کبھی اس کمرے میں جاتا تو کبھی دوسرے کمرے میں کبھی صحن میں آ جاتا تو کبھی فہیم شروع کر دیتا۔ ایسے نازک اور کڑے وقت میں مجھے اپنے بھائی فہیم کے ساتھ کی ضرورت تھی مگر وہ شاید بدنامی کے خوف سے اور لوگوں کے

کاش! یہ وقت ادھر ہی رک جائے، اسے موت آجائے۔ کاش! ابھی دروازہ کھلے اور عاصمہ بہن اندر داخل ہو کر مجھ سے ”بھائی جان“ کہہ کر لپٹ جائے۔
میں نے یہ سوچ کر کئی بار منہ اندھیرے دروازہ بھی کھولا تھا۔ باہر سنسان پڑی گلی کے دونوں طرف بھی جھانکا تھا۔

جب صحن میں روشنی پھیلنے لگی تو میں کوئی بیسویں بار دروازے کی طرف بڑھا ہوں گا۔

دروازہ کھولا، باہر جھانکا۔ دودھ والے کی موٹر سائیکل کو کھڑکھڑاتے ہوئے آتے دیکھا اور ایک دم اپنے چہرے پر نظر، پریشانی اور تشویش آمیز آجارسے مبرا کرنے کی سعی کی۔

موٹر سائیکل کے دونوں طرف دودھ کے بھاری اور بڑے کین لدے جھول رہے تھے۔ مجھے تو اب اس دودھ والے سے بھی عجیب طرح کا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے دیکھ کر میں ایک دم اندر ہو گیا اور دروازہ بھی بند کر دیا۔ وہ مارن دینے لگا۔ مجھے ایک ایسی یوں لگا جیسے اس نے میری کوئی چوری چوکی چوکی ہو۔ میں جلدی سے پلٹا اور رسوکی میں جا کر پتیلی نکال لایا۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور پتیلی آگے کر دکھاتا کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اسے دیکھ کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

”ارے..... صاحب جی! لگتا ہے آج صبح سویرے ہی چائے کی طلب نے پریشان کر دیا ہے آپ کو..... اسی لیے آج باجی کی جگہ آپ تیار کھڑے ہیں۔“

وہ بڑے من موچی لہجے میں بولا اور بایک پر بیٹھے بیٹھے وہ گھوم کر پیتل کے پیانے سے دودھ نکالنے لگا۔ پتیلی میری طرف بڑھائی تو وہ قدرے چونک کر اور اپنی ہنسیوں سیکڑ کر بولا۔ ”صاحب جی! خیریت تو ہے؟ آپ پریشان نظر آرہے ہیں، کہیں خدا نخواستہ! باجی کی طبیعت تو خراب نہیں؟“

لاکھ اپنے چہرے کی پریشانی چھپانے کے باوجود اس نے تاڑی لٹی تھی۔ بھلا ہواس کا کہ سبب بھی اس بھلے مانس نے خود ہی بتا دیا۔

”ہوں..... ہاں..... ہاں بھائی! بے چاری کو رات سے ہی بخار ہے۔“ میرے منہ سے الفاظ پھسلے۔

”اللہ خیر کرے گا۔“ وہ یہ کہہ کر اگلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے ایک دم دروازہ بند کر دیا۔ جیسے

سوالات سے خوف زدہ ہو کر کہیں چلا گیا تھا۔ ایسے وقت، میں خود کو اس قدر تنہا محسوس کر رہا تھا، جیسے میرے سوا دنیا میں اور کوئی تھا ہی نہیں..... میں کس کو بلاتا؟ کسے آواز دیتا کہ آؤ..... میری بہن رات کے اس پہر غائب ہو گئی ہے۔ اسے ڈھونڈو۔

میں صحن میں آ گیا۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر سپیدی سحر کی روشنی سی نمودار ہونے لگی تھی۔ وقت فجر کی اذان ابھری اور مؤذن کی روح پرور آواز سے مجھے سکون ملا۔

”اللہ اکبر!“ اللہ سب سے بڑا ہے۔

”بے شک میرے مالک! میرے خالق تو سب سے بڑا ہے۔ میری مدد فرما۔“

بے اختیار میرے دریدہ دہن سے یہ دعائیں کلمات نکلے تھے۔ مجھے کچھ دلی سکون کا احساس ہوا۔ اندر راحت اترتے ہی میں نے سوچنا شروع کیا۔

یہ سب کیا ہو سکتا تھا؟ کون کر سکتا تھا؟
اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔
”اوغوا!“

کون لوگ ہو سکتے تھے؟ میرے دشمن؟ یا پھر وہی لوگ جنہوں نے خورشید خاں کی معصوم بیٹی کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ خورشید خاں کے دشمن میری اور میرے دشمن خورشید خاں کے نہیں ہو سکتے تھے تو کیا یہ کوئی اور لوگ تھے؟ کیا ایک ہی گروہ تھا۔ یا پھر یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ خورشید خاں کی بیٹی کے قاتل اور لوگ تھے اور عاصمہ بہن کو اغوا کرنے والے میرے دشمن۔

ایسے میں مجھے اس راہی پولیس افسر راجا دلاور اور سیٹھ ستار کی وہ دھمکیاں بھی یاد آئے گی تھیں، جس کا اعادہ وہ میرے سامنے بار بار کرتے رہے تھے۔

”مت بھولو، نعمان! کہ تمہاری ایک جوان بہن بھی ہے۔“

اور واقعی میں یہ بات بھول گیا تھا۔ اب یاد آ رہی تھی۔ آہ..... کیا ہو سکتا تھا اب۔

صحن میں سنک لگا ہوا تھا، وہاں جا کر میں نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ اپنے اندر کی اچھل کو مڑ سکون کیا، دماغ میں ہونے والی یلغار کو سرجھک کر رد کیا مگر سانپ کی طرح یہ رینکتا، گزرتا اور پیتا ہوا وقت مجھے دوبارہ ہلکان کرنے لگا تھا۔ صبح کا ڈب نمودار ہونے لگی تھی۔

آسمان سیاہ سے سپید ہو رہا تھا اور میں جیسے فریاد کرنے لگا کہ

تھوڑی دیر اور دروازے پر ہاتھ دھریا جاؤں گا۔

دو دھکے پٹی میں نے جین میں ڈھانپ کر رکھ دی۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا اور میرے دل و دماغ کی

حالت ایک بار پھر غری ہوئے لگی تھی۔

صبح ہو رہی تھی۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ باہر گاڑیوں

اور لوگوں کی باتوں کی آوازیں دھیرے دھیرے گونجنے لگی

تھیں۔ اکیلا گھر مجھے کانٹے کودوڑنے لگا۔ عاصم نہیں لوٹی،

پتا نہیں کہاں تھی وہ بے چاری! ایک جوان لڑکی کا ہمارے

سامج میں کیا دھار ہوتا ہے، کیا حیثیت ہوتی ہے بھلا۔ محض

ایک کچھ گھرے کی مثال، ایک ذرا سی خراش ایک لکیر جیسے

شفاف آئینہ ہو اور اس پر بال برابر بھی داغ پڑ جائے۔ کئی

سوال اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ایک جوان بہن کے رات سے غیاب پر میرے دل و

دماغ میں طرح طرح کے اندیشے اور دوسرے اٹھ رہے

تھے، کالے ناگ تھے فکر و تشویش کے، جو مجھے رہ رہ کر ڈس

رہے تھے۔ وہ کہاں تھی، کس حال میں تھی۔ رات بھی بیت

چکی تھی۔ اب تک اس کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا ہوگا۔ اس سے

آگے کا تصور ہی میرے لیے جاں کسل تھا۔ میرا سینہ گھٹنے لگا،

دماغ شل ہونے لگا جو دھکا دھواں میں تحلیل ہو رہا تھا۔

میں نے سوچا گھر سے باہر ہی نہ نکلوں، پھر سوچا، آخر

ایسا کب تک چلے گا، ایسے تو اور بھی شہ ہوگا لوگوں کو اور کون

سا لوگ میرے باہر نکلتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیں گے،

ابھی لوگوں کو بھلا معلوم ہی کیا تھا مگر فہم کدھر چلا گیا تھا؟ اس

کے بارے میں قیاس آرائیاں، وقت سے پہلے کوئی گل کھلا

سکتی تھیں۔

مجھے سب کچھ معمول کے مطابق ہی کرنا چاہیے تھا۔

بہت سے کام نمٹانا تھے۔ پہلا کام تو اس سولی پر لٹکنے کا ہی

رہ گیا تھا کہ اپنی جوان بہن عاصمہ کی تلاش کے سلسلے میں کچھ

کروں۔

اب ایک حل تھا، چاچا انور شاہ۔ وہی ہمارے بزرگ

اور بڑے تھے۔ سب سے پہلے انہیں ہی آگاہ کرنا ضروری

تھا۔

میں نے غسل کیا، کپڑے پہنے اور بغیر ناشتے وغیرہ

کے باہر نکلا، گاڑی میں بیٹھا اور لاری اڈے تک پہنچنے تک

مجھے کچھ نہیں احساس ہوا کہ میں خود چل کر یہاں تک پہنچا

ہوں۔

اس وقت میرے دل میں و دماغ میں وہ سارے

حالات اور وہ امور جو میں نے نمٹانے تھے مجھے یاد نہیں رہے

تھے۔ صرف اور صرف عاصمہ کا خیال تھا میرے اندر اور اسی

سے متعلق سوچیں نہیں میرے ذہن میں۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ دوسو نے مجھے

چائے دی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”شاہ صاحب آئے

ہیں۔“

”جی نہیں، سائیں! ابھی تو نہیں آئے۔“ اس نے

جواب دیا۔

”اچھا!“ میرے منہ سے ہوئے سے برآمد ہوا۔ میں

جس قدر پریشان کن بے چینی کے ساتھ چاچا انور شاہ کا

انتظار کر رہا تھا اس وقت وہ میں ہی جانتا تھا۔ حالانکہ وہ مجھ

سے پہلے ہی یہاں موجود ہوتے تھے اور میں انہیں سلام

کرنے کے بعد ہی اپنی سیٹ پر بیٹھتا تھا مگر آج کیا بات تھی

کہ سیدھا اپنے ہی کمرے میں گھسا چلا آیا تھا۔

کام میں میرا کیا جی لگتا تھا۔ میں تو چاچا انور شاہ کا ہی

انتظار کیے جا رہا تھا اور نصف گھنٹے میں کوئی دس بار دوسو سے

پوچھ چکا تھا ان کی آمد کے بارے میں اور ہر بار اس نے نفی

میں اپنا سر ہلایا تھا، ایک بار تو جھٹکا میں نے اس کو بھی بری

طرح ڈانٹ دیا۔

”کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے؟ جو تم ہر بار

اس طرح منہ سے کچھ پھوٹے بغیر انکار میں سر ہلا دیتے

ہو؟“

میرے اس طرح اچانک غصے میں آنے سے وہ بے

چارہ بوکھلا گیا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتا تھا کہ میں

نے اسے بری طرح جھڑک کر اور یہ کہہ کر کمرے سے نکال

دیا کہ جیسے ہی چاچا انور شاہ آئیں مجھے وہ بتائے۔

اس غریب کے لیے بھی یہ پہلا موقع تھا شاید کہ میں

نے اسے یوں ڈانٹ پلا دی تھی۔ اس لیے اس کے چہرے

پر کچھ حیرت کے آثار بھی میں نے محسوس کیے تھے۔

میں نے انور شاہ کے سیل فون پر بھی ان سے رابطہ کیا

تھا جو مسلسل آف جا رہا تھا۔ مجھے ان پر بھی غصہ آنے لگا۔ پتا

نہیں کہاں تھے اور سیل فون بھی آف کر رکھا تھا۔

میں نے فہم کے سیل پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی

تھی۔ رنگ تو جاری تھی مگر وہ کال ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا،

دوبارہ کرنے پر اس نے کال ہی میری ڈسکنکٹ کر ڈالی تھی۔

میں کرسی سے پشت ٹکائے مضطربانہ انداز میں ہلنے

لگا، کبھی انگلیوں سے میز بجانے لگتا، اچانک میرے ذہن

میں کالیا کا خیال آیا۔ چاچا انور شاہ کے بعد میں اسی پر زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔

”کالیا! میرے یار! مجھے اس دقت تجھ سے بہت ضروری بات کرنی ہے، تو جلدی میرے آنس میں آجا!“ میں نے چھوٹے ہی کہا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میں نے رابطہ ہی منقطع کر دیا، مجھے یقین تھا، میرے اس طرح اچانک رابطہ منقطع کرنے پر وہ بھی پریشان ہو گیا ہوگا۔

اچانک میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جو وسیع و عریض میدان میں کھلتی تھی۔ ایک کار مجھے وہاں حرکت کرتی نظر آئی تھی، جسے پہچان کر میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ یہ کار عزیز خان اور اس کے دوست شاہ نواز کی تھی۔

عزیز خان کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے سنے میاں کی متول بیٹی کا چہرہ رقصاں ہو گیا۔ ثوبیہ کے بھائی اختر کی شکل ذہن میں در آئی، اختر کی بہن کے تعلقات اسی نوجوان عزیز جان کے ساتھ تھے اور جس کی بانیو ڈیا میں نے یہ جاننے کے بعد کہ وہ ثوبیہ کا کلاس فیلو تھا، خود یونیورسٹی جا کر نکلوائے تھے۔ اسی لیے مجھے اسی پر شبہ تھا کہ ثوبیہ کے قتل کا عزیز جان سے ضرور تعلق تھا۔ پھر میرے بھائی سرد بھائی نے بھی کچھ ایسے شواہد مجھے فراہم کیے تھے، وہ زیادہ تو کامیاب نہ ہو سکا تھا تاہم اتنی معلومات بھی میرے لیے کافی تھیں۔ جانے کیوں مجھے لگا کہ عاصمہ بہنا کے کل رات اچانک گھر سے غیب کا تعلق بھی اسی شخص سے ہی ہو سکتا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکلا۔ میرے اندر ایک جنگ کی سی کیفیت اور دماغ پک رہا تھا۔

میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جہاں ایک مستطیل عمارت بنی ہوئی تھی۔ یہ گڈز کی عمارت بھی جو ہم نے انہیں ٹھیکے پر دے رکھی تھی۔ وہ کار سے اتر کر اندر داخل ہو چکے تھے۔

کہتے ہیں انسان پریشان ہو اور غصے میں بھی تو اس سے سیدھا کام بھی الٹا ہو جاتا ہے، یہی کچھ شاید میں کرنے جا رہا تھا۔ مجھے آنسو ہورہا تھا کہ میں نے اب تک ثوبیہ کے قاتل کا کھوج لگانے میں احتیاط کے نام پر کچھ زیادہ ہی تساہل برتا تھا۔ اگرچہ اس کے ٹھوس ثبوت کے بغیر مجھے اس کے شواہد ملے تھے مگر میں بھی کیا کرتا۔ کوئی ایک مسئلے میں تو گھرا ہوا نہ تھا۔ یہاں تو مسائل کے طومار تھے۔ کس کس کو میں دیکھتا۔

اندر ان تینوں دوستوں نے اپنے ذاتی خرچے سے

اچھی خاصی سیٹنگ کی ہوئی تھی۔ ایئر کنڈیشن تھا، گیس بیٹر بھی تھا۔ فرنیچر بھی بیش قیمت تھا۔ گویا یہاں بیٹھے یہ تینوں خوب ٹھسے کے ساتھ بزنس کر رہے تھے، یہ جگہ ہم نے ہی انہیں ٹھیکے پر دی تھی اور ہمارا اپنا آفس پرانے طرز کی تعمیر بنا ہوا تھا مگر مجھے یہی پسند تھا، میرا مزاج ذرا کلاسک کریز کا تھا۔

میں اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ان کا کمرہ تھا۔ انہوں نے دو تین ملازم بھی رکھے ہوئے تھے، ظاہر ہے وہ مجھے بھی پہچانتے تھے، اسی لیے جھٹ سے مجھے سلام دیا۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو دونوں کو ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے پایا۔ میرے چہرے پر گہری تنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم چپ سے ہو گئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میں بہت کم ہی یہاں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی، ان دونوں کو حیرت سی ہوئی تھی۔

”آئیے نعمان صاحب! کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے نا؟ آپ کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔“

عزیز خان نے میری طرف دیکھ کر کہا اور میرے استقبال کے لیے کھڑا بھی ہو گیا مگر شاہ نواز اسی طرح اس کے سامنے والی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا رہا تھا۔

میں نے بھی صرف عزیز خان سے ہی ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا اور اس کے چہرے پر اپنی کھنڈی ہوئی نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔“

”ہاں! بیٹھو، کیا بات ہے؟“ اس نے ہاتھ ملانے کے بعد اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا اور مجھے بھی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ کرسی شاہ نواز کے ساتھ ہی دھری تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا اور ایک نگاہ قریب بیٹھے شاہ نواز پر ڈالی اور عزیز خان سے بولا۔ ”بہتر ہوگا کہ یہ بات تنہائی میں کی جاتی۔“

وہ میرا مطلب سمجھ کر ہنسی والے انداز میں بولا۔ ”یہ میرا گہرا دوست ہی نہیں راز دار بھی ہے، تم بے فکر ہو کر اس کے سامنے کوئی بھی بات کر سکتے ہو۔“

”ہوں..... ہونا بھی چاہیے۔“ میں نے کہا۔ انداز میرا طنزیہ ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے عزیز خان کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تم ثوبیہ کو جانتے ہو؟“

جزائر کیمین Cyman Islands

مغربی کیریبین میں تین بڑے اور متعدد چھوٹے جزائر کا مجموعہ۔ اس کے شمال میں کیوبا اور جنوب مشرق میں جیکا ہے۔ رقبہ 100 مربع میل یا 160 مربع کلومیٹر، زبان، انگریزی، مذہب، عیسائیت دارالحکومت، جارج ٹاؤن، ویسٹ بے دوسرا بڑا شہر ہے۔ برطانیہ کا زیر اثر ایک خود مختار علاقہ ہے۔ اس کا انتظام گورنر اور ایگزیکٹو کونسل چلاتی ہے۔ اس کی اپنی دستور ساز اسمبلی ہے۔ سبزیاں اہم زرعی پیداوار ہیں۔ سمندری کچھوا بھی پایا جاتا ہے۔ سیاحت آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ کرسی کیمین آئی لینڈز ڈالر، 1503ء میں کولمبس نے سیاحت کی 1670ء میں برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ 1962ء میں برطانیہ کی نوآبادی بنایا گیا۔

کینبرا Canberrra

آسٹریلیا کا دارالحکومت۔ جنوب مغربی آسٹریلیا میں واقع ہے۔ اس جگہ کا انتخاب 1908ء میں ہوا۔ 1913ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ آسٹریلیا کا دوسرا دارالحکومت ہے۔ پہلا دارالحکومت ملبورن تھا۔ 1927ء میں یہاں پہلی بار پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں عارضی طور پر دارالحکومت کو پھر ملبورن میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں ایئر پورٹ، ریلوے اسٹیشن، دو یونیورسٹیاں 1946-1989ء اور پارلیمنٹ ہاؤس 1988ء بھی ہیں۔

کیمیائے سعادت

امام غزالی 1058-1111ء نے اسی سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سے احیائے العلوم کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کتاب کا خلاصہ کیمیائے سعادت ہے، جس میں عبادات، مہلکات، منجیات پر مبسوط اور لطیف تبصرہ ہے۔ علاوہ اس کے اس میں فردن و وسطی تک اسلامی فکر و نظر کا کامل لب لباب بھی دیا گیا ہے۔ اس کی زبان بہت سلیس ہے اور یہ دور رساتر حد کی بہترین نثری کتابوں میں سے ہے۔

مدرسہ: شاہینہ امتیاز ڈی جی خان

بلاشبہ میرا یہ سوال اس کے لیے اچانک ہی نہیں غیر متوقع بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پہلے تو گڑبڑا سا گیا، پھر ایک ابھی ہوئی سی نگاہ اپنے دوست شاہ نواز کے چہرے پر ڈالی، خود وہ بھی اس سوال پر قدرے چونک کر میرا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

”ہم..... میں سمجھا نہیں تمہارے اس سوال کا مطلب؟“ عزیز خان نے میری طرف دیکھ کر کہا تو میں بدستور چپچپی ہوئی سی نگاہ اس پر مرکوز کیے ہوئے ہلکے طور سے بولا۔ ”عزیر صاحب! میں نے تو بہت صاف اور واضح لفظوں میں آپ سے پوچھا ہے کہ آپ کسی ٹوپیا یا ٹوکی کو جانتے ہیں؟ جو محلہ کریم الدین مسجد کی رہائی تھی۔“

”میں آپ کو کیا جواب دوں اس سوال کا؟“ وہ کچھ سنہلے ہوئے بولا۔ ”آخر آپ کا مطلب کیا ہے یہ سوال پوچھنے کا؟“

”آپ پریشان کیوں ہو گئے ہیں، عزیز صاحب؟ میں نے تو آپ سے سوال پوچھا ہے، آپ بس مجھے ہاں یا نہ میں جواب دیں کہ آپ اس ٹوکی کو جانتے ہیں یا نہیں؟“

وہ ایک بار پھر میری بات کے جواب میں کچھ بولنے کی بجائے میری دراز سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالنے لگا تو اس کا دوست شاہ نواز میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”شاید یہ سوال میرے دوست کے لیے کچھ ذاتی نوعیت کا لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم یہاں کاروبار کرنے کے لیے بیٹھے ہیں ایک دوسرے کی ذاتی زندگیوں میں جھانکنے کے لیے نہیں۔“

اس کی بات پر میں نے تیزی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”شاہ نواز صاحب! اگر کوئی ٹوکی، جس کا ریپ اور بعد میں مرڈر ہو جائے اور وہ میرے محلے سے تعلق بھی رکھتی ہو اور تفتیش کے بعد یہ بات ظاہر ہونے لگے کہ وہ بد نصیب ٹوکی ٹوپیا نہ صرف عزیز خان کی کلاس فیلو رہ چکی ہے بلکہ اس کی دوست بھی تھی تو کیا میرا پوچھنے کا اتنا حق بھی نہیں بنتا جبکہ وہ مقتولہ جس کی دوست تھی وہ یہاں کام بھی کرتا ہو؟“

میرے بچے تلے جواب نے شاہ نواز کو ہی نہیں بلکہ عزیز خان کو بھی تھوڑا پریشان سا کر دیا تھا۔ میں اپنی بات کا رد عمل بڑے غور سے ان کے چہروں سے جھلکتے ہوئے تاثرات سے اخذ کرنے لگا۔

”تب پھر میرا خیال ہے، یہ سوال آپ کو نہیں بلکہ پولیس کو ہی مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔“ دوسرے ہی لمحے عزیز خان نے سگریٹ سلگانے کے بعد ایک گہرا کش لگاتے ہوئے رکھاٹی سے کہا تو میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے بولا۔

”اچھی بات ہے، پولیس بھی آپ سے یہ سوال ضرور پوچھنے والی ہے لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس یہاں آئے، اس سے ہماری بدنامی ہوسکتی ہے جس کا اثر ہمارے معاہدے پر بھی پڑسکتا ہے۔“

یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا اور اپنے کمرے میں آ کر ٹیلی فون کا ریسپورڈ اٹھا کر حاجی کریم بخش صاحب سے رابطہ کیا اور انہیں گرین سگنل دے دیا۔ میں پہلے ہی انہیں وہ ساری معلومات دستاویزات کی صورت میں دے چکا تھا جو میں نے یونیورسٹی سے حاصل کی تھیں اور ان لڑکوں کی بھی جن کے علم میں تھا کہ عزیز اور ثویبہ کے بیچ گہری دوستی جیسے روابط تھے، نیز اختر کا بیان بھی ریکارڈ کروانا تھا۔

حاجی صاحب نے مجھے تسلی دی کہ وہ اسی وقت سنے میاں اور ان کے بیٹے اختر کو لے کر متعلقہ تھانے پہنچ رہے ہیں۔

اس کے بعد میں نے دوسو سے ایک بار پھر چاچا انور شاہ کا پوچھا۔ اس بار اس نے نفی میں سر ہلانے سے کتراتے ہوئے منہ سے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر ان سے فون پر رابطہ کیا تو اس بار وہ آن ملا کر رنگ جاتی رہی کسی نے ریسویس کیا۔ میں ہونٹ پیچھ کر کچھ سوچنے لگا تو اسی وقت کالیا کا فون آگیا۔

”خیریت ہے جگری؟ تیرا فون آ رہا تھا، میں اٹینڈ نہیں کر سکا، بانیٹ پر تھا۔ ویسے میں نے ایئر فون تو لگا رکھا ہوتا ہے۔ پر کسی ٹلے کے ساتھ بحث کر رہا تھا، ہیلنٹ جونہیں پہن رکھا تھا میں نے، بڑی مشکوں سے اس کی منی گرم کر کے چھوٹا ہوں۔“ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”کالیا تم میرے پاس آ سکتے ہو؟“ میں نے استدعا کی۔

”ابے لے..... جگری! ابھی آ جاتا ہوں، ویسے خیریت تو ہے ناں؟“

”بس تو آ جا فوراً۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ ابھی سیل فون میز پر رکھا ہی تھا کہ اچانک میری نظر کھڑکی سے باہر پڑی۔

میں نے ان دنوں کو باہر نکلتے دیکھا۔ دنوں نے دھوپ کے سیاہ چشمے لگا رکھے تھے اور بیس قیمت کاٹن بوتلی کی شلوار نہیں پہن رکھی تھی۔ شاہ نواز میرے کمرے کی طرف ہی نکلے جا رہا تھا جبکہ عزیز خان اپنے سیل فون پر کسی سے بات کرنے کے دوران اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ پھر دونوں اس میں سوار ہوئے اور اگلے ہی لمحے ان کی کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور گیٹ سے نکلتی چلی گئی۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ہوید اٹھی، یہی وہ وقت تھا جب میں نے کالیا کو بانیٹ پر اسی گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ بہ غور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے عاصمہ بہن والے سانچے سے آگاہ کیا تو اس کا چہرہ ایک دم دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔

”ابے لے، جگری! یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے، مل..... لیکن یہ کک..... کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ اکب اکب کر بولا۔

”یہ ہو چکا ہے کالیا! میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، بس یوں سمجھو میں نے بڑی مشکل سے اپنے دل و دماغ پر اس وقت قابو پا رکھا ہے۔“

”پولیس کو تو ابھی تم نے مطلع نہیں کیا ہو گا؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلادیا۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ معاملہ اتنا حساس تھا کہ سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھایا جاسکتا تھا۔ وہ بولا۔

”فہیم بھائی کے روئے پر مجھے بہت افسوس ہوا ہے، وہ پڑھا لکھا نوجوان ہے اسے سمجھداری سے کام لینا چاہیے تھا، ایسے نازک موقع پر اس کا یوں گھر چھوڑ کر چلے جانا ٹھیک نہیں تھا۔“ اس کے بعد کچھ سوچ کر دوبارہ مجھ سے بولا۔ ”اللہ عاصمہ بہن کی عزت اور جان محفوظ رکھے، تم نے اس کے سیل فون پر...“

”کیا تھا رابطہ عاصمہ کے سیل فون پر..... حسب توقع وہ بند ملا تھا۔“

”سچی بات کہوں گا جگری! یہ معاملہ گھر سے بھاگنے کا ہرگز نہیں ہو سکتا..... عاصمہ بہن بھی ابھی ایسی حرکت نہیں کر سکتی، یہ سو فیصد اغوا کا معاملہ ہے۔“

”کسی طرح اس لڑکے کا پتا چل جائے، جس سے عاصمہ باتیں کیا کرتی تھی، تو بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”تو نے اس لڑکے کو دیکھا ہے؟“

”یہی تو مشکل ہے، میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا۔“ میں نے کہا۔ ”البتہ عاصم نے بتایا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے والدین کو گھر لانا چاہتا ہے۔“

”تب پھر میرا خیال ہے کہ وہ خود ہی مغربی تم سے رابطہ کرے گا اور اگر ایسا ہوا تو سمجھ لینا اس لڑکے کا کوئی قصور نہیں..... معاملہ کچھ اور ہے۔“

کالیا نے جیسے فوراً حالات کا تجزیہ کر ڈالا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ اس لیے میں نے اسے عزیر خان کی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ کالیا یہ سن کر چند ثانیے گہری خاموشی میں مستغرق رہا اس کے بعد بولا۔ ”جگر! یہ تم نے اچھا کیا، انہیں بھی مصیبت میں پڑنا چاہیے اور میرا خیال ہے تم ان سے اسی بہانے جان چھڑاؤ اور ثویبہ والا کیس ان کے خلاف مضبوط کرنے کی کوشش کرو، رہی بات عاصم بہن کی گمشدگی کی تو اس سلسلے میں تم اپنے چاچا انور شاہ سے بھی مشورہ کر لو لیکن میرا تو مشورہ یہی ہوگا کہ ہمیں کسی ذمے دار پولیس آفیسر کو اعتماد میں لے کر عاصم بہن کی گمشدگی کی رپورٹ کروادینی چاہیے۔ تاخیر اچھی نہیں ہوگی۔“

میں نے پورے دھیان سے کالیا کی بات سنی تھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا، میرے دل و دماغ میں بھی یہی کچھ تھا۔ اب صرف چاچا انور شاہ سے بات کرنا باقی رہ گیا تھا کیونکہ ان کے علم میں تو یہ سب باتیں لانا از بس ضروری تھا۔

میں اور کالیا تھوڑی دیر تک تبادلہ خیال کرتے رہے، اس کے بعد میں نے اس سے کہا کہ وہ اسپتال جا کر ایڈووکیٹ زہیرہ کی خیریت لے اور عارف چھندر والے کیس کے سلسلے میں ثبوت اکٹھے کرنے کی کوشش کرے، نیز اس کا تعلق زہیرہ کے ایکسیڈنٹ سے جڑتا ہے لہذا جو جلا ہوا ٹرک پولیس کی کسٹڈی میں ہے اس کے مالک کا پتا کروا کر فوراً مجھے مطلع کرے۔ ابھی وہ مجھ سے رخصت ہونے ہی لگا تھا.... کہ چاچا انور شاہ بھی آگئے۔ میں نے انہیں ساری بات سے آگاہ کر دیا۔ جسے سن کر وہ ایک دم سکتے میں رہ گئے۔

”ہمیں فوراً عطا محمد صاحب سے مدد لینا ہوگی اس سلسلے میں۔ وہ ایک معتبر شخصیت ہیں اور ان کی ضرور پولیس افسروں سے جان پہچان ہوگی۔“

”نہیں چاچا! یہ کام ہم خود ہی کریں گے۔“ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں کا کام سنبھالے

رکھیں اور آنکھیں کھلی رکھیں، میں نے عزیر خان اور اس کے دوست شاہ نواز کو ایک بے چینی میں ڈال دیا ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ہی اس بارے میں کوئی آئندہ کا لائحہ عمل تیار کریں گے۔ میں ابھی کالیا کے ساتھ جا رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ کالیا نے اپنی ہائیک وین لاری اڈے میں ہی چھوڑی اور میرے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہم سب سے پہلے اسپتال پہنچے اور ایڈووکیٹ زہیرہ سے ملے۔ اس کی طبیعت کافی بہتر ہونے لگی تھی۔ سر کی چوٹ کا زخم مندمل ہونے لگا تھا مگر ابھی انہیں کچھ دن اور یہاں رہنا تھا۔

ادھر مجھے فرحانہ کے بھی فون پر فون آرہے تھے، مجھے یاد آیا کہ میں نے اس سے ملنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ مگر حالات نے یکا یک پلٹا رکھا تھا جس کی وجہ سے میں الجھ گیا کیونکہ ضروری کام ایک ساتھ آن پڑے تھے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سے کام میں پہلے ہاتھ ڈالاجائے۔

زہیرہ سے ابھی میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی، جس سے وہ پریشان ہوتی۔ وہاں سے میں کار میں آ بیٹھا اور یہی فیصلہ کیا کہ پہلے فرحانہ کے ہاں چلا جائے۔ وہاں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ پن ٹائی سے متعلق ایک اہم کلیو ہمارے ہاتھ لگا تھا اور اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے رواجی سے قبل فرحانہ کو فون کر دیا تھا کہ میں اسی کی طرف آ رہا ہوں۔

اس کی رہائش گاہ پہنچ کر میں کار سے اترا اور کالیا کو اسی میں بیٹھے رہنے کا کہا۔

اندر پہنچا تو فرحانہ میری ہی منتظر تھی۔ اس کے قریب صوفے پر ایک چرمی پاؤچ سا بڑا ہوا تھا۔ وہ عام گھریلو لباس میں تھی اور اس وقت سادگی کی تصویر بنی ہوئی تھی تاہم اس نے ہلکا پھلکا میک اپ کر رکھا تھا اور اس کا عام نظر آنے والا گھریلو لباس بھی اگرچہ کم قیمتی نہ تھا۔ طہقاء امراء کی یہی مجبوری ہوتی ہے کہ ہاتھ روم جانے والا لباس اور جوتی تک ان کی امارت کے مطابق ہوتی ہے۔

بہر کیف..... میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”رانا صاحب کدھر ہیں؟“

”پاپا ادھر ہی ہیں۔ ابھی آ جاتے ہیں، آپ یہی ظاہر

کرنا پاپا کے سامنے کہ آپ یہاں طے شدہ پروگرام سے نہیں آئے ہیں۔“

میں نے جواباً ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ”یہ بات بھلا میں کیسے بھول سکتا ہوں جس کی خود میں نے آپ کو بھی تلقین کر رکھی ہے۔“

تھوڑی دیر میں رانا بشیر بھی آ گیا۔ اس نے گرنے لڑکا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں بریف کیس پکڑا ہوا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ دفتر جانے کی تیاری میں تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ چونک پڑا۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے طوعاً و کرہاً ہی مجھ سے ہاتھ ملایا تھا اور اسی انداز میں پوچھا۔

”ارے بھئی خیریت ہے، آج صبح ہی صبح کیسے آنا ہو گیا؟“

”جی ہاں! بہت دن ہو گئے تھے..... اور.....“ میری بات کو فرحانہ نے درمیان میں ہی اچک لیا اور مجھ سے بولی۔

”اچھا ہوا آپ آگئے، نعمان صاحب! میں آج بہت اہم چیز دکھانے والی تھی جو میں نے کل ہی تلاش کی ہے۔“ اس کی بات پر رانا بشیر قدرے چونک کر اس کا چہرہ تنکے لگے پھر پوچھا۔

”تم نے مجھے بتایا نہیں، ایسی کیا شے تم نے تلاش کی ہے؟“

میری بھانپتی ہوئی نظریں رانا بشیر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جواب میں فرحانہ باپ سے بولی۔ ”پاپا! کل رات ہی میں نے تلاش کی تھی۔ ایک تصویر ہے، الیم سے ملی تھی۔ بس! یوں سمجھیں ایک مضبوط کلیو ہاتھ لگا ہے۔“

”ہاں! ٹھیک ہے مگر!“ رانا بشیر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ انہیں شاید میری موجودگی نے اپنی بیٹی سے کوئی ایسی بات کہنے سے مانع رکھا تھا جو وہ میرے سامنے نہیں کہہ سکا تھا۔

”ٹھیک ہے، بتاؤ کیا بات ہے؟“ وہ ایک گہری سانس لے کر سامنے کے صوفے پر براجمان ہو گئے۔

”پاپا! وہ شے بتانے کی نہیں بلکہ دکھانے کی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے فرحانہ نے اپنے پاس ہی صوفے پر رکھے ہوئے چرمی پاؤچ کو اٹھا کر اس کی زپ کھولی اور وہی تصویر نکال کر پہلے اپنے باپ کی طرف بڑھادی، جو وہ مجھے کچھ دن

پہلے میرے آفس میں دکھا چکی تھی۔

میری نظریں رانا بشیر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ پوسٹ کارڈ سائز کی اس تصویر کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے غور سے اسے دیکھتے رہے۔ ان کی تنگی سی پیشانی پر اس وقت کچھ عجیب سی نمودار ہوئی تھیں جو فوراً ہی غائب ہو گئیں، پھر وہ فرحانہ سے بولے۔ ”اس میں ایسا کیا ہے بیٹا؟ یہ تو عام سی تصویر ہے۔“

”مجھے دکھا نا ذرا۔“ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ رانا بشیر نے تصویر میری طرف بڑھادی۔ حالانکہ میں نہ صرف یہ تصویر دیکھ چکا تھا بلکہ اس میں جو موجود کلیو کو بھی تلاش کر چکا تھا اور دانستہ ہی میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے خاصے جوش سے کہا۔ ”ارے!“

اس پر رانا بشیر چونک سا گیا جب کہ فرحانہ نے میری طرف دیکھ کر ذرا سے کے مطابق مسکرا کر کہا۔

”لگتا ہے، نعمان صاحب نے اس تصویر میں وہ اہم ترین شے پہچان لی ہے جو پاپا کی نظروں میں نہیں آ سکی۔“ بیٹی کی بات پر رانا بشیر نے اس سے کہا۔ ”ارے بھئی

ایسی کیا بات ہے اس تصویر میں..... مجھے تو اس میں مجھ سمیت صرف چار افراد ہی کھڑے نظر آ سکیں ہیں۔“

”میرا خیال ہے آپ دو بارہ اس تصویر کو غور سے دیکھیں۔“ میں نے اپنے چہرے پر ایک جوش ساسوتے ہوئے کہا اور تصویر دو بارہ رانا بشیر کی طرف بڑھادی۔

اس نے تصویر میرے ہاتھ سے لے کر دوبارہ اپنی نظروں کے سامنے کی تو میں نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک چھوٹی سی ہنٹ دیے دیتا ہوں، آپ صرف اس میں سے اس نوجوان کی تصویر کو غور سے دیکھیں جو تقریباً میری عمر کا ہے۔ اب اس کی ٹائی پر نگاہ مرکوز کر دیں۔“

اب میری ہی نہیں، فرحانہ کی بھی نگاہیں رانا بشیر کے چہرے پر جمی گئی تھیں۔

وہ تصویر کو اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے، بظاہر اسے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد بھی اپنے سر کونٹی میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”نہیں، میں کچھ نہیں سمجھ پایا۔“ وہ تصویر کو اپنی بیٹی کی طرف بڑھانے لگے تو میں نے اسے روک دیا اور کہا۔ ”ابھی یہ تصویر آپ اپنے ہاتھ میں ہی پکڑے رکھیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس میں کیا انوکھی بات ہے۔“

رانا بشیر کے چہرے پر کچھ ایسے آثار ابھرے تھے، جسے پریشانی اور تشویش کا نام دیا جاسکتا تھا۔

اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔ میں نے رانا بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کس..... ملک میں ہیں؟“
 ”جرمنی۔“
 ”کیا اپنا پرنس بھی شفٹ کر چکے ہیں؟“
 ”ہاں۔“

”برائے کرم ان کے متعلق مجھے ذرا تفصیل بتائیں گے، مثلاً یہ کتنے عرصے آپ کے ساتھ پرنس پارٹنر کی حیثیت سے رہے، آپ کے اور ان کے درمیان تعلقات کیسے تھے؟ نیز انہوں نے کب یہاں سے ہجرت کی؟ یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ میری مراد اس سوال سے یہ ہے کہ کیا یہ لوگ تینوں آپ کی اہلیہ کے قتل کے بعد گئے تھے یا پہلے؟“

میری بات پر رانا بشیر کسی گہری سوچ میں متفرق ہو گیا۔ پھر اپنی رسٹ وایج پر ایک نظر ڈال کر بولا۔ ”میرا خیال ہے اس اہم ایڈووکیٹ کو بیٹھ کر بات کریں گے، آج اگر مجھے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی اہم میٹنگ میں شامل نہ ہوتا تو میں آج دفتر جاتا ہی نہیں۔“

رانا بشیر کی اس بات پر مجھے اچنبھا ہوا۔ بولا۔ ”کمال ہے رانا صاحب! اس ایڈووکیٹ آپ اہم بھی کہہ رہے ہیں اور اس پر اپنی کاروباری میٹنگ کو ترجیح بھی دے رہے ہیں؟“
 میری بات کا مطلب سمجھ کر اور میرے لہجے میں حلی تخی کو محسوس کرتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے وہ بولے۔ ”نعمان صاحب! آپ کی بات اپنی جگہ لیکن اس وقت فوری طور پر جو معاملہ نمٹانے کا ہے وہ میری میٹنگ ہی ہے۔ رہا یہ معاملہ تو وہ مرحلہ وار آگے بڑھ ہی رہا ہے، اب ہمارے پاس جادو کا چراغ تو بے نہیں کہ اسے رگڑیں اور جن حاضر ہو کر سارا مسئلہ حل کر دے گا تب تک مجھے بھی اس سے متعلق بہت سی باتوں کو سوچنے کا وقت مل جائے گا، بلکہ بہت سا اسٹف (مواد) مجھے اس سے متعلق اپنے دفتر کے ریکارڈز روم سے بھی حاصل ہوگا۔ آج رات تم آ جاؤ یا پھر جیسے تم اپنی سہولت سمجھو، بعد میں بھی آ سکتے ہو۔“

میں نے ان کی بات سن کر فرحانہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی تھوڑا الجھن کا شکار نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ شاید اس نے یہ بات کلی طور پر میری ہی صوابدید پر چھوڑ رکھی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے رانا صاحب! پھر آج رات ہی نشست

میں نے کہا۔ ”رانا صاحب! اس نوجوان نے جو ٹائی پن لگا رکھی ہے یہ وہی ٹائی پن ہے جو دو قوسے کے روز یعنی جب آپ کی ٹیم صاحبہ رفعت خانم کا مرڈر ہوا تھا۔ آپ کی اسٹڈی روم میں پائی گئی تھی اور سب سے پہلے آپ ہی کے ہاتھ لگی تھی۔“

”اوہو!“ میرے اس انکشاف پر اس نے دوبارہ تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر اچھلنے کے انداز میں یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، تصویر ہنوز اس کے ہاتھ میں ہی دبی ہوئی تھی۔

”سی ی..... تو واقعی وہی ہے۔“ کہتے ہوئے، اس نے اپنی بیٹی کو مخاطب کیا۔ ”دراودہ ٹائی پن تو لانا۔“

”وہ میرے پاس ہی ہے۔“ کہتے ہوئے فرحانہ نے اسی پادریج سے وہ ٹائی پن نکال کر باپ کی طرف بڑھادی وہ جس جوش سے صوفے پر سے اٹھا تھا اسی جوش سے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ تصویر کو اتاراج کر کے بھی دیکھا گیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹائی پن کو بھی تصویر کے قریب کیا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں اپنی بیٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک جوش بھرے انداز میں بولے۔ ”تم نے بہت بڑا کام کیا ہے بیٹی! اس ٹائی پن اور تصویر والی ٹائی پن میں کوئی فرق نہیں ہے۔“

میں نے دیکھا کہ رانا بشیر کے چہرے پر بالکل ویسے ہی تاثرات تھے جو ہمارے ہونے چاہیے تھے۔ یعنی یہ تاثرات میرے ان خدشات کی نفی کر رہے تھے جو میں نے رانا بشیر کی شخصیت سے بھی وابستہ کر رکھے تھے۔ کیونکہ میرے مطابق اگر وہ بھی کسی نہ کسی حوالے سے مجرم تھے تو وہ یقیناً تشویش میں مبتلا ہو جاتے، بلکہ سب سے پہلے تو وہ اس اہم کیس کو ہی نظر انداز کرتے، تاہم ابھی ایک شبہ میرا باقی تھا۔ میں نے ان سے سوال کیا۔ ”رانا صاحب! کیا یہ جو آپ کے ساتھ باقی تین افراد کھڑے ہیں، آپ یقیناً انہیں جانتے ہی ہوں گے۔ یہ کون ہیں؟ اور کیا اب بھی یہ آپ کے ساتھ ہوتے ہیں، میرا مطلب ہے۔“

”میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، نعمان میاں!“ وہ اچانک میری بات کا نٹے ہوئے بولے۔ ”یہ میرے سابقہ پرنس پارٹنر ہیں تمیز الدین اور ان کی بیٹی یہ ان کی بیوی ہیں، شائستہ اور ان کا اکھوتا بیٹا خرم کچھ سال پہلے ہی یہ ملک سے باہر جا چکے ہیں۔“

میں ان کی بات پر چونکا، فرحانہ کا بھی یہی حال ہوا۔

”ہمیں پہچاننے کی غلطی بھی مت کرنا، ورنہ تمہارے حالات اس سے بھی زیادہ خطرناک اور تنگ کر دیئے جائیں گے۔“

اس کے لہجے میں رعونت پائی جاتی تھی۔ یکا یک میرے پورے وجود میں سینکڑوں چوٹیاں سی رینگ نکلیں۔ دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ ایک روایتی سے خوف کی لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

چند ثانیے تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہ گیا تھا۔ تاہم کچھ سنبھالا لیتے ہوئے بولا۔ ”آپ جو بھی بول رہے ہیں بہتر ہوگا کہ پہلے اپنا تعارف کرا دیں، ورنہ میں اسے کسی اتجان آدمی کا مذاق سمجھ کر فون بند کر دوں گا۔“

”بس! اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔“ اس بار آواز غراہٹ سے مشابہ تھی۔

”کیسی حرکتیں؟“ میں نے خشک پڑتے ہونٹوں سے..... اپنی زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”جو ہو چکا، اسے جانے دو، جو ہونے والا ہے، اسے ہونے سے روکنے کی کوشش مت کرو۔“

”بہتر ہوگا کہ پتیلیوں کی بجائے صاف بات کریں تاکہ میں بھی کچھ سمجھ سکوں۔“

”تم کڑھے مردے اٹھانے کی کوشش فوراً ترک کر دو۔ تمہارے باپ کو پھانسی لگ گئی۔ چاہے بے گناہ ہی سہی..... وہ اب واپس تو نہیں آ سکتا پھر کیوں رانا..... بشر کے پیچھے لگے ہوئے ہو۔“

اس نے کہا اور میں سر تا پا ایک عجیب سی سنسناہٹ کا شکار ہونے لگا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہ اینڈ مافیا کی لوگوں میں سے کسی ایک کا فون ہوگا یا پھر ان کا جنہوں نے عاصمہ کو اغوا کیا تھا۔ مگر ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ میرے باپ سے متعلق کیس کے سلسلے میں کسی نے مجھے دھمکا یا تھا۔

یہ ایک طرح سے میری جیت کی طرف اٹھتا ہوا پہلا قدم تھا کہ اصل مجرم یا اصل قاتل کو میں نے پریشان کر دیا تھا اور وہ اب سات پردوں کو چر کر باہر نکلنے پر مجبور ہونے لگا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے ہمت پکڑی اور پورے استحکام سے بولا۔ ”جس انسان کی زندگی کا مقصد ہی اپنے باپ کی بے گناہ پھانسی کو ثابت کرنے اور اصل قاتل کو بے نقاب کرنا بن چکا ہو وہ بھلا سوائے خدا کے کس سے اور کیوں کر ڈرے گا۔“

”مت بھولو کہ تم آسمان پر نہیں زمین پر چل رہے ہو

جما لیتے ہیں۔“

”تم رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاؤ گے۔“ وہ مسکرائے۔

”نہیں، میں اس سلسلے میں معذرت ہی چاہوں گا اور مجھے ابھی کنفرم بھی نہیں کہ میں آج ہی رات آ سکتا ہوں یا اگلے دن، یہ میں اپنے یہاں آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی بتا سکتا ہوں۔“

”چلو ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی..... یوں بھی تم فرحانہ بیٹی سے رابطے میں تو ہوتا، میں اسے جو بتاؤں گا یہ تمہیں ویسے بھی بتا ہی دے گی..... چلو میں تمہیں چھوڑ دوں۔“

اس نے آخر میں کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھے یہاں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا ہو۔

”جی شکریہ! میں چلا جاؤں گا میرے پاس گاڑی ہے۔“

”گڈ.....“ اس نے مختصر کہا اور کھڑے کھڑے ایک بار پھر اپنی ریسٹ وایج پر وقت دیکھا۔

میں اور کالیا کار میں تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ساری باتیں سننے کے بعد کالیا بولا۔

”ابے لے..... جگری! ساری بات واضح ہو گئی۔ قاتل یہی خاندان ہوگا۔“

”ابھی ایسا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب تک رانا بشران کے متعلق مجھے پوری تفصیل سے نہ آگاہ کر دے۔“ میں نے

خجندی سے کہا اور کالیانے کا نہ ہا چکا لیا۔ ہم ابھی اس تھانے کو جانے والی سڑک پر پہنچے ہی

تھے، جہاں ایڈووکیٹ زبیرہ کے ایکسیڈنٹ کی ایف آئی آر اور ٹرک کھنڈی میں رکھا ہوا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل منگنائی۔

اسکرین پر میں نے نمبر دیکھا تو میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں، وہ کوئی اجنبی نمبر تھا میں نے ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر ہی جے رہنے دیا اور دوسرے ہاتھ سے فون کان کے ساتھ لگا کر ’ہیلو‘ کہا تو دوسری جانب سے ایک بھاری سی مردانہ آواز ابھری۔

”نعمان احمد ولد احمد حسین؟“ لہجہ استفساریہ تھا۔

”جی میں بات کر رہا ہوں، معاف کیجئے گا میں آپ کو پہچان نہیں۔ آپ کون؟“ میں نے قدرے چوکتے ہوئے

لہجے میں کہا تو وہی آواز دوبارہ ابھری۔

اور میری نظروں میں ہو۔ میں چاہوں تو اسی وقت تمہاری سفید مہراں کو ہم سے اڑا دوں۔ جس میں اس وقت تم اور تمہارا ایک دوست بھی تمہارے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔“

دوسری جانب سے پُر غرور آواز ابھری اور مجھے اپنی ربڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے جو میں نے لہجہ مضبوط کرنے کی ہمت پکڑی تھی وہ ہوا ہونے لگی۔

اسی وقت میں نے جیسے غیر ارادی طور پر پہلے اپنی کھڑکی سے دائیں جانب دیکھا اور پھر بائیں سمت والی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تب ہی میں نے بیک دو یو میں دیکھا تو عقب میں مجھے تین چار گاڑیاں، جن میں ایک ٹرک، دو بسیں اور ایک کار شامل تھیں، کار میں ٹیلی سوار تھی۔ نظر آئیں۔ ”یہ کیم بخت مجھے کہاں بیٹھا دیکھ رہا تھا؟“ میں نے اپنے ہونٹ بھیج کر سوچا۔

کالیا ایسا کوئی موقع بھانپ کر ایک دم چپ سادھ لیتا تھا اور جو میں کرتا تھا وہ خاموشی سے مجھے کرنے دیا کرتا تھا۔ میں نے بدستور اپنے ہونٹ پُر سوچ انداز میں بھیج رکھے تھے۔ نظریں کار چلاتے ہوئے تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ کالیا خاموش مگر حیران سی نظروں سے میری ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا اور اب وہ بھی گویا بلا مقصد ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”وہ ہمیں نہیں ہے کالیا! ہمارے قریب..... تاڑو اسے فوراً!“ میں نے جوش سے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ ”کک..... کون؟“ وہ بوکھلا کر بولا۔

”وہی جو ابھی فون پر مجھ سے مخاطب ہے اور دھمکیاں دے رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اے لے!“ کالیا نے ایک دم یہ کہا اور فوراً ہی بندر کی طرح چھلانگ مار کر عقبی سیٹ پر چلا گیا۔ وہ اب تیزی کے ساتھ اپنا سر گھما گھما کر اطراف میں نگے جارہا تھا اور اچانک ہی وہ چلا کر بولا۔ ”جگری! ہوشیار باشد، ایک کار ٹرک کے پیچھے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے۔“

اس کے کہنے کی دیر بھی کہ اچانک میری سائیڈ کے مرر میں پیچھے سے آتے ہوئے ٹرک کے عقب سے ایک کار تیزی سے نمودار ہوئی اور اسے اس کرتی ہوئی میری کار کے بالکل قریب آگئی۔ میں بوکھلا سا گیا۔ وہ سانپ ٹنڈا تھی، رنگ سیاہ تھا اور اس کی کھڑکی کے شیشے چڑھے ہوئے

تھے جو کالے تھے..... پھر اچانک ہی اس کی باور و نڈو نیچے اتری اور ایک نقاب پوش عورتی شکل مجھے نظر آئی، میں ابھی اسے جانچنے کی کوشش میں ہی تھا کہ سیکنڈ کے اندر اندر اس نے اپنے ہاتھ میں کوئی پکڑی ہوئی شے ہماری کار کی طرف اچھال دی جو میری کھڑکی سے ہوتی ہوئی میری گود میں گری اور لڑھک کر ساتھ والی سیٹ کے نیچے جا پڑی۔ وہ کار گولی کی طرح آگے نکل گئی۔

”باپ رے..... یی..... یہ تو آوان ہے۔“

مجھے عقبی سیٹ سے کالیا کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی، وہ شے اس نے بھی تاڑ لی تھی۔ مہراں کار بڑی ہی کتنی ہوتی ہے اور اس نے کوئی عجیب سا نام لیا تھا ”آوان“ جو میرے جیسے آدمی کے لیے تو تینا ہی تھا، شاید کوئی دسی بم کی قسم ہوگی۔ تاہم میرے اوسان خطا ہونے لگے، میری سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ میں کیا کروں مگر مکی بم کے خوف سے میں نے ایک دم کار کو بریک لگا دیئے۔ اب پتا نہیں کالیا بریک لگنے کی وجہ سے یا پھر بم اگلی سیٹ کے نیچے اٹھانے کے لیے اچھل کر میرے ساتھ والی سیٹ پر آ پڑا تھا کہ ادھر ایک اور مصیبت ہمارے گلے میں آن پڑی۔

ہماری کار کو بریک لگتے ہی، پیچھے سے آتے ہوئے ٹرک کا ہارن بڑے زور سے چیخا اور اس کے بھی ٹائروں کے چرچرانے کی خوفناک آواز ابھری..... اس کے بعد وہ پیچھے سے ہماری کار کے ساتھ ایک دھماکے سے گرایا۔ کار کو ایک طوفانی سا جھجکا لگا اور ساتھ ہی ہمیں بھی۔ شاید پیچھے سے آنے والے ٹرک کے بھی بریک لگانے کی وجہ سے کچھ بچاؤ ہو گیا کہ ہماری کار الٹی نہیں گئی، اسے ایک جھکا ضرور لگا تھا۔ ساتھ ہی کالیا نے بھی بروقت اس جھکے سے خود کو سنبھالتے ہوئے وہ دسی بم جیسی شے بروقت اچک کر کھڑکی سے باہر پھینک دی جو سڑک کے کنارے دور خالی جگہ پر گری اور اسی وقت ساعت شکن دھماکا ہوا۔

”کار دوڑائے جا جگری! ورنہ مفت کی پھینک میں پھنس جائیں گے۔“ کالیا نے کہا اور میں نے بھی سنبھلتے ہی کار کا ایکسلیٹور دبا دیا۔ شکر تھا کہ کار کا انجن بند نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ یقینی طور پر اس کا عقبی حصہ ضرور پھینک گیا ہوگا۔ بہر کیف! ہم تھانہ جانے کی بجائے آنا فانا ہی وہاں سے کہیں اور فرو چکر ہو گئے۔

کالیا کے مشورے پر سب سے پہلے ہم نے مکینک کے گیراج کارخ کیا اور کار کا پچھلا بپھر بنوایا۔ اس کام میں

لگ بھگ دو گھنٹے سرف ہو گئے۔ اس کے بعد دوبارہ کار میں سوار ہوئے اور اسی طرف کو روانہ ہو گئے۔

وہاں کی پمپل تھم چکی تھی۔ ایک پولیس موہائل تو قوسے کا معائنہ کرنے میں مصروف تھی۔ جدھر ہم پہنچا تھا وہاں ہم ڈسپوزل اسکوڈ کے عملے سے تعلق رکھنے والے افراد بھی موجود تھے۔

ہم دونوں باہمی تبادلہ خیال کے بعد دانستہ اس مقام پر دوبارہ آئے تھے۔ دیکھنا چاہتے تھے کہ کہیں کسی نے ہمیں اس وقت قوسے کے حوالے سے پچھانا تو نہیں تھا یا ہماری کار کا نمبر وغیرہ تو نوٹ نہیں کیا تھا۔ وہ ٹرک والا بھی شاید کسی مصیبت میں پھنسنے سے بچنے کے لیے ہماری طرح رونوچکر ہو چکا تھا۔ وہاں موجود دیگر لوگوں کی طرح ہم بھی یہ سب دیکھنے لگے۔ لوگوں میں گھلے ملے بھی، یونہی دریافت کیا کہ ”ماجر اکیا ہے؟“

پولیس اور ان کا ایک افسر بھی کھڑا نظر آیا۔ اپنے شوٹرز پر لگے ستاروں سے وہ پولیس انسپٹر ہی لگتا تھا، ورنہ اس بیک اور اسمارٹ سے نوجوان کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ وہ پولیس انسپٹر تھا۔

ان کے قریب تو کسی کو جانے نہیں دے رہے تھے۔ تاہم کسی چینل کی وین کھڑی ضرور نظر آئی جس کی پوری باڈی پر مذکورہ چینل کا سونوگرام بنا کر رنگین کیا ہوا تھا۔ وہ البتہ ان سے سوالات کر رہے تھے اور جیسے ہی ہمارے کانوں کو یہ بھٹک پڑی کہ واردات ہنوز نامعلوم تھی۔ ہم وہاں سے کھسک گئے اور سیدھا تھانے کا رخ کیا۔

وہاں احاطے میں پہنچ کر میں نے کار روکی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر آیا۔

میں۔۔۔ شلوار قمیص میں تھا اور پیروں میں پشادری جوتے تھے جبکہ کالیا حسب معمول ٹائیٹ نیلی جینز میں تھا۔ پاؤں میں سیاہ رنگ کے نیلی لکیروں والے جوگر تھے اور چست بنیان ٹائپ شرٹ تھی۔ اس لباس میں اس کا سرنی جسم کسی ریسر کی طرح ہی لگتا تھا۔ شرٹ پر سینے کی طرف انگریزی میں ”no way“ لکھا ہوا تھا۔ اس نے چہرے پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اگرچہ قد میرا بھی اس کے برابر تھا مگر میں ڈرا دہلا پلتا تھا۔ وہ کھر دے چہرے کا مالک اور ہلکی سی نولی رنگت تھی، میرا رنگ گندمی اور چہرہ خورہ تھا۔

”وہ دیکھ جگرہی.....! اوھر..... جنازہ کھڑا ہے۔“ اس نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا تو میں

اس سمت ایک جلعے ہوئے ٹرک کو دیکھ کر اس کا طنز سمجھ گیا۔ یہ یقیناً وہی ٹرک تھا جس سے ایڈووکیٹ زبیرہ کی کار کی ٹکر ہوئی تھی۔

میں نے ہونٹ بھیج کر محض اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور پھر تھانے کی عمارت کی طرف بڑھے۔ ایک سنتری نے ہمیں روکا تو ہم نے تھانہ انچارج سے ملاقات کے بارے میں عندیہ دیا تو اس نے کہا۔ ”صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں۔“

”کب تک آجائیں گے؟“

”کچھ نہیں کہہ سکتے۔“ اس نے مجھ پر سرسری نگاہ جبکہ کالیا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں، ہم ویٹ کر لیتے ہیں۔“ کالیا نے کہا۔ اس نے اپنا چشمہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

”آپ کب تک انتظار کریں گے صاحب کا؟ پتا نہیں وہ کب آئیں، ہم اتنی دیر یہاں کسی آؤٹ سائیڈر کو نہیں بیٹھنے دے سکتے۔“ سنتری نے اس بار اپنی آواز کو رعب دار بلکہ کچھ کرخت بھی بنالی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”ہم کسی قریبی گلی سے نہیں آئے ہیں، میلوں کا سفر کر کے آئے ہیں اور اس ایکسیڈنٹ کی پیش رفت معلوم کرنے آئے ہیں، جس میں ایڈووکیٹ زبیرہ شدید زخمی ہو گئی تھیں۔“

میری بات پراس کی اکڑی ہوئیں بھنوں ذرا نیچی ہوئیں، پھر اس نے ہم سے شناخت مانگی وہ ہم نے اپنے آئی ڈی کارڈ کے ساتھ کروائی۔ اس کے بعد اس نے ہمیں بے دلی سے باہر احاطے میں ہی ایک لکڑی کی بیچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا۔

میں اور کالیا وہاں آکر بیٹھے تھے کہ ایک پولیس موہائل گیٹ سے اندر احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کے رکتے ہی کچھ پولیس والے اور ڈرائیونگ کیمین سے ایک انسپٹر ٹائپ کا اسمارٹ سا آدی اتر ا تو ہم دونوں ہی اسے دیکھ کر چونک پڑے۔

یہ وہی نوجوان سا پولیس انسپٹر تھا جسے ہم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وقتے کی جگہ پر دیکھا تھا۔ ہم اسے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے ایک سرسری سی نظر ہم پر ڈالی تھی اور میں نے اس سے مخاطب ہونے کی کوشش چاہی تو کالیا نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ کر رک گیا۔

بتای دیا ہوگا کہ وہ کون تھا اور اس کا ٹرک اس روز کیوں لے کر گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ انسپکٹر کامران نے جواب دیا۔ ”وہ اسے کچھ زیادہ تو نہیں جانتا تھا، یہ قول اس کے وہ اسے دھوکے میں رکھ کے ٹرک لے گیا تھا۔“

”کمال ہے، وہ اسے جانتا تک نہیں تھا اور اس کا ٹرک لے اڑا؟“ کالیا حیرت سے بولا۔ اس پر انسپکٹر کامران نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

”اسی لیے تو وہ اب تک لاک اپ میں ہے۔ حالانکہ جمالی صاحب اس کی ضمانت کے لیے بھی آئے تھے مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا اور ان کے سامنے بھی یہی شرط رکھی کہ جب تک یاسر نہیں مل جاتا میں ملوک کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔“

میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں، اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے عام روایتی پولیس افسروں کے مقابلے میں تھوڑا مختلف لگا لیکن صرف ”مردم شناسی“ سے کام نہیں چلایا جاسکتا تھا۔

میرے چند مزید سوالوں کے جواب میں اس نے صرف اسی قدر بتایا کہ احسان جمالی کی گڈز ٹرانسپورٹ سے تعلق رکھنے والا ملوک گزشتہ پانچ سال سے ایک بار بردار ٹرک ڈرائیور ہے۔ وہ ایک ہال بچے دار اور شریف انسان ہے۔ تھوڑا بے وقوف اور دوسروں پر جلد بھروسہ کرنے والا ایک سادہ لوح آدمی ہے جس کے بارے میں انسپکٹر کامران نے بھی اپنے طور پر تفتیش کر لی تھی جبکہ یاسر تو سسے سے چند روز پہلے ہی چائے پانی لانے کے طور پر وہاں کام کرنے آیا تھا اور ایک روز جب مال لے جاتا تھا تو ملوک کی بیوی کے ہاں ولادت ہونے والی تھی اور اسے ایک میٹرنٹی ہوم میں لے جاتا تھا۔ ملوک پریشان تھا کہ مال لے جائے یا بیوی کو میٹرنٹی ہوم پہنچائے۔ اس پر یاسر نے ہی اس سے کہا تھا کہ اسے ٹرک چلانا آتا ہے اور کون سا دوسرے شہر جاتا ہے۔ اسی شہر میں مال پہنچاتا ہے، اس لیے وہ بے فکر ہو کر اپنی بیوی کو جا کر دیکھے، میں (یاسر) مال پہنچاتا آتا ہوں۔ سادہ لوح ملوک اس کی باتوں میں آ گیا۔“

انسپکٹر اس کی کہانی پر ہم بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ قول اس کے ملوک کی تلاش جاری تھی، نیز ہم نے بھی اسے اشاروں میں بتا دیا تھا کہ وہ ملوک کو کسی قیمت پر نہ چھوڑے جب تک اس مفرور ڈرائیور یاسر کا پتا نہیں چل جاتا۔ دوسری

”اسے اندر براجمان ہونے دو۔“ کالیا نے میرے کان میں سرگوشی بھی کر دی۔ پھر جب وہ اندر چلا گیا تو ہم آگے بڑھے اور کمروں والے برآمدے میں آگئے۔ وہاں اب پہلے والا سنتری تو غائب تھا مگر اس کی جگہ دوسنتری کھڑے نظر آئے۔ میں نے ان سے ”صاحب“ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور جب ملاقات کی نوعیت بتائی تو...

ان میں سے ایک نے ہمیں وہیں کھڑے رہنے کو کہا اور خود انسپکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرا سنتری وہیں کھڑا اسکرینٹ سلگانے لگا۔ اس کا سامنی تھوڑی ہی دیر میں لوٹ آیا اور ہمیں اندر جانے کا کہا۔ ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انسپکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ داخل ہونے سے پہلے ہم نے اس کے کمرے کی دیوار پر لگی نیم پلیٹ میں اس کا نام ایس ایچ او کامران شانی لکھا دیکھ لیا تھا۔

وہ ہم سے بڑے مہربانک انداز میں ملا اور ہمیں اپنے سامنے کی دو کرسیوں پر بیٹھنے کا بھی کہا ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ کالیا نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر اپنے سامنے رکھ دیا تھا۔

میں نے کالیا کے دوست کی حیثیت سے تعارف کروایا اور پھر مذکورہ کیس سے متعلق بات کی تو اس نے ایک گہری سانس لے کر بتایا۔

”تفتیش تو ابھی جاری ہے۔ ٹرک کے مالک سے بھی رابطہ ہوا ہے۔ مگر ہمارا اصل ٹارگٹ ٹرک کا ڈرائیور ہے۔ جو نو فرور ہے۔“

”کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی انسپکٹر صاحب؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایک شخص کو گرفتار کیا ہے۔ ملوک نام ہے اس کا۔ وہ اس ٹرک کا اصل ڈرائیور ہے۔“

”اصل ڈرائیور؟ میں سمجھا نہیں؟“ میں نے بھنویں سکیز کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

”اس ٹرک کا اصل ڈرائیور ملوک ہی تھا مگر اس روز اس کا ٹرک یاسر نامی شخص چلا رہا تھا۔“

”تو آپ نے گرفتار کسے کیا ہے؟“ اس بار کالیا نے پوچھا۔

”ملوک کو۔“

”پولیس کے پاس بھی جادو کا چراغ نہیں ہوتا
ملوک!“ میں نے اس سے دانستہ اب سندھی میں باتیں
شروع کر دی تھیں۔ اسے بھی کچھ حوصلہ ہوا۔

”ہم اپنے طور پر بھی یاسر کو تلاش کرنے کی کوشش میں
ہیں۔ تم یاسر کے سلسلے میں کچھ چھپاؤ گے تو یہ تمہارے اپنے
لیے اچھا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے کسی عام شخصیت کو زخمی نہیں
کیا ہے، وہ ایک ایڈووکیٹ ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی
تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ اسی لیے پولیس نے بھی تمہاری کسی
قسم کی ضمانت نہیں ہونے دی ہے۔“

”سائیں! میں آپ سے پورا تعاون کرنے کا وعدہ
کرتا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”یاسر کے بارے میں کوئی ایسی بات بتاؤ، جس سے
تم سمجھتے ہو کہ پولیس یا ہمیں بھی اس تک پہنچنے میں مدد ملے۔
باقی تو ہمیں اس کے بارے میں پتا چلا چل چکا ہے، مگر وہ
نا کافی ہے۔ تم ذرا سوچ کر اس کے بارے میں کوئی نئی بات
بتاؤ؟“

میں نے اس سے صراحت میں سوال کیا تو وہ بھی کچھ
سوچتا بن گیا۔ پھر گوگلو سے لہجے میں بولا۔

”میں کیا بتاؤں سائیں! میری تو خود سمجھ میں نہیں
آ رہا ہے کہ یہ میرے ساتھ ہو کیا گیا ہے؟ میں ایک غریب سا
آدی ہوں، بیٹھے بٹھائے یہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ اتنے
سالوں بعد اللہ سائیں نے مجھے بیٹے سے نوازا مگر.....“

فرط رقت سے وہ آبدیدہ ہو گیا اور جملہ بھی اپنا مکمل نہ
کر سکا۔ اپنی ہی قیص کے دامن سے وہ اپنے آنسو پونچھنے
لگا۔

مجھے اس غریب اور سادہ لوح سے آدی پر بے حد
ترس آنے لگا۔ ایک تو اپنا بھی مزاج کچھ رحم پرور اور
ہمدردانہ تھا۔ بات بھی یہ جھوٹ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اتنے
سالوں بعد باپ کی خوشی حاصل کر پایا اور اس مصیبت میں
پھنس گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی بھی اکیلی ہے اور بچہ
بھی چند ہی دنوں کا ہے۔ خوشی غمی اور بیماری میں اس کے
ساتھ سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ تاہم اس نے یاسر
کے بارے میں مجھے بھی وہی کچھ بتایا جو انسپکٹر کا مران
ہمارے علم میں لا چکا تھا۔ میں نے اس سے جانی گذر کہنی کا
پتالیا اور پھر دوبارہ انسپکٹر کا مران سے مل کر اس سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ملوک واقعی بے گناہ ہے، تاہم اس
سے سادہ لوحی میں ایک بے وقوفی ہوئی، لگتا ایسا ہی ہے کہ اسے

بات میں نے انسپکٹر کا مران کے علم میں یہ بھی لانی ضروری
تھی کہ ایڈووکیٹ زنیہ بہت جلد شفا یاب ہونے کے بعد اپنا
یہ کس خود لڑنے والی ہیں۔ وغیرہ۔

اس پر وہ مسکرا کر بولا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ بات، اسی
لیے تو ابھی تک میں نے ملوک کو نہیں چھوڑا ہے جبکہ اپنے طور
پر ہم مفرد یاسر کی بھی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔“
”گمڈ!“ میں نے کہا پھر اس سے رخصت ہونے
والے انداز میں پوچھا۔

”کیا ہم ملوک سے ایک ملاقات کر سکتے ہیں؟“
میری بات پر اس کے ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ
ابھری۔ اس کے بعد اس نے گھٹنی بجا کر ایک سنتری کو اندر
بلوایا اور اس کے ساتھ ہمیں بھیج دیا۔

ایک پولیس انسپکٹر کا ہمارے ساتھ اتنا تعاون کرنا
ہمارے لیے شاید خوش قسمتی ہی کی بات تھی۔ مجھے اس مقولے
پر یقین سا آنے لگا کہ پانچوں اگلیاں برابر نہیں ہوتیں،
ورنہ تو وہ راشی پولیس انفراراجا دلاد رہی تھا۔

بہر کیف ہمیں لاک اپ میں ملزم ملوک سے ملوایا
گیا۔ وہ ایک تین، پینتیس سالہ دبلا پتلا شخص تھا، صورت
سے تو مسکین ہی لگتا تھا اور اس وقت پریشانی میں تو اور زیادہ
ستا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا اس کا۔ ہمیں دیکھ کر وہ کچھ حیران بھی
ہوا اور اس کی پشمرہ دی آنکھوں میں اُمید کی کرن بھی چمکی
تھی کہ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ ہم اس کی ضمانت کے لیے آئے
ہیں۔

”تمہارا نام ہی ملوک ہے؟“ میں نے اس کے
چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں!“ وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں
بولا۔

ہم نے اسے اپنے بارے میں مختصر آیتا یا تو وہ یہ سن کر
مزید پریشان سا ہو گیا کہ ہمارا تعلق ”فریادی پارٹی“ سے
تھا۔

”دیکھو، ہم خود بھی یہ چاہتے ہیں کہ اصل مجرم جلد
سے جلد گرفتار ہو جائے۔ تم ایک غریب اور شریف آدی
دکھائی دیتے ہو لیکن یہ تب ہی ممکن ہوگا کہ یاسر کو گرفتار کیا
جاسکے۔“

”سائیں! میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ وہ مردار پولیس
کے ہتھے چڑھ جائے اور میری جان چھوٹے مگر یہ کام تو
سائیں! پولیس والوں کا ہی ہے ناں؟“

استعمال کیا گیا ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ نے ملوک کے اس بیان کی تصدیق کی ہے کہ وہ اپنے بارے میں جو کہہ رہا تھا وہ غلط نہیں ہے۔ آئی مین، کیا وہ واقعی ایک بچے کا باپ بھی ہے جس کی ولادت بہت منتوں مرادوں اور سالوں بعد ہوئی ہے؟“

”جی ہاں!“ انسپٹر کا مران نے اثبات میں سر ہلایا۔
”میں خود اس کے بارے میں تصدیق کرنے جہاں گڈ زکھنی گیا تھا، وہاں بھی اس کے ساتھی ملازموں نے اس کے بارے میں یہی بتایا کہ ملوک ایک سادہ لوح اور شریف آدمی ہے۔ ہم گہری گئے اس کے۔ وہاں اس کی بیوی اکیلی تھی، اس کا دودھ پتا بچہ تھا۔ محلے کی کوئی بوڑھی عورت خدا ترسی میں وہاں رہتی ہے۔“

”بس تو پھر انسپٹر صاحب! میری آپ سے ایک گزارش ہے۔“ میں نے فوراً کا مران سے کہا۔ ”مجھے فریادی پارٹی کا ایک ذمے دار فرد سمجھتے ہوئے اسے چھوڑ دیں تو یہ اس غریب آدمی پر آپ کا احسان ہوگا۔“
میرا جملہ ختم ہوا تو انسپٹر کا مران کے چہرے سے یوں لگا جیسے وہ ایک دم ہی ہلکا چھلکا ہو گیا ہو۔ اسی لمحے میں وہ بولا۔

”اگر یہ بات ہے تو یوں سمجھیں آپ نے میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا۔ میں تو اسی دن اسے جہاں صاحب کی ضمانت پر چھوڑ دیتا مگر چونکہ ہم پرسب سے زیادہ دباؤ فریادی پارٹی کا ہوتا ہے، اس لیے ہمیں بھی احتیاط کرنا ہوتا ہے مگر اب یہ مسئلہ آپ نے حل کر دیا۔“
”مگر انسپٹر صاحب! اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اصل مقصد تساہل کا شکار ہو جائے، میں اپنے طور پر بھی کوشش کروں گا کہ اصل جواب دار گرفت میں آجائے۔“

میں نے انسپٹر کا مران سے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ فوراً خوش خلقی سے مسکرا کر بولا۔ ”آپ اس کی فکر نہ کریں، میں بھی یاسر کی تلاش میں نچلا نہیں بیٹھا ہوں۔“
”آئی ہوپ دیٹ..... آل ریڈی انسپٹر!“ میں نے کہا۔

اسی وقت کا مران نے ایک سنترمی سے کہہ کر ملوک کو آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔

میں اور کالیا وہاں سے نکل کر باہر آئے۔ کار میں سوار ہوتے وقت کالیا اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج

اندھیری رات میں جگنو کا چمکنا ایک عام سامعہ ہے جسے تقریباً ہر شخص جانتا ہے مگر اس روشنی کی نوعیت سے بہت کم لوگ پوری طرح واقف ہوں گے جو جگنو کے جسم سے خارج ہوتی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی روشنی ہے جسے سائنس کی زبان میں بائیو لومینیسنس کہتے ہیں۔ عام الفاظ میں ہم اسے ”غٹھنڈی روشنی“ بھی کہہ سکتے ہیں جگنو کے جسم میں دراصل آکسیجن کی ایک اور دیگر چند کیمیکلز کے ملاپ سے لیوس فیروز نامی ایک اینزائم پیدا ہوتا ہے جو یہ روشنی پیدا کرتا ہے دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ روشنی ایک کیمیائی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جو جگنو کے مختصر سے جسم کے اندر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کرۂ ارض پر پائے جانے والے کئی دیگر حشرات بھی مختلف رنگوں کی روشنی خارج کرتے ہیں۔ یہ روشنی عام روشنی سے اس لحاظ سے مختلف ہوتی ہے کہ اس میں حدت یعنی گرمی نہیں پائی جاتی۔ جب کہ عام روشنی کے اکثر آخذ روشنی کے ساتھ ساتھ حدت بھی پیدا کرتے ہیں اگر اس روشنی کے ساتھ حدت بھی پیدا ہوتی تو جگنو کا نازک جسم جل کر راکھ ہو جاتا۔

مرسلہ: انم سلطان۔ جھنگ

کرتے ہوئے بولا۔ ”جگری! تم نے یہ بہت اچھا اور نیک کام کیا کہ ایک ایسے غریب انسان کی جان بچا دی جو ہمارے آگے جواب دہ تھا۔ ورنہ لوگ کہاں دوسرے کی جان بخشی کرتے ہیں، جب تک اسے نچوڑ نہ لیں۔ یہ پتا ہونے کے باوجود کہ وہ بے قصور ہے، اس بے چارے کی خوب مٹی پلید کرتے ہیں اور جب وہ بالکل ادھ موا ہو جاتا ہے پھر اسے جانے دیتے ہیں، پولیس ایسے آدمی کو نچوڑ کر رکھ دیتی ہے اور اس کے وارثوں سے بھی خوب مال پانی کھاتی ہے۔ یہ اس غریب آدمی ملوک کی خوش قسمتی تھی کہ اسے پولیس بھی خلاف توقع اچھی ملی اور ہم بھی۔“

”ہاں! کالیا تیری بات سچ ہے۔“ میں نے گہرے دکھ سے کہا اور کار کا اسٹیرنگ سنبھالا۔ ”میرا باپ بھی بے گناہ تھا اور اپنی سادہ لوحی کے باعث کچھ بھیڑ یا نفرت لوگوں کی سازش کا شکار ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اسے انصاف نہیں ملا اور اب میں یہ داغ دھونے کے لیے کوشاں ہوں۔ کالیا! میرے یارا میرے دوست! تو کیا سمجھتا ہے کہ میرے باپ نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ میں یہ داغ دھونے کی

کوشش کروں۔ اس کے ذہن میں اٹھتا یہ بھی ہوگا کہ ہماری یعنی اس کے بچوں کی نظروں میں بھی اگر کوئی تھوڑا بہت شبہ ہے تو وہ بھی باقی نہ رہے۔ ہاں! کالیا، کاش، اس وقت میرے باپ کے ساتھ بھی اسی طرح کی کوئی بھلائی کر دیتا۔ کاش رانا بھیرا سے معاف کر دیتا۔ اس کا دل بھی نرم پڑ جاتا وہ صرف ایک بار میرے باپ کا بیک گراؤنڈ دیکھ لیتا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے، بھلا ایسا آدمی کیسے اتنا بڑا جرم کر سکتا ہے تو اس کا دل ضرور میرے باپ کی بے گناہی کی گواہی دیتا۔“

یہ کہتے کہتے میری آواز بھر آئی۔ آنکھیں باپ کو یاد کر کے آب دیدہ ہو گئیں۔ کالیا بھی ایک دم رنجور سا ہو گیا۔ اس نے بے اختیار اپنا ایک بازو میرے کاندھے کے گرد حائل کر دیا اور یوگھل سے لہجے میں بولا۔ ”بس کر میرے جگری! تیرے دکھ کا اندازہ مجھے ہے مگر اتنا کبھی نہیں ہو سکتا جتنا تو اپنے اندر ایک درد اور کسک کی صورت میں رکھتا ہے۔“

”ہاں کالیا! مجھے یہی کسک بے چین کیے رہتی ہے کہ میرا نیک شریف اور حق حلال کی روزی کما کر کھانے والا باپ تل جیسے بھیا تک جرم کے جھوٹے الزام تلے بے گناہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بعض لوگوں کی اموات کا دکھ وقت کے ساتھ ساتھ مامند پڑتا جاتا ہے مگر بے گناہ کی موت کا دکھ تا عمر ہی بڑا پاتا رہتا ہے۔ ایک جاں نسل کسک میں مبتلائے غم دوراں رہتی ہے۔ یہ دکھ ایک عذاب مسلسل ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”چل جگری! بے غم ہو جا، کبھی نہ کبھی ہم اصل قاتل تک پہنچ ہی جائیں گے۔ یہ پولیس والے ہمیں اب مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔“ اس نے تھانے کے برآمدے کی طرف اشارہ کیا اور میں نے کارا اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔

☆.....☆

اس ساری بھاگ دوڑ میں شام ہونے لگی تھی۔ میں نے اپنے گھر کا ایک چکر لگا کر ضروری سمجھا اس کے بعد لاری اڑے جانے کا ارادہ تھا۔ یہ کالیا کا ہی مشورہ تھا کہ لاری اڑے جانے سے پہلے ایک چکر گھر کا لگانا ضروری تھا۔ نجانے کیا سوچ کر اس نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا تاہم جب گھر پہنچے پہنچے مجھے کچھ سمجھ میں آتا رہا۔ کچھ باتوں کا اظہار ضروری نہیں ہوتا اور یہ خود ہی

کھینچنے کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ مقولہ کالیا کا تھا اور بر محل تھا۔ ظاہر ہے، عاصمہ بہنا آج صبح ہی گھر سے غائب ہوئی تھی۔ فہیم بھی نہیں تھا، گھر پر صبح سے ہی تالا پڑا ہوا تھا۔ پیچھے کون آیا گیا کیا پتا۔

ہم گھر پہنچے تو سب کچھ بہ ظاہر معمول کے مطابق نظر آ رہا تھا۔ وہی محلے میں چہل پہل، دکانیں اور مختصر سا بازار سب کچھ ایسے ہی معمولات اور معاملات زندگی کی طرح رواں دواں تھا۔ ایک میرا گھر تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا اور وہ سنان بڑا دکھائی دیتا تھا۔

محلہ کمیٹی کے ایک معزز ممبر اور یہاں کے لوگوں میں حاجی کریم بخش کے بعد مجھے ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آتے جاتے لوگوں سے سلام دعا اور حال و احوال کرتا ہوا گھر میں داخل ہوتا تھا لیکن اب میں جیسے خود کو چور سا محسوس کرنے لگا تھا۔ لوگوں کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی جرم کر کے اپنے گھر میں داخل ہونے والا ہوں۔ کار میں نے گھر کے دروازے پر روکی اور قفل کھول کر میں اور کالیا اندر آ گئے۔

دش روم وغیرہ جا کر میں اور کالیا کچھ فریش ہوئے اس کے بعد میں نے فریڈر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لی۔ ہم دونوں نے آرام سے بیٹھ کر پانی پیا۔

خالی گھر سے مجھے اداسی محسوس ہونے لگی۔ بڑا بھائی ہونے کے ناطے میں فہیم اور عاصمہ کو اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتا تھا۔ اب ان دونوں کے بغیر یہ گھر مجھے کھانے کو دوڑنے لگا۔ دکھ اور کرب کے احساس تلے میرا اندر بھرا آیا۔ کالیا گھر کا، بالخصوص عاصمہ کے کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے پاس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے وہ غور سے دیکھتا ہوا میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہے یہ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لو خود ہی دیکھ لو۔“ کہتے ہوئے میری طرف وہ شے بڑھا دی۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ چوکور سا کوئی بکلی نما چیز تھی۔ ابھی میں اس کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ کالیا بولا۔ ”یہ کسی مشینک جنیٹر کی بیلٹ کا کمپنی ہولڈر بکلی ہے اس پر ”ایم“ کندہ تھا۔“

میں تو زیادہ تر شلوار قمیض ہی پہنا کرتا تھا، پینٹ شرٹ

وغیرہ کا مجھے کوئی خاص کرہ نہ تھا۔ کبھی کبھار پہن لیا کرتا تھا مگر کالیا کونٹ نئی پینٹ اور شرٹ پہننے کا شوق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس بگل کو دیکھتے ہی نہ صرف پہچان گیا تھا بلکہ اس کا ”میک“ بھی بتا دیا تھا۔

”تم نے شاید عاصمہ بہن کے کمرے کو کراٹم سین بنا رکھا تھا۔ کیا تم نے اس کا جائزہ تک نہیں لیا تھا؟“

”نہیں یار! میں خود پریشان تھا اس وقت۔“ میں نے کہا۔

”کہا سمجھتے ہو تم کہ یہ کس کا ہو سکتا ہے؟“

”اغوا کاروں کے کسی ساتھی کا ہی ہو سکتا ہے۔“ وہ مجھ سے بگل دوبارہ لیتے ہوئے بولا۔ ”لیکن پہلے اپنی تسلی کرنا ضروری ہوگا۔ ممکن ہے یہ تمہاری یا فہیم کی پینٹ کے بیلٹ کا بگل ہو۔“

”میرے پاس تو اتنی پینٹیں نہیں ہیں، ہاں البتہ فہیم کے پاس بہت سی پتلونیں ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”سب سے پہلے گھر میں موجود سب پتلونوں کے بیلٹ چیک کرو، ایسا نہ ہو کہ بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں، والی بات ہو جائے۔ اس کے بعد ہی کچھ سوچتے ہیں۔“

میں نے اس کی بات پر صاف کیا اور لگ بھگ کوئی پندرہ بیس منٹ میں سب دیکھ لیا۔

”نہیں، یہ ہماری کسی پینٹ کا بگل نہیں ہے۔“

”گڈ! اس کا مطلب ہے جو عاصمہ بہن کو زبردستی اٹھا کر لے گئے ہیں یہ انہی میں سے کسی ایک کی بیلٹ سے ٹوٹ کر گرا ہے، جو پہلے ہی ڈھیلا ہوگا۔“ کالیا بولا۔

میں نے اس کی بات پر غور کرنے والے انداز میں اس سے کہا۔ ”یار کالیا! کیا تجھے عاصمہ بہن کے کمرے سے ایسے شواہد نظر آتے ہیں کہ اسے کسی نے اغوا کیا ہوگا؟ جبکہ فہیم کا خیال کچھ اور تھا۔“ میں نے دانستہ ”بھاگ جانے“ کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا جیسا کہ فہیم کا خیال تھا۔ کالیا بھی میری بات سمجھتے ہوئے اثبات میں اپنا سر ہلا کر بولا:

”خیال تو میرا بھی یہی ہے مگر یار جگری! کمرے کی حالت ظاہر یہی کرتی ہے کہ کوئی یہاں سے بڑے آرام سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے اغوا کاروں نے پوری پلاننگ کے تحت پہلے رکھی کی ہے اور رات کے کسی پہر یہ کام انجام دیا ہے۔“

”وہ بند گھر میں داخل کیسے ہوئے؟“ میں نے الجھ

کر کہا۔

”تمہارے کچلے صحن سے انہوں نے اندر نقب لگائی ہے۔“ کالیا بولا۔ ”مجھے بیرونی اور اندرونی دیواروں کی منڈیروں پر گڑے نشانات نظر آئے ہیں۔“

کالیا غلط نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ خود ایسے گروہ سے تعلق رکھتا تھا، جہاں یہ سب ہونا یا کرنا ان کے طبی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں یہ سب اس لیے نہیں جانچ سکا تھا کہ میں خود اس وقت اسی پریشانی میں مبتلا تھا کہ اس سانحہ کی بھگ بھی باہر نہ پہنچے۔

”تو پھر یہ طے ہوا کہ معاملہ اغوا کا ہی ہے۔“ بالآخر میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے پر ہونے والی دستک سے ہم دونوں چوٹے۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ کہتے ہوئے میں دھڑکتے دل سے اٹھا۔ صحن میں آکر دروازہ کھولا تو سامنے حاجی کریم بخش کا لازم اسلم موکا کھڑا نظر آیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پہلے سلام کیا پھر بولا۔

”نعمان صاحب! حاجی صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے، میں پہلے بھی آچکا تھا۔ وہ کہہ رہے ہیں یا تو وہ خود آجائیں یا مجھے بلا لیں۔“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”انہیں میرا سلام کہنا، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

”جی بہتر۔“ وہ یہ کہہ کر لوٹنے لگا تو میں نے یونہی پوچھا۔

”ویسے خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں! خیریت ہی ہے، بس، وہ اپنے خورشید خان والے مسئلے کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔“

”ان سے کہنا کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے اور میں اپنے طور پر بھی کوشش کر رہا ہوں۔“

”جی بہت بہتر۔“ اس نے کہا اور چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر ہونٹ بیٹھتے چڑسوچ انداز میں اسی طرح دروازے پر کھڑا رہا اس کے بعد جیسے ہی دروازہ بند کرنے لگا تو گلی کے بائیں جانب سے ایک نوجوان تیز تیز قدموں سے آتا ہوا نظر آیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنا ایک ہاتھ بھی لہرایا تھا کہ میں دروازہ بند نہ کروں۔

میں الجھ سا گیا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے

انداز میں دروازے کے قریب آیا اور پھولی ہوئی سانس سے مجھے پہلے سلام کیا۔ وہ میرے لیے اجنبی ہی تھا اور محلے کا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ مجھے فہم کی ہی عمر کا نظر آیا۔
 ”آپ کون؟“ میں نے اپنی آنکھیں ذرا سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آ..... آپ نعمان صاحب یا فہیم صاحب ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ مجھے اس کے یوں پوچھنے کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔

”جی! میں نعمان ہوں، فہیم میرا چھوٹا بھائی ہے، آپ کون ہو بھائی؟“

”میرا نام کاشف ہے..... اور.....“ اس نے اپنا اتنا ہی تعارف کروایا اور پھر نبھانے کیوں آگے کچھ بولنے سے قبل ہی ہچکچاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ پھر بولا۔

”کیا ہم بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“
 ”مسئلہ کیا ہے آپ کا بھائی؟ ملنا کس سے ہے آپ کو؟“ میں نے اس بار قدرے بیزاری سے کہا تو وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”نعمان صاحب! وہ..... دراصل بات ایسی ہے کہ.....“

”اندرا آ جاؤ تم۔“ اچانک میرے عقب سے آواز ابھری۔ یہ کالیاتھا۔ وہ نبھانے کب میرے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ ”راستہ دو اسے.....“ کالیانے بولے سے کہا۔

میں ایک طرف ہو گیا۔ کاشف اندر داخل ہوا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کالیانے اندر آنے کا اشارہ کر کے پلٹا اور پھر ہم تینوں اندر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں تو کرسیوں پر براجمان ہو گئے، میں بیڈ پر بیٹھ گیا اور مستفراز نظروں سے نو دروازی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں! کاشف میاں! اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“

کاشف پہلے کن آنکھوں سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگا اس کے بعد اس نے کالیانے پر نظر ڈال کر استفسار یہ کہا۔ ”آ..... آپ، بھینا فہیم صاحب ہیں۔“

”نہیں، میں نعمان کا دوست ہوں۔“ کالیانے بولا۔ اس کی پر غور سی نظریں کاشف کے چہرے پر کڑھی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکا پھر ابھن کا شکار نظر آنے لگا۔ مجھے لگا وہ کوئی ایسی ہی بات کرنا چاہتا تھا جو صرف میرے اور فہیم کے سامنے ہی کرنا

چاہتا ہو۔ اسی لیے اس نے کالیانے کو فہیم سمجھا تھا۔
 میں نے اس کی ابھن دور کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا بھائیو جیسا ہی دوست ہے، تم جو کہنا چاہتے ہو، بے فکری سے کہہ سکتے ہو اور ذرا جلدی بھی، کیونکہ ہمیں ابھی کہیں جانا بھی ہے۔“

”عا..... عاصمہ نے شاید آ..... آپ سے میرا ذکر کیا ہو؟“ وہ پہلے اتنا بتا کر خاموش ہوا اور مجھ سمیت کالیانے بھی چونک پڑا۔

”آگے بولو۔“ میں نے بدستور اس کے چہرے پر نظریں گاڑے رکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔ عاصمہ بہنا کے ذکر پر میرا دل یلکھت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ آگے بولا۔

”ایسی باتیں ایک بھائی سے کرنا مناسب تو نہیں لگتیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں اپنے والدین کو ہی لانا چاہتا تھا آج مگر آج سارا دن عاصمہ سے رابطہ ہی نہ ہوسکا، صبح سے اب تک جانے کتنی ہی باہر میں اسے فون کرتا رہا مگر دوسری جانب سے مسلسل پاور آف ملا تو عاصمہ کی خیریت معلوم کرنے خود ہی چلا آیا۔“ وہ اتنا بتا کر چپ ہو گیا۔

کالیانے نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا تو کالیانے اپنے سر کو ہولے سے اٹھائی جنبش دے کر مجھے کچھ ایسا اشارہ کیا کہ میں کسی قسم کے جوش سے کام نہ لوں۔

”تم عاصمہ کو کب سے جانتے ہو؟“ میں نے بالآخر اس سے پوچھا۔

”کچھ زیادہ تو نہیں، بس یہی کوئی چھ سات ماہ ہی ہوئے ہوں گے۔“

”تم کہاں رہتے ہو؟“

”دو محلے چھوڑ کر عظیم پورہ میں۔“

”کتنے پڑھے ہوئے ہو؟“

”میں سائنس گریجویٹ ہوں ایک پرائیوٹ کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔“

”ماں باپ کیا کرتے ہیں اور بھائی بہن؟“ میں نے اصل بات کرنے سے پہلے اس کا مختصر ایک گراؤنڈ جاننا ضروری سمجھا۔ وہ جواب بولا:

”میرے ابو بھی ایک پرائیوٹ کمپنی میں آفس سپرینٹنڈنٹ ہیں۔ والدہ ہیں۔ ایک بھائی ہے جو مجھ سے بڑے ہیں اور وہیں ایک الگ کرائے کے مکان میں رہتے

ہیں۔ میں امی اور اوسا ساتھ رہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔
مجھے کاشف نامی اسی نوجوان میں کوئی برائی نظر نہیں
آئی تھی۔ نیز میں نے اسے عاصمہ کے غیاب یا شہبے کی
فہرست سے بھی اسی وقت خارج کر دیا۔ پھر بولا۔
”کاشف! تمہارا کہنا صحیح ہے کہ مجھے عاصمہ بہنہانے
تمہارے بارے میں بتا رکھا تھا اس نے بھی مجھ سے یہی کہا
تھا کہ تم غقریب اپنے والدین کو ہمارے ہاں لانا چاہتے
ہو۔“

افراد اغوا کر کے لے گئے ہیں۔“ کالیا نے جیسے دھماکا کیا اور کاشف یہ سن کر جیسے سکتے میں آ گیا۔ پھر اس کے حلق سے اٹکتے ہوئے برآمد ہوا۔

جلد کچھ کرنا ہوگا، اس اطلاع پر تو میرا سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نے تو اپنی ای کو بھی بتا دیا تھا کہ!۔“
وہ شدید کرب تلے اپنا جملہ ہی مکمل نہ کر پایا اور پُر سوچ انداز میں اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔
”دیکھو بھائی! ابھی تم بھی اس سانحے کو راز میں ہی رکھنا۔“ بالآخر کالیا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بات تو بدنامی کی ہے مگر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ہم بھی نہیں بیٹھے ہوئے ہیں کیونکہ کچھ روز پہلے بھی اغوا کا ایک واقعہ..... اسی محلے میں ہو چکا ہے، کیا خبر یہ وہی لوگ ہوں، جو ایک گروہ کی صورت میں یہ ناپاک کام سرانجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاتھ کچھ گلیڈ بھی لگے ہیں۔ تم اب اپنے گھر جاؤ اور اپنے ای ابو سے کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہو، ہم کچھ کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی کسی نتیجے تک پہنچ جائیں گے۔“

یہ کہتے ہوئے کالیا اٹھ کھڑا ہوا، اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی۔ کاشت بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے میرا نمبر مانگ لیا اور میں نے اس کا۔
اس کے بعد وہ پریشان پریشان سا چلا گیا۔ میں اور کالیا کمرے سے باہر نکل آئے۔ صحن میں آکر میں بے اختیار اپنی پیشانی مسلتے لگا۔ مجھے اس قدر پریشان دیکھ کر کالیا نے نشئی آمیز انداز میں میرے کانہ سے پر ہاتھ رکھا اور اسی لہجہ میں بولا۔

”ابے لے..... جگری! تو نے تو ابھی سے دل چھوٹا کر لیا۔ میں ہوں ناں! تیرے ساتھ، بے غم ہو جا، اب تک تو یہی کچھ ہو رہا تھا ناں، اب مجھے جانے دے اور ذرا اپنے طور پر کچھ کرنے دے۔ اپنا استاد بھابھا کم نہیں ہے، ایک میٹنگ میں نے آج اس کے ساتھ بھی ادھر اڑے پر لگائی ہے۔“
کالیا کی بات سے مجھے کافی حوصلہ ہوا۔ میں نے کہا۔
”یار! ایک اللہ کا اور دوسرا تیرے جیسے دوست کا ہی آسرا ہے ورنہ تو کب کا ڈھس چکا ہوتا۔“

”اللہ بہتر کرے گا۔ میں ذرا داش روم جا رہا ہوں، اس کے بعد اڑے پر چلتے ہیں۔ استاد بھابھا سے کوئی مشورہ کرتے ہیں اس کے بھی کچھ پولیس افسروں سے واقفیت ہے۔“ میں نے ہولے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

کالیا صحن میں بنے داش روم کی طرف بڑھ گیا اور میں اپنے کمرے میں آگیا اور اپنا سیل فون دیکھا، کچھ میسج آئے ہوئے تھے۔ جنہیں میں دیکھ نہیں پایا تھا۔ سوائے دو

میسج کے باقی غیر ضروری تھے، ایک فوریہ کا تھا اور دوسرا سدو بھائی کا۔

سدو بھائی کے میسج نے مجھے چونکا دیا تھا۔

”سر! آپ کہاں ہیں اس وقت؟“

یہ میسج تین گھنٹے پہلے آیا تھا جبکہ فوریہ کا اس سے ایک گھنٹا پہلے۔ میں نے سدو بھائی کو میسج کیا کہ ”جاگ رہے ہو؟“

میرا میسج جاتے ہی اس کی کال آگئی۔

”ہاں! سدو بھائی! خبریت؟“ میں نے بغیر کسی تہیہ کے پوچھا تو وہ بولا۔

”سر! ایک اہم بات بتانا تھی۔“ وہ بولا۔

”ہاں! بولو کیا بات ہے؟“ میں نے جلدی سے کہا۔

”سر! آپ نے عزیز خان اور اس کے ساتھیوں پر اور سیٹھ ستار کے معمولات پر نگاہ رکھنے کا کہا تھا ناں کہ ان کے معمولات میں کوئی مشکوک شے محسوس کروں تو میں آپ کو فوراً آگاہ کروں؟“

”ہاں..... ہاں.....“

”سر! پہلے عزیز خان اور اس کے دوستوں کے بارے میں بتانا ہوں، ان دونوں کو میں نے گلستان جوہر کے ایک فلیٹ میں آتے جاتے دیکھا ہے، وہ رہائشی پروجیکٹ نیا بتا ہے۔“

”یہاں تم نے کون سی خاص بات محسوس کی ہے۔ وہ بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”سر! کچھ ایسی خاص بات تو نہیں معلوم ہو سکی ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ ان تینوں کا یہ نیا ٹھکانا ہے۔“
”یہاں تم نے ان کی کوئی غیر معمولی یا مشکوک نقل و حرکت محسوس کی ہے؟“

”ابھی تک تو نہیں! لیکن میں کوشش میں ہوں کہ اندر داخل ہو کر ان کی گفتگوں سکوں مگر اس پروجیکٹ میں سیکورٹی کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ کچھ وقت لگے گا اس مہم میں۔“
”ٹھیک ہے لگے رہو کوشش میں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”اب سیٹھ ستار کے بارے میں بتاؤ..... مجھے۔“

”نہیں سر! وہ ایک دم بولا۔“ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ کو ایک دن لاڈلہ سائیں کے بارے میں بتایا تھا، آج کل میں اسے سیٹھ ستار کے ساتھ دیکھ رہا ہوں پچھلے دنوں آج کل ان دونوں کو میں نے ملیر گڑھ کے ایک جاگیردار حاجی

مہران خان کے ہاں بھی آتے جاتے دیکھنے لگے ہوں۔“
 ”اوکے گڈا ان مذکورہ افراد کے معمولات میں مزید
 کچھ بھی دیکھو مجھے اسی طرح فوراً آگاہ کرتے رہتا۔“ میں
 نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
 ”رائٹ سر!“ سدو بھائی نے کہا اور میں نے رابطہ
 منقطع کر دیا۔

سدو بھائی نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ میں پہلے ہی سے
 جانتا تھا۔ اسے میں ایک اتفاق ہی کہہ سکتا تھا، ورنہ اس سے
 پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ میرے
 ساتھ اب کالیا ہوتا تھا اور میں خود بھی پہلے سے زیادہ فعال
 ہو گیا تھا۔

لیکن سدو بھائی سے میں جو اُمید کیے ہوئے تھا، یعنی
 جس سے مجھے عاصمہ بہنا کی اغویا کشمکی سے متعلق کوئی کلیو
 ملتا وہ پوری نہیں ہو سکی۔

میں اب اس گمنام فون کال اور اس کار والوں پر غور
 کرنے لگا جس کی وجہ سے میں اور کالیا موت کے منہ میں
 جانے سے بال بال بچے تھے۔ دشمنوں کی اس چنڈال
 چوڑی میں ایک نئے دشمن کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ
 ”اضافہ“ غیر متوقع نہیں تھا، تاہم یہ یہ ضرور ہی کہا جاسکتا تھا
 کہ وہ مقابل آگیا تھا۔

دیکھا جاتا تو میرا اصل دشمن یہی تھا۔ مجھے اپنے اسی
 دشمن سے ٹمٹنا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے میرے شریف
 اور سادہ لوح باپ کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنا کوئی بڑا مقصد
 حاصل کیا تھا۔ اسی دشمن نے میری زندگی کا ڈھب بدل کر
 رکھ دیا تھا۔ یہی وہ دشمن تھا جو کسی بھیا تک عفریت کی طرح
 سات پردوں میں چھپا ہوا تھا اور اب سامنے آنے لگا تھا اور
 ظاہر ہے میں اسے اپنی کامیابی طرف بوہتا ہوا پہلا قدم ہی
 سمجھوں گا کہ میری کوششوں نے بالآخر اسے لمبی کوتھیلے سے
 نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سات پردوں میں چھپا ہوا دشمن ظاہری دشمن سے
 زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ یہ دشمن مجھے ہر صورت میں کوئی بھی
 موقع دینے بغیر ختم کر ڈالنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے
 آنا فانا اپنے اس مذموم مقصد کے لیے خود حرکت میں آنا
 از بس ضروری سمجھا تھا۔

اب میرے نزدیک سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آیا عاصمہ
 کے اغوا میں اسی کا ہاتھ ہو سکتا تھا یا پھر دشمن کے کسی دوسرے
 گروپ کا۔

حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے مزید غور کیا تو یہی سمجھ آیا
 کہ مجھے بہن اور بھائی کے حوالے سے اب تک دھمکیاں
 دینے والا لینڈ فافا گروپ تھا۔ ازیں علاوہ..... اغوا سے
 متعلق کوئی تیسرا پلکر بھی ہو سکتا تھا۔

عاصمہ بہن کو اغوا یا غائب ہوئے چوبیس گھنٹے بیتے
 والے تھے اور میرے اندر اس کی سلامتی سے متعلق طرح
 طرح کے اندیشہ تک دوسوے کوڑیا لے ناگ کی طرح ڈسنے
 لگے۔ دل گھٹنے لگتا اور دماغ سن سا ہونے لگتا تھا۔ فہم اور
 عاصمہ میرے چھوٹے بھائی بہن تھے اور ان کی ذمے داری
 میرے ہی شانوں پر تھی۔

باپ کے مرنے کے بعد میں نے ہی انہیں باپ جیسا
 لاڈ اور پیار دے رکھا تھا۔ فہم اور عاصمہ میرے بچوں کی
 طرح تھے۔ فہم ناراض ہو کر پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا اور
 عاصمہ اغوا تھی۔ خالی گھر مجھے کانٹے کودوڑ رہا تھا ایسے میں
 مجھ جیسے حرام نصیب کا دل و دماغ زبردست انتشار کی زد
 میں تھا، ساتھ ہی مجھے فہم کے اس رویے پر دکھ بھی ہوا تھا،
 اس نے بے مبری اور غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا۔ اس
 مشکل گھڑی میں اسے میرے ساتھ ہونا چاہیے تھا مگر وہ
 بدنامی کے خوف سے پہلے ہی گھر چھوڑ گیا۔

دفعتاً ہی میں انتشار زدہ خیالات سے چونکا۔ مسیح کی
 ہپ ابھری۔ میں نے دیکھا فوزیہ کا مسیح تھا۔ ایسی دکھ بھری
 اور پر معلوب گھڑی میں فوزیہ کے تصور نے مجھے کچھ سنبھالا
 دیا، دل کرتا تھا کہ کوئی ایسا ہو جو جسم و جاں کے ہی نہیں بلکہ
 روح سے بھی قریب تر ہو اس سے اپنے دل کی بھڑاس نکالی
 جائے۔

یہ اس کا دوسرا مسیح تھا۔ پہلا دالا پڑھنے کے بعد میں
 اس سے رابطہ کرنے کا سوچ رہا تھا۔
 میں نے رپلائی کیا کہ وہ جاگ رہی ہے میں اسے
 کال کر سکتا ہوں؟

جواب آیا۔ ”کوئی خاص بات ہے؟ دن بھر کہاں
 رہے؟ خیریت تو ہے نا؟“
 میں نے مختصر ارپلائی کیا۔ ”خیریت نہیں ہے، آسانی
 سے بات کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ کل صبح میں کر لیتے ہیں،
 پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“
 اس کا جواب آیا۔

”کمال کرتے ہیں آپ بھی..... خیریت بھی نہیں ہے
 اور مجھے پریشان نہ ہونے کا بھی کہہ رہے ہیں۔ چند منٹ بعد

فون کرتی ہوں۔ مجھے فکر ہو گئی ہے۔“

طور پر لڑکھڑا رہا تھا۔

”شش..... شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو فونی! میں نے اگرچہ ایسا کرنے کا سوچا بھی تھا مگر.....“ میری آواز قطع میں ہی انک گئی۔ اسی وقت بات کے دوران کچھ الٹی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی کی کال آ رہی ہو۔ میں..... اسے ہولڈ نہیں کرانا چاہتا تھا تاہم اس سے تھوڑی اور باتیں کر کے رابطہ منقطع کر دیا اور دیکھا، کوئی ان نون نمبر تھا۔ میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

میں نے اس پر کال بیک کرنا مناسب نہیں سمجھا البتہ اس نمبر پر میں نے رابطہ کیا جس پر مجھے دو جھمکی دی گئی تھی جس وقت میں اور کال کیا تھا نے جارہے تھے۔ اسی وقت کال کیا کرے سے لکھا وہ واش روم سے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہاں سے لکھا تو ہم گھر سے باہر نکل آئے۔

اس کے بعد میں نے دروازے کو تالا لگایا اور ہم دونوں کار میں ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔

اڈے پر پہنچے تو استاد بھابھا موجود تھا۔ کالیا نے اسے سب بتا دیا، استاد بھابھانے پرسوج انداز میں اپنی بھنویں سکڑ لیں۔ وہ چند ثانیوں تک بولا نہیں۔ کالیا نے اسے آج والے سارے حالات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر... خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد استاد نے ہم دونوں سے کچھ سوالات پوچھے۔ اس کے بعد اپنا سیل فون نکال کر کسی سے بات کرنے لگا۔

”ہاں! میں بول رہا ہوں۔ کہاں ملے گا تو اس وقت؟“

استاد بھابھانے فون پر کسی سے پوچھا تھا۔ پھر دوسری طرف سے وہ یہ سب سنتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، میں ان دونوں کو بھیج رہا ہوں، ایس بی صاحب سے ان کی رہائش گاہ میں ہی ملاقات ہو جائے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا، کیونکہ معاملہ ذرا حساس نوعیت کا اور رازداری کا بھی ہے۔ چلو ٹھیک ہے، ابھی بھیج رہا ہوں میں۔“

یہ کہہ کر استاد نے سیل فون اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھتے ہوئے ہی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر کالیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم ضمیر شاہ کے ہاں چلے جاؤ، وہ تمہیں اے ایس بی خادم حسین کے پاس لے جائے گا۔“

”ضمیر شاہ؟“ کالیا نے سوالیہ نظروں سے استاد بھابھا کی طرف دیکھا۔

اس کے جواب سے مجھے حوصلہ سا ہوا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ میں خود بھی اس سے عاصمہ کے اغوا سے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔ انسان جب گونا گوں پریشانیوں کا شکار ہو تو اور کسی مشکل میں بھی تو چاہتا ہے کہ کسی اپنے سے بھی حال و احوال کرے اس.... کا مشورہ دیکھنے کی کوشش کرے۔ چند منٹوں بعد اس کی رنگ آ گئی۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

”ہیلو“ اس کی دل و دماغ میں اترتی ہوئی مترنم سی آواز ابھری۔ جو اس مشکل گھڑی میں بھی دل و دماغ کو سرشار کر گئی۔ میں نے اسے عاصمہ کے متعلق یہ بری خبر سنائی تو دوسری جانب سے اس کی فوراً ہی کپکپاتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔

”نن..... نعمان! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے پشمرہ لہجے میں کہا تو وہ بڑے کرب انگیز سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا..... کسے ہو گیا یہ؟ اللہ عاصمہ بہن کی عزت و زندگی سلامت رکھے۔“

”آمین“ میں نے زیر لب کہا تو وہ سسکتے ہوئے انداز میں بولی۔ ”نعمان! اللہ آپ کی مدد فرمائے، یہ بتائیں کہ آپ نے اب تک کیا کیا ہے عاصمہ بہن کی تلاش کے سلسلے میں پولیس کو اتنا فرم کیا؟“

”نہیں، مجھے کا ہی شکار ہوں۔“ میں نے دل میں ابھرنے والی درد و کرب کی لہر کو دباتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہیں تو پتا ہے کہ یہ معاملہ ہی ایسا حساس نوعیت کا ہے کہ پولیس جگ ہنساتی پہلے کرتی ہے اور مجرم کو بعد میں تلاش کرتی ہے۔“

”یہ غلط ہے نعمان!“ وہ ایک دم بولی۔ ”میرے خیال سے آپ کو ابھی تک کسی ذمے دار پولیس افسر سے رابطہ کر کے اسے ساری بات بتا دینا چاہیے تھی۔ ان سے مدد لینا آپ کا قانونی حق ہے، آپ نے غلطی کر دی، تب تم کیا کر سکتے ہو؟“

فوزیہ نے شدید تفکر سے یہ کہا تو میرے اندر ایک چھٹکا سا ہوا۔ پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے میں بہن کے معاملے میں خود غرضی سے کام لیتا رہا ہوں، مجھے اپنی بدنامی کی پرواہ بھی مگر بہن کی نہیں حالانکہ کالیا نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب میں بولا تو میرا لہجہ واضح

”ہاں! کیوں، کیا تم اسے نہیں جانتے؟ نہیں پتا
میں اس کا ٹھکانا؟“ استاد بھابھانے اس کی طرف دیکھ
کر کہا۔

”نہیں..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں استاد! بھلا ضمیر
شاہ کو میں نہیں جانوں گا تو اور کون جانے گا۔“ کالیا نے
عجیب سے انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے استاد ہم ابھی نکل
جاتے ہیں۔“ کالیا فوراً بولا۔

”ذرا ٹھہر جاؤ..... اس کا فون آنے دو..... پہلے وہ
ان سے رابطہ کر کے بتائے گا۔“
میں نے کن انھیوں سے کالیا کی طرف دیکھا تھا اس کا
چہرہ مجھے کسی الجھن کا شکار نظر آرہا تھا۔ جسے شاید صرف میں
ہی محسوس کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تو ضمیر شاہ کا فون آگیا۔ جسے ریسو
کرنے کے بعد استاد بھابھانے ہمیں جانے کی اجازت
دے دی۔
میں اور کالیا روانہ ہو گئے۔ کار اس پار کالیا ہی چلا رہا
تھا۔ اسے بائیک کے علاوہ کار بھی چلانا آتی تھی۔ میں اس
کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔
میں ضمیر شاہ کو نہیں جانتا تھا لہذا کالیا سے بولا۔ ”یہ
ضمیر شاہ تمہارا ہی ساتھی ہے؟“

”ساتھی نہیں ہے ہمارا یہ.....“ کالیا نے دونوں
ہاتھوں سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے اور نظریں وٹ
اسکرین پر مرکوز رکھتے ہوئے جواب دیا۔
”وہ استاد بھابھ کا حلیف گروہ ہے۔ کبھی وہ ہمارے
گروہ میں ہوتا تھا، گروہ میں استاد بھابھ کے بعد اس کی
حیثیت نمبر دو کی تھی۔“

”اچھا!“ میں تھوڑا چوکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ پھر اس
سے بولا۔ ”میں نے محسوس کیا تھا کہ تم اس کے ذکر پر تھوڑا
الجہ سے گئے تھے، کوئی خاص وجہ؟“

میری بات پر اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں
وٹ اسکرین سے ہٹائیں تھیں اور میرے چہرے کی طرف
عجیب مسکراتی نظروں سے دیکھا تھا پھر دوبارہ سامنے نظریں
جھاتے ہوئے بولا۔ ”اے لے..... جگر! تو بھی چھپا رہے
ہے، بندے کو تو فوراً ایسے تاڑ لے گا کہ بس! تیری نظریں ہیں
یا انیسرے مشین؟“

میں غیر تاثراتی انداز میں ہلکے سے مسکرا کر رہ گیا۔ وہ
بھی چپ رہا۔ میں نے پوچھا۔

ماہنامہ مسرگوشٹ

طرف دیکھ کر کہا۔

”چلنا ہی بہتر رہے گا، رات بھی کافی ہونے والی ہے۔“ کالیا نے کہا اور پھر یوں ہم کوئی چند منٹوں بعد ہی روانہ ہو گئے۔

ضمیر شاہ کی رہائش گاہ قریب ہی تھی۔ کالیا کار چلا رہا تھا اور ضمیر شاہ اس کے برابر والی سیٹ پر تھا میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

اے ایس پی خادم حسین کی بنگلا نما رہائش گاہ پر ہم دس، پندرہ منٹ میں پہنچ گئے تھے اور وہ ہمارا ہی منتظر تھا کیونکہ ضمیر شاہ نے اس سے فون پر بات کر کے وقت مانگ لیا تھا۔

ہمیں کسی ملازم نے ایک شاہانہ سی نشست گاہ میں بیٹھا دیا تھا جو اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے مزین تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک قد آور اور پختہ العمر کا صحت مند سا شخص برآمد ہوا، اس نے ہلکا ہلکا کھلا ڈلاشلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہم نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا اور پھر ضمیر شاہ نے ہمارا مختصر تعارف کروایا۔ اس کے بعد کالیا کو اس نے اشارہ کیا کہ معاملے کی بات کرے۔

کالیا نے ہولے سے ہٹکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر پہلے میرے بارے میں مختصر آیتانے کے بعد اس نے اصل حقیقت اے ایس پی خادم حسین کو بتا ڈالی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے کچھ سوالات پوچھے، جو روایتی طرز کے تھے۔ اس میں کچھ ایسے سوالات بھی تھے جنہیں بتاتے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہوئی تھی مگر معاملہ ہی یہ ایسی حساس نوعیت کا تھا کہ وہ بھی پوچھنے پر مجبور تھے اور میں بتانے پر۔

اس کے بعد انہوں نے مجھ سے ایک تحریری بیان لیا اور کچھ تفصیل لکھوائیں، پھر دو روز بعد ہمیں اپنے بن قاسم والے تھانے آکر ملاقات کرنے کا کہا۔

اس کے بعد ہم ان کا شکریہ ادا کر کے ضمیر شاہ کے ساتھ ہی اس کی رہائش گاہ کے سامنے اوطاق کے دروازے پر کے، گاڑی سے اتر کر ہم نے اس کا بھی شکریہ ادا کیا اور پھر اس سے بھی رخصت چاہی تو ضمیر شاہ، کالیا کے کاندھے کو ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں اس سے بولا۔ ”کالیا! میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں، تو یاروں کا یار ہے۔ استاد بھابھا کے ہی نہیں بلکہ تیرے بھی مجھ پر کافی احسانات ہیں۔ مجھے تمہارے اس دوست (اس کا اشارہ میری طرف تھا) کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔“

میں نے دیکھا کالیا نے کچھ غور کرنے والے انداز میں ضمیر شاہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دی مگر منہ سے کچھ بولا نہ تھا اس کے بعد وہ اسے سلام کر کے کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے ضمیر شاہ سے آخر میں ممنون انداز میں رخصتی چاہی تھی اور کالیا کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

”کیا بات ہے کالیا! تو مجھے اس شخص سے کچھ کھینچا کھینچا سا نظر آیا تھا؟ خیریت تو ہے ناں؟“ گاڑی میں روڈ پر آئی تو میں نے اپنے اندر کی اکھن مٹانے کی غرض سے کالیا کو مخاطب کر کے پوچھ ہی لیا تو وہ مختصر آ بولا۔

”میں اس آدمی سے کسی قسم کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔“ ”کیوں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”یہ قول تمہارے یہ آدمی تمہارے استاد بھابھا کا حلیف گروہ ہے اور پھر ضمیر شاہ تو تمہارے احسانوں کو بھی یاد رکھے ہوئے تھا۔“ ”اچھا جگر! چھوڑ اس بات کو یہ ہمارے اندر کے معاملات ہیں، تو نہیں سمجھے گا۔ اب اے ایس پی خادم حسین سے ملاقات کے بعد تو تیری کچھ تسلی تو ہوگی ناں؟“

کالیا نے میری بات کا جواب گول کرتے ہوئے کہا تو میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ”بس یار! کالیا، سلی تو مجھے تب ہی ہوگی جب عاصمہ بہن میری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔“

اڈے تک سفر خاموشی سے گزرا۔ کالیا نے مجھے اس تاکید کے ساتھ، تسلیوں تشنیوں کے بعد رخصت کر دیا کہ صبح ہونے تک یا بعد میں کسی بھی قسم کی کوئی غیر معمولی بات ہو، میں اسے آگاہ ضرور کروں اور خود سے کوئی عملی قدم اٹھانے کی غلطی بھی نہیں کروں گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گھر لوٹ آیا۔

گھر ایک بار پھر مجھے کانٹے کو دوڑنے لگا۔ کچھ اُمید پیدا ہوئی تھی مگر یہ بس ایسی ہی اُمید تھی جیسے دریا میں ٹپکنے کا سہارا۔ اب مجھے عاصمہ کے ساتھ ساتھ فہیم کی بھی فکر ستانے لگی تھی۔ وہ ناراض ہو کے گھر سے نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں اس کے بس چند دوستوں سے ہی واقف تھا اور ان کے سیل نمبرز بھی چند ایک کے ہی تھے میرے پاس وہاں فون کر کے میں نے پوچھ لیا تھا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔

اس نازک گھڑی میں مجھے فہیم کے رویے نے بہت افسردہ کر دیا۔ عاصمہ پہلے ہی غائب تھی اور اب فہیم بھی چلا گیا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں ان کے غیب سے متعلق

بہت سے سوالات ابھر سکتے تھے۔

فہیم ہوتا تو عاصمہ کا معاملہ ظاہر نہ ہوتا مگر اب فہیم نے اپنی خود ساختہ گمشدگی سے اس حساس معاملے کو اور بھی ابھار دیا تھا۔ لوگ اگر عاصمہ کے بارے میں نہیں تو اس کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ عاصمہ سے متعلق ایک حد تک سو بھانے تھے مگر فہیم تو باہر آتا جاتا تھا۔ میں اس کے بارے میں محلے والوں کو کیا بتاتا؟ اور کب تک بات چھپاتا؟ میں خود کو بالکل اکیلا اور تنہا محسوس کرنے لگا۔ کھانے کا جی نہیں کیا اور بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔

اس دوران چاچا انور شاہ کا بھی فون آیا تھا، میں نے انہیں اب تک کی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ بھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے مجھے عاصمہ کی برآمدگی تک لاری اڈے آنے سے منع کر دیا تھا۔ میں نے انہیں دھمکی آمیز فون اور بم پھینکیں جانے سے متعلق نہیں بتایا تھا۔

بہت سے معاملات تھے جنہیں مجھے ہی فیس کرنا تھا۔ نامساعد اور دگرگوں حالات کا ایک جھگڑا سا تھا جو کسی تار عنکبوت کی طرح مجھے جکڑے ہوئے تھا۔ یہ کچھ میری اپنی ہمت تھی اور کالیا کا ساتھ تھا کہ میں انہیں فیس کر رہا تھا ورنہ تو کب کا ڈھسے چکا ہوتا۔ ساتھ ہی مجھے قحط رہنے کی بھی ضرورت تھی، کیونکہ میرے دشمن در پردہ ہی نہیں بلکہ منظر عام پر بھی مجھے گند پھینکانے کے لیے میدان میں آتے تھے۔ میں اپنی سکت کے مطابق ان سے دو چار ہاتھ کر رہا تھا۔ بخشا میں نے بھی نہیں تھا۔ تاہم مجھے اپنی کم مائیگی کا بھی احساس تھا۔ دشمن طاقت ور تھے اور میں اکیلا تھا۔ کیا حیثیت تھی میری ان ارضی خداؤں کے آگے۔

میں بستر پر پڑا، بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار یہی سوچے جا رہا تھا کہ آخر عاصمہ بہنا کو کتنے لوگوں نے گھر سے اغوا کیا اور ہم دونوں بھائیوں کو اس کی ہوا تک نہ لگی۔ فہیم تو خیر یہ ماننے کو ہی تیار نہ تھا کہ عاصمہ اغوا ہوئی تھی لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اغوا ہوئی تھی۔

اچانک میرے سیل کی بیل گنگنائی۔ میں چونک پڑا۔ وقت رات کا تھا اور بارہ بجتے والے تھے۔

موبائل میرے سر ہانے ہی تھا، میں نے اسے اٹھایا۔ اسکرین پر نمبر دیکھا۔ بالکل نیا نمبر تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ میں نے فون کان سے لگا کر ”ہیلو“ کہا۔

”ہی! بھائی جان.....م.....مجھے بچا لو.....ی ی ی.....لوگ مجھے.....آہ.....“

دوسری جانب سے عاصمہ کی ہراساں اور سسکتی ہوئی آواز نے مجھے ایک دم بستر سے اچھلنے پر مجبور کر ڈالا۔

”عاصمہ! م.....میری بہن! کہاں ہو؟ کیسی ہو اور.....اور.....“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری جانب سے

اس بار عاصمہ کی بجائے ایک کرخت سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”مسٹر نعمان! تمہاری بہن زندہ ہے اور با آبرو بھی.....تسلی ہو گئی ہے تو معاملات کی بات کرتے ہیں۔“

میرے اعصاب یک دم تن گئے۔ میں یہی تو چاہتا تھا کہ اغوا کنندگان کا فون آجائے تو صورت حال کچھ واضح ہو۔ لہذا میں اپنے مختل پڑنے سے حواسوں پر لکھتے قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں.....میں تیار ہوں، کتنا پیسا چاہیے؟“

”تمہارے جیسے نجانے کتنے پچھر ہمارے جیروں کے نیچے رہتے ہیں، بھلا تم ہمیں کتنے پیسے دے سکتے ہو۔“ دوسری طرف سے وہی کرخت آواز، استہزائیہ انداز میں ابھری تھی۔

”کیا چاہتے ہو مجھ سے تم لوگ؟“ میں نے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا، ساتھ ہی میں اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا، جو ہنوز میرے لیے اجنبی ہی تھی۔

وہ زہر خند سے لہجے میں بولا۔ ”لاری اڈے سے دست بردار ہو جاؤ۔“

اس کا مطالبہ سنتے ہی میری کنپٹیوں میں دھڑکن گونجنے لگیں۔ لینڈ فافا کے ان تمام ارضی خداؤں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے رقص اٹلیں کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ان میں سرفہرست چہرہ سیٹھ ستار اور حاجی مہراں خان کا تھا لیکن چوں کہ ابھی تک حاجی مہراں کا براہ راست مجھ سے ٹکراؤ نہیں ہو پایا تھا، جو خود سیٹھ ستار کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ تاہم سیٹھ ستار کا مجھ سے اس معاملے میں کئی بار سامنا ہی نہیں ٹکراؤ بھی ہو چکا تھا۔ میرے بھائی اور بہن سے متعلق اس کی مکروہ دھمکیوں کی گونج بھی ہنوز میری سماعتوں میں کم نہیں ہوئی تھیں۔

”میں اس زمین کا مالک نہیں ہوں، میں تو خود ایک ادنیٰ ملازم ہوں۔“

”بکواس بند کرو، یہ بول بچن کسی اور کے ساتھ کرتا۔“ دوسری جانب سے غرائی ہوئی زہریلی آواز ابھری۔ ”ہم ہی نہیں تم بھی یہ حقیقت اچھی طرح جانتے ہو کہ ملیر کے اس لاری اڈے کو ہائی وے کی طرف منتقل

کرانے کے سارے احکامات کو رد کرنے اور ان کے آگے سینہ سپر ہونے والا کون ہے، کس نے عوامی کارڈ بھیلتے ہوئے ہمارے منصوبوں کو خاک میں ملایا۔ اس لیے اب اور کوئی ہنسی چٹکنی مارنے کی بجائے صرف کام کی بات کرو۔ ہاں، یا نہیں۔ ورنہ میں رابطہ منقطع کر دوں گا۔

اس کی بات سن کر میں نے جلدی سے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا اور بولا۔ ”مجھے منظور ہے مگر اس میں وقت لگے گا، چوں کہ یہ سب رازداری سے کرنا ہو گا کہ مجھ پر شبہ بھی نہ کیا جائے۔ میری نوکری کا بھی معاملہ ہے۔ تم میری بہن کو چھوڑ دو۔“

جواباً دوسری جانب سے ایک استہزائیہ ہنسی کی آواز ابھری تھی پھر اسی لہجے میں کوئی بولا۔ ”تم پر شبہ تمہاری نوکری، یہ سب گیا بھاڑ میں ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں، بات صرف ہمارے کام کی ہوگی، تمہاری نہیں، ہماری طرف سے سارے انتظامات مکمل ہیں۔ کل ایک پارٹی آئے گی تمہارے پاس۔ جو ایجنڈا لائیں، اس سمیت سارے معاملات پر تم اپنی رضامندی دو گے، اس کے لوٹنے کے ٹھیک دو گھنٹوں بعد تمہاری پیاری، خوبصورت اور جوان کنواری بہن جیسے گھر سے اٹھانی گئی تھی اسی طرح وہاں بٹھا دی جائے گی، اب ہاں یا نہ۔ میں جواب سنیں گے ہم۔“

”ہاں..... ہاں! ہم مجھے منظور ہے۔“ میں نے فوراً کہا۔

”گڈ.....“ دوسری جانب سے مختصراً کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع ہو گیا۔

میرے اندر سائیں سائیں ہو رہی تھیں۔ اعصاب شکست اور حواس منتشر سے ہو رہے تھے۔

”سینہ ستار..... سینہ ستار.....“ اسی مردود کا نام بار بار میرے دل و دماغ میں گردش کرنے لگا۔

مجھے کا لیا کہ وہ بات یاد آنے لگی تھی اور بعد میں، اس پر میں نے بھی صاف کرتے ہوئے بالآخر ہائی بھری تھی کہ اب لوہے کو لوہے سے کاٹنا اور زہر کو زہر سے بھجنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہم سینہ ستار کی املاک کو نقصان پہنچا کر اسے اسی زمان میں جواب دینے کا ارادہ باندھ چکے تھے کہ بعد میں دیگر معاملات میں الجھا دیئے گئے۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کے دو بجتے والے تھے۔ صبح ہونے اور زبردستی کی اس ”ڈیل“ کو پورا ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے۔ اس سے

پہلے مجھے اینٹ کا جواب پھر سے دینا تھا، مگر کیسے؟ اب تو شاید اس کا بھی وقت نہیں رہا تھا۔ یہ کام تو مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا، یہ قول کا لیا کہ ”جبری! قانون کا پہاڑا بڑھتے بڑھتے تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔ دشمن اپنے سارے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے اور ہم اپنے ہاتھ میں نازک سی چھری پکڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں چلے گا۔“

اس کی بات سچ تو تھی۔ ہر طرف سے ناکامی کے بعد دشمن نے بالآخر اپنی دھمکی کے مطابق تپ کا آخری پتا چھینک دیا تھا اور ایک ایسا ٹرپ کارڈ کھلا تھا، جس کے بعد مجھے سوائے بندگی کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دشمن راستوں کی اس بندگی سے میں سرگمرا رہتا اور دشمن اپنا کام کرتے رہتے۔

میرے پاس یوں بھی اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ میں اینٹ کا جواب پھر سے ہی دوں۔ پھر آریا پار۔

لاری اڑے کا معاملہ اگر صرف میرے ذاتی مفادات تک محدود ہوتا تو ایسے ایک ہزار لاری اڑے میں اپنی بہن پر قربان کر دیتا، مگر میرا اللہ جانتا تھا کہ لاری اڑے کی اس زمین سے میرا رتی برابر بھی مفاد نہ تھا، بلکہ اس زمین کا تعلق مفاد عامہ سے تھا۔ ہزاروں لوگ اس لاری اڑے سے مستفید ہوتے تھے۔ محض ایک لینڈ مافیا کے ذاتی اور مالی مفادات کی خاطر اس زمین کا کسی دور دراز علاقے میں منتقل ہو جانے کا مطلب، غریب اور متوسطہ لوگوں سے ایک سہولت کا چھن جانا تھا۔

ہاں! اگر اس زمین پر اس کی جگہ عام لوگوں کے لیے اس سے زیادہ فائدہ کی چیز بنائی جاتی تو بات بھی مگر میں جانتا تھا کہ یہ وسیع و عریض پلاٹ محض فرد واحد کے اپنے ذاتی اور مالی مفادات کے لیے چاہنا کٹنگ کی صورت میں اس کی تجوری بھرنے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ کا لیا بھنا سو گیا ہو گا۔ آج وہ بے چارہ یوں بھی سارا دن ہی میرے ساتھ جھل ہوتا رہا تھا مگر اس کی تاکید بھی مجھے یاد تھی جو اس نے رخصت ہوتے وقت مجھے کی تھی۔ شاید اسے بھی ایسی سی بات کا شبہ تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے تکلیف نہ دوں مگر مجھے ڈر تھا کہ وہ ناراض نہ ہو جائے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہو چکا تھا۔ وہ بہت خفا ہوا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ میرے پاس وہ ہتھیار نہیں، جس سے دیدہ و نادیدہ دشمنوں کو اس طرح کا جواب

دیا جاتا ہے۔ دشمن کا پورا گروہ میرے خلاف سرگرم تھا اور میرے ساتھ کون تھا؟ صرف کالیا..... میں شریف تھا اور کالیا شریف بد معاش! وہ بھی دیا ہی ہتھیار رکھتا تھا جو دشمن رکھتے تھے۔

میں نے اسی وقت کالیا کے تیل پر رابطہ کر لیا۔ تیسری رنگ پر اس کی نیم غنودہ سی آواز ابھری تھی۔ میں نے اسے اس فون کے بارے میں بتایا تو وہ جیسے ایک دم جاگ پڑا اور صرف اسی قدر بول کر رابطہ منقطع کر دیا کہ وہ اسی وقت میرے ہاں پہنچ رہا ہے۔

کالیا میرا کیا گلتا تھا؟ دوست، بھائی، جاں نثار ساتھی۔ میرا اس سے خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر اس کی دوستی کے انہی رشتے نے سارے خونی رشتوں کو بھی مات دے دی تھی۔ فقط ایک بار ہی تو میں نے اس کی جان بچائی تھی، طبر پندرہ کے علاقے میں، جب وہ اپنے مخالف گروہ کے اسلحہ بردار لڑکوں کے زخمے میں آگیا تھا۔

وقت گزرا کالیا دروازے پر تھا۔ اس کی پینٹ کی بیلٹ سے ایک بڑا سا چرمی پاؤچ اڑسا ہوا تھا۔ پشت پر ڈوریوں والا اسکوئی تھیلّا جھول رہا تھا۔ پاؤں میں جو کر اور حسب معمول چست پینٹ شرٹ۔

”مجھے پہلے ہی اس مردود پر شبہ تھا۔ اب یقین ہو گیا۔ چل اب اس کی رہائش گاہ پر شب خون مارنے کا وقت آپہنچا ہے۔“

وہ کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آیا تھا۔ جوش میں تو میں بھی پورا ابھرا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تو نے بتایا تھا شاید کہ یہ کلفٹن میں رہتا ہے؟“

”ہاں! میں نے تو اس کی رہائی کر لی تھی جب تو نے میری اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ اب لوہے کو لوہے سے کاٹنے کا وقت آگیا ہے۔“

ہم دونوں باہر نکل آئے۔ میں نے گھر کو تالا لگایا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ کالیا اپنی بانیک پر ہی آیا تھا۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اس کی ون ٹو فائیو بی بی او کا داسا کی سیٹ اشارت تھی۔ اس نے اشارت کرتے ہی بانیک آگے بڑھائی۔

ذرا ہی دیر میں بانیک مین روڈ پر آکر فرارے بھرنے لگی۔ رات کے اس پہر سڑکیں سنسان تھیں۔ اسی سبب ہم جلد ہی اپنی منزل کے قریب جا پہنچے۔ مطلوبہ بلاک پہنچ کر بانیک ایک نسبتاً تاریک گوشے میں گھڑی کر دی اور خود ہم

پیدل چل پڑے۔

کراچی کے اس نمبر دن پوش علاقے میں اس وقت گہرا سناٹا طاری تھا۔ سڑک کے دونوں جانب وسیع و عریض رقبہ اراضی پر محیط عالیشان کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کے اندر سے مدھم مدھم سی روشنیاں پھوٹی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کبھی کسی کوٹھی کے احاطے سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز ابھرتی تو ہم غلط ہو جاتے۔

ایسے علاقوں میں کسی چوکیدار کی نظروں میں آجانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ تاہم کالیا اس معاملے میں ہوشیار نکلا تھا وہ مجھے اپنے ساتھ لیے چھپتا چھپتا ہوا بالآخر ایک ایسی کوٹھی کے نزدیک جا پہنچا جس کی باؤنڈری دیال، پہاڑی پتھروں کا منظر پیش کرتی تھیں۔ یہ ڈیزائننگ تھی۔ بڑے سے آہنی گیٹ کے دونوں طرف سنگ مرمر کے پلرز تھے، جن پر دو دروہیاں روشنی دیتے گلوب نصب تھے۔ باؤنڈری وال کے سرے پر رنگین شیشوں کے نوکیلے ٹلڑے لگے ہوئے تھے۔ اندر عمارت سفید اور نیلے رنگ کی تھی جو دو منزلہ تھی۔ اندر لان سے جھانکتے ہوئے درخت اس کے غیر معمولی رقبے کا پتا دیتے تھے۔

گیٹ پر نیون سائن کے انداز کی نیم پلیٹ روشن تھی جس پر سیٹھ سار لکھا ہوا تھا۔ گیٹ کے اندر سپیدھے ہاتھ پر اندرونی طرف ایک گاڑی مین کی جھلک نظر آتی تھی۔

میرے جیسا عام آدمی اتنی بڑی اور عالیشان رہائش گاہ کو دیکھتے ہی دنگ رہ گیا تھا۔ نجانے اس مردود نے کتنے غریبوں کا خون چوس کر یہ عمارت کھڑی کی تھی، اس کی دولت کمانے کی حرص پھر بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ حرص کا نامرنا بھی ایک طرح کا عذاب ہے۔ اللہ جتنا بھی دے دے، ان کی حرص کم ہونے کا نام نہیں لیتی۔

”اندر شیر جتنی جسامت کے دو جرمن شیفرڈ کسی کو بھی چیر پھاڑ ڈالنے کے لیے موجود ہیں۔ ہمیں اس طرف سے نقب لگانی ہوگی۔“ کالیا نے عمارت کا جائزہ لیتے ہوئے سرگوشی میں ساتھ والی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا۔ وہ شاید پہلے بھی یہاں آکر اس عمارت کی رہائی کر چکا تھا۔ ہم اس طرف بڑھ گئے۔

ابھی ہم مذکورہ سمت آکر ٹھہرے ہی تھے کہ اچانک اندر سے کتے کے بھونکنے کی آواز ابھری۔

”دھت تیری کی۔“ کالیا نے کوسا۔ ”سالے بڑی تیز بور کھتے ہیں۔“ کہہ کر وہ آگے بڑھا، میں نے اس کی

تقلید چاہی۔ یوں ہم کھوم کر عقیبت میں آ گئے۔

”میں یہاں سے نقب نہیں لگانا چاہتا تھا مگر اب مجبوری ہے۔“ وہ ہولے سے بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ پھر دیوار سے کان لگا کر کچھ سنا۔

”وہ دونوں اس طرف آ گئے۔ اب کام آسان ہو جائے گا۔“

وہ خود کلامیہ بڑبڑاتے رہنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اسے شاید اندر کسی کے کھسر پھسر کرنے سے مشابہ آوازیں آ گئی تھیں، اس نے اپنی پشت کا اسکوئی تھیلہ اتارا اور اس کے اندر ہاتھ ڈال کر پہلے دو دستانے نکالے ایک مجھے پہننے کو دیا۔ اور دوسرا خود اپنے ہاتھوں پر چڑھایا۔ کالیا فنگر چٹس سے بچنے کے لیے یہ دستانے لایا تھا، اس کے بعد اس نے تھیلے کے اندر سے اور بھی کچھ نکالا تو میں چونک گیا۔ وہ گوشت کے دو بڑے پارچے تھے جو اس نے ہاتھ بلند کر کے اندر اصل عمارت اور باؤنڈری وال کے درمیانی خلا میں اچھال دیئے۔

اس کے بعد وہ پھر کھٹنوں کے بل پیٹھ کر دیوار سے کان لگائے رہا۔ چند ہی سیکنڈوں بعد وہ بولا۔ ”مگر کام سے دونوں، اب ہمارا کام شروع ہوتا ہے۔“ وہ عادتاً پھر بڑبڑایا۔ اب میں بھی اس کی خود کلامیہ بڑبڑاہٹوں کا مطلب سمجھنے لگا تھا۔

وہ شاید ان دونوں جرمن شیفرڈ کتوں کو بے ہوشی کی دوا والے گوشت کے پارچے کھلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کالیا جیسے ایک لگے بندھے معمول کے مطابق اپنا کام مرحلہ وار کیے جا رہا تھا۔ اس نے نقب زنی کا سامان نکالا۔ یہی وہ وقت تھا جب کہیں قریب ہی ایک تیز نشی کی آواز ابھری اور میں بدک سا گیا۔

”نشش..... کچھ نہیں ہوا جگر! یہ چوکیدار نے ماری ہے، محض اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے۔“ کالیا مجھے فکر مند سادکھ کر بولا تو میں پراسکون ہو گیا۔

تھوڑی دیر مزید اطراف کی سن گن لینے کے بعد کالیا نے نقب لگانے کی تیاری کرتے ہوئے مجھے اپنی جگہ دیکے رہنے کا اشارہ کیا اور خود کھڑا ہو کر اس نے رسی اچھالی۔ تسلی کے بعد اس نے جبک کر مجھ سے کہا۔ ”ہوشیار رہنا اور میرے اندر ٹاپتے ہی تم بھی اسی طرح آجانا۔ بے شک یہ

کام میرے لیے آسان اور تمہارے لیے تھوڑا مشکل ہو گا مگر مجھے دیکھتے رہو اسی طرح اوپر آ جانا، نو پر اہلم!“ میں نے اس کی بات پر اپنے سر کو اٹھائی جنبش دی۔

میں نے کالیا پر نظریں جمادیں۔ وہ کسی بندر کی طرح پھرتی سے اوپر چڑھ گیا۔ جسے دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ کم از کم میں ایسی پھرتی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہی رہوں گا جبکہ تاخیر کسی مشکل یا مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی ہمارے لیے۔

بہر کیف! میرے دیکھتے ہی دیکھتے کالیا بندر کی طرح چڑھا اور باؤنڈری وال کے سرے پر پہنچ کر دوسری جانب غائب ہو گیا۔

میں چند ثانیے تو ہفتی سا اپنا سر اٹھائے اوپر دیکھتا رہا اس کے بعد جمویتی رسی کو ایک نظر دیکھا، اس میں ذرا ذرا فاصلے سے گانٹھیں بنی ہوئی تھیں۔ پھر جس طرح کالیا نے رول پلے کیا تھا، میں نے بھی اس کی نقل کرتے ہوئے وہی کچھ کیا اور..... ابتداء میں سست رومی کا شکار رہا مگر جلد ہی پراپر طریقے پر سیٹ ہو گیا اور میرے ہاتھوں حیلوں میں غیر معمولی تیزی آ گئی۔

میں نے باؤنڈری وال چڑھنے میں کالیا سے دگنا وقت لگایا تھا مگر کامیاب رہا تھا۔

ہم دونوں اب ایک تنگ سی گلی نما راستے میں دیکے کھڑے تھے۔ یہاں ہلکی سی روشنی تھی، وجہ یہ تھی کہ یہاں سے لان قریب ہی نظر آتا تھا، جہاں فولا دی پائپوں پر نصب گلوب روشن تھے۔ اسی روشنی میں مجھے سامنے ہی اپنے قدموں کے پاس دو موٹے تازے بکرے کے سائز جتنے کتے بے سدھ پڑے نظر آ گئے۔

کالیا کے بے ہوشی کی دوا والے پارچوں نے خوب کام دکھایا تھا۔

”اے لے جگر! تو تو ایک دم سپر ڈپر جا رہا ہے۔“ اس نے سرگوٹی میں میری تعریف کی۔ میں خاموش رہا۔ میں اندر سے کچھ ڈرا..... ہوا تھا۔ اگرچہ دو ایک بار پہلے بھی میں ایسے حالات سے دوچار ہوا..... چکا تھا، تاہم وہ سب حالات کے سر پڑنے والی بات تھی جبکہ یہاں میں خود ایسے حالات کے سر ہو گیا تھا۔

کالیا نے تھوڑی گردن اونچی کر کے لان کی طرف دیکھا، پھر مجھے وہیں دیکے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ

تھوڑا آگے بڑھا اور چند قدم چلنے کے بعد رک کر وہ اس طرف کی سن گن لیتا رہا پھر میری طرف پلٹ آیا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔
تھیلا وہ اٹھا چکا تھا۔

اب ہم کوشی کی مرکزی عمارت کے عقبی گوشے میں آگئے۔ یہاں زیادہ تر سیوریج کے موٹے موٹے پائپ نظر آرہے تھے۔ ہم رکے نہیں اور بڑھتے رہے، یہاں تک کہ نصف چکر کے بعد دوسری سمت کی گلیاں آگئے اور یہاں ہمیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ کالیا، ان کھڑکیوں میں رک رک کر اندر جھانکنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ یوں ہم دوسری طرف سے گھوم کر عمارت کے اس طرف نکل آئے جہاں کارپورج تھی اور دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اب یہاں سے سامنے کا گیٹ ہی نہیں، بلکہ اس کی اندرونی سمت میں بنا ہوا وہ گاڑ کیبن بھی صاف دکھائی دیتا تھا جس کے بغیر دروازے والے چوکھٹے کے اندر روشنی ہی ہو رہی تھی۔

کوشی کا مرکزی بھاری بھر کم دروازہ جو خوب صورت عمرانی شکل میں تھا، بند نظر آ رہا تھا۔

کالیا نے مجھے ایک اشارہ کیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس کار کی چھت پر چڑھ گیا جو ادھری منزل کی بالکونی کے زیادہ قریب کھڑی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے کار کی چھت پر چڑھ گیا۔ کارپورج کے قریب لگا ایک اونچائی سی اور مخروطی سیلونی درخت ہمیں خاطر خواہ آؤ فرام کر رہا تھا۔ پہلے کالیا نے مجھے اپنی پشت کا سہارا دے کر بالکونی پر چڑھایا اس کے بعد میں نے ریلنگ سے ٹک کر اسے اوپر چڑھ آنے میں مدد دی۔

ہم اب اندر تھے مگر یہاں بھی ایک بند دروازہ نظر آیا۔ یہ ٹیرس سے اندر کی طرف کھلتا تھا۔ دائیں بائیں بڑے بڑے خوب صورت کھلمے رکھے ہوئے تھے۔ مصنوعی بیلوں کی جھالری بنائی گئی تھی۔ کالیا اور میں دے پاؤں اس دروازے کی طرف بڑھے اور پھر اس نے اپنی ہیلٹ سے جھولتے پاؤں کی زپ کھول کر اس کے اندر سے کوئی ماسٹر کی ٹائپ کی چابی نکالی اور انٹر لاک میں پر آزمایا۔ چند سیکنڈوں تک وہ اس سے جھپٹ جھڑکتا رہا اس کے بعد پینل کا موٹا سا ٹوکھمایا تو لاک کھل چکا تھا، کالیا نے اسے

راغب احسن

(1905ء - 1975ء) تحریک پاکستان

کے ممتاز رہنما اور قائد کے معتمد خصوصی، وہ ضلع ”سیا“ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی، اپنی سیاسی زندگی کا آغاز خلافت کمیٹی میں شمولیت اختیار کر کے کیا اس پاداش میں جیل بھی کافی، جیل سے رہائی کے بعد ایم، اے کیا اور اخبار ”اسٹار آف انڈیا“ کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے جب سر شفاعت احمد نے الہ آباد سے انگریزی ہفت روزہ اسٹار جاری کیا تو وہ اس کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور انہیں اقوام عالم میں صحیح مقام دلانے میں صرف کی۔ تقسیم سے پہلے وہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن تھے، جہاں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے اور قائد اعظم کے ساتھ مل کر انہیں انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ 1931ء میں آل انڈیا یوتھ لیگ بنائی اور اسی اثنا میں بیٹا فکرم اسلامیت و استقلال ملت کے نام سے ایک فکرم انگیز دستاویز مرتب کی۔ 1932ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں سیف الملت کا لقب دیا۔ 1964-1965ء میں ادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے صد رتاری انتخاب میں مشرقی پاکستان میں بہت کام کیا۔ لاء کمیشن کے رکن کے علاوہ سینٹرل اقبال کمیٹی کے نائب صدر اور سلیمان ندوی اکیڈمی آف اسلام کے بنیادی رکن تھے۔

مرسلہ: نوید صدیقی، کراچی

ہولے سے اندر کی طرف دھکیلا اور پھر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

سامنے لاؤنج تھا۔ یہاں زیرو پاؤر کا بلب روشن تھا۔ سچے سچائے اس لاؤنج سے متصل دو کمروں کے دروازے

”خبردار، سیٹھ! آواز نکالنے کی بے وقوفی مت کرنا، ورنہ گولی چل جائے گی۔“

سیٹھ ستارے تو نہیں، البتہ مجھے ضرور پہچان گیا تھا کیونکہ میں اس کے سامنے تھا۔ اسے ایک دم چپ کی لگ گئی تھی۔

کالیانے مجھے اشارہ کیا اور پھر سیٹھ ستار کو اپنے ساتھ رکھتا ہوا اندر کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں انٹرکمنیشن چل رہا تھا۔ کالیانے عقب میں لات مار کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

سامنے ایک جہاز کی ساز کے آرام دہ اور ہلکورے لیتے بیڈ پر ایک ٹھنڈے رنگی بالوں والی حسینہ سیاہ رنگ کے مہین سے باریک گاڈن میں ملبوس ہو شرپا انداز میں بیڈ پر نیم دراز تھی۔ یہ واٹر بیڈ تھا۔ اس حسینہ کی عمر کا اندازہ میں اکیس سال کے درمیان ہی ہوتا تھا۔ ہم پر اس کی نگاہ پڑتے ہی، پہلے تو اس کی کالی گہری آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹکتی چلی گئیں، اس کے بعد اس نے چیخنے کے لیے اپنے گدازبوں کو اٹھایا تھا کہ کالیانے اس کی طرف گن کارخ کرتے ہوئے غراتی آواز میں دھمکایا۔ ”خبردار! اگر ذرا بھی آواز نکالی تو..... اسی وقت دونوں کی لاشیں گرا دوں گا۔“

کالیانے سر دوسٹاک لہجے کا اس حسینہ پر خاطر خواہ اثر ہوا کہ اس کے ہونٹ دہشت ناک منظر دیکھنے والے انداز میں کھلے رہ گئے۔ کالیانے ایک زہر خند غراہٹ کے ساتھ سیٹھ ستار کو بیڈ پر دھکا دیا، وہ حسینہ کے ساتھ جا لگا۔ میرے دل میں اچانک ایک غماز سا خیال ابھرا اور میں نے بہ سرعت حرکت کرتے ہوئے ان کے غلافی تکیے کے نیچے کچھ تلاش کرنا چاہا تو مجھے کچھ نہ ملا، کالیانہ شاید میری اس حرکت کا مطلب فوراً سمجھتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”سائیڈ ٹیبل کی تلاشی لو، وہاں کوئی اسلحہ رکھا ہوگا۔“

لڑکی کی طرف والے سائیڈ ٹیبل سے تو کچھ نہیں ملا البتہ دائیں جانب والے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی اوپری دروازے ایک سیاہ رنگ کا پستول ملا، وہ میں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ حسینہ کی نیم برہنگی دیکھ کر میں نے اسے چادر اپنے اوپر لینے کا کہہ دیا تھا۔

”مم..... میں کپڑے بدلنا چاہتی ہوں.....“ وہ میری رعایت دیکھتے ہوئے بولی تو میں نے سانپ جیسی ہچکاک سے اسے گھور کر کہا۔ ”شٹ اپ! زیادہ چالاک بننے کی کوشش

اور سامنے کے رخ پر ایک راستہ دکھائی دیا جو کسی کوریڈر کا پتا دے رہا تھا۔ ان مذکورہ دو کمروں میں سے ایک کے دروازے کی پٹلی درز سے روشنی نظر آرہی تھی۔ جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اندر جو کوئی بھی تھا وہ جاگ رہا تھا۔ ابھی ہم وہاں کھڑے کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک کھٹکتی ہوئی ہنسی کی آواز ابھری۔ میں اور کالیانہ پھرتی کے ساتھ حرکت میں آئے۔ کالیانہ تو ایک بڑے سے ڈیوائیڈر کی آڑ میں چلا گیا جبکہ میں ایک فیملی ساز کے صوفے کے عقب میں جا چھا۔

اسی وقت روشنی والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھر کم جسامت کا شخص بیش قیمت سلیٹنگ گاڈن میں نمودار ہوا تو اس کے عقب سے مجھے وہی کھٹکتی آواز سنائی دی۔ ”میرے لیے ریڈ اسکاچ بغیر سوڈا کے.....“

برآمد ہونے والے شخص نے قدم بڑھاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”او..... ڈارلنگ! لگتا ہے دوبارہ موڈ بنانے کے چکر دوں میں ہو۔“

جواب میں کھٹکتی ہنسی ابھری تھی۔ وہ شخص جو مجھے اپنے جیسے اور لب و لہجے سے بلاشبہ سیٹھ ستار ہی لگا تھا، اندر پتا نہیں اس کی بیوی تھی یا پھر کوئی اور تاہم وہ یہ کہتے ہوئے ڈیوائیڈر کی طرف بڑھا جس کی آڑ میں کالیانہ چھا ہوا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سیٹھ ستار نے فریب پہنچ کر کوئی خفیہ بین پش کیا تو ڈیوائیڈر کا درمیان حصر شق ہو گیا۔ اب وہاں ایک مختصر سا کچن نما کوئی گوشہ نظر آ رہا تھا، وہاں روشنی جل اٹھی تھی۔ غور کرنے پر پتا چلا وہ ایک بار کاؤنٹر تھا، جہاں شیلٹ میں بھانت بھانت کی فینسی شپ کی بوتلیں رکھی نظر آرہی تھیں۔

سیٹھ ستار جیسے خون چوسنے والی جوکوں کی رہائش گاہوں میں یہ مختصر شراب خانہ کوئی اچھنے کی بات نہیں تھی۔ میں صوفے کی آڑ سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک بوتل اٹھائے نکلا اور وہی بین دبا کر ڈیوائیڈر کا پتہ برابر کر دیا اور پھر دائیں ہاتھ کی طرف رکھے لیے چوڑے فروج کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے اس کے پیچھے سے کالیانہ کو نمودار ہوتے اور اس پر چھپتے دیکھا۔ یہ حملہ تھا سیٹھ ستار کے لیے اچانک اور غیر متوقع ہی تھا۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر پیچھے دبیز قالین پر گر پڑی تھی۔ میں بھی صوفے کی آڑ سے برآمد ہوا۔ کالیانے اپنی انی پستول نکال لیا تھا جس کی ٹال اس نے سیٹھ ستار کی کپٹی سے لگا دی تھی۔

مت کرو۔“

”اس حرکت کا مطلب جانتے ہو تم مسٹر نعمان؟“
بالآخر سیٹھ ستار نے ہمت کی اور مجھے گھور کر بولا۔

”بہت اچھی طرح.....“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر بے خوفی اور اسے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا۔ ”میں ایسی بہت سی باتوں کو جان گیا ہوں رزویل کتے! جواب تک محض تیری گیدڑ بھبکیاں ہی ثابت ہوتی رہی ہیں۔ میری بہن کہاں ہے؟“

کہتے ہوئے میں نے اپنی جلتی سلتی آنکھیں اس کے مکروہ اور چرمیلے چہرے پر جمادیں۔ اس کی چندی چندی آنکھوں میں میرے اس سوال پر کچھ ایسے تاثرات ابھرے تھے جیسے وہ کچھ بھانپنے کی کوشش چاہ رہا ہو.....

”تمہاری بہن؟“ وہ سوالیہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے کیا پتا؟“

اس دوران کالیا کو جانے کیا سوچیں تھی وہ اپنے سیل فون پر ان دونوں کی ویڈیو اور تصاویر بنانے لگا۔

”یہ کیا لگ..... کر رہے ہو تم؟“ سیٹھ ستار بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”پپ..... پلیز! یہ مت کرو.....“ وہ لڑکی بھی کالیا سے منت بھرے لہجے میں بولی۔ اس کا حسین چہرہ اب خوف سے زیادہ کسی اور نئی جذبے سے سرخ پڑنے لگا تھا۔

کالیا نے اپنا کام کر لیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”جگزی! وقت کم ہے، اپنا کام سناؤ یا پھر میں اپنا.....“

میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے پریٹیش انداز میں سیٹھ ستار کی طرف بڑھا اور اس کی موٹی گردن دبوچ کر اسے بیڈ سے نیچے قالین پر پھینک کر الٹ دیا۔ اس کے منہ سے غرائشیں برآمد ہونے لگیں۔ اس کے بعد میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اسی کے پستول کی نال اس کے منہ کے اندر ڈال کر وحشت ناک لہجے میں بولا۔ ”ذلیل کتے! میں تیرے جھانے میں آنے والا نہیں ہوں، مجھ سے دو ٹوک بات کر، میری بہن کا پتا دے یا اپنی جان سے چلا جا۔“ مجھ پر اس وقت غیرت کی آگ کے سوائے اور کوئی سودا نہیں سما یا ہوا جلدی بول کہیں!“

کالیا بیڈ کے پائنتی کی طرف اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اور ہاتھ سینے میں باندھے آرام سے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹی ٹی ہتھوڑ دبا ہوا تھا۔ ”مم..... مجھے،

نن..... نہیں معلوم.....“

پستول کی نال نکالنے پر وہ ہکلاتے ہوئے بولا تو میں نے پستول کے ٹھوس آہنی دستے اس کے جڑے پر سرید کر دیا۔ پھر اپنے بائیں۔۔۔ ہاتھ کے کھونٹے سے اس کی ناک پر ضرب لگائی۔ گمراہ سا ڈنڈہ پروف تھا، اس کا دروازہ اور کھڑکیاں ائیر ٹائٹ تھے۔ اس کے چیخنے کی آوازیں باہر نہیں جاسکتی تھیں۔ تاہم سیٹھ ستار کو اس طرح پٹا دیکھ کر لڑکی خوف سے کانپنے لگی تو کالیا نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

سیٹھ ستار جیسے آرام طلب لوگ جو ہر چھوٹا بڑا کام اپنے زرخیز کتوں سے کروانے کے عادی ہوتے ہیں اور جانے کتنوں کو جسمانی گزند پہنچاتے رہتے ہیں، خود ایک مار بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میرا جنونی انداز دیکھ کر سمجھ گیا کہ کہیں غیرت کی آگ سے مغلوب الغضب ہو کر میں اسے ختم ہی نہ کر ڈالوں۔ وہ خون تھوکتے ہوئے بولا۔ ”ٹھہ ٹھہرو..... ٹھہرو.....“

میں رک گیا۔ میری سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ چہرہ عیض و غضب کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے سیٹھ ستار کو اسی حالت میں اٹھا کر دوبارہ بیڈ پر پٹ دیا۔ میں نے پستول کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس کی نال کا رخ سیٹھ ستار کے سینے کی طرف کر دیا اور غراتے ہوئے بولا۔ ”کتے! آخری موقع ہے یہ۔۔۔ سچ بول، ورنہ تیرا قصہ ادھر ہی ختم کر دوں گا۔“

اسی وقت کالیا بولا۔ ”جگزی! اس بار اگر تجھے جھوٹ کا ڈر ابھی شبہ ہو تو اسے بلا خوف گولی مار دے۔ یہ چوری کی واردات ثابت ہوگی اور کوئی ہم پر شبہ نہیں کرے گا، ہاتھوں میں دستانے میں نے اسی لیے چڑھائے ہیں۔“

کالیا نے یہ بات دانستہ سیٹھ ستار کو سنانے اور اس پر نفسیاتی خوف ڈالنے کے لیے ہی مجھ سے کہی تھی۔ جس کا اس پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا۔

”مم..... میں سچ ہی بولوں گا..... تمہاری بہن میرے ہی آدمیوں کے قبضے میں ہے۔“ بالآخر اس نے بتایا۔ یہ سن کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”کہاں رکھا ہوا ہے اسے تمہارے کتوں نے؟“

”مم..... مجھے موقع دو..... میں ان سے رابطہ کرتا ہوں، وہ تمہاری بہن کو ادھر ہی لے آئیں گے۔“

”یہ کیم بازی کر رہا ہے جگزی! ایک اور ڈوز دے اسے، یہ وہ مقام بتانے سے متر ہا ہے۔“ کالیا بولا۔

وائیڈ اسٹیکر آن کر دیا تھا۔

فون اب کالیا نے سیٹھ ستار کے کان سے لگا دیا۔

”ہہ..... بیلو، میں بول رہا ہوں، راجو! اس لڑکی کو ابھی اور اسی دقت میرے بنگلے میں لے آؤ۔“

”بج..... جی سیٹھ صاحب؟“ دوسری جانب سے راجو نامی شخص کی متحیرانہ سی آواز ابھری۔

”الو کے بٹھے! جو کہا ہے وہ کرو، جلدی.....“ سیٹھ ستار نے غصے سے کہا تو دوسری جانب سے بوکھلاہٹ بھری آواز ابھری۔

”او..... او کے سیٹھ صاحب! ابھی لے کر پہنچتا ہوں۔“

”سنو، تم اکیلے ہی اس لڑکی کو لے کر میرے کلفٹن والے بنگلے پر پہنچو گے۔“ کالیا کی جیسے سے ہدایت کے مطابق اس نے تحکمانہ کہا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

”میرا خیال ہے اسے یہاں تک پہنچنے میں پونا گھنٹا لگ جائے گا؟“ کالیا نے فون آف کرتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی وہ لڑکی ہکلاتے ہوئے کالیا سے بولی۔

”پپ..... پلیز! میں گھر جانا چاہتی ہوں..... مجھے جانے دو۔“

”اپنا منہ بند رکھو تم! تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔“ کالیا نے اسے جھڑکا۔ سیٹھ ستار لڑکی کو غصے سے گھورنے لگا۔ کالیا کسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ میں، تیس منٹ اسی طرح بیت گئے تو کالیا نے سیٹھ ستار سے تحکمانہ کہا۔

”میں دوبارہ تمہارے اس راجو نامی آدمی کا نمبر ملا رہا ہوں، اس سے پوچھو گے تم کہ وہ ابھی کہاں پہنچا ہے؟“

سیٹھ ستار کے اثبات میں سر ہلاتے ہی کالیا نے ایک بار پھر راجو کا نمبر ملا کر فون اس کے کان کے قریب کر دیا۔

اس کے پوچھنے پر راجو نے بتایا کہ وہ شاہراہ فیصل پر ہے اور اگلے دس پندرہ منٹ میں پہنچ جائے گا۔“

سیٹھ ستار کے ”او کے“ کہنے کے بعد کالیا نے رابطہ منقطع کر کے فون کھینچ لیا۔

”اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔“ اچانک ہی جیسے اس ڈری سہمی لڑکی نے ہمارے سامنے ایک دھماکا خیز انکشاف کیا، جس پر میں اور کالیا بری طرح چوکنے لگے۔

تھے۔

(جاری ہے)

میں نے خوشخوار نظروں سے سیٹھ ستار کو گھورا تو وہ جلدی سے اپنے خون آلودہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ”نن..... ننس، میں کوئی گیم نہیں کھیل رہا ہوں۔“

”اس جگہ کا نام بتاؤ اور تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے تاکہ تمہارا جھوٹ نہ چل سکے۔“ میں نے کہا۔ میری بات

جس کے چہرے پر پریشان کن تاثرات ہویدا ہونے لگے۔ میں نے جھک کر اس کے مونٹے پیٹ پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ چلایا اور اپنا پیٹ پکڑے دوہرا ہو گیا۔ لڑکی خوف

زدہ ہو کر ایک جانب سسڑسٹ گئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی وہ اس معاملے سے الگ ہے۔ اس نے میری دی ہوئی چادر خود پر لپیٹ رکھی تھی۔

”گگ..... گلشن حدید کا علاقہ ہے..... وہ، گھر نمبر بارہ، اے، بلاک ٹو ہے۔“ اس نے پیٹ کی درد کو پیتے ہوئے یہ مشکل اگلا۔

اس بار کالیا نے مجھے اشارہ کیا اور خود اس کے قریب آ کر بولا۔ ”وہاں تمہارے کتنے ساتھی موجود ہیں؟“

”دو، یا پھر تین.....“

”تمہارا سیل فون کہاں ہے؟“

”دو..... دروازے کے اندر ہے، نیچے والی۔“ اس نے اپنی طرف کی سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ میں حرکت میں

آیا اور وہاں سے اس کا سیل فون نکال لیا۔ پھر کالیا کے اشارے پر وہ میں نے اسے تھما دیا۔

”اب میری بات غور سے سنو..... سیٹھ!“ کالیا فون سنہٹالتے ہوئے اس سے بولا۔ ”تم مجھے اپنے اس کتے کا

نمبر بتاؤ گے، جو وہاں اس مکان میں موجود ہے اور اسے فقط اتنا حکم دو گے کہ وہ عاصمہ کو جلد سے جلد ادھر لے کر پہنچ جائے۔“

”ٹھٹھ..... ٹھیک ہے.....“ وہ بولا۔

”مگر یاد رکھنا کوئی گولی دینے کی کوشش کی تو یہی گولی تمہارا مقتدر بن جائے گی۔ پہلے اپنا لہجہ نرم کن کر دو اور کسی بھی قسم کی اندشت یا غیر دانستہ طور پر اپنی آواز کو پریشان بنانے کی کوشش مت کرنا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”نمبر بتاؤ؟“

اس نے نمبر بتایا۔ کالیا نے ملا دیا۔ فون پہلے اپنے کان سے لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی شاید کسی کی دوسری

جانب سے نیم غنودہ سی آواز ابھری تھی۔ کالیا نے اس کا

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

عبدالستار..... ساہیوال

مرے پاس سے گزر کر مرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

(قمر جہاں کراچی کا جواب)

مریم حبیب کاشف..... حیدر آباد

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

(رعنا رضوی مانچسٹر یو کے کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری..... کراچی

دشت کا یہ عالم کہ پس چاک گریباں
لڑتے ہیں بہاروں سے الجھتے ہیں خزاں سے

اور یس مسیح..... کراچی

وہ آج میری شکل بھی پہچانتا نہیں
وہ شخص جس نے کل ہی کہا تھا خدا مجھے

(نیلو فرشاہین اسلام آباد کا جواب)

اختر شاہ عارف..... جہلم

میں بنا تو لموں فیشن کسی شاخ گل پہ اپنا
لیکن ساتھ آشیان کے یہ چمن بھی جل نہ جائے

ناہید ایوب..... کامرہ

موسموں کے اداس چہرے میں
تیری صورت اثر دکھانے لگی

سیف اللہ..... ملک وال

میں نے بلبل سے جو پوچھا دردِ جدائی کا علاج
شاخ گل سے گر پڑی، تڑپتی اور تڑپ کے مر گئی

ناصر حسن..... چنیوٹ

میں ترا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو تیرے ذہن میں آتا کیا ہے

عفت کریم..... راولپنڈی

مثال شاخ جھکے جب تو ہم پھلے پھولے
نہال عجز لگا کر عجب شرم دیکھا

انور سجاد ملک..... لاہور

مری جگہ پہ کوئی اور ہو تو چیخ اٹھے
میں اپنے آپ سے اتنے سوال کرتا ہوں

(نزابت افشال مہوردہ کا جواب)

انظہر علی..... کراچی

ان کو بھی اپنے حسن کا احساس ہو گیا
آنکھوں میں میری پیار کا اظہار دیکھ کر

نصرت افروز..... جہلم

اپنے حواس میں شبِ غم کب حیات ہے
اے دردِ بھر تو ہی بتا کتنی رات ہے

(لطیف امین حیدر آباد کا جواب)

بادیہ ایمان ماہا ایمان..... فورٹ عباس

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا میری رسوائی کا

ناعمہ تحریم..... کراچی

درد کھا لیتے ہیں ہنستے ہوئے چہروں سے فریب
کیا کریں اپنی آنکھوں میں مروت ہے ابھی

مرزا جہان بیک..... لطیف آباد

رقابتوں کے شہر میں عداوتوں کا دور ہے
دھواں دھواں ہے بدن، قیامتوں کا دور ہے

(عبدالستار ساہیوال کا جواب)

بادیہ ایمان ماہا ایمان..... فورٹ عباس

دوست دار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھیں نالہ نارسا پایا

(ظفر اقبال ظفر کامرا مشرقی کا جواب)

اختر علی..... لاہور

بجلی چمکی بادل گرجا سبزہ لہکا پھول کھلے
کتنے عالم بیت چکے ہیں زلف تیری لہرانے تک

(سعید احمد جنگ کا جواب)

نزابت افشال مہورہ..... فتح جنگ۔

ہائے صدقے میں کہاں رکھوں
اس نے بھیجی ہے اوقات میری
اجہا احساس..... لاہور

ہجر کا کرب میرے سینے میں
آگ بن کر بہر نفس گیا ہے
(ماہ نور قسم ملتان کا جواب)

اختر شاہ عارف..... جہلم

اک مٹی کا دیا لو کو سنبالے کب تک
تیل بھی ختم ہے طوفاں بھی اٹھ آیا ہے
اشرف چاہد..... حیدر آباد

ایسے بدلے ہیں زمانے کے کبھی طور کہ اب
لوگ کرتے ہیں محبت بھی ارادہ کر کے
نیاز ملکھانی..... لاڑکانہ

اک دن میں نے اپنی خوب تواضع کی
اک دن میں بھی اپنے گھر مہمان ہوا
انیس پراچہ..... کراچی

ایک دن مثبت نتائج بھی ملیں گے دیکھنا
دشمنوں کی انجمن میں دوستانہ بات کر
(عبدالبارودی لاہور کا جواب)

عبدالحکیم شمر..... کراچی

وقت رخصت آگیا دل پھر بھی گھبرایا نہیں
اس کو ہم کیا کھوئیں گے جس کو کبھی پایا نہیں
نادیہ فیضان..... علی پور

دفور شوق میں ہم بھی کرامت
گزر جاتے ہیں مشکل رہ گزر سے
نائلہ منصور..... کوئٹہ

آرزو کے کنول کھلے ہی نہ تھے
فرض کر لو کہ ہم ملے ہی نہ تھے
(نیلو فرشاہین اسلام آباد کا جواب)

ارشاد خان..... پنڈی

تو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ جاتی ہیں

زین جتئی..... کراچی

تم دعا دے رہے ہو جینے کی
ہم اسے بددعا سمجھتے ہیں
(عارف شیخ چنیوٹ کا جواب)

زاہد توفیق..... لاڑکانہ

مشورہ ہے مری وحشت کا کہیں بھاگ چلو
چل کے اس شہر سے اس گھر سے کہیں دور سو
احمد جاوید..... ملتان

منافقت کی سیاست ڈبو کے چھوڑے گی
یہ بے حسی کی قیادت ڈبو کے چھوڑے گی
(ہادیہ ایمان ماہ ایمان فورٹ عباس کا جواب)

سعید احمد چاند..... کراچی

اشقی ہے کبھی دل سے غموں کی جو گھٹائیں
احساس کا دریا بھی بہا دیتی ہیں آنکھیں
رفیق احمد ناز..... ڈیرہ غازی خان

آیا جو ان کی معصوم اداؤں کا خیال
بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے
نیلو فرشاہین..... اسلام آباد

ایک گھڑی کا سکھ جو تم سے ہم کو ملا تھا یاد رہا
دکھ میں سارا جیون بیتا کچھ بھی لیکن یاد نہ آئے
نیاز احمد..... رحیم یار خان

آبلہ پا بھی چلاتی رہی ہے خواہش وصل
ہجر کی آگ میں چلتے رہے پیکر کتنے
ذیشان علی..... جہلم

آنکھوں کا ہے قصور کہ عکس جمال ہے
آئی ہے کیوں نظر تیری صورت جگہ جگہ

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی
لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین
اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف
کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر
ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسٹمز ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوا یا جائے کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کوئی کسے کہتا ہے جواب نمبر 30 اگست 2017 تک علمی آزمائش 140 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111 بکسٹیشن ڈسٹریکشن ہاؤس اٹھارویں مین کوئی روڈ کراچی

فون 35895313 فیکس 35802551

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم / محترمہ کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعرا لگ کاغذ پر ہے) 101

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

علمی آزمائش۔ 140

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا مندرجہ انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک صبحی سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپر ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اگست 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

نام تو ان کا مرزا اولاد تھا اور اردو ادب میں ایک قد آور ادیب کے طور پر پہچانے گئے لیکن ادبی نام کچھ اور پسند کیا۔ پیدائش لاہور کی ہے۔ 4 اپریل 1914ء میں پیدا ہوئے اور 31 جولائی 1999ء کو اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے۔

علمی آزمائش 138 کا جواب

عمران خان کے رشتے داروں میں خالد جہانگیر خان نے انڈین ٹیم کے رکن کی حیثیت سے 1932ء میں انگلستان کے خلاف ٹیسٹ میچ کھیلا۔ دو خالد زاد جاوید برکی اور ماجد خان نے ٹیسٹ میچوں میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی۔ بچپن و لڑپن لاہور میں گزرا۔ وہیں ایک قریبی عزیز جاوید زمان خان نے اسے ابتدائی سطح پر کرکٹ کی تربیت دی۔ 1974ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم کی قیادت کی۔ پہلی ٹیسٹ سیریز 81-1980ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف لاہور میں بنائی۔ 1982ء میں انگلینڈ کے دورے کے لیے پاکستانی ٹیم کی قیادت کی اور لارڈز کے مقام پر انگلینڈ کو تاریخی شکست دی، محسن حسن خان کا ان کے بارے میں کہنا تھا۔ ”وہ بہت اچھا کھلاڑی اور اچھا کپتان ہے۔ آج تک وہ بلاوجہ کسی سیاست میں نہیں الجھا۔“ مگر آج کل وہ سیاست میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

انعام یافتگان

- 1۔ افروز جہاں۔ کراچی
- 2۔ نسیم اختر۔ کوئٹہ
- 3۔ زاہد شیخ۔ چنیوٹ
- 4۔ عباس علی خان۔ لاہور
- 5۔ امداد اللہ۔ حیدرآباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے حسن افضل، رضیہ مسعود، بلقیس فرخ، عطاء الرحمن شاہد اثنا جاہت مہر خورشید، عثمان خان، محمد خواجہ، نصیر احمد، سعید احمد چاند، سید عزیز الدین، یاسین نوید، ناصر بیگ، خاقان علی سید، نظام الدین، ذیشان احمد، ارباب خان، مظہر

علی سید، بتعلیم عباس زیدی، خادم خان، غالب علی، محمد اسلم، مشفق احمد، خادم حسین، کمال وارچی، عثمان خان، سندس حیات،
 ار باب حسن، خادم حسین، نیاز حسن، ایم ناصر، اکبر حیات، سید عباس، صالح محمود، منیب حبیب، ذیشان احمد، سید فرح محمود،
 عباس خان، اشفاق محمد، فیض محمد، یاسین، خالدہ یوسف، اکبر خان، شجاع رضوی، دانش قریشی، مرزا سلیم، توقیر ناصر، طیب
 خان، محمد اختر، علیم ذکاٹی، یاسین خان، خالد مصطفیٰ دانش قریشی، سلطان خان، طیب الحسن، راغب الحسن، ناصر بیگ،
 منیر الحسن، توقیر عباس پکڑتی، فرحین سلطان۔ لاہور سے عدنان سعید اشفاق، عبدالبجاری انصاری، افتخار احمد تارا،
 ارسلان شاہد، ماڈل ٹاؤن۔ عبدالحق، عباس علی، یحییٰ بھٹ، شیخ محمد سرور جاوید، ناصر علی، نوید اصغر، فہد اللہ، زینہ ایوب،
 نواب الحسن، یاسین محمد، انیس قائم خانی، ظفر چنیوٹی، آصف خان، چودھری فضل اللہ، محمد اکرام، فرحت مصطفیٰ، برکات اللہ،
 ظفر قاسم، فاضل اختر، خادم علی، ذیشان علی، کائنات علی، فرحت بٹ۔ ملتان سے محمد سرفراز مغل، امام بخش (گلگت) محمد
 منیب چشتی، معین چشتی، خواجہ محمد حسین، محمد منیب، نازش فاروقی، حفصہ حیات بھٹی، اقبال انصاری، توقیر عباس، بابر سعید، لبنی
 ارشاد، ادیس سلمان، سلطان فتح علی، شیر علی سید، نوید اصغر بخاری، محمد آصف، اقبال حسن خان، انعام حسن خان، امام بخش
 ملک، محمد معین، ناصر کوچی، حنیف محمد، برکات اللہ بخش، اسماعیل آفاق، شیخ نہال احمد، ارشاد حسن گلگی۔ پشاور سے نصیر من
 اللہ، شیر نواز گل، شاہ نواز گل، وحیدہ خان، شاہ زرولی، غلام عباس طوری۔ سرگودھا سے خدیجہ دلدار، ماریہ چودھری،
 قدرت خان، اشفاق حسن، داؤد عثمانی، فرحت اللہ، رمضان حسن، ظفر میمنگل، ہاشم رضا، عمیر علی۔ اسلام آباد سے فریدہ
 افتخار، محمد ریاض رحیل، عبدالاحد، نیلو فرشاہین، انور یوسف زئی، ادیس پاشا، یوسف حمید گل خان، ڈاکٹر فرخندہ لودھی، خرم
 علی، شیخ فتح یاب، جنید ملک، جہانزیب خان، ملائکہ حسن۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان۔ ڈی جی خان سے رفیق
 احمد ناز۔ میرپور خاص سے معین علی خان، غلام شبیر، مرزا طاہر الدین بیگ، حافظ محمد حسن، عابد علی شیخ، تانیہ عطاری، رخشاند
 اکمل، لبنی اکرام، فرحت اعجاز بھٹو، شیخ یاسین، ذوقشاں فاطمہ، محمد منیب، محمد بخش، زویا اعجاز بھٹو، فرحین شمرہ۔ تملہ گنگ سے
 ملک طارق رشید، عباس علی۔ بدین سے سید ایس ڈی ساغر۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ، ڈسک سے طاہر سلیم۔ صونی کے پی کے
 سے کوثر اسلام۔ انک سے رضوان ارشد، سید محمد حسین شاہ، حبیب علی۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان تنک، میانوالی سے نصر اللہ
 خان، عمر حیات، حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی، کمال حسن، شاہ مراد۔ بہاولپور سے: ساجدہ عندلیب، فاخر حسین، مصباح الرضا۔
 ننکانہ صاحب سے: جمیل چیمہ۔ کمالیہ سے: سعید علی محمد اکبر۔ کوثری سے: ندیمہ ناز، شمسہ اصغر، ساجد علی۔ میرپور خاص سے: عابد علی
 رخشاند اکمل، اقراسلطان، شامک قادری عطاری، مظہر حسین قائم خانی، مرزا طاہر بیگ۔ تملہ گنگ سے: محمد توریہ، نوگراں، جہلم سے
 کمال اللہ خان چوکیدار۔ کوہاٹ سے: صفدر عباس اشرفی۔ واہ کینٹ سے: نور افضل خان تنک، مجید الرحمن، تانیہ فرید، مسز معین نصیر۔
 تونہ شریف سے: میاں محمد نوید۔ جب سے: شاہینہ رضوان۔ پاک پتن شریف سے: علی محمد۔ خیرپور سے: گل باز خان خالد
 آفریدی، ذکیہ ممتاز، عامر جمیل قریشی، محمد علی، صنوبر، جوکیہ، منیبہ بلوچ، ملک سرفراز۔ راولپنڈی سے: جویریہ حلیم، محمد سلیم، حافظ محمد اقبال
 مرزا الطاف حسین، نقیہ جمال، صفراں بیگم، نواز علی، مہوش خان، اطہر احمد قریشی۔ لالہ موٹی سے: رخشاند یاسین، فوزیہ وہاب۔ اوکاڑہ
 سے: سید احسن محمود، جعفر افتخار، افضل بیڑو۔ سیالکوٹ سے: اقرار حسن، دین محمد، تاشیر زیدی۔ خوشاب سے: ملک نوید اصغر۔
 حیدرآباد سے: محمد یاسین اندوری، ماہ رخ، ساجد فاروق، حکیم اللہ جان، سلطان علی، سید کاظم علی، نصیر بوترا، راغب الحسن،
 روٹی انصاری، طیب علی، حسن گلگی، اختر ہاشمی، نعمان فاروق، منیر حسین، فرحت عثمان، عزیز شیخ، فرخ مرزا بیگ، دانش فتح
 محمد، اشفاق شیخ، کاظم علی گلگی۔ لیہ سے: ماہینہ انور، نوید حسن خان، لطیف اللہ۔ حسن ابدال سے: خرم حسن۔ ہری پور ہزارہ سے
 کاظم علی گلگی، اشرف الماس۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے: باسط، سلمان نیازی، ملک دین محمد، ڈیرہ غازی خان سے: عباس
 خان، اشرف حسن، رفیق احمد ناز، زرین مجید، قبلائی خان۔ خوشاب سے: ممتاز حسن۔ بہاولنگر میں ناصر عباس۔ جہلم سے: اختر
 شاہ عارف، فتح یاب خان، زعیم شریف، انصر عباسی۔ جوئیہاں سے: ملک شاہین۔ کمالیہ سے: فرحت خان۔ بھکر سے: محمد عارف
 قریشی۔ فتح جنگ سے: نزہت افتخار۔ مظفر گڑھ سے: ڈاکٹر نادیہ اطہر۔ بورے والا سے: رانا محمد شاہد۔ ساکھڑ جام نواز علی
 سے: عاشق حسین مغل۔ ساہیوال سے: عبدالستار۔

بیرون ملک سے: بکرم نیاز، عمان سعودیہ۔ ناصر احمد، الحین یو اے ای۔ عباس بٹ، مانچسٹر یو کے۔ نور عین طاہرہ،
 نورنو کینڈا۔ برمیں قدر، دہلی یو اے ای۔

نقشب

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

زندگی کی راہ میں ایسے ایسے لوگ ملتے ہیں جو حیران کر دیتے ہیں۔ میری دوست شمائیلہ کا شوہر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس نے مجھے اس قدر حیران کیا کہ میں اسے بھلا نہیں سکتی۔ گو کہ اب وہ میری دوست کا شوہر نہیں رہا، پھر بھی اسے میں بھلا نہیں پائی ہوں۔

انیلہ

(کراچی)



ہوئے کہا۔ ”تم نے ہی یہاں روک کر باتیں شروع کر دیں۔“

شمائیلہ میری بچپن کی سہیلی تھی۔ اسکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی ہم ساتھ ساتھ رہے پھر اس کی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کر اپنے ماں کے ساتھ اسلام آباد چلی گئی جب کہ میں کراچی میں ہی مقیم رہی۔ میرے شوہر کو وہی میں جاب مل گئی لیکن ان کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ زیادہ تر مختلف شہروں اور ملکوں کے دورے پر رہتے تھے۔ اس لیے مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔ میں کراچی میں ہی اپنی ساس اور دیور کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ میرا دیور سلیم بھی برسر روزگار تھا اور صبح کا گیا شام کو واپس آتا تھا۔ کبھی کبھی کام کی زیادتی کی وجہ سے آٹھ نو بج جاتے۔ ساس صاحبہ گھنٹوں کی تکلیف میں جلتا تھیں اور ان سے گھر میں بھی بمشکل چلا جاتا تھا۔ وہ زیادہ دقت اپنے کمرے میں گزارتیں۔ ان کا واحد علاج آپریشن تھا جس کے لیے وہ تیار نہیں ہوتی تھیں۔

اس دوران میں شمائلہ کے حالات سے بالکل بے خبر رہی۔ کبھی کبھی ہمارا فون پر رابطہ ہوتا تو ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گزر جاتا۔ نہ میں نے کبھی اس سے کچھ پوچھا اور نہ ہی اس نے خود کچھ بتایا لیکن کبھی کبھی اس کے لہجے سے محسوس ہوتا کہ وہ خوش نہیں ہے اور اس نے اپنے دکھ کو ہنسی کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہی ہنس کھ اور شوخ و شریار و خور ہوئی تھی۔ ہنسا ہنسانا، لطیفے سنانا اور نئی شرارتیں

میں نے دروازہ کھولا تو شمائلہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کی اچانک آمد میرے لیے غیر متوقع تھی۔ گو کہ اس سے دو دن پہلے فون پر بات ہوئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ کراچی آ رہی ہے۔ اس نے

مجھ سے میرا پتا بھی پوچھا تھا جو میں نے اسے موبائل پر سینڈ کر دیا تھا لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی نازل ہو جائے گی۔ میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے دیکھا اور اس سے پلٹتے ہوئے بولی۔ ”کم از کم

کم اپنے آنے کی اطلاع تو دی ہوتی۔ میں تمہیں لینے اتر پورٹ آ جاتی۔“

”تم میرے میاں کو نہیں جانتیں۔ انہیں سر پرانز دینے کا بہت شوق ہے۔ یہ انہی کا آئیڈیا تھا کہ ہم اچانک کراچی پہنچ کر سب کو حیران کر دیں گے۔“

”اچھا۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا سامان کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟“

”ظاہر ہے کہ میکے میں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چند روز میں کوئی بندوبست ہو جائے گا تو ہم وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔“

”اچھا! اندر تو چلو۔ کیا یہیں کھڑے کھڑے ساری باتیں کر لو گی؟“ میں نے کہا۔

”میں تو سیدھی اندر ہی جا رہی تھی۔“ اس نے ہنستے



چائے کا پانی کیتلی میں ڈال کر چولہے پر رکھا اور جلدی جلدی شامی کباب تیلنے لگی۔ اسے شامی کباب بہت پسند تھے۔ گھر کے نیچے ہی بیکری تھی۔ میں نے فون کر کے کچھ چیزوں کا آرڈر دیا۔ پانچ منٹ میں ان کا لڑکا سب سامان لے کر آگیا۔ میں نے تقریباً سب لوگوں کے فون نمبر لے رکھے تھے اور انہیں فون کر کے بلا لیا کرتی تھی۔ ان میں قسائی، دودھ والا، سبزی فروش، جنرل اسٹور، ٹیلر ماسٹر، کارپینٹر، الیکٹریشن اور پلمبر وغیرہ سبھی شامل تھے۔ اس طرح مجھے کہیں نہیں جانا پڑتا تھا اور میرے سارے کام گھر بیٹھے ہو جاتے تھے۔

شاملہ نے جو یہ اہتمام دیکھا تو بولی۔ ”تم تو میری اس طرح خاطر مدارات کر رہی ہو جیسے پہلی بار تمہارے گھر آئی ہوں۔“

”ارے میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ شامی کباب تمہیں پسند ہیں۔ اس لیے بنالے۔ باقی چیزیں تو لوگ چلتے پھرتے کھا لیتے ہیں۔“

”تمہیں اب تک یاد ہے؟“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں سب دوست اس کی حرکتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اس نے ہنسی علاج غم ہے، کو اپنا موٹو بنا رکھا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ ہنسنے والے کے ساتھ سب ہنستے ہیں لیکن رونے والے کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔ اس لیے اگر رونا آ رہا ہے تب بھی ہنسو کیونکہ اسی میں تمہاری بقا ہے۔

میں اسے لاؤنج میں لے کر آئی اور بولی۔ ”تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”میں چائے پینے نہیں، تم سے ملنے آئی ہوں۔ یہاں بیٹھو میرے پاس۔“

”ارے تو چائے بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ بس پانچ منٹ دے دو۔ اس کے بعد ہم دل کھول کر باتیں کریں گے۔“

”اچھا تو جب تک میں تمہاری ساس سے مل لوں۔“

”کہاں ہے ان کا کرا؟“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ چلو میں تمہیں ان کے پاس لے جاتی ہوں۔“

شاملہ کو ساس کے پاس چھوڑ کر میں کچن میں آئی۔

”کیسے بھول سکتی ہوں۔ تمہاری ایک ایک بات میرے دل پر نقش ہے۔“

”واہ محبت ہو تو ایسی۔“ اس نے میرے گلے میں بانٹیں ڈالے ہوئے کہا۔ ”اگر تم لڑکا ہو تیں تو میں تم سے ہی شادی کرتی۔“

”چلو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تمہیں مجھ سے بہتر بندہ مل گیا۔ تم خوش تو ہونا؟“

”ہاں کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے سر آدھ بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے پاؤں دوہ ٹسکار رہی تھی۔

”تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ کھل کر کہو۔“

”دیکھو، جیسی مرد کی اصلیت کا پتا شادی کے بعد ہی چلتا ہے۔ دیسے تو ہر انسان میں خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات اس کی ایک خامی ہزار خوبیوں کو نگل لیتی ہے۔“

”ذرا میں بھی تو سنوں کہ تمہارے شوہر میں ایسی کیا خامی ہے جس نے تم جیسی زندہ دل لڑکی کو آپس بھرنے پر مجبور کر دیا۔“

”رہے دو۔ تمہیں دکھ ہو گا اور میں تمہیں دکھی کرنا نہیں چاہتی۔“

”تمہارا دکھ میرا دکھ ہے۔ تمہی تو کہا کرتی تھیں کہ دکھ بانٹنے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“

”مانا کہ تم ایک کامیاب سوشل ورکر ہو اور تم نے کئی کیس چنکی بجائے حل کیے ہیں لیکن تم کسی انسان کی فطرت نہیں بدل سکتیں۔ یہ بھی ایسا ہی ایک کیس ہے۔“

”پھر بھی پتا تو چلے کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ میرے خیال میں ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو۔“

”تو سنو، میرا میاں ٹھہر گیا ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”ٹھہر گیا؟ وہ کیا ہوتا ہے؟“

”عورتوں کا رسیا۔ انگریزی میں اسے womanizer کہتے ہیں۔ ہر خوب صورت عورت کو دیکھ کر اس کی رال پٹنے لگتی ہے اور وہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔“

”اوہ، یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے۔“ میں نے فکر مندی سے کہا۔ ”بھی اسے کامیابی بھی ہوئی؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ چوبیس گھنٹے تو اس کے ساتھ

نہیں رہتی۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں کہاں منہ مارتا پھرتا ہے۔“

”پھر بھی بندے کی حرکات و سکنات سے کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔“

”اوہ بھی! تم تو تفتیش کرنے بیٹھ گئیں۔“ وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔ ”بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ فون پر تو وہ کافی دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے لیکن اس نے گھر سے باہر کبھی رات نہیں گزاری۔ دن میں کوئی کارنامہ انجام دیا ہو تو کہہ نہیں سکتی۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور شکایت؟“ میں نے اپنی تفتیش سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں اگر اس کی شخصیت سے یہ پہلو نکال دیا جائے تو اس سے اچھا انسان کوئی نہیں۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔“

”خارج کی بھی کوئی شکایت نہیں۔ مجھے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ آج تک ہمارے درمیان کوئی بڑا جھگڑا نہیں ہوا۔ بس اس کی اس عادت نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ ڈرتی ہوں کہ کھیل کھیل میں کوئی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھو، بہت سی عورتیں ایسے مردوں کی تاک میں رہتی ہیں۔ مثلاً کوئی ایسی لڑکی جس کی عمر زیادہ ہو جائے اور اس کی شادی نہ ہو یا رہی ہو۔ کوئی بیوہ، مطلقہ یا ایسی عورت جو اپنے شوہر سے مطمئن نہ ہو ایسی کوئی بھی عورت اس کے گلے پڑ سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو مجھے اس گھر سے نکلنا ہو گا بلکہ میں خود بھی اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہوں گی۔“

”تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”اس لیے کہ جو گرہتے ہیں وہ برستے نہیں اگر اس نے آج تک رات باہر نہیں گزاری تو اس کا مطلب ہے کہ وہ عیاش نہیں ہے بلکہ اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس کرتا ہے یا پھر وہ کسی قسم کے احساس محرومی میں مبتلا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی ہو رہی ہو۔“

”کیا مطلب؟“ وہ تنک کر بولی۔

”مطلب بالکل واضح ہے۔ لگتا بھی ہے کہ تم اسے وہ توجہ اور محبت نہیں دے پا رہی ہو جس کی وہ توقع کرتی ہے اور اسی لیے وہ دوسری عورتوں میں پناہ ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اس کی

خوشی ہوگی کہ میرے حسن کا ایک قدردان تو ملا۔“
”کیوں تمہارے میاں.....؟“ وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”بہت اچھے ہیں لیکن انتہائی غیر رومانی، محبت بھی اپنا فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔“

”چلو اچھی بات ہے۔ کم از کم محبت میں خیانت تو نہیں کرتے۔“

”ہاں ان کی یہی کمزوری میرے لیے باعث اطمینان ہے جب وہ مجھ سے رومانی مکالمے نہیں بول سکتے تو کسی اور سے کیا بولیں گے۔“

شائلہ کے شوہر ماجد کو میں نے اس کی شادی کے موقع پر دیکھا تھا اور اب مجھے اس کی شکل بھی یاد نہیں رہی تھی۔ شادی کے فوراً بعد وہ اسلام آباد چلی گئی اور ایک طویل عرصے بعد اس کا کراچی آنا ہوا تھا۔ میں تو اسے ویسے بھی کھانے پر بلاتی لیکن یہ دعوت میرے منصوبے کا حصہ تھی۔ اس لیے میں نے خاص طور سے اہتمام کیا تھا۔ صبح سے ہی کھانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ میں نے تین چار ڈشیں بنائیں اور مہمانوں کے آنے سے پہلے خود تیار ہونے لگی۔ اس روز میں نے ماجد کی خاطر تواضع کرنے کے لیے اپنے بناؤ سنگھار پر خصوصی توجہ دی کیونکہ یہ بھی میرے منصوبے کا حصہ تھا۔ میں نے فنگ والی فیص پہنی چہرے پر ہلکا میک اپ کیا۔ ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائی۔ بالوں کو برش کر کے انہیں کھلا چھوڑ دیا اور اپنے جسم کو خوشبوؤں میں بسا کر مہمانوں کے استقبال کے لیے تیار ہو گئی۔

مجھے یقین تھا کہ ماجد مجھے دیکھتے ہی گھٹاں ہو جائے گا اور اس کے بعد میں اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل شروع کر دوں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ بھی ایک کانیا شخص تھا۔ بیوی کی موجودگی میں وہ بیٹکی بلی بن کر بیٹھا رہا اور اس نے ایک دفعہ بھی میری طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھ سے زیادہ بات کی۔ رکی ہائے ہیلو کے بعد وہ میرے دیور سے باتوں میں لگ گیا لیکن میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ چوری چوری میری جانب دیکھ رہا ہے اور اس کی گستاخ نظریں تیر کی مانند چھ رہی تھیں۔

کھانے کے دوران اس کا کردار کھل کر سامنے آ گیا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا شائلہ نے بتایا۔ میں جب بھی کوئی ڈش یا پلیٹ اٹھانے کے لیے جھکتی تو اس کی نظریں فوراً میرا

ڈتے داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ وہ شروع سے ہی ایسا ہے۔ کالج میں بھی لڑکیوں سے دوستی کرنے کے چکر میں رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی کزنز کو بھی نہیں بخشا۔ ان سے بھی افسر چلانے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک تو اس کے دام میں آ گئی تھی لیکن اس کی شادی نہیں اور ہو گئی۔ یہ بات مجھے اس کی بہن نے بتائی۔“

”اوہو! یہ تو بہت دلچسپ کیس ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ سوچتی ہوں۔ بس تم اس پر کڑی نظر رکھو اور اگر کہیں کوئی گزب نظر آئے تو مجھے فوراً بتانا۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ میرے خیال میں یہ مرض ناقابل علاج ہے۔“

”دیکھو بلی! ڈاکٹر کو پتا ہوتا ہے کہ مریض موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ اسے آخر وقت تک بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں بھی ناامید نہیں ہوں۔ اللہ نے چاہا تو اچھا نتیجہ سامنے آئے گا۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دیا اور اس پر عمل کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ پہلے خیال آیا کہ شائلہ کو بھی اس منصوبے میں شامل کر لوں لیکن پھر اسے ترک کر دیا۔ بے شک وہ میری عزیز ترین دوست ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عورت بھی ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہے گی کہ میں اس کے شوہر سے قریب ہو جاؤں۔ ویسے بھی میرے شوہر پردیس میں تھے اور کبھی کبھی مجھے شدت سے تنہائی کا احساس ہونے لگتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شائلہ کا شوہر میری اس محرومی سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جائے اور میں سبکی سے سوتن بن جاؤں۔ اس لیے میں نے اپنے طور پر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن میں نے شائلہ کو فون کر کے اسے شوہر سمیت اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ پہلے تو اس نے رسوا انکار کیا لیکن میرے اصرار پر مان گئی۔ تاہم اس نے کہا۔ ”انیلا ایک شرط پر تمہاری دعوت قبول کر سکتی ہوں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”تم بہت خوب صورت ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں دیکھتے ہی پاگل ہو جائے گا۔ اگر وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو پلیز مائنڈ مت کرنا۔ تم تو جانتی ہو یہ اس کی عادت میں شامل ہے۔“

”نو پراہلم۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بلکہ مجھے

طواف کرنے لگتیں۔ میں نے تنگ آ کر دو پیاسر اور سینے پر اچھی طرح پٹیٹ لیا تاکہ اس کی آتش شوق مزید بھڑک اٹھے۔ میں اسے دریا کے کنارے لا کر پیاسا رکھنا چاہ رہی تھی۔ شامکہ اور میرا دیور کھانے میں مصروف تھے۔ انہیں پتا بھی نہیں چلا کہ میں کیا کھیل، کھیل رہی ہوں۔ کھانا ختم ہونے تک میں جان چکی تھی کہ وہ پوری طرح مجھ پر مرنا ہے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد میرا دیور تو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے جلدی سونے کی عادت تھی۔ ہم لوگ لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ میں نے سب کے لیے چائے بنائی۔ اب تک اس نے سلام دعا کے علاوہ مجھ سے براہ راست کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس سے زیادہ دیر ضبط نہ ہو سکا اور بولا۔ ”وائقی آپ کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔ سب چیزیں مزے کی تھیں۔ میں تو ضرورت سے زیادہ ہی کھا گیا۔“

”شکریہ!“ میں نے ایک قاتل مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی آپ لوگوں کے ساتھ کھانا اچھا لگا۔ ایسے مواقع کبھی بکھار ہی ملتے ہیں۔“

میرے جواب سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں۔“

”ضرور پوچھیں۔ میں دوستوں کی بات کا برا نہیں مناتی۔“

میں نے اسے ایک دم ہی دوست کا درجہ دے دیا تو وہ خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا اور بولا۔ ”بڑی نوازش کہ آپ نے مجھے دوست سمجھا۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ کے شو ہر ملک سے باہر ہیں اور آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں۔ آپ کو تنہائی نہیں ستاتی؟“

اس کی بات سن کر شامکہ نے اسے بری طرح گھورا۔ شاید اسے ماجد سے اس بے تکلفی کی توقع نہیں تھی لیکن وہ پوری طرح میرے حسن کے شہر میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس نے شامکہ کے گھورنے پر کوئی توجہ نہیں دی اور میری طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

”پہلی بات تو یہ کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ساس اور دیور بھی رہتے ہیں۔“ میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا حالانکہ میں سمجھ چکی تھی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔ ”جہاں تک شو ہر سے دور رہنے کا تعلق ہے تو یہ ہماری مجبوری ہے۔ ان کے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ

مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔“

”یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ آپ کب تک ان کے بغیر رہتی رہیں گی۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں مسلسل میرے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں نے زندگی میں ایسا نظر باز شخص کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسی مرحلے پر اپنا منصوبہ ترک کر دوں اور دوبارہ بھی اس بد معاش کی شکل نہ دیکھوں لیکن پھر مجھے اپنی عزیز سہیلی کا خیال آیا جس کی خاطر میں نے یہ کھڑاگ بھڑپھلا یا تھا۔ میں ماجد کو سبق سکھانا چاہ رہی تھی تاکہ وہ زندگی بھر کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ اس لیے اپنے آپ پر جبر کر لیا لیکن شامکہ میری بے چینی بھانپ چکی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”مجھے ہاتھ روم کا راستہ دکھا دو۔“

میں سمجھ گئی کہ وہ مجھ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ میں ماجد سے معذرت کر کے شامکہ کو اپنے بیڈ روم میں لے گئی جس کے ساتھ ایجنڈ ہاتھ بھی تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”اسے زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری جان کو آجائے گا۔“

”بے فکر رہو۔ میں ایسے لوگوں سے غمنا خوب جانتی ہوں۔“ پھر اپنی آواز پچی کر کے کہا۔ ”میں نے تمہارے شو ہر کو راہ راست پر لانے کے لیے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ آج کی دعوت اسی کا حصہ ہے۔ اس کی تفصیل بعد میں بتاؤں گی۔“

”ہو شیار رہنا، وہ شکار نہیں شکاری ہے۔“

”یہ تو اسے آنے والا وقت بتائے گا کہ کون شکار ہے اور کون شکاری۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

ماجد شدت سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”کہاں رہ گئی تھیں آپ۔ میرے لیے تو ایک ایک سیکنڈ گزرا نا مشکل ہو رہا تھا۔“

”اتنے بے تاب کیوں ہو رہے ہیں۔“ میں نے ایک اداسے بالوں کو پیچھے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں آئندہ بھی ملنے کے مواقع میسر آئیں گے۔“

”اوہ۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ”گویا آپ کی طرف سے اجازت ہے۔ میں آپ سے ملنے کے لیے آسکتا ہوں۔“

”بالکل اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ جب جاہن آسکتے ہیں بلکہ شاملہ کو بھی ساتھ لے کر آئیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ آپ لوگوں کے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔“

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”شاملہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسے گھر کے کاموں سے ہی فرصت نہیں دیے بھی اسے میرے ساتھ کہیں آنا جانا پسند نہیں۔ البتہ میں آپ کی تنہائی دور کرنے آسکتا ہوں۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ظاہر ہے کہ میں اسٹینک کر رہی تھی۔ ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔

میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ شاملہ آگئی۔ اس نے ہیکھا لچہ اختیار کرتے ہوئے ماجد سے کہا۔ ”اگر آپ کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو گھر چلا جائے۔“

”ہاں ہاں چلو۔“ وہ گڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے میں نے شاملہ سے کہا۔ ”اب کب آؤ گی؟“

”دیکھو، کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ وہ بے رخی سے بولی۔

”اب تمہاری باری ہے ہم لوگ اپنے مکان میں شفٹ ہو جائیں۔ پھر میں تمہاری دعوت کروں گی۔“

”دعوت کی کیا ضرورت ہے۔ میں ویسے ہی تم سے ملنے آ جاؤں گی۔“

”تم دس مرتبہ آؤ لیکن دعوت تو ہوگی۔ مجھے یہ ادھار بھی تو چکانا ہے۔“

مجھے اس کا لچہ بدلا ہوا محسوس ہوا۔ جب آئی تھی تو اس کا موڈ کچھ اور تھا لیکن جاتے وقت وہ کافی اکھڑی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ عدم تحفظ میں مبتلا ہوگئی ہے۔ وہ

اپنے شوہر کے کرتوتوں سے واقف تھی اور اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میری طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسے

میں اس کی ناراضی بھی سمجھا لیتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگلے روز فون کر کے اس کے خدشات دور کر دوں گی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے آپ کو اس بکھیرے سے الگ کر لوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری عزیز ترین سہیلی بھی مجھ سے بدگمان ہو جائے۔

ویسے بھی میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے خدوخال پوری طرح واضح نہیں تھے۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات

تھی کہ شاملہ کے شوہر کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوسری عورتوں کا پچھا کرنا چھوڑ دے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اسے اپنے قریب لاؤں اور جب وہ سر سے پاؤں تک میرے عشق میں ڈوب جائے تو اس کے نیچے سے بیڑھی ٹھیک لوں تاکہ وہ منہ کے بل زمین پر گرے اور اس کے ہوش ٹھکانے آجائیں لیکن اس کے لیے ایک ایسی پچویشن کا ہونا ضروری تھا جس کے ذریعے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے لیکن وہ پچویشن میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس منصوبے کو لینے کا فیصلہ کر لیا اور دوسرے دن میں نے شاملہ کو فون کر کے بتا دیا کہ اس کے شوہر کا مرض ناقابلِ علاج ہے اور صرف وہی اسے قابو کر سکتی ہے۔

وہ تہقیر لگاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا لیکن تمہیں ہی شر لاک ہو مرنے کا شوق ہو رہا تھا۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ میں اسے کیسے قابو کر سکتی ہوں۔“

”اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم اس کے ساتھ مستقل قحطی ہو جاؤ۔ دفتر کے علاوہ اسے کہیں اکیلا نہ

جانے دو۔ اسے کسی مخمل میں عورتوں سے قریب ہونے یا بات کرنے کا موقع نہ دو۔ ہر جگہ اس کے ساتھ جاؤ۔ اس کا دم چھلا بن کر رہو۔ اس طرح اسے کوئی ایسی دینی حرکت

کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”میں یہ سب کر کے دیکھ چکی ہوں۔“ اس نے بے زار کن لہجے میں کہا۔ ”وہ ہمیشہ رسی ترا کر بھاگ جاتا ہے۔“

”ایک ترکیب اور بھی ہے۔“ میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن شاید تم اس پر عمل نہ کر سکو۔“

”وہ بھی بتا دو۔“ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”جس طرح لوہے کو لوہا کا ثنا ہے۔ اسی طرح تم بھی ماجد کے ساتھ وہی کرو جو وہ تمہارے ساتھ کر رہا ہے۔“

”یعنی؟“

”یعنی یہ کہ وہ غیر عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے تم غیر مردوں سے پینٹیں بڑھانا شروع کر دو۔“

”کیا؟“ وہ تقریباً دھاڑتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا جو مجھے ایسا فضول مشورہ دے رہی ہو۔“

”یہ میں نے کب کہا کہ تم سچ سچ ایسا کرو۔ یہ محض دکھاوا ہو گا تاکہ ماجد کو احساس ہو جائے کہ جس طرح وہ

پرس کرتی ہے تو وہ صاف مکر جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کسی عورت کے پیچھے نہیں جاتا اور نہ ہی کسی سے اس کا کوئی افیئر ہے۔

”جو شخص اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا ہو۔ اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنا جرم قبول کر لے گا۔“

شائلہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اس وقت مجھے اپنی عزیز سہیلی پر بہت ترس آیا۔ مجھے لگا کہ اس پر ہونے والے ظلم میں کچھ حصہ میرا بھی ہے کیونکہ وہ عورت میں ہی تھی جس کا وہ ان دنوں پیچھا کر رہا تھا۔ اب مجھے رہ رہ کر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ کاش میں اس روز ان دونوں کو دعوت پر نہ بلاتی۔ اگر بلایا تھا تو ماجد کے سامنے بن سنور کر نہ آتی۔ لیکن اس وقت میرا منصوبہ کچھ اور تھا۔ میں شائلہ کی مدد کرنا چاہ رہی تھی لیکن ماجد کی حرکتیں دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی اور میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

میں نے شائلہ سے کہا کہ وہ ماجد کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ کسی کے کہنے سننے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ صبر کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ راہ راست پر آجائے یا اسے کسی جگہ سے اتنے جوتے پڑیں کہ اس کا دماغ ٹھکانے آجائے۔ میں نے شائلہ کو تو سمجھا بھجا کر بیچ دیا لیکن خود انجانے دوسوں میں گھر گئی۔ میرا دل جیسے کسی نے ٹٹھی میں لے لیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے یا کوئی طوفان میری جانب بڑھ رہا ہے جو میرا سب کچھ بہا کر لے جائے گا پھر ایک روز میرے اندیشے حقیقت میں بدل گئے۔

اس روز گری بہت شدید تھی۔ میں نے جلدی جلدی کچن کا کام نمٹایا۔ ساس کو کھانا دیا اور خود نہانے چلی گئی۔ کافی دیر تک شاور کے نیچے کھڑی ٹھنڈے پانی میں بھیکتی رہی۔ اس روز میں نے موسم کی مناسبت سے لون کا سوٹ نکالا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ گوکہ میں نے بالوں کو اچھی طرح تولیہ سے خشک کر لیا تھا لیکن اس کے باوجود پانی کی بوندیں میرے کپڑوں پر گر رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دیر سیکھے کے نیچے بیٹھوں گی تو کپڑے خشک ہو جائیں گے۔ اتنے میں دروازے کی کھٹکی بجی۔ میں بے دھیانی میں دوپٹا لیے بغیر ہی دروازے تک گئی۔ وہاں ماجد کھڑا ہوا تھا۔

”آپ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا پھر میں اگلے قدموں واپس آئی۔ صوفے پر سے دوپٹا اٹھا کر گلے

دوسروں کے گھر میں تاک جھانک کر سکتا ہے اسی طرح کوئی اور اس کے گھر میں بھی.....“

”بس بس رہنے دو اپنی منطق میں ایسے کسی کھیل کا حصہ نہیں بن سکتی جس میں میری عزت پر حرف آئے۔ تم ان مردوں کو جانتی ہونا۔ خود چاہے جو کرتے پھریں لیکن عورت اگر کسی غیر میرے ہنس کر بات کر لے تو ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔“

اس گفتگو کے بعد میرا خیال تھا کہ شائلہ کا قصہ ختم ہو گیا۔ اب وہ جانے اور اس کا کام۔ اس کے بعد وہ میرے گھر آئی اور نہ ہی میرا جانا ہوا۔ البتہ فون پر بات ہو جاتی تھی۔ اس نے بتایا کہ ماجد نے سرکاری مکان کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ جب تک سرکاری مکان نہیں ملتا۔ وہ میکے میں ہی رہے گی کیونکہ وہ لوگ کرایہ کا مکان افرور نہیں کر سکتے۔

ایک دن وہ میرے گھر آئی تو بہت پریشان تھی۔ اس نے بتایا کہ ماجد کی بے راہ روی دن بے دن بڑھتی جا رہی ہے۔ ان دنوں بھی وہ کسی عورت کے چکر میں ہے۔ ہر وقت اسی کے تصور میں گم رہتا ہے اور بار بار اپنے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرتا رہتا ہے۔ میں اسے کیا بتاتی کہ وہ نمبر میرا ہی ہے۔ پہلی بار جب اس نے مجھے فون کیا تو میں نے اس کی آواز پہچان کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ روزانہ مجھے صبح شام فون کرتا رہتا لیکن میں کوئی جواب نہیں دیتی۔ کئی بار سوچا کہ سم تبدیل کر لوں لیکن اس میں یہ مسئلہ ہے کہ میرا یہ نمبر کئی لوگوں کے پاس ہے اور میں اسے تبدیل نہیں کر سکتی۔ اس کا مجھے صرف یہی حل نظر آیا کہ اس کی کوئی کال نہ سنوں۔ تھک ہار کر خود ہی خاموش ہو جائے گا۔

میں نے شائلہ کو تسلی دی اور کہا کہ وہ اپنے شوہر سے دو ٹوک بات کیوں نہیں کرتی۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ اسے کم از کم اپنی عمر اور مرتبہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ گریڈ اٹھارہ کا سرکاری افسر ہے اور اب تو اس کی کنپٹیوں کے پاس کے بال بھی سفید ہونے لگے تھے۔ اگر اس کی شادی کم عمری میں ہو جاتی تو اس کے بیٹے نوجوانی کی حدود میں قدم رکھ چکے ہوتے۔ ایسے شخص کی یہ روش ناقابل فہم تھی اور اسے محض ذہنی عیاشی ہی کہا جاسکتا تھا۔

شائلہ نے بتایا کہ وہ اسے ان حرکتوں پر کئی مرتبہ ٹوک چکی ہے اور اس پر آئے دن جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ اپنی غلطی ماننے پر تیار نہیں۔ وہ جب بھی اس سے باز

عید الفطر کے حسین رنگوں سے سجا جولائی 2017ء کا خوشیاں بکھیرتا پاکیزہ

پاکیزہ

ماہنامہ

رفت سراج و شیریں حیدر کے دلکش ناول، نت نئے روپ لیے.....

سحر ساجد کے خوب صورت انداز بیان کا مرقع من جان بازم

سیما رضا ردا کا مٹی ناول، تیزی سے اگلی منزل کی جانب گامزن

اختر شجاعت، اخلاص کے موثر بیان کے ساتھ

عید کے رنگ عقیلہ حق، رضوانہ پرنس، منشا محسن علی،
غزالہ عزیز کے ساتھ ساتھ دیگر مایہ ناز رائٹرز کی تحریروں کے سنگ۔

شانستہ زبیں

کے دلچسپ و خصوصی عید سروے میں

شرکاء کے خوب صورت جوابات

پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی و

معروف قلم کار فریدہ اشفاق

نے بڑھائی ہماری بزم کی رونق

رنگین اعلان

نادیہ احمد، فریدہ سیفی، فوزیہ احسان رانا، فصیحہ آصف خان،
فریدہ لاکھانی، فوزیہ اشرف و ریما نور رضوان کے پُر مسرت افسانے

عید کی مناسبت سب سے دل خوش کن سلسلے ہریدار پکوان ہندی کے حسین ڈیزائن اور مجسمہ مند نے کے علاوہ صرف آپ کی خوش فہمی کی خاطر

میں ڈالا۔ اتنی دیر میں وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلا ہوا
لاؤنج تک آگیا۔

”آپ اس وقت کیسے؟“ میں نے حیران ہوتے
ہوئے پوچھا۔

”بتاتا ہوں۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”پہلے
ایک گلاس پانی پلا دیں۔“

میں پانی لے کر آئی۔ اس نے دو گھونٹ لیے اور گلاس
میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”دراصل میری گاڑی کا ٹائر پتھر ہو
گیا ہے۔ جیسے تیسے کر کے گاڑی پتھر شاپ تک گیا۔ وہاں
جا کر معلوم ہوا کہ لائٹ گئی ہوئی ہے۔ دو گھنٹے میں آئے گی۔
میرے پاس فالتو ٹائر بھی نہیں ہے اس لیے پتھر لگنے کا انتظار
کرنا ہوگا۔ وہاں گرمی بہت تھی اور بیٹھنے کا بھی کوئی انتظام
نہیں تھا۔ اس لیے یہاں چلا آیا۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب تو
نہیں کیا۔“

یہ سن کر میری تو جان ہی نکل گئی۔ گویا اب اسے دو
گھنٹے برداشت کرنا ہوگا۔ میں دل ہی دل میں اسے چلتا
کرنے کے لیے کوئی بہانہ سوچنے لگی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں
آیا۔ اس نے میرے سر پرے پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”اس لباس
میں آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“
میں نے جمل کر کہا۔ ”میں ہر لباس میں اچھی لگتی
ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے ایک میگزین اٹھایا اور اسے پکڑا
ہوئے بولی۔ ”آپ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں مجھے
ایک دو کام نمٹانے ہیں۔“
”میں میگزین پڑھنے نہیں، آپ سے باتیں کرنے آیا
ہوں۔ اگر آپ کے پاس میرے لیے وقت نہیں تو چلا جاتا
ہوں۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“
”آپ میرا فون بھی نہیں اٹھا رہی ہیں۔“
”اچھا! آپ نے فون کیا تھا، کب؟“ میں انجان
بننے ہوئے بولی۔

”میں تو روزانہ چار پانچ مرتبہ فون کرتا ہوں لیکن
آپ جواب ہی نہیں دیتیں۔“

”اچھا! وہ آپ کا نمبر ہے میں بھی سوچ رہی تھی کہ کس
کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں دراصل میں اجنبی لوگوں
کے فون نہیں سنتی۔“
”گویا میں آپ کے لیے اجنبی ہوں۔“

”اجنبی نہیں تو غیر ضرور ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں
کہ مجھے فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”بس یونہی، میں نے سوچا کہ آپ تنہا ہیں۔ بور
ہو رہی ہوں گی۔ کچھ باتیں بھی ہو جائیں۔“

”آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری
تنہائی بانٹنے والے بہت لوگ ہیں۔“

”حیرت ہے۔ آج تو آپ کا رویہ اس روز کے
مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔ کیا میں اس تبدیلی کی وجہ جان
سکتا ہوں۔“

”اس روز آپ میرے مہمان تھے۔ آج بن بلائے
مہمان ہیں۔ اس لیے رویہ میں کچھ فرق تو ہوگا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔“
”اگر آپ شام تک کے ساتھ آتے تو خوشی ہوتی۔“

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا۔ اس کے سل فون کی
کھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سے غالباً پتھر والا بول رہا تھا۔

”اچھا آ رہا ہوں۔“
”مہمان نوازی کا شکریہ۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”امید ہے کہ اگلی بار آپ کا رویہ بہتر ہوگا۔“
میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر شام تک کے
بغیر آئے تو شاید میں آپ کو گھر میں بھی داخل نہ ہونے
دوں۔“

”یہ تو وقت ہی بتائے گا۔“ اس نے کہا اور ہنستا ہوا چلا
گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ اس مصیبت
سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اس کے تیز ہوتا رہے تھے
کہ وہ دوبارہ بھی آئے گا بلکہ مجھے بار بار تنگ کرتا رہے گا۔
بہت سوچنے کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے اپنے
میاں کو فون کیا اور بولی۔ ”آپ مجھے بہت یاد آ رہے ہیں۔
خود آجائیں یا چند روز کے لیے مجھے اپنے پاس بلا لیں۔“

انہوں نے صاف جواب دے دیا اور کہا کہ اس وقت
وہ ایک اہم پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں اس لیے دو ڈھائی
مہینے تک نہ خود آ سکتے ہیں اور نہ ہی مجھے اپنے پاس بلا سکتے
ہیں۔ اس پروجیکٹ کے ختم ہونے کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا۔

مجھے ان کی بات سن کر مزید گھبراہٹ ہونے لگی کیونکہ
میری نند کے یہاں ڈیوری ہونے والی تھی اور میری ساس
تین چار مہینے کے لیے اس کے یہاں چلی جاتی تھیں۔ ان کے
جانے کے بعد میں گھر میں تنہا ہوں گی کیونکہ میرا دور تو صبح کا

”نہیں۔“
 ”لیکن مجھے تو ہے۔“ وہ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب؟“
 ”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ ایک دم آپ سے تم پر آگیا۔ ”تم بھی تنہا ہو اور میں بھی پیاسا۔ کیوں نہ دونوں اپنی طلب پوری کر لیں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ اس کی اس جسارت پر میں حیران رہ گئی لیکن میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی حرکت کرتا۔ میں نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا صوفے پر جا گرا۔ میں دوڑتی ہوئی کمرے میں گئی۔ دروازے سے ریوالتور نکالا اور اس پر تان لیا۔ میرے ہاتھ میں ریوالتور دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ ہلکاتے ہوئے بولا۔ ”یہ..... یہ کیا کر رہی ہو؟“

میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”اگر تم میری سہیلی کے شوہر نہ ہوتے تو چھ کی چھ گولیاں تمہارے سینے میں اتار دیتی لیکن میں تمہارے خون سے ہاتھ رنگ کر بھانسی چڑھنا نہیں چاہتی۔ تم ابھی اور اسی وقت اپنی منخوس شکل لے کر یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کسی غیر عورت کو درغلانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ جس طرح تم دوسرے کے گھر میں تاک جھانک کر سکتے ہو اسی طرح کوئی تمہارے گھر میں بھی نقب لگا سکتا ہے۔“

اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی اور وہ گرتا پڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے فون کر کے الیکٹریشن کو بلوایا اور اس سے کہا کہ وہ بیرونی دروازے پر انٹرکام اور سیکورٹی کیمرہ لگا دے تاکہ آئندہ میں کسی غیر متعلقہ شخص کے لیے دروازہ کھولنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لوں۔ یہ دونوں کام اسی روز ہو گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اب وہ کبھی دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ہی میرا ویزا آگیا اور میں میاں جی کے پاس دعی چلی گئی۔ جانے سے پہلے میں نے شام کو اپنی رواجی کے بارے میں بتایا لیکن اس سے ماجد کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ تین مہینے بعد واپس آئی تو کافی مڑسکون تھی۔ میرے شوہر کو ایک دوسری ملازمت مل گئی تھی اور اب انہیں دعی میں ہی رہنا تھا۔ انہوں نے مجھ سے

یاشام کو گھر واپس آتا تھا۔ اگر ان کی غیر موجودگی میں ماجد گیا اور اس نے مجھ سے چھیڑ چھاڑ کی تو میں کیا کروں گی۔ سانسے ایک بار پھر اپنے مہاں کو فون کر کے کہا کہ امی کے سانسے کے بعد میں گھر میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ اس لیے وہ مجھ دونوں کے لیے مجھے اپنے پاس بلا لیں۔ میرے بہت زیادہ اصرار کرنے پر وہ مان گئے اور کہا کہ رہائش کا موبسٹ ہوتے ہی وہ محلے بلا لیں گے لیکن اس میں دس مہینے دن یا مہینا لگ سکتا ہے۔

یہ سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جانے کی یاری شروع کر دی۔ میرا پاسپورٹ تو بنا ہوا تھا۔ ویزا وہ پیچھے۔ میں نے اپنا سامان پیک کر لیا تھا اور جانے کے انتظار میں ایک ایک دن گن رہی تھی لیکن اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے میرے ہوش اڑا کر رکھ دیے۔ وہ وہ چہرہ کا وقت تھا۔ میری سانس اپنی بیٹی کے گھر جا چکی تھی اور میں گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے ٹیلی فون کر کے فوڈ شاپ کو اپنے لیے کھانے کا آرڈر دیا اور ایک میگزین کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کی کھٹکی بجی۔ میں سمجھی کہ ڈیلیوری بوائے ہوگا لیکن اس کی بجائے دروازے پر ماجد کھڑا ہوا تھا۔ میں دروازہ بند کرنا چاہ رہی تھی کہ عین اسی وقت ڈیلیوری بوائے بھی کھانا لے کر آگیا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوئی تو ماجد بلا تکلف گھر میں داخل ہو گیا۔ جب میں ڈیلیوری بوائے کو پیسے دے کر واپس آئی تو وہ بڑے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیسی ہیں آپ؟“
 ”ٹھیک ہوں۔“ میں نے جل کر کہا۔ ”معاف کیجیے۔“
 مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ آپ کو وقت نہیں دے سکوں گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر بعد چلی جائیں۔ میں بھی تو اپنے کئی کام چھوڑ کر آیا ہوں۔“
 ”بڑی نوازش آپ کی۔ لیکن میں نے تو آپ کو نہیں بلایا تھا۔ پھر یہ احسان کیوں جتا رہے ہیں۔“
 ”بے شک آپ نہ بلا لیں لیکن مجھے تو آپ کی تنہائی کا احساس ہے۔ اسی لیے آجاتا ہوں۔“

”بہتر ہوگا کہ آپ میرے بارے میں سوچنے کی بجائے اپنی بیوی کو وقت دیں۔ مجھے آپ کی کمپنی کی ضرورت

وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد مستقل طور پر مجھے اپنے پاس بلا لیں گے۔

میں نے واپس آنے کے بعد ایک بار پھر شاملہ کو فون کیا لیکن بات نہ ہو سکی۔ کھٹی بج رہی تھی لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد میں نے اسے کئی مرتبہ فون کیا لیکن رابطہ نہ ہو سکا تو مجھے فکر ہونے لگی۔ میرے پاس اس کے میکے کا نمبر نہیں تھا اور نہ ہی میں کبھی وہاں گئی تھی۔ اس سے رابطہ کا واحد ذریعہ سیل فون تھا۔ جس پر بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ مجھے فکر ہونے لگی۔

کئی ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں دوسرے دینی کا چکر لگا چکی تھی۔ پھر ایک دن ایسا نکلا کہ مجھ سے ملنے آ گئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ میں نے اس سے فون پر رابطہ نہ ہونے کی شکایت کی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ میں چاہنے کے باوجود تم سے رابطہ نہ کر سکی۔“

”خیریت تو ہے۔ کیا ہوا؟“ میں گھبراتے ہوئے بولی۔

”ہاں خیریت ہی ہے۔ دراصل میں سعودی عرب چلی گئی تھی۔“

”واہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کیا ماجد کو وہاں جاب مل گئی ہے؟“

”ماجد نہیں راشد۔“

”ہیں۔“ میں چونکتے ہوئے بولی۔ ”یہ راشد کون ہے؟“

”میرا ماموں زاد ہے۔ میں نے ماجد سے طلاق لے کر راشد سے شادی کر لی ہے اور اس کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی ہوں۔“

”میں بھی نہیں تفصیل سے بتاؤ یہ کیا قصہ ہے؟“

”ماجد کی بے راہ روی حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ راتوں کو بھی گھر سے باہر رہنے لگا تھا۔ میں اگر کچھ بولتی تو مارنے پیٹنے پر اتر آتا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی روش نہیں بدل سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھوں ورنہ وہ مجھے طلاق دے دے گا۔ میں اس کی دھمکی سے ڈر گئی اور چپ چاپ یہ ظلم سہتی رہی۔ اتفاق سے انہی دنوں راشد چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ وہ سعودی عرب میں ملازمت کرتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو شروع سے چاہتے ہیں اور مجھے پورا یقین تھا کہ

”اور ماجد اب وہ کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ طلاق دینے کے بعد وہ گھر سے چلا گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے اپنا تبادلہ اسلام آباد کر دیا تھا۔“

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی لیکن میرے خواب اس وقت چمکانے لگے کہ جب ابونے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ دراصل ماموں بہت غریب تھے اور انہوں نے بڑے مشکل حالات میں اسے بچوں کی پرورش کی۔ راشد نے ٹیکنیکل کالج سے ڈپلوما کیا لیکن اسے کوشش کے باوجود ملازمت نہیں مل رہی تھی۔ ابونے میرے بہتر مستقبل کی خاطر ماجد سے میری شادی کر دی۔

راشد دل برداشتہ ہو کر سعودی عرب چلا گیا اور اسے وہاں جاب مل گئی۔ وہ پورے پانچ سال بعد واپس آیا تو اس کے حالات کافی بہتر ہو چکے تھے۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تو

میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور میں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھی میری یاد کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا اور اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ میرے حالات سن کر اسے بہت افسوس ہوا اور

اس نے پیشکش کی کہ اگر میں ماجد سے طلاق لے لوں تو وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ اندھا کیا چاہیے دو آنکھیں۔ میرے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور

ماجد سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ اسے مجھ سے یہ توقع نہیں تھی۔ پہلے تو وہ حیران ہوا۔ پھر اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے مجھے طلاق نہ دی تو میں عدالت کے ذریعے خلع لے لوں گی۔ اس پر وہ ڈر گیا اور اس نے مجھے طلاق دے دی

میرے گھر والے بہت ناراض ہوئے لیکن میں نے کسی کی پروا نہیں کی اور عدت پوری کرنے کے بعد راشد سے نکاح کر لیا اور اس کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی۔ اللہ نے میری سن لی۔ میرا صبر رنگ لایا اور اب میں راشد کے ساتھ بہت خوش ہوں۔

”اور ماجد اب وہ کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ طلاق دینے کے بعد وہ گھر سے چلا گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے اپنا تبادلہ اسلام آباد کر دیا تھا۔“

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

میں نے اسے نئی زندگی کی مبارکباد دی اور سوچنے لگی کہ میرے منہ سے نکلی ہوئی بات کتنی جلدی پوری ہو گئی۔ ماجد یہ بھول گیا تھا کہ دوسرے کے گھر میں جھانکنے والے کے اپنے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔

مقتول ساتھی

محترم مدیر اعلیٰ

سلام تہنیت

ایک اور سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ سرگزشت ایک قیدی کی ہے اور اتنی الجھی ہوئی ہے کہ اسے عدالت سزا سنانے والی تھی لیکن میری وجہ سے ایک بے گناہ بالآخر سزائے موت سے بچ گیا۔

زرین قمر

(کراچی)



انسانوں کی نفسیات، ان کے ذہن کے اتار چڑھاؤ، ان کی سوچ کے انداز اور معاشرے میں ان کے کردار کا مطالعہ کرنے میں لطف آتا تھا۔ میں کسی بھی شخص کے ساتھ ہونے والے غیر معمولی حادثے کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں کراچی یونیورسٹی سے سوشالوجی میں ماسٹرز کر رہی تھی میری ساری توجہ اپنی تعلیم کی طرف تھی اور میں چاہتی تھی کہ اچھے گریڈ سے ماسٹرز کرنے کے بعد کسی بڑی اور مستحکم این جی او کو جوائن کر لوں۔ مجھے

سوشالوجی کے فائنل ایئر میں مجھے ایک ایسا تھیسس تیار کرنا تھا جو میری دلچسپی کا حاصل تھا۔ میں نے اس پر اپنی سالانہ رپورٹ تیار کرنے کی ہائی بھر لی تھیسس کا عنوان پروفیسر ٹمس الدین نے خود ہی منتخب کر کے دیا تھا۔
”دیکھو میں چاہتا ہوں کہ تم اس موضوع پر اپنی سالانہ رپورٹ بناؤ۔“ انہوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”انسان کو مجرم بنانے میں معاشرے کا کردار“ میں نے پیپر ان کے ہاتھ سے لے کر پڑھا۔ اس پیپر پر میرے دوسرے کلاس فیلوز کے نام بھی درج تھے اور ان کے ناموں کے ساتھ مختلف موضوع لکھے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ دوسرے ساتھیوں کو دیئے گئے موضوعات زیادہ دلچسپ لگے۔
”سرا کیا میں یہ ٹاپک بدل سکتی ہوں؟“ میں نے پروفیسر ٹمس سے پوچھا۔

”بدل تو سکتی ہو لیکن اگر نہ بدلو تو زیادہ اچھا ہے۔“
”لیکن میں اس موضوع پر کن کتابوں سے مدد لوں گی؟ اس پر تو اتنا زیادہ لکھا بھی نہیں گیا کہ میں معلومات جمع کر کے تحقیق رپورٹ بنا سکوں۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔
”ایسا نہیں ہے۔ جب تم اس پر کام شروع کر دو گی تو تمہیں اس میں دلچسپی محسوس ہوگی اور لطف بھی آئے گا۔ تم کتابوں، جرنلز، اخبارات کے علاوہ انٹرنیٹ سے بھی مدد لے سکتی ہو لیکن میں تمہیں ایک اور مشورہ دوں گا، اگر تم جیل جا کر ان قیدیوں سے ملو جو مختلف جرائم میں سزا میں کاٹ رہے ہیں تو تمہیں ہر قیدی ایک نئی کہانی سنانے کا کہ وہ مجرم کیسے بناویں تمہیں کتابوں میں سرنہیں کھپانا پڑے گا اور اپنے موضوع کے لیے فرسٹ ہینڈ ناچ ملے گی یعنی وہ لوگ جو زمانے کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے مجرم بنے، اپنے ذاتی تجربات وہ تمہیں خود بتا رہے ہوں گے۔“ پروفیسر نے مجھے سمجھایا اور یہ بات میرے دل کو لگی۔

”ٹھیک ہے سر میں اس موضوع پر کام کروں گی۔“ میں نے وعدہ کر لیا۔
”پھر سیمینٹرل جیل کب جا رہی ہو؟“ انہوں نے ہنسنے ہوئے پوچھا۔

”بس ایک دو دن میں۔“ میں نے جواب دیا۔
دو دن بعد میں نے سیمینٹرل جیل فون کر کے وہاں کے جیلر سے ملاقات کا ٹائم مانگا۔ انہوں نے چند سوالات پوچھنے کے بعد مجھے سیمینٹرل جیل آنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ

ہی ہدایت کی تھی کہ میں اپنے یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ سے اپنے ڈین کا اجازت نامہ لے کر آؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا اور اجازت نامے کے ساتھ مقررہ وقت پر سیمینٹرل جیل پہنچ گئی تھی جہاں استقبالیہ پر میرے بیک کی تلاشی کے بعد ایک باوردی ملازم کے ساتھ جیلر سے ملنے ان کے آفس میں بھیج دیا گیا۔
”کس زمرین؟“ جیلر نے مجھ سے پوچھا۔

”جی، میں نے کل آپ سے فون پر ملاقات کا وقت مانگا تھا۔“ میں نے یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ کا تصدیق نامہ اور شناختی کارڈ کی کاپی جیلر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”میں آپ ہی کا منتظر تھا۔ تشریف رکھیے۔“ جیلر نے اخلاق کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور میں اس کے سامنے رکھی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔
”آپ نے بتایا تو تھا کہ کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں شاید کسی قیدی سے ملنا ہے آپ کو۔“ جیلر نے پوچھا۔

جی میں نے بتایا تھا کہ میں یونیورسٹی کے سوشالوجی ڈیپارٹمنٹ میں زیر تعلیم ہوں اور فائنل ایئر میں مجھے ایک سالانہ رپورٹ بنانا ہے جس کا عنوان ہے ”انسانوں کو مجرم بنانے میں معاشرے کا کردار“ میں نے جواب دیا۔
”اس سلسلے میں آپ کسی خاص قیدی سے ملنا چاہتی ہیں؟“

”خاص قیدی تو نہیں اگر آپ مجھے مختلف نوعیت کے جرم کرنے والے چندا لگ الگ قیدیوں سے ملوا سکیں تو بہتر ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔
”کس قسم کا جرم کرنے والے؟ قتل، چوری، ڈکیتی، زنا، جعل سازی کرنے والے یا جب کترے کن سے ملنا چاہیں گی؟“ جیلر اپنی طرف سے ذہانت کا مظاہرہ کر کے بات کو طول دے رہا تھا۔

”ہر طرح کے لوگوں سے دیکھیں جرم کوئی بھی ہو اس کا مرتکب مجرم ہوتا ہے آپ مجھے کسی بھی مجرم سے ملوا سکتے ہیں لیکن اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مجھے کئی مجرموں سے ملنا ہوگا۔“ میں نے سمجھایا تو جیلر نے بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا جیسے بات اس کی سمجھ میں آگئی ہو۔

”تو یوں کرتے ہیں کہ میں آپ کو اپنا رجسٹر دکھاتا ہوں جس میں مجرموں کے ساتھ ان کے جرم اور ان کی قیدی کی مدت وغیرہ درج ہے، آپ اس میں سے اپنے مطلب کے مجرم چن لیں۔“ جیلر نے یوں کہا جیسے میں اس کے پاس

اپنی پسند کے سوٹ خریدنے آئی ہوں اور وہ کپڑے بیچنے والا کوئی دکاندار ہے۔
”کیا مطلب؟“

”اوہو! مطلب یہ کہ میں آپ کو جن قیدیوں سے ملواؤں گا ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو پسند نہ آئے تو آپ اپنی مرضی سے رجسٹر میں سے چن لیں۔ ویسے میں کسی کو اپنی سہولت دیتا نہیں ہوں لیکن آپ چونکہ اسٹوڈنٹ ہیں تو آپ کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔“ اس نے کہا۔ مجھے اندازے سے لگا کہ وہ اسٹوڈنٹ ہونے کے ناطے نہیں بلکہ لڑکی ہونے کے ناطے میری مدد کر رہا ہے۔

”چلیں ٹھیک ہے آپ مجھے رجسٹر دکھا دیں۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”نیل..... اونیل۔“ جیلر نے دوسرے کونے میں گلی میز پر بیٹھے لڑکے کو آواز دی جو رجسٹر پر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

”جی سر۔“ اس نے الٹ ہوتے ہوئے کہا۔
”دیکھو یہ صاحبہ کچھ قیدیوں سے ملنا چاہتی ہیں، انہیں قیدیوں والا بورڈ رجسٹر دکھا دو اور جن لوگوں کو یہ بتائیں ان کے ناموں کی فہرست بنا کر مجھے دے دو۔“ جیلر نے کہا۔

”جی سر! ٹھیک ہے۔“ نیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔
”میں ابھی رجسٹر لاتا ہوں، وہ شاید ریکارڈ روم میں ہے۔“ نیل نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ جیلر نے میز پر رکھی کھنٹی بجائی، ایک گارڈ کمرے میں داخل ہوا۔

”باہر سے دو انسپل چائے اور کچھ منگواؤ، بھی ہمارے مہمان آئے ہیں۔“ جیلر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوکے سر۔“ گارڈ نے کہا اور واپس مڑ گیا۔
”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی جناب۔“ میں نے انکساری سے کہا۔

”نہیں ضرورت کیوں نہیں تھی، بھی آپ کو بھی تو پتا چلے کہ ہم لوگ اتنے بد اخلاق نہیں ہوتے جیسا کہ لوگوں نے منہ پور کیا ہوا ہے۔“ اس نے کہا۔

”نہیں صاحب! ایسا کچھ نہیں ہے۔“ میں نے سمجھایا۔ ”آپ ایک اہم عہدے پر فائز ہیں اور اپنی ذمہ داری بخوبی نباہ رہے ہیں۔ اگر کسی کے ساتھ سختی کرتے ہیں تو وہ آپ کے کام کا حصہ ہے۔“ میں نے یہ سوچ کر اس کی تعریف کی کہ وہ میرے ساتھ مزید تعاون کرے اور میری یہ

تعریف کام کر گئی۔

”آپ کے ذہن میں کیا ہے؟ اگر آپ مجھے بتائیں تو شاید میں آپ کی زیادہ اچھے طریقے سے مدد کر سکوں۔“ اس نے اپنائیت سے کہا۔

”ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ چند قیدیوں سے ملنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ جیلر نے کہا۔ اتنی دیر میں چائے آ گئی۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے قیدیوں کے رجسٹر سے چند قیدیوں کے نام منتخب کیے اور فہرست جیلر کی طرف بڑھا دی جسے دیکھنے کے بعد جیلر نے وہ فہرست اپنی ٹیبل کے پیشے کے نیچے لگا لی۔

”ٹھیک ہے، میں آپ کو ایک دن میں ایک قیدی سے ملواؤں گا۔ اس فہرست میں پانچ قیدی ہیں جنہوں نے مختلف جرم کیے ہیں۔ ایک دن میں آپ صرف ایک گھنٹے کے لیے ایک قیدی سے مل سکیں گی۔“ جیلر نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”لیکن اس طرح تو مجھے پانچ دن لگ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میں اس سے زیادہ آپ کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتا۔ قیدیوں کا معاملہ ہے آپ کو ان کے ساتھ اکیلا بھی چھوڑا نہیں جاسکتا اور دوسرے معاملات بھی دیکھنا ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے تو پھر آج؟“
”آج نہیں..... دراصل ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ اب کل آپ دس بجے آئیں۔“ جیلر نے خاصی خوش اخلاقی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ مزید میری کوئی بات نہیں سنے گا چنانچہ میں اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس آ گئی۔ پھر میں لگا تار تین دن تک مقررہ وقت میں تین قیدیوں سے ملی لیکن مجھے بات بنی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی قیدی بے انتہا بد مزاج اور غصیلا ہوتا اور کسی بات کا جواب دینے کو تیار نہ ہوتا۔ کوئی اپنی کہانی سنانے کی بجائے اپنے بے گناہ ہونے کا رونا روتے بیٹھ جاتا اور کسی کو اپنے گھر والوں سے ملنے کی اتنی فکر ہوتی کہ وہ میرے سوالوں کے جوابات دینے کی بجائے مجھ ہی سے اپنی سفارش کرنے کی فرمائش کرنے لگتا۔ میں اس صورت حال سے تنگ آ گئی تھی کہ چوتھے دن میری نگاہ انتخاب ایک قیدی پر پڑی۔ اس کا نام میری فہرست میں شامل نہیں تھا۔ دراصل اس کی کوٹھڑی اس قیدی کی کوٹھڑی کے سامنے تھی جس

”ارے سب یہی کہتے ہیں چوری کا الزام ہے۔ قتل الزام ہے، یعنی ہم الزام لگا کر قید کر دیتے ہیں۔“ جیلر نے غصے سے کہا تو مقبول ہم کراسے دیکھنے لگا۔

”جیلر صاحب کیا میں اکیلے میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہمارے درمیان جیلر موجود نہ ہو تو شاید مقبول کچھ کھل کر بات کر سکے گا۔

”اکیلے میں؟“ جیلر نے حیرت سے کہا۔

”ہاں! میرا خیال ہے کہ اکیلے میں وہ زیادہ کھل کر بات کر سکے گا۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”دراصل ہم قیدیوں سے اکیلے میں لوگوں کو کم ہی ملواتے ہیں، ہم نہیں چاہتے کہ سیکورٹی کا کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔ ہم سے بھی سخت پوچھ پچھ ہوتی ہے۔“ جیلر نے جواب دیا۔

”اچھا آپ مجھے دس منٹ کے لیے اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیں یہ تو کوٹھڑی میں بند ہے اور سامنے گاڑ کھڑا ہے۔ میں چند سوال پوچھ کر آپ کے آفس میں آ جاؤں گی شاید یہ آپ کے ذرے سے کچھ بتانے سے گریز کر رہا ہے۔“ میں نے جیلر کو سمجھایا۔

”اچھا ٹھیک ہے، دیکھیں آپ اصول توڑ رہی ہیں۔ پہلے تو فہرست کے علاوہ آپ کسی سے مل رہی ہیں اور اب اکیلے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کر دیتے جیے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد آپ واپس آ جائیے گا۔“

”ہاں..... ہاں..... ٹھیک دس منٹ بعد میں واپس آ جاؤں گی۔“ میں نے ہامی بھری تو وہ واپس ہو گیا۔ پھر جاتے جاتے گاڑ کے پاس رک کر اس نے اسے کوئی ہدایت دی تھی۔ میں مقبول کی طرف مڑ گئی۔

”مقبول! تم نے چوری کیوں کی تھی؟“ میں نے پوچھا تو اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

”بتاؤ مقبول..... میں جانا چاہتی ہوں کہ تم نے چوری کیوں کی تھی؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”آپ کیوں جانا چاہتی ہیں؟“

”کیونکہ میرا ماننا ہے کہ ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے، برے کام اسے حالات یا مجبوریوں سے سکھائی ہیں۔ تمہارے ساتھ ایسی کیا مجبوری تھی کہ تم نے چوری کی اور اب جیل کاٹ رہے ہو؟“

”میرے ساتھ مجبوری نہیں تھی۔ شاید میری بد قسمتی تھی یا میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔“ مقبول نے کہا۔

سے مجھے ملنا تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران میری ساری توجہ سامنے والی کوٹھڑی کے قیدی کی طرف تھی۔ اس کوٹھڑی میں دو قیدی تھے لیکن دونوں خاموش بیٹھے تھے ایک دوسرے سے بھی باتیں نہیں کر رہے تھے۔ میری توجہ کا مرکز جو قیدی تھا اس کی عمر پینتیس سال رہی ہوگی۔ سر کے بال بھورے اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اطراف سے بے خبر بیٹھا مسلسل اپنی کوٹھڑی کی دیوار کو گھور رہا تھا۔

”یہ..... یہ کون ہے؟“ میں نے اپنے ساتھ موجود جیلر سے پوچھا۔ ہر روز وہ مجھے ایک قیدی سے ملوانے میرے ساتھ قیدی کی کوٹھڑی تک آتا تھا۔

”یہ مقبول ہے مالا پور کا رہنے والا، اس نے ڈاکا ڈالا تھا۔ پکڑا گیا اور اب سزا کاٹ رہا ہے۔“ جیلر نے بتایا۔

”کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مل تو سکتی ہیں لیکن اس کا نام تو اس فہرست میں نہیں ہے۔ دراصل ہمیں بھی اپنے افسران کو... جواب دینا ہوتا ہے۔“

”تو یہ کون سی بڑی بات ہے اس کا نام بھی اس فہرست میں ڈال دیں۔“ میں نے کہا۔

”چلیں ٹھیک ہے ڈال دوں گا۔“ جیلر نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور میں اٹھ کر مقبول کی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گئی۔

”یہ کیا غضب کر رہی ہیں؟ بھی ایک دن میں ایک قیدی..... یہ بات تو طے ہو چکی ہے نا۔“ جیلر نے اعتراض کیا۔

”بس ٹھیک ہے جیلر صاحب میں نے اس قیدی سے آج زیادہ بات نہیں کرنا۔ کل تفصیل سے بات کروں گی۔ آج تو بس تھوڑا سا تعارف کرانا چاہتی ہوں۔“ میری بات پر جیلر برا سا منہ بنا کر چپ ہو گیا۔ لیکن اسے میری یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

”اے سنو! میں تم سے کہہ رہی ہوں مقبول۔“ میں نے قیدی کو نام لے کر مخاطب کیا تو اس نے میری طرف دیکھا لیکن وہ کچھ بولا نہیں تھا۔

”تمہارا نام مقبول ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہاں کیوں لائے گئے ہو؟“

”چوری کا الزام ہے۔“

”الزام؟ کیا چوری نہیں کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹی تو میں مقبول کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کی کبھی ہوئی بات دل کو تو لگی تھی، حقیقت ہے جو شخص تعلیم کو اہمیت نہیں دیتا وہ زندگی میں ناکامیوں کا سامنا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا اور وہ بہترین یا مناسب پیشہ اختیار نہ کر سکا اور چوریاں کرنے لگا۔ میں نے اگلے دن مقبول سے کیے جانے والے چند سوالات نوٹ کیے اور سو گئی۔

دوسرے دن میں مقررہ وقت پر سینٹرل جیل پہنچ گئی تھی مقبول اپنی کوٹھڑی میں تھا تھا۔

”ہاں تو مقبول تم بتا رہے تھے کہ تم بھوک پیاس سے تنگ آ کر چوریاں کرتے تھے پھر اس کے بعد کیا ہوا؟“ میں نے اس کے پاس پہنچنے ہی سوالات شروع کر دیے۔

ایک بار میں کئی روز کا بھوکا تھا تو اپنے علاقے کے واحد ہوٹل میں جا بیٹھا۔ ہوٹل کے مالک نے مجھے دیکھ کر براسا منہ بنایا کیونکہ میرے اوپر پہلے بھی اس کا ادھار چڑھا ہوا تھا۔ میرے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی ہوٹل کے مالک نے اپنے ملازم کو تنبیہ کی تھی۔

”چھوئے! دھیان سے بھئی۔“ ہوٹل کے مالک نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کا مطلب تھا کہ چھوٹا مجھ پر نظر رکھے کہ کسی چیز پر ہاتھ صاف نہ کر جاؤں۔ اب علاقے کے لوگ جان گئے تھے کہ میں عادی چور بن چکا ہوں۔ ابھی مجھے دہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرا دوست بشیر ہوٹل میں داخل ہوا اور مجھ پر نظریں پڑتے ہی اس کی باچھیں کل گئیں۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا آیا اور میرے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مقبول میں ساری ہستی میں تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں اور تو یہاں بیٹھا ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیوں؟ کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک جگہ کام نکلا ہے۔“ اس نے رازداری سے کہا۔

”دیکھ بھئی بشیر اس بار مال آدھا آدھا ہوگا۔“ میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ”ہر بار ساری محنت میں کرتا ہوں اور مال تو لے اڑتا ہے اور مجھے ذرا سی اجرت پر ٹر خا دیتا ہے۔“ میں نے ناراضگی سے کہا۔

”ارے تو ناراض کیوں ہوتا ہے کر لینا آدھا آدھا۔“

بشیر نے فراخ دلی سے کہا۔

”اچھا یہ بتا کام کہاں کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا تو بشیر نے چپکے چپکے تفصیلات مجھے سمجھا میں پھر وہ سیدھا ہو

”کیوں آخر کیا بدھ تھی؟“

”جب میں نے چوری کی تھی تب یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب جب میں جیل میں ہوں اور پہروں بیٹھا سوچتا رہتا ہوں تو مجھے سمجھ آئی کہ قصور وار میں ہی ہوں۔“

”کھل کر بات کرو مقبول، میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔ دراصل میں ایک تحقیقی مضمون لکھ رہی ہوں جس میں ان وجوہات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں کہ لوگ مجرم کیوں بنتے ہیں۔“

”سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ میرا دل کبھی پڑھنے میں نہیں لگا۔ باپ کے ہزار سمجھانے کے باوجود میں نے کبھی دل لگا کر نہیں پڑھا۔ جب ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو میں پانچویں کلاس میں تھا اور عمر میں کلاس کے بچوں سے دگنا تھا۔ استاد بھی میری نالائقی کی وجہ سے ہر وقت لعن طعن کرتے رہتے تھے۔ باپ کی زندگی میں اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی خواہش پوری ہوتی رہی لیکن باپ کے مرنے کے بعد میں پانی پانی کو محتاج ہو گیا اور تب ہی میں نے چوری چکاری شروع کر دی جس سے کسی نہ کسی طرح دن بھر میں ایک بار مجھے پیٹ بھر کر کچھ کھانے کو مل جاتا تھا۔ میں ہر بار یہ سوچتا کہ اب چوری نہیں کروں گا لیکن پھر جب بھوک ستائی تو میں پھر سے چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ یہی سلسلہ کافی عرصے تک چلتا رہا۔“ مقبول بولتے بولتے رک گیا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے آپ کے دس منٹ پورے ہو گئے ہیں وہ گاڑا ادھر ہی آ رہا ہے۔“ اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں کل پھر آؤں گی اور تم سے مزید باتیں پوچھوں گی۔“ میں نے کہا اور گاڑے کے ساتھ واپس جیلر کے آفس میں چلی گئی۔

”کچھ کام بنامیڈم۔“ جیلر نے مجھ سے پوچھا۔

”آپ نے صرف دس منٹ دیئے تھے۔ دس منٹ میں زیادہ سے زیادہ میں کتنے سوالات کر سکتی تھی۔ مشکل سے دو تین باتیں ہی کی ہیں، میں کل پھر آؤں گی۔“ میں نے کہا۔

”ضرور۔ پھر کل مقبول ہی سے ملنا ہے یا اگلے قیدی سے؟“ جیلر نے پوچھا۔

”نہیں ابھی میں مقبول ہی سے ملوں گی بعد میں اگر ضرورت ہوئی تو دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا اور واپس آ گئی۔

کر بیٹھ گیا تھا۔

”اچھا! اب یہ بتا کر تو نے کچھ کھایا بھی ہے؟“ اس نے ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔

”ہاں! اب تیرا کام ہے تو پوچھے گا ہی ورنہ پچھلے تین دن سے مجھ پر کیا گزر رہی ہے تو نے پوچھا؟“ میں نے مصنوعی غصے سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

”ادھوٹے!“ بئیرے نے ہوٹل کے ملازم کو آواز دی، وہ دوڑ کر قریب آکھڑا ہوا۔

”جی صاب۔“

”جا جلدی سے میرے پار کے لیے گرم کھانا لے آ..... اور ہاں بعد میں چائے کی دو گرم اور کڑک پیالیاں بھی لے آنا۔“ بئیرے نے گردن اکڑا کر آڑور دیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں پرسکون ہو گیا تھا۔ کئی دن کے بعد کھانا نصیب ہوا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ لمبی تان کر سو جاؤں۔

”اچھا کل پہنچ جانے کا ٹھکانا پر۔“ چائے پینے کے بعد بئیرے نے مجھ سے پوچھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں ہاں پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ پھر میں نے چائے ختم کی اور سرگرتھ سلگالی۔ میں ہوٹل سے نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر احمد پر پڑی جو ابھی ابھی ہوٹل میں داخل ہوا تھا۔ سلمان احمد قصبے کی تھوک کی دکانوں پر مال سپلائی کرتا تھا اور ہر مہینے کی دس تاریخ کو ان دکانداروں سے پیسے وصول کر کے لے جاتا تھا۔ اس روز بھی دس تاریخ تھی اور سلمان احمد کی پتلون کی جینس تیار رہی تھیں کہ ان میں موجود رقم میرے نصیب کی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج نصیب نے مجھے بڑی رقم پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ شہر جانے کے لیے سلمان احمد اسٹیشن ضرور جانے گا اور اسٹیشن تک جانے والا راستہ سنسان ہی رہتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف تھیں جھاڑیاں تھیں اور سلمان احمد جانے کیوں اسٹیشن جانے کے لیے اسی راستے کو منتخب کرتا تھا جب کہ کچھ فاصلے پر سڑک بھی تھی جہاں سے اگاؤ کا ٹانگے اور ریشے بھی گزرتے تھے اور وہ راستہ نسبتاً محفوظ بھی تھا۔“ مقبول اتنی بات کر کے خاموش ہو گیا تھا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔

”مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ جیسے ہی کاؤنٹر سے ہٹ کر ہوٹل سے باہر نکلا میں بھی اس کے پیچھے ہو گیا۔

اس نے نیلی پتلون اور نیلی دھاری دار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کالا بیگ تھا جس میں وہ اپنا چشمہ اور ضرورت کے کچھ کاغذات رکھتا تھا۔ وہ مکانوں کی قطاروں اور گلیوں سے گزرتا ہوا اس سنسان راستے کی طرف بڑھ رہا تھا جو جھاڑی دار تھا۔ میں بہت ہوشیاری سے خود کو چھپاتے ہوئے جھاڑیوں کی اوٹ میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ جب وہ آبادی کو چھوڑ کر اس سنسان راستے پر آگے بڑھا تو میں نے اپنے اور اس کے درمیان کے فاصلے کو کم کرنا شروع کر دیا پھر ایک موقع مل گیا۔ راستے میں ایک موٹی سی ڈالی مل گئی تھی اسے اٹھائے ہوئے میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا میں نے اس کے سر پر دے ماری۔ سلمان احمد کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور وہ لڑکھڑا کر گر گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس کی جیبوں کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ ایک جیب میں سے تو صرف رسیدیں ہی نکلیں جو مختلف اشیاء کے سودے کے بارے میں تھیں لیکن دوسری جیب سے نوٹوں کی جو گڈی برآمد ہوئی وہ پچیس ہزار کی تھی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ پہلی بار میں اس رقم کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ میں نے رقم اپنی جیبوں میں غنڈی اور واپس مڑ گیا۔ پھر واپسی کے لیے میں نے جو راستہ منتخب کیا وہ گنے کے کھیتوں سے گزرتا تھا۔ میں زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک شدید دھکا لگا اس کے ساتھ ساتھ میرے سر پر بھی ضرب لگی تھی۔ میں ایک کڑے میں جا کر اڑا اور مجھے دنیا د مافیا کی کوئی خبر نہ رہی۔“ مقبول ایک بار پھر خاموش ہو گیا تھا۔ وہ گفتگو کے دوران بار بار چپ ہو کر جیسے کچھ سوچ میں پڑ جاتا تھا۔

”پھر؟ آگے بتاؤ۔“ میں نے اسے ٹوکا۔

”بس پھر جب مجھے ہوش آیا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی تو وہ خالی تھیں۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ جب میں نے دردی جگہ پر ہاتھ رکھا تو وہاں بڑا سا گومڑا ہوا تھا جس سے خون رس رہا تھا اور ایک پتی سی دھار نکل کر نیچے پک رہی تھی۔ میرے کپڑے ریت میں اٹ گئے تھے۔ میں اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ پیری بدستی میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ اچھی خاصی لوٹی ہوئی رقم میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی جس کی میں کسی تھانے میں رپورٹ نہیں لکھا سکتا تھا کیونکہ مجھے بتانا پڑتا کہ میں نے کہاں سے رقم حاصل کی تھی۔“ مقبول کی بات ختم ہوتے ہی گارڈ میرے پاس آکھڑا ہوا تھا۔

میں اچھا خاصا ہنگامہ تھا۔ دونوں آپس میں لڑ رہے تھے۔
 ”میں کہہ رہا ہوں کہ نیچے والا بستر میرا ہے۔“ مقبول
 نے اکڑ کر اکرم سے کہا۔

”ہونہہ! میں تم سے پہلے سے یہاں رہ رہا ہوں اور
 اس بستر پر سوتا ہوں تم بعد میں آئے ہو چنانچہ اوپر والی برتھ
 تمہاری ہے۔“ اکرم نے ناگواری سے کہا۔
 ”دیکھو اکرم فضول بحث مت کرو۔“ مقبول کے لہجے
 میں نفرت تھی۔

”ورنہ کیا کر لو گے؟“ اکرم نے بھی اکڑ کر کہا۔
 ”میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“ مقبول نے
 غصے سے جواب دیا۔ اس کے جواب پر اکرم اس سے لڑنے
 مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ میں دونوں کو آوازیں دے دے کر منع

”میڈم! جیلر صاب ملارہے ہیں آپ کا ملاقات کا
 بائم ختم ہو گیا۔“ اس نے کہا تو میں نے مقبول سے اگلے روز آنے
 کا وعدہ کر کے رخصت جا ہی۔

اگلے روز میں پھر مقبول سے ملنے پہنچ گئی تھی۔
 ”ہاں تو مقبول پھر کیا ہوا تم زخمی ہو کر لوٹی ہوئی رقم منوا
 کر اپنے گھر چلے گئے اس کے بعد؟“ میں نے پوچھا۔
 ”بس پھر دو سال تک سلسلہ یونہی چلتا رہا چھوٹی موٹی
 کامیابی ملتی رہی۔ ایک بار میں نے قصبے کے سب سے امیر
 شخص کے گھر چوری کا پروگرام بنایا۔ میں نے کامیابی سے
 چوری بھی کر لی تھی لیکن جب بھاگنے کے لیے باہر سڑک پر
 چھلانگ لگائی تو قسمت نے دغا دے دی۔ علاقے میں
 پہرے پر موجود پولیس والا مجھ سے صرف چار فٹ کے فاصلے
 پر کھڑا تھا گویا میں ایک بار پھر اپنی قسمت کے ہاتھوں شکست
 کھا گیا تھا۔“ مقبول نے اداسی سے کہا اس کا سامھی قیدی
 خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا اب تک اس نے ہماری
 باتوں میں دل اندازی نہیں کی تھی۔
 ”پھر؟“

”پھر کیا؟ میں گرفتار ہو گیا میرے قصبے سے چوری کی
 رقم اور زیورات برآمد ہوئے جنہیں شناخت کر لیا گیا مجھے
 پولیس کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد کورٹ میں پیش کر دیا
 گیا اور چھ سال قیدی سزا سنائی گئی۔ جب سے میں اس کوٹھڑی
 میں قید ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے کوئی مجھ سے ملنے بھی
 نہیں آتا ہے۔“ مقبول نے اپنی کہانی ختم کرتے ہوئے کہا۔
 مجھے خاصی مایوسی ہوئی تھی کیونکہ اس کی کہانی میں مجھے ایسا کچھ
 خاص ملا نہیں تھا۔

”اور تمہارا یہ قیدی ساتھی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”یہ بھی میری طرح چوری کی وارداتیں کرتا تھا اس پر
 ایک قتل کا الزام بھی ہے۔“ مقبول نے کہا۔
 ”اے الزام نہیں قتل ثابت ہو گیا تھا اور میں پندرہ
 سال کی سزا بھگت رہا ہوں۔“ ساتھی قیدی نے مداخلت کی
 جس کا نام اکرم تھا۔ میں خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی تھی اور
 جیلر کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”آج آپ کو کئی دن ہو گئے ہیں کچھ کام ہٹا؟“ جیلر
 نے مجھ سے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
 ”کل آخری کوشش اور کروں گی پھر کسی اور قیدی سے
 سوالات کروں گی۔“ میں نے کہا۔

دوسرے روز جب میں مقبول سے ملنے پہنچی تو کوٹھڑی

کراچی

پاکستان

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک
 نیا اور منفرد سلسلہ باتیں، تمہارا خوشنماں کی...
 پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر
 قاری بہن دیے گئے سوالوں کے
 جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی
 ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات
 ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہمارے بک کروالیں

کر رہی تھی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی میری آواز پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ آخر کار گاڑی اپنی جگہ سے آیا اور اس نے دونوں کو ڈانٹ کر خاموش کیا۔

”ان دونوں نے پریشان کر دیا ہے۔ جب لڑتے ہیں تو ایسے جیسے ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں اور جب دوستی ہوتی ہے تو دونوں کھٹوں باتوں میں مگن رہتے ہیں۔“ گاڑی نے مجھ سے کہا گاڑی کے جانے کے بعد میں نے پھر مقبول کو مخاطب کیا۔

”مقبول تم نے اب تک مجھے جو کچھ بتایا اس میں تم نے اپنی ناکامی کا سبب ہمیشہ اپنی بد قسمتی کو ٹھہرایا ہے ایسا کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے اگر قسمت اچھی ہوتی تو میں اپنے باپ کی ہدایت پر عمل کر کے تعلیم حاصل کرتا اور کوئی اچھا آدمی بن جاتا، عزت کی زندگی بسر کرتا، میرے بھی بیوی بچے ہوتے، پرسکون زندگی ہوتی۔“

”بس بس..... بس کر یار تو تو شیخ چلی جیسی باتیں کرنے لگا۔“ اکرم نے اسے ٹوکا۔

”نہیں اکرم میں سچ کہتا ہوں میری زندگی صرف میری بد نصیبی کی وجہ سے برباد ہوئی ہے۔“ مقبول نے کہا۔ خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔

”دیکھو میں نے جب بھی سوچا کہ کوئی بڑا ہاتھ ماروں، ساری عمر کے لیے کچھ کمالوں اور باقی زندگی گناہوں سے توبہ کر لوں تو میری بد نصیبی میرے آڑے آ جاتی رہے، میں ناکام رہا۔ اب تم میری آخری چوری کی مثال لے لو۔ میں نے قصبے کے سب سے امیر آدمی کے گھر اس لیے چوری کی تھی کہ مجھے اتنی رقم حاصل ہو جائے گی کہ باقی زندگی چوری نہیں کرنا پڑے گی۔“

چوری میں نے بہت کامیابی سے کی تھی اور رقم لے کر فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی تھی کوئی فرد نہیں جاگا تھا لیکن جب میں نے چھت سے چھلانگ لگا کر ایک پولیس والا نظر آیا جو مجھ سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا اس نے مجھے پکڑ لیا، تھانے لے گیا جہاں چوری کا مال برآمد ہوا اور مجھے اس جرم میں چھ سال کی قید ہو گئی۔“ مقبول نے اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم ہی بتاؤ کہ یہ میری بد نصیبی تھی تو اور کیا ہے؟“

”میں اب بھی یہ نہیں مانتا کہ اس میں تمہاری بد نصیبی کا

قصور ہے، بھی یہ تو اتفاق تھا کہ وہاں پر اس وقت سائیکو موجود تھا یا پھر تم اسے اپنی غلطی کہہ سکتے ہو کہ تم نے بغیر دیکھے چھت سے چھلانگ لگا دی۔ میرے تو خیال میں یہ بد نصیبی سے زیادہ تمہاری غلطی نظر آتی ہے۔“ اکرم نے کہا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے بھی اکرم کی تائید کی۔

”تم نہیں مانو گے لیکن مجھ سے پوچھو میں کئی بار اپنی بد نصیبی کا شکار ہو چکا ہوں۔“ مقبول نے کہا۔

”چلو چھوڑو کوئی اور بات کرو۔“ اکرم نے بے دلی سے کہا۔

”اچھا کہا، تم اس کو بھی میری غلطی کہہ سکتے ہو کہ اب سے تین سال پہلے میں نے ایک شخص کی جیب سے پچیس ہزار روپے چرائے تھے لیکن اسی وقت ذرا سی دیر میں کسی نے میری جیب سے وہ رقم واپس نکال لی، میں گنے کے کھیت میں کئی گھنٹے بے ہوش پڑا رہا۔“ مقبول کی اس بات پر اکرم اسے چونک کر دیکھنے لگا۔

”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“ اکرم نے اس سے وہ سوال کیا جو پچھلے ایک سال سے نہیں کیا تھا۔

”میں مالا پور کا رہنے والا ہوں۔“ مقبول نے اپنے قصبے کا نام بتایا۔

”مالا پور۔“ اکرم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ مقبول نے جواب دیا۔

”تم نے یہی کہا تھا کہ جس وقت کسی نے تمہاری جیب سے پچیس ہزار کی رقم نکالی تم گنے کے کھیت میں تھے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”ہاں۔“ مقبول نے جواب دیا۔

”تم نے یہ بھی کہا کہ تم وہاں کئی گھنٹے بے ہوش پڑے رہے تھے؟“ اکرم نے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں! میں نے یہی کہا ہے۔“ مقبول نے کہا۔

”تم نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ رقم تم نے کسی اور شخص کی جیب سے اڑائی تھی؟“ اکرم نے پھر پوچھا۔

”بھئی میں نے کہا تھا لیکن تم اس طرح کیوں سوالات کر رہے ہو؟“ مقبول نے پوچھا۔ میں حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر اکرم اس سے یہ سب کیوں پوچھ رہا ہے سوالات تو مجھے مقبول سے کرنا تھے۔

”کیا کرو گے سب پوچھ کر اب تو اس بات کو بہت

اعرصہ ہو گیا۔“ مقبول نے کہا۔
 ”میں جانتا چاہتا ہوں مجھے بتاؤ۔“ اکرم نے اصرار کیا۔

”تین سال پہلے کی بات ہے میں اپنی بد نصیبی ہی کے ہاتھوں کئی دن کی بھوک برداشت کیے ہوئے تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھے ایک جگہ واردات کرنے کے بارے میں بتایا اس نے مجھے مالا پور کے ہوٹل میں کھانا بھی کھلایا تھا پھر میں وہاں سے نکلنے ہی والا تھا کہ میری نظر اس علاقے کے ایک آدمی پر پڑی جو وہاں کی تحوک کی دکانوں پر مختلف اشیاء فروخت کرتا تھا اس دن وہ دکانوں سے رقم جمع کر کے لے جا رہا تھا۔ میری توجہ بھی اس کی طرف اس کی پھولی ہوئی جیبوں ہی نے کرائی تھی جب وہ شخص ہوٹل سے نکلا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا اور سنان راستے تک پہنچتے ہی میں نے ایک موٹی سی لکڑی اس کے سر پر ماری۔“

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ اکرم نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”پھر وہ زمین پر گر گیا اور میں نے اس کی جیب سے رقم نکال لی پوری پچیس ہزار کی رقم تھی پھر میں راستہ بدل کر گئے کہ کھیتوں کی طرف گیا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کسی نے میرے سر پر کوئی بھاری چیز ماری اور مجھے دھکا دے کر گڑھے میں پھینک دیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو رقم میری جیب سے غائب تھی۔ بتاؤ یہ میری بد نصیبی نہیں تو اور کیا تھا؟“ مقبول نے پھر قسمت کارو ناروایا۔

”جس شخص کی جیب سے تم نے رقم نکالی تھی اس نے نیلی پتلون اور نیلی دھاری دار قمیص پہنی ہوئی تھی؟“ اکرم نے پوچھا۔
 ”ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے نیلی پتلون اور نیلی دھاری دار قمیص ہی پہنی ہوئی تھی۔“ مقبول نے حیرت سے اکرم کو دیکھتے ہوئے کہا میں بھی ساری گفتگو حیرت سے سن رہی تھی۔
 ”اس شخص کا نام سلمان احمد تھا نا؟“ اکرم نے پوچھا تو مقبول نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور اس دن دس تاریخ تھی نا؟“ اکرم نے پوچھا۔
 ”ہاں وہ دس تاریخ کو ہی دکانداروں سے رقم وصول کرنے آتا تھا۔“ مقبول نے حیران ہو کر جواب دیا۔ ”لیکن یہ سب کیا ہے؟ تم اتنا کچھ کیسے جانتے ہو؟“
 ”دوست جس شخص نے تمہاری جیب سے پچیس ہزار

کی رقم نکالی کیا تم اسے معاف کر سکتے ہو؟“ اکرم نے مقبول کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں تو اس شخص پر بھی بھی ناراض نہیں ہوا اور میرے دل میں بھی اس شخص کے لیے برائی نہیں آئی۔“ مقبول نے کہا۔ ”بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کسی دوسرے کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا۔“
 ”مقبول میں تم سے معافی چاہتا ہوں کیونکہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے تمہیں قتل کیا تھا۔“ اکرم نے کہا اور مقبول کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس کی سمجھ میں اکرم کی بات نہیں آ رہی تھی۔
 ”تم نے مجھے قتل کیا تھا؟“ مقبول نے حیرت سے پوچھا۔ ”لیکن میں تو زندہ ہوں۔“
 ”لیکن قانون کی نظر میں تم مردہ ہو۔“ اکرم نے کہا۔ ”میں جو سزا بھگت رہا ہوں یہ تمہارے ہی قتل کے نتیجے میں ملی ہے۔“

”خدا کے لیے پوری بات بتاؤ اکرم میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“ میں نے کہا مقبول بھی پریشان نظر آ رہا تھا اور حقیقت جانتا چاہتا تھا۔
 ”جب میں تمہاری جیب سے پچیس ہزار کی رقم لے کر جا رہا تھا تو عین اسی وقت بستی کے دو افراد بھی اُدھر سے گزر رہے تھے۔“ اکرم نے کہا شروع کیا۔ ”میرے کپڑوں پر خون لگا ہوا تھا اور میرے قبضے سے ان لوگوں نے پچیس ہزار کی رقم برآمد کی تھی۔ انہوں نے مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر مشکوک سمجھا تھا اور روک کر میری تلاشی لی تھی اور مجھے تھانے لے گئے تھے۔ جس جگہ سے مجھے پکڑا گیا تھا اس سے تھوڑے فاصلے پر سلمان احمد کی لاش لی تھی پھر پولیس کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ رقم سلمان احمد کی تھی جو وہ دکانداروں سے وصول کر کے لے جا رہا تھا اور پولیس والوں کی نظر میں، میں نے اسے ہلاک کر کے وہ رقم حاصل کی تھی۔ میں بہت چچھا میں نے بہت کہا کہ میں نے سلمان احمد کو ہلاک نہیں کیا بلکہ میں نے یہ رقم کسی اور کی جیب سے چرائی ہے۔ میں نے تمہارا حلیہ بھی بتایا لیکن تلاش کے باوجود گئے کے کھیت میں تم نہ مل سکے۔ میری بات پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ میں سزا کے ڈر سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا جہاں سے مجھے پندرہ سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔ آہستہ آہستہ میں بھی سمجھنے لگا کہ شاید میں نے جس میں تھا اسی وجہ سے مرنے والے کا

حلیہ غلط یاد رہ گیا میں نے ہی اسے قتل کیا ہو لیکن اب تو مجھے یقین ہے کہ میں بے قصور ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے جو جرم نہیں کیا تم اس کی سزا بھگت رہے ہو؟ اور میں جس نے وہ قتل کیا تھا آج تک یہ نہیں جانتا کہ جس شخص کے سر پر لکڑی مار کر میں نے رقم چھین لی تھی میرے ہی ہاتھوں موت کے منہ میں پہنچ گیا تھا اور میں اس کا قاتل ہوں۔“ مقبول حیرت سے بول رہا تھا۔

”اوہ..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں اچانک کبھی میرے سر سے ایک قتل کا بوجھ اتر جائے گا۔“ اکرم نے خوشی سے کہا۔

”سنو مقبول..... میرے دوست..... کیا تم میرے بے گناہ ہونے کی گواہی دو گے۔ کیا تم جیلر صاحب کو بتاؤ گے کہ سلمان احمد کے سر پر تم نے لکڑی ماری تھی جس سے وہ ہلاک ہوا اور تم نے اس کی جیب سے پچیس ہزار کی رقم نکالی جو بعد میں، میں نے تمہاری جیب سے اڑائی اور جس کی وجہ سے مجھے سلمان احمد کا قاتل سمجھا گیا کیونکہ اس کی رقم میرے پاس سے نکلی۔“ اکرم خوشی اور تذذب کے عالم میں مقبول سے پوچھ رہا تھا اور میں حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”تم دونوں ٹھہرو.....! میں جیلر سے بات کرتی ہوں۔“ میں نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر جیلر کے کمرے میں پہنچ گئی۔

”خیریت..... آپ کا کام ہو گیا؟“ جیلر نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”جی..... ہو گیا..... لیکن آپ کے لیے بھی ایک نئی خبر ہے۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ جیلر نے چونکتے ہوئے کہا۔

”مطلب یہ جیلر صاحب کہ اکرم بے قصور قید ہے۔“ میں نے کہا۔

”اکرم؟ بھی آپ تو مقبول سے سوالات کر رہی تھیں یہ اکرم کہاں سے سچ میں آ گیا؟“

”جب خدا کی پر مہربان ہو جائے اور اس کی مدد کرنا چاہے جب کہ وہ بے قصور بھی ہو تو پھر ایسے ہی سچ میں کوئی ٹپک پڑتا ہے اور بے قصور کے لیے نجات کا راستہ بن جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ذرا وضاحت کریں گی اس بات کی۔“ جیلر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا تو میں نے مقبول اور اکرم کی ساری گفتگو اس کے سامنے دہرا دی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے اکرم پر باقاعدہ مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہونے پر سزا سنائی گئی ہے۔“ جیلر نے کہا۔

”لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔ مقبول اپنا بیان دینے کے لیے تیار ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ضروری کارروائی کریں۔“ میں نے کہا۔

”پہلے میں خود ان دونوں سے ملوں گا۔“ جیلر نے کہا۔

پھر جیلر اکرم اور مقبول سے ملا تھا۔ ان سے ملنے کے بعد ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور پھر ضابطے کی کارروائی کی گئی تھی جس کے نتیجے میں اکرم رہا ہو گیا تھا اور مقبول کی سزا میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اب اسے سلمان احمد کے قتل کی سزا بھی بھگتنا تھی جس روز اکرم رہا ہوا میں آخری بار سینٹرل جیل گئی تاکہ اکرم اور مقبول سے مل سکوں۔

”میں آپ سے کہتا تھا کہ میری بد نصیبی نے ہر قدم پر مجھے ناکامیوں کا منہ دکھایا ہے۔ اب تو آپ بھی گواہ ہیں کہ یہاں بھی میری بد نصیبی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔“ مقبول نے ڈڈبائی آنکھوں کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں بڑے صبر و تحمل سے تمہارا انتظار کروں گا۔“ اکرم نے رخصت ہوتے وقت مقبول سے کہا۔ ”میرے دوست جب تم اپنی سزا کاٹ کر واپس آؤ گے تو میں تمہارا منتظر ہوں گا۔ میں تمہاری دعوت کروں گا تمہارے ساتھ گھوموں گا۔ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا تم نے مجھے رہائی دلائی ہے۔ یہ سب کتنا اچھا لگے گا کیونکہ کبھی کسی قاتل نے اپنے مقتول کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا ہو گا۔ اپنے مقتول کے ساتھ سیر و تفریح نہیں کی ہو گی۔ یہ خوشی میں کبھی بھول نہیں سکوں گا۔“ اکرم بولے جا رہا تھا اور مقبول اداس نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں بول جھلمکوں سے آہستہ آہستہ چلتی سینٹرل جیل کے گیٹ سے باہر آ گئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں.... وہاں اپنی سالانہ رپورٹ مکمل کرنے گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بے گناہ کو آزاد کرانے کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ میں اس ذات باری تعالیٰ کی شکر گزار تھی کہ اس نے مجھے اس نیک کام کے لیے منتخب کیا تھا اور میں مقبول کے لیے دعا گو تھی کہ اللہ اس کی خطائیں بخش کر اسے اچھا انسان بننے کا موقع فراہم کرے، آمین۔

رانگ نمبر

محترم
السلام علیکم

گزشتہ دنوں میں نے ایک فلم دیکھی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ہر غلط آدمی رانگ نمبر ہوتا ہے۔ میرا دوست بھی موبائل کے رانگ نمبر سے ایک رانگ نمبر تک جا پہنچا۔ اس پر کیا بیٹی یہی کچھ میں نے اس کہانی میں تحریر کیا ہے۔
ڈاکٹر ظفر احمد خان
(کراچی)

میں ایک باعزت اور تعلیم یافتہ گھرانے کا چشم و چراغ ہوں لیکن میرا باطنی مکمل طور پر دغا دار ہے جس کے سبب میں گنتی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر میں اپنے روز و شب کا احوال بیان کر رہا ہوں تاکہ لوگ سبق حاصل کر سکیں لیکن اپنی سرگزشت بیان کرنے سے قبل میں نوجوانوں سے استدعا کرنا چاہتا ہوں کہ خدا را اپنے والدین اور اہل خانہ کی عزت اور ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ اپنے اندر اچھے اوصاف پیدا



کریں۔ اپنی تعلیم پر توجہ رکھیں۔ جب آپ اچھی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں گے تو یقیناً آپ کا مستقبل بھی تاجنک ہوگا۔ آپ کسی اچھی پوسٹ پر کام کریں گے۔ کسی اچھے گھرانے میں آپ کی شادی ہو جائے گی اور یوں آپ اپنے شجرہ نسب کو نیک نامی کی طرف لے جائیں گے۔ انسان ٹھوکر کھا کر سبق حاصل کرتا ہے لیکن میں ایسا کندھ بن ہوں کہ ٹھوکر کھا کر بھی سنبھل نہ سکا۔ میں نے کہاں کہاں اور کس کس طرح ٹھوکر کھائی یہ آپ بھی سنیں۔

میرا نام کا شف ہے۔ میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میرے والد ایک تعلیم یافتہ اور دینی رجحان والے انسان تھے اور ایک سرکاری ادارے میں کلرک کی جاب کرتے تھے۔ میری تین بہنیں تھیں۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت مذہبی تھا۔ والد صاحب قاعدے قوانین کے پابند تھے۔ بہت سخت ہدایات تھیں۔ گھر کا کوئی فرد بھی والد صاحب کے قوانین کی خلاف ورزی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆.....☆

میں ان دنوں میٹرک میں تھا۔ گویا میں سنہری دور سے گزر رہا تھا جو بچپن سے جوانی کی راہ گزرتھی۔ جس سے ہر انسان کو زرتا ہوتا ہے اور یہ بڑا مسور کن دور ہوتا ہے۔ جب نئی نئی خواہشات اور امنگیں اور جذبے برساٹاتے ہیں جہاں اس کی حرکتیں زیاں ہیں وہیں اس کی خطرناکیاں بھی ہیں۔ بس یہیں سے انسان عروج پاتا ہے یا پھر زوال۔

میں بھی سن بلوغت کی لذتیں محسوس کر رہا تھا۔ میرے اندر عصبی جذبات و احساسات کا سمندر ٹھانٹیں مار رہا تھا۔ عشق و محبت کے خود ساختہ جذبے عود کر آ رہے تھے۔ میرے ہم عمر دوست ان کا دل میں طاق تھے۔ ان کی سرگرمیاں سن کر میں بھی بے قرار رہنے لگا تھا لیکن میرے گھر کا سخت قوانین پر مبنی ماحول مجھے ان کے رنگ میں رننے سے روک رہا تھا۔ فجر سے پہلے بستر چھوڑ دو اور محلے کی مسجد میں جا کر بامعاذت نماز ادا کرو، سر پر ہمدردت ٹوپی اوڑھے رہو۔

گھر کا ماحول ایسا تھا لیکن کالج کا ماحول بالکل الگ تھا۔ جتنے بھی دوست تھے ان سب کی گرل فرینڈز تھیں۔ اس لیے میں اندر ہی اندر بے چین رہنے لگا۔ میرا بھی دل چاہنے لگا کہ میری بھی کوئی گرل فرینڈ ہو جسے میں پیار کروں اسے گفت دوں۔ اسے ڈیٹ پر لے جاؤں۔

میرے ہم عمر دوستوں میں ارباز مجھ سے زیادہ کلوز

تھا۔ اس کی دو گرل فرینڈز تھیں۔ جن کے قصے وہ اکثر سنایا کرتا تھا۔

☆.....☆

ایک دن فری چیریڈ تھا۔ اتفاق سے کلاس روم میں، میں اور ارباز ہی تھے۔ باقی لڑکے کینٹین گئے ہوئے تھے۔ میں نے موقع قیمت جانا اور ارباز سے پوچھ لیا۔ ”یار! لڑکی کیسے پھنساتے ہیں۔“

”ہا ہا ہا.....!“ ارباز کا قہقہہ کلاس روم میں گونج اٹھا۔ ”تو تجھے بھی گرل فرینڈ کی ضرورت پڑ گئی۔“

”بتانا یار۔ میں سنجیدہ ہوں۔“ میں نے خفت مٹاتے ہوئے کہا۔

”محبت کرے گا میرا بھائی۔“ ارباز نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”اے یہ بھی کوئی کام ہے..... یوں..... یوں پھنستی ہے لڑکی۔“ ارباز نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

”تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے یہ ریاضی کا کوئی سوال ہو جسے یوں..... یوں..... حل کر لے گا۔“ میں نے ارباز کی نقل اتاری۔

”اے..... یہ ریاضی سے بھی آسان سمجھ کر ہے۔“ ارباز بڑی خوش دلی سے بولا۔ جیسے میں نے اس کا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا ہو۔

”مجھے کیا کرتا ہوگا۔ گائیڈ کر۔“ میں نے کہا۔

”کچھ خاص نہیں۔ بس اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑاؤ۔ محلے بڑوس میں دیکھو۔ سب سے پہلے اپنا شکار تلاش کرو۔ پھر اس پر کام کرو۔ دھیرے دھیرے اس کے سامنے آؤ۔ اس کا موبائل نمبر حاصل کرو۔ پھر اس کو اپنے جال میں لاؤ۔ کیوں کہ ہر لڑکی کسی سرکش گھوڑے کی مانند ہوتی ہے۔ پہلے اسے رام کرو۔ پھر بیڑہ کر حلو ا کھاؤ۔“ ارباز نے اپنی ماہرانہ رائے دی۔

”اچھا!“ میں نے جھٹ کو گھورتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ محبت کے کوچنگ سینٹر سے یہ میرا پہلا سبق تھا۔

☆.....☆

اب میں ہر وقت محلے بازار اور گرد و نواح میں اپنی مطلوبہ خوبرو لڑکی تلاش کرنے لگا لیکن کافی تلاش و بسیرا کے بعد بھی کوئی ایسی لڑکی نظر نہیں آرہی تھی جسے میں اپنی محبوبہ بناؤں۔ میں اپنی تلاش میں سرگرداں تھا کہ وہ نظر آگئی۔

ہوا یہ کہ میں ایک موبائل شاپ سے ایزی لوڈ کروا کر

مسیح اسی نمبر سے آیا تھا۔ اس نے رومن اردو میں لکھا تھا۔ ”آپ کون؟“

میں نے جوابی مسیح لکھا۔ موبائل شاپ کا حوالہ دیا۔ وہ مجھے پہچان گئی اور اس نے میرے مسیح کرنے پر برا بھی نہیں مانا اور پھر مسیح کا سلسلہ چل نکلا۔ میں بڑے باادب انداز میں اسے مسیح کرتا تا کہ وہ میرے اخلاق اور ادب سے متاثر ہو جائے۔ لیکن اس کے نتیجے سے اندازہ ہوا کہ وہ ایسی مچھلی ہے جو خود میرے کانٹے میں پھنسا چاہتی ہے۔ میں نے تمھوڑے کو بہت جانا اور اسی پر اکٹفا کیا کہ اب میں بھی صاحب گریڈ ہو گیا ہوں۔

میرا دل خوشی سے جھونے لگا۔ میں تصور میں ٹہینے کے ساتھ خود کو ساحل سمندر پر دیکھتا کہ ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سمندر کی آبی جانی لہروں سے محفوظ ہو رہے ہیں۔ کبھی میں تصور کی آنکھ سے دیکھتا کہ میں اس کو بائیک پر بٹھا کر کہیں جا رہا ہوں۔ غرض ٹہینے میرے تخیل کا حصہ بن گئی۔ میں نے ارباز سے مشورہ کیا کہ اب کیا کروں۔ تو اس نے مجھے مزید گائیڈ کیا۔

”یار کاشف! اب وقت آ گیا ہے کہ اسے مل سے باہر نکالو۔“ ارباز نے کہا۔

”لیکن کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس سے کو اپنی کسی سبکی سے ملنے کے بہانے کسی ہوٹل یا پارک میں آ جائے۔“ ارباز بولا۔

”کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ارے کچھ نہیں ہوگا۔“ ارباز نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”یار تجھے تو پتا ہی ہے، میرے والد کتنے سخت آدمی ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا تو قیامت ہی آ جائے گی۔“ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں دل کی بات کہی۔

”انہیں پتا چلے گا تب نا۔“ ارباز نے میری ڈھارس بندھائی۔

”ٹھیک ہے پھر میں دیکھتا ہوں کہ چوہے کو مل سے کیسے نکالا جائے۔“ میں نے مصنوعی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لائن کاٹ دی۔

لیکن میں اندر سے بہت خوفزدہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ سب کیسے کروں گا۔

اس نے اپنا نام ٹہینے بتایا تھا اور وہ بڑی آسانی سے میرے پکر میں آ گئی تھی۔

ہٹا۔ اسی وقت ایک لڑکی وہاں آئی۔ اس نے دوپٹے سے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا لیکن اس کی بڑی بڑی جمیل جیسی آنکھیں دیوانہ بنانے کو کافی تھیں۔ اس کی آنکھوں نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔ میں ایک ہی نظر میں اس کا دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اپنا موبائل نمبر ایک پرچی پر لکھ کر ایزی لوڈ والے کو دیا جس پر اس نے ایزی لوڈ کروایا۔ اس نے وہاں سے فارغ ہو کر ایک اچھتی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میں چونکہ اسے پہلے سے دیکھ رہا تھا لہذا میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے وہ موبائل نمبر والی پرچی موڑ کر میرے سامنے گرا دی۔ میں مجھے میں گھبرا کرچی کو دیکھتا رہ گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ وہ ادائے بے نیازی سے چلتی ہوئی میرے سامنے سے گزر کر باہر چلی گئی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے لپک کر وہ پرچی اٹھالی۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ میرے دل میں اس کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال میں نے وہ پرچی جیب میں رکھی اور تیز تیز چلتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆.....☆

گھر آ کر میں نے پرچی دیکھی تو اس پر موبائل نمبر لکھا تھا۔ میں نے اپنے موبائل سے ارباز کا نمبر سرچ کیا اور اسے ساری صورت حال بتا دی۔

”ارے کاشف بھائی..... لاٹری نکل آئی تمہاری تو۔“ ارباز نے خوشی کا اظہار کیا۔

”اب تم مجھے بتاؤ آگے کیا کرتا ہے۔“ میں نے موبائل فون ہونٹوں کے قریب کر کے قدرے سرگوشی میں پوچھا۔

”ارے کرنا کیا ہے۔ پہلے مسیح پر ہائے لکھ کر بھیجو۔ دیکھو دوسری طرف سے کیا رسپانس آتا ہے، اگر مثبت ہو تو بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیتا لیکن پہلے یہ کنفرم کر لینا کہ یہ اس کا ذاتی نمبر ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر میں نے ارباز کو خدا حافظ کہہ کر لائن کاٹ دی اور وہ نمبر اپنے موبائل میں فرضی نام سے سیو کر لیا۔ کیوں کہ میں اس حینہ کا نام نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسی وقت اس کے نمبر پر ”ہائے“ لکھ کر مسیح بھیجا اور انتظار کرنے لگا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ بے چینی بڑھ گئی تھی۔ تبھی میرے موبائل پر مسیح کی رنگ ٹون بجی۔

میں نے جلدی سے موبائل نکالا اور مسیح دیکھنے لگا۔

ہے جیسے کسی نوٹھال کو تین پیہوں کی سانیکل۔“ ارباز نے منکھکھ خیر لہجے میں کہا۔

”یونہی سہی..... اب چل بھی۔“ میں نے ہلکی لہجے میں کہا۔

میرے اصرار پر ارباز میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ ہم دونوں تیسرے کوریڈور کی طرف بڑھے۔ یہاں دونوں جانب گارمنٹس کی دکانیں تھیں۔ میری نظریں مونا فیئر کس تلاش کر رہی تھیں اور پھر میں نے دور سے مونا فیئر کس کا سان بورد دیکھ لیا۔

”ارباز وہ رہا..... مونا فیئر کس۔“ میں نے ارباز کا کندھا دیا۔

”ہاں گڈ چل آجا دیکھتے ہیں۔“ ارباز نے پیش قدمی کی اور میں اس کے ساتھ مونا فیئر کس کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے قدموں کی چال سے تیز میرے دل کی چال تھی۔ میری گھبراہٹ عروج پر تھی۔ مگر اتنے اطمینان سے جا رہا تھا جیسے اس کی پچھو کی بیٹی ہو۔

چند ساعت کے بعد ہم مونا فیئر کس کے باہر موجود تھے۔ فرنٹ شے کا بنا تھا۔ جس میں سے ہم اندر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ اندر وہ فیملی شاپنگ کر رہی تھیں۔ ہم نے متلاشی نظروں سے شمینہ کو تلاش کیا تو وہ اپنے بتائے ہوئے طبقے میں نظر آگئی۔ سرخ پھولدار کپڑے اور بلیک اینڈ وائٹ چیک والا اسکارف، ہم بھی دکان کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہو گئے اور کسی گاہک کی طرح سوٹ دیکھنے لگے۔

ارباز نے مجھے کہنی ماری اور اشارہ کیا کہ میں بہانے سے ٹھٹھا ہوا ان کے پاس جاؤں۔ شمینہ کے علاوہ ایک بڑی عمر کی عورت، ایک انکل اور ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا سوٹ پس دیکھ رہے تھے۔

میں سوٹ دیکھنے کے بہانے ٹھٹھا ہوا شمینہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ ہنجر میں لٹکے ہوئے سوٹ کا کپڑا چیک کر رہی تھی۔ میں اس کے برابر والا سوٹ چیک کرنے لگا اور آہستہ سے کھنکارا۔ میرے کھنکارنے پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ حسب معمول آدھا چہرہ چھپائے ہوئے تھی لیکن اس کی جھیل جیسی مسور کن آنکھیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ شمینہ ہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں نے سوٹ چیک کرتے کرتے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ اس نے جھنجھک کر اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے بھی زیادہ فری ہونے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ اس کی فیملی موجود تھی۔

ایک دن شمینہ کا مسیج آیا کہ وہ شاپنگ کے لیے فیملی کے ساتھ جارہی ہے۔ طارق روڈ پر پیراڈائز شاپنگ ہال ہے اگر ملتا ہے تو آجاؤ۔ میں نے جوابی مسیج میں پوچھا کہ فیملی کے ساتھ ہوگی تو ملاقات کیسے ممکن ہے۔ تب اس نے مسیج کیا کہ ملاقات نہ سہی ایک دوسرے کو دیکھ تو لیں گے۔ میں رضا مند ہو گیا کہ اگر موقع مل گیا تو مل بھی لیں گے۔ دو چار باتیں بھی کر لیں گے۔ شمینہ نے بتایا کہ وہ سرخ رنگ کے پھولدار پرنٹ والے سوٹ میں ہوگی اور بلیک اینڈ وائٹ چیک والا اسکارف پہنے ہوئے ہوگی اور ٹھیک تین بجے وہ شاپنگ سینٹر میں پہنچے گی۔

میں نے فوراً ارباز کو فون کیا۔ ”ہیلو ارباز! وہ شاپنگ سینٹر میں بلارہی ہے۔“

”ارے تو گھبراتا کیوں ہے۔ چلا جا۔“ ارباز نے اطمینان سے کہا۔

”یار کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو میرے ساتھ چلے۔ میری ہمت بندھی رہے گی۔“ میں نے ہلکی لہجے میں کہا۔

”ہونہہ..... چل ٹھیک ہے۔ کب جانا ہے۔“ ارباز نے پوچھا۔

”آج سہ پہر تین بجے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں اپنی بایک پر آ رہا ہوں۔ تو فائنل تیار ہو جا۔“ ارباز نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

☆.....☆

پونے تین بجے ارباز میرے گھر پہنچ گیا۔ میں ارباز کے ساتھ طارق روڈ روانہ ہو گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم پیراڈائز شاپنگ سینٹر کے قریب تھے۔

”چلو ڈیز! اپنا فون نکالو اور لوکیشن پوچھو۔“ ارباز نے کہا۔

میں نے موبائل فون نکالا اور شمینہ کو مسیج کیا کہ میں پہنچ گیا ہوں تم کہاں ہو۔ چند منٹ بعد ہی جواب آ گیا۔ اس نے مسیج میں بتایا کہ وہ تیسرے کوریڈور میں مونا فیئر کس پر موجود ہے تب میں نے جواب طلب نظروں سے ارباز کو دیکھا۔

”تو مل کر آ..... میں یہیں تیرا انتظار کرتا ہوں۔“ ارباز نے کہا۔

”نن..... نہیں، میں اکیلا نہیں جاؤں گا تو بھی ساتھ چل۔“ میں ہکلا یا۔

”تو تو بالکل ہی بونگا ہے۔ عاشقی ایسے سکھانی پڑ رہی

کسماؤ ساناٹا

(Gusmao Xanana)

مشرقی تیمور کے رہنما اور صدر انہوں نے قبل ازیں صحافی اور استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1978ء میں مشرقی تیمور کے مزاحمتی رہنما لو باٹو کو قتل کر دیا گیا تو انہیں ان کی جگہ مزاحمتی رہنما بنا دیا گیا۔ 1992ء میں ان کو گوریلار گریمریوں کے نتیجے میں گرفتار کر لیا گیا۔ 1993ء میں عدالت نے انہیں عمر قید کی سزا سنائی جسے بعد ازاں صدر سہارتو نے کم کر کے بیس سال کر دی۔ عالمی برادری کے دباؤ پر اندونیشیا کی حکومت نے 1999ء میں انہیں جیل سے گھر میں نظر بند کر دیا، تاہم بعد ازاں رہا کر دیے گئے۔ رہائی کے بعد 20 ستمبر 1999ء کو جکارا سے شمالی آسٹریلیا ... چلے گئے، جہاں انہوں نے مشرقی تیمور کی جلاوطن حکومت قائم کی، مشرقی تیمور میں استصواب رائے کے بعد وہ وطن واپس آ گئے اور 2002ء کو جب مشرقی تیمور کی آزادی کا اعلان ہوا تو انہوں نے اس کے پہلے صدر کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالا۔

مرسلہ: نیم حسن، جھنگ

میں دو چار سوٹ ایسے ہی چپک کر کے دکان سے باہر آ گیا۔ ارباز بھی میرے ساتھ باہر آ گیا۔

”کیا ہوا دوست۔ کوئی کارنامہ کیا۔“ ارباز بولا۔

”یہاں کیا کارنامہ کروں گا۔ یہ پلک پلک ہے۔“

میں نے برجستہ کہا۔

”کچھ تو کیا ہوگا۔“ ارباز تجسس انداز میں بولا۔

”ہاں آنکھیں چار ہوئی تھیں اور میں نے بہانے سے

اس کا ہاتھ دبا دیا تھا۔“ میں شرما کے بولا۔

”پھر اس کا کیا راسخا تھا۔“ ارباز نے پوچھا۔

”اس نے میری حرکت کا برا نہیں مانا۔ صرف جھینپ

کر رہی تھی۔“ میں نے کہا۔

”چل اس کو میٹج لگا۔ شاید ایک آدھ موقع اور مل

جائے۔“ ارباز نے کہا۔

میں نے میٹج کیا کہ کیفے میرا میں لو اس کا جواب آیا

کہ میں اکیلی نہیں آسکتی کیونکہ میرے والد بہت سخت اور ٹھکی

مزاج کے ہیں۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

میں نے ارباز کو میٹج سنایا تو وہ بولا۔ ”چل ٹھیک ہے۔

دل چھوٹا نہ کر۔ کوئی دوسرا پلان بناتے ہیں۔ جس میں تم

دونوں تھما ل سکو۔“ ارباز نے حوصلہ افزائی کی۔

☆.....☆

دن بہ دن ثمنینہ میرے حواسوں پر چھار ہی تھی۔

خیالوں میں خوابوں میں آ رہی تھی۔ پھر ایک دن ثمنینہ کا میٹج

آیا۔ ”کال می۔“ اور میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ میں نے

جلدی سے اس کا نمبر بچ کیا۔

”ہیلو۔“ اس کی دھیمی سی ٹریکھیرتی آواز سنائی دی۔

”ثمنینہ۔“ میں نے آہستہ سے پکارا۔

”ہاں۔“ اس نے کہا۔

”کیسی ہو، کیا کر رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔ میں انگریز کی تیاری کر رہی ہوں۔“

اس نے جواب دیا۔

”ہاں انگریز تو میرے بھی سر پر سوار ہے۔ اب بتاؤ

کب مل رہی ہو مجھ سے۔“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”دیکھو کاشف میرا تم سے ملنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ

میرے والد بہت سخت مزاج کے ہیں۔ پھر بھی میں کوشش

کروں گی۔“ ثمنینہ نے کہا۔

”اپنی کسی سہیلی سے ملنے کے بہانے آ جاؤ۔“ میں

نے کہا۔

”ہاں کوشش کروں گی۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم میرے

لیے کیا جذبات رکھتے ہو۔“ ثمنینہ نے استفہامیہ لہجے میں

پوچھا۔

”میں میں تم سے م م محبت کرنے

لگا ہوں۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”محبت کا مطلب جانتے ہو۔“ ثمنینہ نے معنی خیز

لہجے میں کہا۔

”ہاں جانتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”اور ہمارے ملن میں سماج کی دیواریں جو بچ میں

آئیں گی ان کا کیا کر دے۔“ ثمنینہ نے فکر انگیز لہجے میں

سوال کیا۔

”میں سماج کی دیواروں سے ٹکرا جاؤں گا۔“ میں

نے کہا۔

”یہ تو تم جذبات میں کہہ رہے ہو جبکہ وہ ایسی رکاوٹیں ہوں گی جنہیں تم عبور نہیں کر پاؤ گے۔“ وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

”میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تبھی میں تمہیں دل دے بیٹھا تھا۔ یقین کرو میں تمہیں بہت چاہتا ہوں اور تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں وقت آنے پر تمہیں دکھا دوں گا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تو پھر دیکھتے ہیں۔ تم کتنے پانی میں ہو۔“

”تم دیکھ لیتا۔ مجھے کسی مقام پر بھی پیچھے نہیں پاؤ گی۔“ میں نے کہا۔

”کیا شادی کرو گے مجھ سے۔“ ثمنینہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”ہاں بھئی۔ کیوں نہیں کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”اگر تمہارے گھر والے نہ مانے تو۔“

”نہیں مائیں تو میں تم سے کورٹ میرج کر لوں گا۔“

میں نے پُر جوش لہجے میں جواب دیا۔

”اچھا اتنا یار کرتے ہو مجھ سے۔“ ثمنینہ نے تسخیر لہجے میں کہا۔ پھر گھبرا کر بولی۔ ”اچھا میں فون رکھتی ہوں۔ کوئی آ رہا ہے۔“

میں موبائل فون کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”بڑی آئی لیلیٰ کی گرجی۔ میں تو سماج کی دیواروں سے نہیں ٹکرا سکتا کیونکہ سماج کی سب سے بڑی دیوار میرے والد ہیں۔ میں ان کی مخالفت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سوری ثمنینہ۔“

یہ کہہ کر میں نے موبائل حبیب میں رکھ لیا۔

☆.....☆

میں اور راز باز اسکول کینٹین میں موجود تھے۔ میں نے راز باز کو ثمنینہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا جسے سن کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ”تو پھر کیا ارادے ہیں مجھوں صاحب۔“

”یار وہ سر پھری تو مجھے چوڑے میں مردائے گی۔ وہ تو مستقبل کے سہانے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے بیٹھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے وہ بھی تجھے اُلٹو بنا رہی ہو۔ وہ بھی تو آج ہی کے دور کی لڑکی ہے۔“ راز باز نے کہا۔

”کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن میرا مقصد یہ نہیں کہ میں اس سے زندگی بھر ساتھ بھاننے کے عہد و پیاں کروں۔“

”بس تو پھر ہوشیار رہنا۔“ راز باز بولا۔

”ہونہ۔“ میں نے فضا میں گھورتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

ایک شام جب میں اور راز باز ساتھ ہی تھے کہ ثمنینہ کی کال آگئی۔ میں نے راز باز کو بتایا۔ اس نے اشارے سے اٹینڈ کرنے کو کہا۔

”ہیلو۔“ میں نے کال اٹینڈ کی۔

”ہیلو جانو..... کیسے ہو۔“ ثمنینہ کی مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

”ہاں جان میں ٹھیک ہوں تم سناؤ آج فون کیسے کر لیا۔“ میں نے خوش دلی سے پوچھا۔

”بس تمہاری بہت یاد آ رہی گی۔“ اس کی آواز میں پیار اندر رہا تھا۔

”اچھا ایسا ہے۔ یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں آتشِ عشق ہے۔ بجھاؤں کیسے۔“ ثمنینہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

”دیر تو تمہاری طرف سے ہے۔ میں تو کب سے تیار بیٹھا ہوں۔“

”میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں لیکن مجھ پر بہت سخت پابندیاں ہیں۔ میرے بابا جان ہر وقت کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔“ ثمنینہ نے کہا۔

”کوئی تو راستہ ہو گا تم سے ملنے کا۔“

”ایک راستہ ہے۔“

”کیا۔“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”اگر تم ہمت کرو تو رات 12 بجے کے بعد میرے گھر آ سکتے ہو۔ چھپکلی جانب جو گیلری ہے اسے بہ آسانی عبور کر سکتے ہو، گیلری کے ساتھ والا کرا میرا ہی ہے۔ وہاں ہم مل سکتے ہیں۔ اس وقت سب سو رہے ہوتے ہیں۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی۔“

”مگر یہ بڑا رسکی ہے اگر میں پکڑا گیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔“ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم آؤ تو سہی۔“ ثمنینہ نے کہا۔

”اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے بے چارگی سے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کیں اور لائن کاٹ دی۔

☆.....☆

میں نے فوراً ر باز کوفون لگایا اور ثمنینہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ ار باز ایک لمحے کو سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”ڈونٹ ڈری ڈیر! یہ موقع اچھا ہے تو اس سے مل لے اور اپنے سارے ارمان پورے کر لے۔ اس سے اچھا موقع تجھے نہیں ملے گا۔ جب وہ خود تجھے آفر کر رہی ہے تو اس سے اچھی کیا بات ہے۔“ ار باز نے کہا۔

”دیکھ لے۔ میں تو تیرے شورے پر چلتا ہوں۔ مروامت دیتا۔“

”کچھ نہیں ہوگا۔ تو تو خواخوہ ڈر رہا ہے۔“

”میں اور کسی بات سے نہیں بس اپنے والد سے ڈرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ان کو پتا چلے گا تب کی بات ہے ناں۔“ ار باز نے ہمت بندھا لی۔

”ٹھیک ہے میں آج رات ثرائی کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

☆.....☆

میں نے مسیح پر ثمنینہ سے ایڈریس مانگا تو اس نے علاقہ کلی محلہ مکان نمبر حوالہ سب لکھ کر بھیج دیا۔ تاکہ میں آسانی سے پہنچ جاؤں۔ میں نے مسیح پر اسے بتا دیا کہ میں آج آ رہا ہوں۔ پھر میں رات بارہ بجے گھر سے نکلا اور ثمنینہ کے بتائے ہوئے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ علاقہ میرے علاقے سے متصل تھا۔ لہذا میں وہاں پیدل ہی پہنچ گیا۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں ہر طرف ہوکا عالم تھا۔

میں اپنی مطلوبہ گلی تلاش کرنے لگا۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے وہ گلی مل گئی۔ اب مکان نمبر کا مسئلہ تھا اگر مکان نمبر لکھا ہوا نہیں ہوا تو مسئلہ ہو جائے گا۔ میں مکان نمبر تلاش کرنے لگا لیکن مکان نمبر مجھے نہیں مل رہا تھا۔ تب میں نے ایک مناسب جگہ رک کر ثمنینہ کو مسیح کیا کہ میں یہاں پہنچ چکا ہوں اپنے مکان کی کوئی نشانی بتاؤ تاکہ میں پہنچ سکوں۔

اگلے ہی منٹ جواب آ گیا۔ اس نے لکھا کہ پہلے رنگ کا مکان ہے جس پر ملک عبدالرحمن کے نام کی پلٹ لگی ہوئی ہے۔ اس پلٹ پر مکان نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔ بس اس مکان کے عقب میں آ جاؤ وہاں ایک گیلری ہے۔ اس کی دیوار زیادہ اونچی نہیں ہے تم آسانی سے آ جاؤ گے۔

میں نے مکانات کا جائزہ لیا اور کچھ ہی دیر میں مجھے وہ پہلے رنگ کا مکان مل گیا جس پر ملک عبدالرحمن لکھا ہوا تھا۔ یہ گلی میں تیسرا مکان تھا۔ میں گھوم کر عقب میں گیا۔ تیسرے

مکان پر گیلری بنی ہوئی تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے گیلری کی دیوار کے پاس جا کر اندازہ کیا۔ وہ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے اچھل کر دیوار کا سرا پکڑ لیا۔ پھر اپنی ٹانگ اوپر لے جا کر دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ میں آہستہ سے اندر کود گیا۔ ہلکی سی دھمک پیدا ہوئی۔ اسی وقت اندر کسی کمرے سے مردانہ کھانسی کی آواز آئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ میں کچھ دیر جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔ وہاں ایک دروازہ نظر آیا۔ یہ یقیناً ثمنینہ کا کمرہ ہوگا جیسا اس نے بتایا تھا۔ میں نے ثمنینہ کو مسیح کیا کہ میں آ گیا ہوں اور تمہارے کمرے کے باہر کھڑا ہوں۔ اسی وقت دروازے کی کنڈی کھلنے کی دھمکی سی آواز آئی اور دروازہ نیم ہوا گیا۔ اس کا مطلب تھا اس نے دروازہ کھول دیا تھا تاکہ میں اندر آ جاؤں۔ میں اندازے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ چند لمحوں بعد میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو مجھے ہلکا ہلکا منظر نظر آنے لگا۔ وہاں ایک پلنگ پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

”ثمنینہ۔“ میں نے آہستہ سے پکارا۔

”ہاں میں ادھر ہوں۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

میں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ثمنینہ ہی تھی۔ میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”میں جان جو کھوں میں ڈال کر آیا ہوں۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں محبت کی راہوں میں دشواریاں بہت ہیں۔“ ثمنینہ بولی۔

”تمہارے باقی گھر والے کہاں ہیں۔“ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”میرے بابا جان پہلے کمرے میں اور میری امی اور بھائی ساتھ والے کمرے میں سو رہے ہیں۔“ ثمنینہ نے بتایا۔

ابھی میں ثمنینہ سے سرگوشی کر رہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرا کالر پکڑ لیا۔ میں گھبرا گیا لیکن خود کو اس مضبوط ہاتھ سے چھڑا نہیں پایا۔ اس نے مجھے زور سے پیچھے کھینچا اور میں پلنگ سے زمین پر گر پڑا۔ ثمنینہ ہم کرکھڑی ہو گئی۔

”کون ہے تو اور اتنی رات گئے میری بیٹی کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔“ ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اسی وقت ایک کھٹکے کی آواز کے ساتھ کمرہ روشن ہو گیا۔ میں

نے دیکھا ایک پہلوان نما شخص میرے پیچھے موجود ہے۔ جس کے ہاتھ شے میں میرا کاہر پھنسا ہوا تھا۔

”مم..... میں چور نہیں ہوں۔“ میں نے ہکا کر کہا۔

”چور نہیں تو پھر کون ہے اور کیا کرنے آیا ہے۔“ وہ شایہ شہینہ کے بابا جان تھے ملک عبدالرحمن۔

”وہ..... وہ..... میں..... تو.....“ میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

”وہ میں کے بچے..... سیدھی طرح بتا کس ارادے سے آیا ہے۔ ورنہ میں بار مار کر تیرا کچھ مر بنا دوں گا۔“

میں خوشامدی نظروں سے شہینہ کی طرف دیکھنے لگا لیکن وہ تو پہلے ہی قہر قہر کا پ رہی تھی۔

”میں شہینہ سے پیار کرتا ہوں اور اس سے ملنے آیا تھا۔“ میں نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”ابے نا بنجار تجھے شرم نہیں آئی۔ ہم غیرت مند لوگ ہیں اور اپنی عزت کے لیے جان دے دیتے ہیں اور لے بھی لیتے ہیں۔“ ملک عبدالرحمن نے غراتے ہوئے کہا۔

”مجھے معاف کر دیں۔ مجھے جانے دیں۔ میرے والد بھی بہت سخت ہیں۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ میں اپنی لہجہ میں بولا۔

”ایسے کیسے جانے دوں۔ بکرے اب تو تیری پوری قربانی ہوگی۔“ عبدالرحمن بولا۔

”شہینہ تم ہی سمجھاؤ اپنے بابا جان کو۔“ میں نے رو دینے کے اعدا میں کہا۔

”نن..... نہیں..... مجھے کچھ نہیں پتا۔“ شہینہ دونوں ہاتھ تنی میں ہلانے لگی۔

”تیرا باپ غیرت مند ہے تو اس نے تیرے جیسی بے غیرت اولاد کو کیسے جنم دے دیا۔“ ملک عبدالرحمن غرایا۔

”خدا کے واسطے مجھے جانے دیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”ارے عارف! ذرا سی لے کر آؤ۔“ عبدالرحمن نے غالباً اپنے بیٹے کو آواز لگائی۔ چند ہی لمحوں میں عارف ری لے کر پہنچ گیا۔

”دونوں باپ بیٹے نے میرے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے اور منہ میں کپڑا ٹھوس دیا تاکہ میں شور نہ مچا سکوں۔ پھر ملک عبدالرحمن نے میری جامہ تلاشی لی اور میرا موبائل اپنے قبضے میں کر لیا۔

”بابا جان! ایسا مت کریں۔ اس کو جانے دیں۔“

شہینہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

”جانے دوں؟ ہرگز نہیں..... اری کم بخت..... اس نیم کے لیے ایسے ہی شریف زادے کی ضرورت تھی۔ تو سارا کھیل خراب کرائے گی۔“ ملک عبدالرحمن بولا۔

میں حیرت سے دونوں باپ بچی کو دیکھ رہا تھا۔ میں بول نہیں سکتا تھا کیوں کہ میرے منہ پر کپڑا باندھا ہوا تھا مگر سوچ تو سکتا تھا اس لیے سوچے جا رہا تھا کہ یہ لوگ کون سے گیم کا ذکر کر رہے ہیں۔

”اب اس کے موبائل میں سے اس کے باپ کا نمبر تلاش کر کے مجھے دے تاکہ میں یہ کیل مکمل کروں۔“ ملک عبدالرحمن نے میرا موبائل شہینہ کی طرف بڑھایا۔

میرے پیروں سے زمین نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ملک عبدالرحمن نہ جانے کیا کرنے والا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرے چھانے لگے۔ میں پری طرح پھنس چکا تھا۔ مجھے اربا بازی شدت سے یاد آ رہی تھی مگر اسے فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بے بسی پر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

شہینہ وہیں کھڑی میرے موبائل میں میرے والد کا نمبر تلاش کر رہی تھی۔

”بابا جان! اس کے والد کا نمبر نہیں مل رہا۔ آپ اس کا منہ کھول کر خود ہی معلوم کر لیں۔“ شہینہ نے موبائل ملک عبدالرحمن کو دیتے ہوئے کہا۔ تب انہوں نے میرے منہ پر باندھا کپڑا کھول دیا۔

”چل اپنے باپ کا نمبر بتا تاکہ میں اسے تیرے کرتوت بتاؤں۔“ ملک عبدالرحمن نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے بے چارگی کے عالم میں موبائل میں سے والد کا نمبر نکال کر دیا۔ ملک نے میرا موبائل جھپٹ کر والد کا نمبر شیخ کر دیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

شہینہ اب تنگ وہیں کھڑی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ تیرا ہمارے بابا جان کس کھیل کی بات کر رہے ہیں؟“ میں نے شہینہ سے پوچھا۔

”دراصل میرے بابا جان بہت سخت انسان ہیں۔ ہم سب کو احکامات پر چلانے کے پابند ہیں۔“

اسی وقت ملک کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں میرا فون تھا۔

”تیرے باپ پر بجلی گرا دی میں نے۔ وہ آ رہا ہے

لسانی مسئلہ

ایک ہندو جسے گنثار بجانے کا بہت شوق تھا۔ ایک سکھ کا ہمایہ تھا۔ سکھ کو اس کے وقت بے وقت گنثار بجانے سے بہت چڑھتی۔ ایک صبح سکھ نے ہندو کو گنثار بجاتے ہوئے جا پکڑا اور غصے سے کہا۔ ”کی گل اے باؤ جی؟ سویرے سویرے وجان لگ پیندے او۔“ (کیا بات ہے جناب! صبح آپ بجانے لگتے ہیں؟) ”سکھنی جو ہوئی۔“ (سکھنی جو ہوئی) ہندو نے سکھ کو شرمندہ کر دینے والا جواب دیا۔ سردار جی کہاں شرمندہ ہونے والے تھے۔ ہندو کے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ”ایہہ دی سکھ دالے؟“ (یہ بھی پکھتا ہے؟) ”نہیں، پر ایہہ نوں سکھنی چاہیدی اے“ (نہیں، لیکن اسے سکھنی چاہیے) ہندو نے اطمینان سے جواب دیا۔ (خشونت سکھ کے لطیفے)

بدنامی ہوگی۔“ ملک بولا۔

”نہیں یہ غلط ہے۔ میں شمینہ سے پہلی بار ہی ملنے آیا تھا اور میں نے اسے اب تک ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“ میں نے ملک کی مبالغہ آرائی سن کر کہا۔

”چپ کر مکار..... ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔“ ملک غرایا۔

”ایسی بے غیرت اولاد دے تو میں بے اولاد بہتر تھا۔“ والد صاحب نے روہانے لہجے میں کہا۔

”اب اس کا ایک ہی حل ہے۔ کل کا دن نکلتے ہی ان دونوں کا نکاح کرادو۔ کیونکہ اب میری بیٹی کو کون اپناے گا۔“ ملک مکاری سے بولا۔

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن میں اس کو اپنے گھر سے نکال رہا ہوں۔ کیونکہ میرے گھر میں ایسی اولاد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ کہیں بھی رہے۔ مجھے اس سے کوئی سرکار نہیں۔“ والد صاحب نے کہا۔

”لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل تم دونوں باپ بیٹے مکرگئے تو میں کیا کروں گا۔“ ملک نے تشویش سے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں جو زبان دیتا ہوں تو اس

یہاں۔“ ملک نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔
”یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”چپ کر..... خبیث! جب کسی عزت دار کے گھر کی دیوار کو دگر انداز آیا تھا وہ ٹھیک تھا؟ اب بھگت۔“
ملک ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شمینہ وہیں کھڑی تھی اور میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ وہ سب میرے والد کی آمد کے منتظر تھے۔
تقریباً پچیس منٹ انتظار کے بعد باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

”آگیا اس کا باپ۔“ یہ کہہ کر ملک دروازے کی طرف بھاگا اور تھوڑی دیر میں میرے والد سمیت کمرے میں داخل ہوا۔

”یہ ہے تمہارا لاڈلا..... دیکھ لو..... جسے ہم نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ یہ آدمی رات کو دیوار کو دگر انداز آیا تھا اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو یہ سامنے بیٹھا ہے۔ خود ہی پوچھ لو۔“ ملک نے کہا، والد صاحب مجھے متنی نیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ والد صاحب نے خاموشی کو توڑا۔
”جی۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ پھر تو گویا

قیامت ہی آگئی۔ ”بے غیرت..... ناہنجار..... خبیث.....“
گالیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے لاتوں گھونسلوں کی بھی بوچھاڑ کر دی۔ وہ مجھے بری طرح مارتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر رک گئے۔ ان کا سانس پھول گیا تھا۔ مجھے والد صاحب کی ماری بالکل پروا نہیں تھی۔ بلکہ جواب ہونے والا تھا اس کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

”دیکھیں صاحب! ایسا نہیں کہ آپ کا بیٹا کسی کی چاکلیٹ چھین کر بھاگ گیا اور آپ اسے مار پیٹ کر معاملہ رفع دفع کر دیں گے، یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔“ ملک نے کہا۔

”جناب مجھے اس بات کا پورا احساس ہے۔ آپ کی عزت میری عزت ہے۔ آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔“
والد صاحب بے چارگی سے بولے۔

”آپ کا بیٹا میری بیٹی سے نہ جانے کب سے مل رہا ہے اور نہ جانے کتنی بار داغدار کر چکا ہوگا، ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ پولیس میں بھی رپورٹ درج نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس میں بھی ہماری

سے کبھی نہیں کرتا۔“ والد صاحب نے کہا۔

”لیکن میں کیسے یقین کروں۔“ ملک نے کہا۔

”جو آپ کو ٹھیک لگے وہ بتادیں۔“ والد صاحب نے

کہا۔

”ابھی ایک کانڈ پر لکھ کر دے دو۔“ ملک نے برجستہ

کہا۔

”ٹھیک ہے لاؤ کانڈ۔“ والد صاحب نے کہا۔ ملک

فوراً اندر گیا اور ایک کانڈ قلم اور اسٹمپ پیپر لے آیا۔ والد

صاحب نے اپنا حلیہ بیان لکھا اور دستخط کر کے انگوٹھا لگا دیا۔

☆.....☆

اگلے دن میرے والد صاحب نے آخری بار مجھے

ماں اور بہنوں سے ملوایا اور سب کو بتا دیا کہ آج کے بعد وہ

میرا چہرہ بھی نہیں دیکھیں گے۔ سب کی آنکھیں غم خیز لیکن

کوئی بھی والد صاحب کے فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھا سکتا

تھا۔

پھر مجھے ملک کے گھر لے گئے جہاں انتہائی سادگی

سے میرا نکاح ثمنینہ سے کر دیا گیا اور اسی علاقے میں ایک

چھوٹا سا مکان کرائے پر دلوا دیا گیا۔ نکاح سے فارغ ہو کر

والد صاحب مجھے نئے گھر میں منتقل کر کے وہاں سے رخصت

ہو گئے ہمیشہ کے لیے۔

میرے چہرے کی ہنسی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی

تھی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی موقوف ہو چکا تھا۔ مجھے ایک دفتر میں

جاب کرنی پڑی۔ میں نے تو ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا

ہی تھا کہ شادی کے حادثاتی بندن میں بندھ گیا۔ میں ملک

کی چال کا شکار ہو چکا تھا اور اس میں تصور میرا بھی تھا جو میں

نے انجانے میں اپنے بڑوں کی نافرمانی اور غلط راستے کو

اپنایا۔ اسی دوران ایک دن ثمنینہ نے بتایا کہ اس دن میرے

ابو نے جو ڈراما کیا تھا اس کی ایک وجہ تھی کہ میں موبائل پر

جانے انجانے کو دوست بنا لیتی۔ دل بھر کر چیٹ کرتی۔ انہی

میں ٹھیکر بھی تھا۔ اس نے موبائل کی دوستی کے بعد ملنے کی

آفر کی۔ پہلی بار ہم ایک پارک میں ملے پھر ادھر ادھر ملتے

لگے۔ اس نے اپنے گھر لایا۔ میں چلی گئی۔ اس دن اس کے

گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس اکیلے پن کا فائدہ اٹھا کر اس نے

من مانی کر لی۔ میری یہ لغزش خطرناک ثابت ہوئی تب ابو

نے ایک راہ بتائی اور میں نے تمہیں اپنے گھر لایا۔ ابو نے

ڈرامے کو تکمیل تک پہنچا دیا۔

میں نے اس کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔

وقت گزرتا رہا۔

ایک دن میں ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک

عورت گود میں ایک شیرخوار بچے کو لیے کھڑی تھی۔

”میں ثمنینہ کی خالہ ہوں، سکھر سے آئی ہوں۔“ اس

نے تعارف کروایا۔ میں نے اسے اندر بلایا اور کمرے میں

بٹھایا۔ ثمنینہ نے خالہ سے سلام دعا کی۔ پھر خالہ کھڑی ہوئی

اور اس شیرخوار بچے کو ثمنینہ کی گود میں دے دیا۔

”لو بیٹی اپنی امانت۔“ خالہ نے کہا۔ تو میں حیرت

سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

”امانت..... کیا مطلب.....!“ میں نے پوچھا۔

”یہ ثمنینہ کی بچی ہے۔ اسی نے اسے جنم دیا ہے۔ اس

کے باپ ملک عبدالرحمن نے کہا تھا کہ جب تک اس کا نکاح

نہ ہو جائے تب تک بچی میرے پاس رہے گی۔ اب چونکہ

نکاح ہو چکا ہے لہذا میں اس کی امانت لوٹا رہی ہوں۔“ خالہ

نے کہا تو مجھ پر جگلیاں گر پڑیں۔

”اب یہ بچی کی کیا کہانی ہے؟“ میں نے غصے سے

ثمنینہ کو دیکھا۔

”دراصل میں نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی تھی۔

اس لغزش کے نتیجے میں میں حاملہ ہو گئی تھی۔ اس کے بعد

میری خالہ مجھے اپنے ساتھ سکھر لے گئیں۔ بچی کی پیدائش

تک میں وہیں رہی۔ بچی کی پیدائش کے بعد میں بچی کو خالہ

کے پاس چھوڑ کر کراچی آ گئی۔ بابا جان نے کہا کہ میری

شادی کے بعد وہ بچی لے لیں گے۔“ ثمنینہ بہت چلی گئی۔

”اودہ خدایا!“ میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆.....☆

آج مجھے گمنامی کی زندگی گزارتے کئی برس بیت چکے

ہیں۔ ثمنینہ سے میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ کیوں کہ اس نے

بتایا کہ بچی کی پیدائش کے وقت کوئی چھیدگی ہو گئی تھی جس کی

وجہ سے مجھ میں ماں بننے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ ثمنینہ بھی

موبائل کے ذریعے محبت کے جھانے میں آ کر اس مصیبت کا

شکار ہوئی اور میں بھی۔ آج کئی برس بیت گئے۔ میں نے سچ

میں کئی بار اپنے گھر والوں سے ملنے کی کوشش کی لیکن انہوں

نے مجھے دھتکار دیا۔ میری دنیا ٹال چکی تھی۔

میری نو جوان نسل سے گزارش ہے کہ موبائل فون پر

محبت نہ کریں۔ یہ بہت بڑا عفریت ہے۔

بدگمان

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

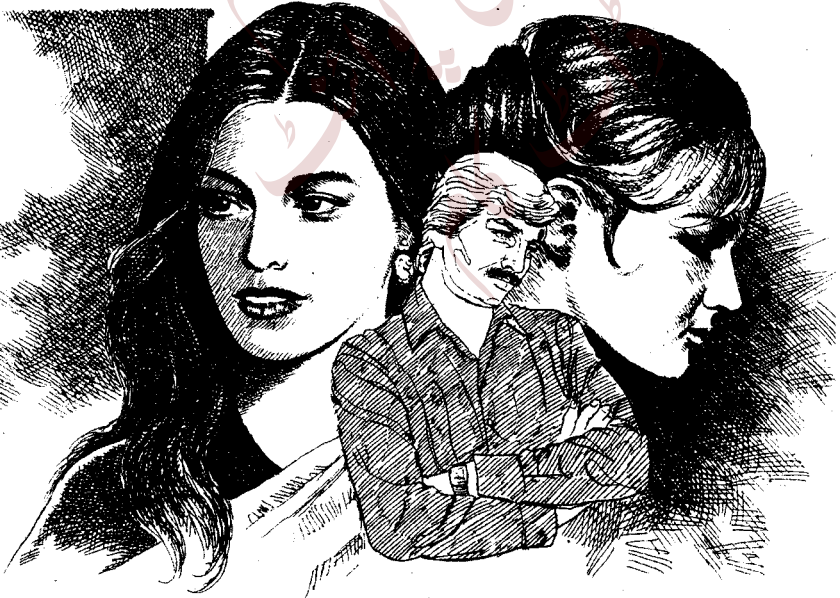
انسان کتنا کند ذہن ہے، کیسا شکی ہوتا ہے یہ ہر ایک کے علم میں ہو گا۔ ایسی باتیں وہ لوگ کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں جو خود بھی شکی مزاج ہوں۔ میں نے بھی اپنے ذہن میں شک کا ناگ پالا تھا جس نے مجھے بار بار ڈسا۔ میرے گھر کے ٹوٹنے کا سبب بن گیا تھا لیکن عین وقت پر اصل بات سامنے آگئی۔

وردہ خان

(کراچی)

ارسلان نے جب گلاس میں پانی لا کر میرے سامنے رکھا تو میں حیران رہ گئی۔ میں نے اس سے پانی نہیں مانگا تھا۔ پھر بھی اس نے جان لیا تھا کہ میں بازار سے واپس آئی ہوں تو مجھے پیاس لگی ہوئی۔ اسی لیے وہ پانی کا گلاس لے آیا تھا۔

مجھے اس کی یہ حرکت بہت اچھی لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بیٹھا لیا۔ ”بیٹے تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ مجھے پیاس لگی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔



”مما۔ جب میری مہادھوپ سے واپس آتی تھیں تا تو ان کو بھی پیاس لگتی تھی۔“ اس نے بتایا۔ میں نے اسے پیار کر لیا تھا۔

ارسلان میرا بیٹا نہیں تھا۔ یعنی اس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا۔ اس کی امی کا انتقال ہو چکا تھا۔

میں نہیں جان سکتی کہ اماں نے ارمغان سے میرا رشتہ کس طرح قبول کر لیا تھا۔ میں ان دنوں بی اے کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ کچھ دنوں تک خوب آرام کروں گی۔ دوستوں کے ساتھ سیر کروں گی۔ لیکن اماں نے رشتے کی خبر سنا دی اور وہ بھی کس سے ارمغان سے۔

ارمغان میرے ہی محلے کا تھا۔ اس کی ساکھ اچھی تھی۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ کسی اچھی پوسٹ پر تھا لیکن شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی ایک بیٹا تھا۔ ارسلان جو چھ یا سات سال کا ہو چکا تھا۔

میں یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ”اماں۔ کیا ہوا ہے تم کو؟ کس سے میرا رشتہ کروا رہی ہو۔ اس کا ایک بیٹا ہے اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اس سے شادی کر لوں؟“

”بیٹا ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ۔“ اماں نے کہا۔

”کیا ارمغان اچھا آدمی نہیں ہے؟ کیا شریف نہیں ہے۔ کیا پڑھا لکھا نہیں ہے؟ اب خدا کی مرضی تھی کہ اس کی بیوی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تو اس میں اس کا کیا قصور؟ رہا اس کا بیٹا ارسلان۔ تم خود جانتی ہو کہ وہ کتنا پیارا بچہ ہے۔ تم بھی اس سے پیار کر رہی ہو۔“

”اماں۔ اس سے پیار کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس کی ماں بن جاؤں۔“ میں نے کہا۔ ”اور ارمغان کو سوجھی کیا کہ اس نے ہمارے ہاں اپنا رشتہ بھیج دیا۔ کیا اس کو کوئی اور نہیں ملا تھا؟“

مختصر یہ کہ میرے لاکھ انکار کے باوجود ارمغان سے میرا رشتہ طے پا گیا۔ میں تھلا رہی تھی کہ اچانک ارمغان کا فون آ گیا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ”فائزہ۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت ضروری ہے؟“

”اب کیا ضرورت رہ گئی ہے؟“ میں تلخ ہو کر بولی۔

”آپ کا جو مقصد تھا وہ تو پورا ہونے والا ہے؟“

”نہیں۔ تم مجھے غلط مت سمجھو۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ بس ایک بار مجھ سے مل لو۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔ کہاں ملنا ہے؟“ اس نے ایک ریٹائرمنٹ کا نام بتا دیا۔ وہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ کئی بار اپنے دوستوں کے ساتھ جا چکی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں جا ہوں تو اماں کو بتا سکتی ہوں۔ اس کے بعد مجھے کوئی ایسا خدشہ نہیں تھا۔ میں نے اماں کو بھی بتا دیا۔ انہوں نے بھی کچھ سوچنے کے بعد اجازت دے دی تھی۔

میں وقت پر پہنچ گئی۔ ارمغان پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میری زندگی کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ میں کسی مرد سے ملنے نہیں آئی تھی۔ اور وہ بھی اس سے جس سے میرا رشتہ رہا تھا۔

ارمغان نے بہت مہذب انداز میں مجھے دیکھ کر کہا۔ پہلی بار میں انہیں قریب سے دیکھ رہی تھی۔ ویسے تو دور سے دیکھا ہی کرتی تھی۔

”اب یہ بتاؤ۔ کیا کھاؤ گی؟“ انہوں نے پوچھا۔ ”کچھ نہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”میں گھر سے کھا کر چلی ہوں۔“

”ظاہر ہے آٹنی تمہیں بھوک تو نہیں رکھتی ہوں گی۔“ ارمغان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا خود انہوں نے اپنی مرضی سے بہت سی چیزیں منگوا لی تھیں۔ کچھ دیر بعد میری جھجک ختم ہو گئی تھی۔ احساس ہوا کہ وہ بہت معقول انسان ہیں۔

”دیکھو۔ فائزہ۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں ہزار قسم کے ارمان ہوں گے۔ تم نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ تمہاری شادی کسی ایسے شخص سے ہو جس کی پہلے شادی ہو چکی ہو اور جس کی ایک اولاد بھی ہو۔ ایک غیر شادی شدہ لڑکی کے لیے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ہمت کر کے تمہارے گھر اپنا رشتہ بھجوا دیا اور آٹنی نے قبول بھی کر لیا۔ لیکن مسئلہ آٹنی کا نہیں تمہارا ہے۔ زندگی تمہیں گزاری ہے۔ اسی لیے میں نے تم کو بلوایا ہے۔ تاکہ تم سے مل کر بات ہو سکے۔ تمہارے دل میں کوئی خلش نہ رہے۔“

”ارمغان صاحب۔ آپ مجھے ایک معقول انسان لگے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”حالانکہ میرے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ ہے کہ میں ایسے شخص کو اپنا جیون ساتھی بنالوں کہ جو ایک بچے کا باپ ہے۔ لیکن شاید تقدیر اسی کا نام ہے۔“

”فائزہ۔ اس سلسلے میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔“
ارمغان نے کہا۔ ”ابھی بھی کچھ نہیں ہوا ہے۔ بات آگے
نہیں بڑھی ہے۔ تم چاہو تو انکار کر سکتی ہو۔ اور یہ تمہارا حق
ہے۔“

لیکن میں انکار نہیں کر سکی۔ ارمغان آج کل کے
ناپختہ ذہن کے نوجوانوں سے نہیں بہتر تھا۔ اس میں ایک
ایسا دھیمپا بن تھا جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ میں
نے گھر آکر اماں سے ہاں کہہ دی۔ اماں اسی دن سے
شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔
مختصر یہ کہ شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ اور ہماری
شادی بھی ہو گئی۔ میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔
بس اتنا ہوا کہ میں اپنے گھر سے اٹھ کر ارمغان کے گھر
آئی۔

ارمغان بہت اچھے انسان ثابت ہو رہے تھے۔
مہذب اور خیال کرنے والے۔ بہت خوبیاں تھیں ان
میں۔ ارمغان نے ابتدا میں مجھے قبول نہیں کیا تھا۔ میں سمجھتی
تھی کہ یہ ایک نیچرل سی بات ہے۔ کوئی بچہ یہ کیسے
برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی اور عورت اس کی ماں کی جگہ
آجائے۔ اسی لیے شروع شروع میں وہ مجھ سے اکھڑا
اکھڑا سا رہا۔ لیکن میں اس کو درگزر کرنی چلی گئی۔ بچہ ہی تو
تھا۔ میں نے اسے پیار دیا۔ توجہ دی۔ اس کا پورا پورا خیال
رکھا۔

ارمغان کو اس بات کا اعتراف تھا۔ وہ کہا کرتے
تھے کہ تم نے ارمغان سے ماں کی کمی دور کر دی ہے۔ میں
تمہارا احسان مند ہوں۔ میں ان سے کہا کرتی کہ میں جو
بھی کر رہی ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ دوسری طرف خود
ارمغان تھا۔ اس نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک فرماں
بردار قسم کا بچہ ہے۔

ایک دن عروسہ ہمارے گھر آ گئی۔ عروسہ ایک ایسی
لڑکی تھی جس نے زندگی میں بہت دشواریاں برداشت کی
تھیں۔ میں اس کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کی اماں
محلے کے بچوں کو ٹیوٹن پڑھایا کرتی تھی۔ وہ خود بھی کئی
بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ صورت شکل کی بہت پیاری سی
تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ میں نے اس کو ایک
آفر کر دی۔ ”عروسہ۔ کیا تم ارمغان کو ٹیوٹن دے سکتی
ہو؟“

”کیوں نہیں؟ آپ کہہ رہی ہیں تو ضرور دوں گی۔“

”تو پھر کل شام سے آ جایا کرو۔“ میں نے کہا۔
”وہ تنگ کرنے والا بچہ تو نہیں ہے نا؟“
”نہیں وہ بہت سمجھدار اور فرمانبردار قسم کا بچہ ہے۔“
میں نے بتایا۔ ”تم خود ہی دیکھ لو۔ میں اس گھر میں اس کی
ماں بن کر آئی ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مجھ سے اکھڑا
رہتا۔ اس کے برعکس وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔“
”ٹھیک ہے۔ میں کل سے آ جایا کروں گی۔“
عروسہ نے ارمغان کو پڑھانا شروع کر دیا۔ میں
نے جب ارمغان کو یہ بتایا کہ میں نے ارمغان کے لیے
ٹیوٹن کا بندوبست کر دیا ہے۔ تو وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔
”فائزہ۔ تم ارمغان کے لیے جو بھی کر رہی ہو۔ وہ تمہارا
احسان ہے۔“

”کیسی بات کر رہے ہیں۔ کیا وہ میرا بیٹا نہیں ہے؟“
عروسہ نے باقاعدگی سے آنا شروع کر دیا۔ ارمغان
سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ ارمغان بھی اس سے بہت
خوش تھا۔ اس کی تعریف کیا کرتا۔ کچھ دن گزر گئے۔ اس
کے بعد میں ارمغان کی طرف سے بے فکر ہو گئی۔ عروسہ کی
شکل میں اسے ایک اچھی ٹیوٹل لگی تھی۔
عروسہ آتی رہی اور ارمغان کی پروگریس اچھی ہوتی
چلی گئی۔ ایک دن ارمغان نے مجھ سے ایک عجیب بات
کی۔ ”مما۔ یہ بتائیں۔ کوئی دوسری دنیا سے واپس آ سکتا
ہے؟“

”نہیں بیٹے۔ جس کو اللہ میاں اپنے پاس بلا لیتے
ہیں وہ واپس نہیں آتا۔ وہیں رہتا ہے۔“
”اس کے پاس تو ایک اچھا سا گھر بھی ہوتا ہوگا؟“
”ہاں۔ بیٹا۔ بہت پیارا گھر ہوتا ہے۔“
”مما۔ کیا میں اپنی ماما کے گھر میں رہنے کے لیے
ان کے پاس جا سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”ارمغان۔ آئندہ سے ایسی بات مت کرنا۔ میں
بھی تمہاری ماما ہوں۔ اب تم میرے پاس ہو تو میرے ہی
پاس رہو گے۔“

اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔ نہ جانے کہا ہوا تھا اس کو۔
اس کے بعد اس نے پھر ایسی کوئی بات نہیں کی۔
پھر ایک دن میری ایک دوست مجھ سے ملنے گھر آ گئی۔ وہ
بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار میرے
گھر آئی تھی۔ میں نے جب اس سے شکایت کی تو اس نے
بتایا۔ ”یار کیا بتاؤں۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ اور آج بھی

ایک بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں۔“
”کون سی بات؟“

”یہ بتاؤ۔ ارمغان بھائی کا تمہارے ساتھ کیسا رویہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اب تک تو بہت اچھا ہے۔ بہت خیال رکھنے والے انسان ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا ہے؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

میں اس سے کرید کرید کر پوچھتی رہی۔ تب اس نے بتایا کہ اس نے ارمغان کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔ ایک بار ایک ہوٹل میں اور ایک بار ایک شاپنگ سینٹر میں۔ وہ اسے کپڑے دلوا رہے تھے اور کئی شووز بھی دلوائے۔ ارمغان چونکہ انم کو نہیں جانتے تھے۔ اسی لیے وہ اسے پہچان نہیں سکے۔ جبکہ انم ارمغان کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ میں ارمغان کی کئی تصویریں اسے بھیج چکی تھی۔ اس کے علاوہ شادی میں بھی اس نے ارمغان کو دیکھا تھا۔ ارمغان نے بھی اسے دیکھا ہوگا۔ لیکن وہ پہچان نہیں سکے تھے۔

انم کے جانے کے بعد میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی۔ میں نے کتنی محبت کی تھی اس شخص سے۔ کتنا ساتھ دیا تھا اس کا۔ انتہا تو یہ ہے کہ میں نے یہ جان لینے کے بعد بھی اس کو قبول کر لیا تھا کہ وہ شادی شدہ تھا۔ اور ایک بچے کا باپ تھا۔ ایک جوان اور کنواری لڑکی اس سے زیادہ اور کیا قربانی دے سکتی ہے۔

میں نے سوچا کہ میں ارمغان سے معلوم کروں۔ ان سے پوچھوں کہ مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے کہ انہوں نے کسی اور کے ساتھ گھومنا پھرنا شروع کر دیا ہے۔ کسی اور کے چکر میں آگئے ہیں۔ کیوں؟ شاید ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن ارمغان ایسے تو نہیں تھے۔

ارمغان شام کو واپس آئے تو میں نے ان سے بات نہیں کی۔ یعنی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ ویسے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ میرے لیے اب ارسلان کے معاملے سے ہمیں زیادہ اہمیت ارمغان کے معاملے کی تھی۔

ارمغان اور ارسلان آپس میں کھیلتے رہے۔ جبکہ میں کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ میرے ذہن میں ایک آندھی سی اٹھ رہی تھی۔ کیا تھا یہ سب۔ اگر انم کو

دھوکا نہیں ہوا تھا تو ارمغان ایسا کیوں کر رہے تھے۔
بہر حال کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ ارمغان کی وہی محبت تھی۔ ویسی ہی توجہ تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے مجھے کوئی شبہ ہوتا۔

پھر ایک دن ایک اور قیامت آگئی۔ انم مجھ سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اس نے شاید مجھ اور دیکھ لیا تھا۔ کوئی اور خبر لے کر آئی تھی۔ اس نے خون پر اشارہ تو دے دیا تھا۔ لیکن میں یہ نہیں جانتی تھی کہ معاملہ اتنا سیریس بھی ہو سکتا ہے۔

”فائزہ۔“ میں ایک بار پھر بتا رہی ہوں کہ اپنے شوہر کی طرف سے آنکھیں بند کر کے مت بیٹھ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ معاملہ بہت آگے جا چکا ہے۔“

”اب کیا نئی بات ہو گئی؟“
”تم تو جانتی ہو کہ میری زندگی شادی ہونے والی ہے۔ میں مارکیٹس کی خاک جھپٹتی پھر رہی ہوں۔ کل میں اپنی ساس کے ساتھ جو لڑی لینے گئی تھی کہ میں نے تمہارے ارمغان صاحب کو اسی لڑکی کے ساتھ دیکھا۔ وہ اسے اس کی پسند سے جو لڑی دلوا رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم ایک لاکھ کی جو لڑی دلوا دی ہوگی۔“

اب میں یا گل سی ہو گئی۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب۔ انم کی انفارمیشن غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ ارمغان ضرور ایسا کر رہے ہوں گے۔ اور مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا بھی کر سکتے ہوں گے۔

”میں نے تم کو خبردار کر دیا ہے۔“ انم نے کہا۔

اسی وقت دروازے کی کھٹکی بجی تھی۔ عروسہ کے آنے کا یہی وقت تھا۔ ارسلان دروازہ کھولنے چلا گیا تھا۔ میں انم کو کمرے میں لے آئی۔ جس وقت میں انم کو کمرے میں لے جا رہی تھی۔ اسی وقت عروسہ داخل ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ انم اس کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر جھنجھوڑ دیا۔ ”فائزہ۔ میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے کہا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی تھی۔

”فائزہ۔ یہی لڑکی تو ارمغان کے ساتھ ہوتی ہے؟“ اس نے بتایا۔ ”تمہارے ارمغان اسی کو تو شاپنگ کراتے ہیں۔“

میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ یہ عروسہ! ایسی ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ہمدردی کی تھی اور یہ میرے ہی گھر کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔

پھر انعم کا فون آگیا۔ ”جلدی آ جاؤ۔ میں جیولرزی شاپ پر ہوں اور تمہارے شوہر اور عروسہ آئے ہوئے ہیں۔“ اس نے مجھے جیولرزی دکان کا پتا بھی بتا دیا جو میرے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ گئی تھی۔ میں براہ راست دکان میں داخل نہیں ہوئی بلکہ ایک طرف کھڑی ہو کر دیکھتی رہی۔

انعم بھی دکان میں تھی۔ اور وہ دونوں بھی تھے۔ دکاندار انہیں جیولری دکھا رہا تھا۔ شاید اس نے ساری جیولری تیار کر لی تھی۔ اتنی دیر میں انعم دکان سے نکل کر میرے پاس آگئی۔ ”دیکھ لیا تم نے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے سچ پہچاننا تھا؟“
 ”ہاں۔ بالکل سچ۔ اب میں چلتی ہوں۔ مجھے جو دیکھنا تھا۔ وہ دیکھ چکی ہوں۔“
 ”اب کیا کرو گی؟“

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ تم سے بعد میں بات کروں گی۔“
 میں گھر واپس آگئی۔ بدن میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ارمغان کو کیا سمجھا تھا۔ اور وہ کیا نکلے اور وہ کتنی لڑکی عروسہ۔ اس نے میری ہمدردی اور توجہ کا کیسا غلط فائدہ اٹھایا تھا۔

میں نے سوچا کہ دوسرے دن جب وہ ارسلان کو پڑھانے آئے گی تو میں اس کی دھجیاں بکھیر دوں گی۔ پہلے اس مکار لڑکی کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس کے بعد ارمغان سے نمٹ لیتی۔ اس نے میری محبت کا یہ کیسا صلہ دیا تھا۔ اس رات میں نے ارمغان سے کوئی بات نہیں کی۔ سر درد کا بہانہ کر کے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ ایک دو بار ارمغان نے آواز بھی دی تو میں نے آنکھیں اس طرح بند رکھیں جیسے سو گئی ہوں۔

دوسری صبح بھی دیر سے بے دار ہوئی۔ ارمغان میرے جاگنے کے انتظار میں تھے۔ جبکہ ارسلان جا چکا تھا۔ اسے ارمغان نے اسکول کے لیے تیار کیا ہوگا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ارمغان نے تشویش سے پوچھا۔

”ہاں۔ ٹھیک ہوں۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔ ”مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ ارمغان نے کہا۔

میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ عروسہ کے علاوہ اور کیا

اودھنایا۔ ایک غریب گھر کی لڑکی جو جگہ جگہ ٹیوشن پڑھاتی پھر رہی تھی۔ اس کی ایسی حرکت۔ اور کمال یہ ہے کہ اس نے اور ارمغان نے شبہ بھی نہیں ہونے دیا کہ ان دونوں کے درمیان اتنی راہ رسم ہو چکی ہے کہ وہ اس کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔ اس کو شاپنگ کرا رہے ہیں۔ وہ بھی جیولرزی جیسا مہنگا آئیٹم۔

انسان کے کتنے چہرے ہوتے ہیں۔ کتنے بھید ہوتے ہیں۔ اوپر سے کچھ اور ہوتا ہے۔ اندر سے کچھ اور۔ اور یہ عروسہ، کتنی گہنی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی کسی بات سے ہوا بھی نہیں کٹنے دی تھی۔

”انعم۔ ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہی وہ لڑکی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میری آنکھیں اتنی کمزور نہیں ہیں کہ اسے پہچان نہ سکوں۔“ انعم نے کہا۔

”اب تم بتاؤ۔ کیا کروں میں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”سب سے پہلا کام یہ کرو کہ کسی بہانے اسے نچے کی ٹیوشن سے ہٹا دو“ انعم نے کہا۔ ”اس کے بعد تم خود اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ لو۔“
 ”کیسے دیکھ لوں؟“

”اس کا طریقہ یہ ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ سناں سے ساری گفتگو میرے سامنے ہوئی تھی۔ تمہارے شوہر نے آڈر بھی دیا تھا اور ایڈوانس پیسے بھی دے دیے تھے۔ تیرہ تاریخ کو سناں نے بلا یا ہے۔ تیرہ تاریخ پر سوں ہے۔ پرسوں میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“
 ”چلو ٹھیک ہے۔ لیکن میں ابھی اس سے کچھ نہیں کہہ رہی۔ پرسوں دیکھ لوں پھر کوئی بہانہ کر کے اسے ہٹا دوں گی۔ اس کے بعد ارمغان سے بات کروں گی۔ پورے ثبوت کے ساتھ۔“
 ”چلو ایسا کر لو۔“

اس دن میں نے انعم کو دوسرے دروازے سے گھر سے باہر نکال دیا تاکہ عروسہ اسے دیکھ نہ پائے ورنہ وہ کوئی کہانی بھی سناسکتی تھی۔ یا ارمغان کو خبردار کر دیتی۔

اس دن عروسہ نے بچے کو پڑھانے کے بعد مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس سے اکھڑی اکھڑی رہی تھی۔ ورنہ عام طور پر ہم دیر تک باتیں کرتے تھے۔ وہ چیراں سی بھی تھی۔ لیکن اب مجھے اس کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ اس سے نفرت سی ہو گئی تھی۔

بات ہو سکتی تھی۔ ارمغان نے پھر کہا۔ ”میں دفتر سے آکر تفصیل سے بات کروں گا۔“

”مجھے بھی تفصیل سے بات کرنی ہے۔“ میں روکے لمحے میں بولی۔ ”آپ دفتر سے واپس آجائیں۔ پھر بات ہوگی۔“

ارمغان مجھے ابھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ لیکن ارمغان سے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور بات ہوئی بھی تو اس کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔ گیارہ بجے کے قریب عروسہ اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی ماں اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ ایک اچھی عورت تھی۔ میں برسوں سے جانتی تھی۔ ایک ہی محلہ تھا۔ وہ چونکہ پہلی بار میرے گھر آئی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے اندر بلا کر بیٹھالیا۔

”بیٹی۔ میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آئی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”حالانکہ دل میں طرح طرح کے خیال آرہے ہیں کہ تم بتائیں کیا سمجھو۔ لیکن میں نے سوچا کہ تم سے چھپانا اچھا نہیں ہے۔ تم کو سب بتا دیا جائے۔“

”ہاں۔ بتائیں۔ کیا بات ہے؟ میں نے پوچھا۔ عروسہ اس دوران ایک طرف جا کر بیٹھ گئی تھی۔ ”بیٹا۔ کئی دنوں سے ایک غلط میرے ذہن میں تھی۔“ اس نے کہا۔ ”میری عروسہ کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ لڑکے والے شادی کی ضد کر رہے ہیں کہ جلدی ہو جائے۔ میں ایک غریب عورت ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے تاکہ دو چار جوڑے کپڑے اور تھوڑے سے زیورات اپنی عروسہ کو دے کر رخصت کر سکوں۔“

میں نے سوچا تھی چالاک عورت ہے۔ کہاں سے گھما پھر کر بات کر رہی ہے۔ اس دوران عروسہ بھی پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی ماں نے ایسی بات دو بار شروع کی۔ ”پھر یہ ہوا کہ مجھے کسی نے شہر کے ایک مخیر شخص کے بارے میں بتایا کہ ان کا کوئی ادارہ ہے۔ ایک درخواست دینی پڑتی ہے۔ پھر وہ اللہ کا بندہ خاموشی سے مدد کر دیتا ہے۔ میں اور عروسہ ایک دن اس آدمی کے پاس چلے گئے۔ اتفاق سے وہ آدمی تمہارے شوہر ارمغان کا دوست نکلا۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے تو ارمغان بھی وہیں موجود تھے۔ وہ ہم دونوں کو پہچان گئے۔ انہوں نے ہمیں الگ لے جا کر ہماری خیریت دریافت کی۔ میں نے بتا دیا کہ ہم اس لیے آئے ہیں۔

اس پر انہوں نے اپنے دوست سے کہا کہ اس بار تھوڑا سا ثواب ان کے حصے میں دے دو۔ اس کے بعد انہوں نے ہماری مدد کی۔ عروسہ کو اس کی پسند کے کپڑے اور جیولری دلوا دی۔ ہم ایک دو بار ان کے ساتھ ہی گئے تھے۔ خدا خوش رکھے۔ کیا آدمی ہیں تمہارے شوہر۔ ایسا فرشتہ اس دور میں کہاں ملتا ہے۔ تو آج ہم نے یہ سوچا کہ کیوں نہ تم کو بھی اس بات میں شامل کر لیں۔ دل پر ایک بوجھ تھا کہ اگر تم کو معلوم ہو گیا تو نہ جانے تم کیا سمجھو۔ کیا خیال کرو۔ اسی لیے ہم تمہارے پاس سب کچھ بتانے کے لیے آئے ہیں۔ جبکہ اس اللہ کے بندے نے کہا تھا کہ کسی کو کبھی خبر نہ ہو۔ ورنہ اس کی نیکی برباد ہو جائے گی۔ لیکن یہ ہمارا تو فرض بننا تھا نا۔ اسی لیے ہم آئے ہیں اور تم کو سچی بات بتا دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتی ہوں کہ جیسے بھی ہو۔ میں یہ قرض ادا کر دوں گی۔ ابھی ہم مجبور ہیں۔ لیکن تھوڑا تھوڑا کر کے یہ پیسے واپس کریں گے۔ میں نے ایک ایک پانی کا حساب رکھا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ عروسہ نے بھی اپنا سر جھکا رکھا تھا۔

مجھے ایسا لگا جیسے ایک دم سے اندھیرے دور ہو گئے ہوں۔ ارمغان کی عزت اور محبت میرے لیے اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ کانوں کی پرکھی نہیں جانا چاہیے۔ بلکہ آنکھوں کا دیکھا بھی غلط لگتا ہے۔ ہم سب دھند میں لپٹی ہوئی زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ جانے کون کس جال میں ہو۔ کیا اس کے ساتھ مجبوری ہو۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر مجبور شخص کسی اور کے پاس اپنی جوانی اور اپنے حسن کا سودا ہی کرنے گیا ہو۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ منافق کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بڑھا دے۔ یادگاری میں مبتلا ہو جائے۔

دو سال ہو گئے ہیں۔ عروسہ کی شادی ہو گئی ہے۔ اور میں نے ابھی تک ارمغان کو نہیں بتایا کہ میں اس راز سے واقف ہوں۔

اور ہاں معلوم ہے کہ خود مجھے اس نیکی کا کیا صلہ ملا ہے؟ وہ صلیب ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے خوش خبری سنائی ہے۔ اس کے علاوہ خود ارسالان اتنا فرماں بردار ثابت ہو رہا ہے کہ ہر دم دل سے دعائیں لگتی رہتی ہیں۔

ناگن

محترم مدیر

سلام شوق

عورت کو سمجھنا آسان نہیں اسی لیے اسے ناگن بھی کہتے ہیں۔
مثلاً مشہور ہے کہ عورت کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا مگر میں
کہوں گا کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ حوا کی بیٹیاں سبھی بری نہیں
ہوتیں۔ ہاں ایک دو فطرتاً غلط ہوتی ہیں، ایسی ہی ایک عورت میرے
دوست کی زندگی میں آئی تھی۔ اس نے کیسا کھیل کھیلا آپ بھی
ملاحظہ کر لیں۔

اختر شہاب

(کراچی)



لوگ کہانی پڑھتے ہیں، سنتے ہیں اور پھر بھول جاتے
ہیں۔ لیکن میں جو کہانی سنانے جا رہا ہوں یہ ایک ایسی کہانی
ہے جسے میں بھولنا بھی چاہوں تو بھول نہیں سکتا۔ اسی لیے میں
چاہتا ہوں کہ اسے آپ بھی سن لیں پھر انصاف سے بتائیں کہ
کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ شاید آپ بھی اسے سن کر کبھی بھول
نہیں پائیں گے، تو جناب چلیے چلتے ہیں اس کہانی کی طرف
جس کا آغاز بھوک سے ہوتا ہے۔

جی ہاں وہ کل سے بھوکا تھا۔ بھوک اگرچہ بڑے بڑوں

ایک دفعہ تب، جب وہ اپنے دوست کے گھر بڑھنے گیا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ کر ہوم ورک کر رہا تھا کہ دوپہر کا ایک بچہ گیا۔

”یار کھانا کھانے کا پروگرام ہے یا بھوکا ہی رہتا پڑے گا؟“ اس نے اپنے دوست سے پوچھا۔ اس زمانے میں بھوک بھی شدت سے لگتی تھی۔

”ہاں! ہاں۔“ اس کا دوست بولا۔ ”میں دیکھتا ہوں۔“ وہ اندر چلا گیا۔ ”سوری بھئی!“ تھوڑی دیر بعد اس کا دوست واپس آ کر بولا۔ ”بادرہجی خانے میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے حالانکہ والدہ کو پتا بھی تھا مگر وہ پتا نہیں پکا کر کیوں نہیں گئیں؟“

”بھائی دیکھ کچھ تو ہوگا۔“

”میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟“ اس کا دوست بڑ گیا۔ ”چل خود چل کے دیکھ لے۔“

دونوں نے اندر جا کر تلاشی لی تو کل کی بچی ہوئی آدمی روٹی دستیاب ہوئی۔ ”چلو اسے آدھا آدھا کھاتے ہیں۔ کچھ تو آسرا ہو۔“ وہ بولا مگر اس سے بھوک بجائے کم ہونے کے دو آتشہ ہو گئی۔

”چلو یا کچھ ایکسپس سائز کرتے ہیں۔ اس سے بھوک کم ہوگی۔“ دوست نے مشورہ دیا۔

ان بے وقوفوں کو کیا علم تھا کہ اس سے کھایا پیا اور ہضم ہو جائے گا اور بھوک کی شدت بھی بڑھ جائے گی۔

”اچھا چل یار! میرے گھر چلتے ہیں۔ وہاں کھانا کھا نہیں گئے۔“

”نہیں تم بیٹھو۔ میں کھانے کا انتظام کر کے ابھی آتا ہوں۔“ دوست نے کہا۔

اور وہ ایک پلیٹ ہاتھ میں لے کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں پلیٹ، پلاؤ سے بھری ہوئی تھی۔ دونوں نے خوب مزے سے پلاؤ ڈاڑیا اور آخری دانے تک صاف کر ڈالا۔

”یہ تو بتاتا کھانا کہاں سے لے آیا؟ کیا پڑوس سے؟“ کھانا کھانے کے بعد اس نے پانی پیتے ہوئے پوچھا۔

”بس یہی سمجھ لے۔“

”کیا مطلب؟“

”مجھے کھانے سے مطلب ہے یا پوچھنے سے؟“ وہ بولا۔ ”تیرا پیٹ تو بھر گیا؟“

”مگر بتا تو سہی یہ کھانا آیا کہاں سے؟“

کے حوصلے سلب کر لیتی ہے، شعور کو مات دے دیتی ہے، عقل پر غلبہ آ جاتی ہے اور آدمی گناہ و ثواب کی تمیز کو بیٹھتا ہے مگر اس نے ابھی تک شعور کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ گونا گویا پیٹ تین گلاس پانی پینے کی وجہ سے اس کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا اور وہ کمزوری کی وجہ سے چلنے میں مشکل محسوس کر رہا تھا مگر ابھی تک اس کا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا کہ وہ بھیک مانگے۔ ہاں، البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ کھانے کا انتظام کیسے ہو؟

”کیا کسی شادی ہال میں جایا جائے؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

مگر قیاحت یہ تھی کہ اوّل تو شادی ہال میں کھانا رات کو ملتا اور اس وقت تک اس سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ تین دن سے بڑھی ہوئی شیوا اور صلے ہوئے کپڑوں میں اگر وہ شادی ہال جاتا تو فوراً این پلائے مہمان کی حیثیت سے پہچان لیا جاتا لہذا اس صورت میں ہونے والی بے عزتی اسے منظور نہ تھی۔ ”بہتر یہی ہے کہ میں کوئی مزدوری تلاش کروں۔“ اس نے سوچا مگر مزدوری کے سلسلے میں کل کا تجربہ اس کا حوصلہ پست کر رہا تھا جب وہ کئی جگہ سے فقیر سمجھ کر دھنگارا گیا تھا اور کسی جگہ بغیر ضامن کے ملازمت بھی نہیں مل سکتی تھی اور جہاں اس کی ملازمت کا چانس تھا وہاں اس کا ہنرمند نہ ہونا آگے آیا تھا۔

”تو کیا میں اپنی خودداری اور اتانا لائے طاق رکھتے ہوئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں؟“ تنگ آ کر اس نے سوچا۔

مگر اس میں بھی مصیبت یہ تھی کہ اوّل تو کسی کے آگے اس کا ہاتھ ہی نہ اٹھتا اور دوسرے اس برے حال میں بھی اس کے چہرے پر فقر و دلی پشیمانی کے بجائے شرافت موجود تھی لہذا وہ بھیک مانگنے میں بھی ناکام ہی رہتا۔

”اچھا چلو کوئی چیز ہی چرا کر بیچ دیتے ہیں یا پھر کچرے سے ہی نکال کر کچھ کھاتے ہیں۔“ اس نے سوچا لیکن پھر خود کو لغت ملامت کرنے لگا۔

”مراودان یہ تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ لعنت ہے تجھ پر کسی گھٹیا باتیں سوچ رہا ہے۔ کیا باپ دادا کے نام کو بھل گائے گا۔ تیری عقل، تیری ذہانت کہاں مر گئی؟ کچھ لڑکپن کی شرارتیں یاد کرو اور باعزت کھانا کھانے کی کوئی ترکیب سوچ لڑکپن کی شرارتوں کے نام پر اسے دو قصے یاد آ گئے تھے۔ جب اس نے مانگا ہوا کھانا کھایا تھا۔“

”ماگ کے لایا ہوں۔“

”کس سے؟“

”ایک فقیر سے۔“

”کیسی؟“

”یعنی میں نے اسے کہا۔ تم! روز ہم سے ماگ کر لے جاتے ہو، آج نکالو تمہارے پاس کیا ہے؟ اس کے پاس پلاؤ کے علاوہ دوسری چیزیں بھی تھیں، پلاؤ میں لے آیا۔“

”کم بخت!“ وہ اسے مارنے کو دوڑا۔ ”مجھے خیرات کھلاؤ۔“ وہ بولا۔

”تو کیا ہوا میں نے جی تو کھایا ہے۔“

”مگر تھا بڑے مزیدار۔“ دونوں ہنسنے لگے۔

”بچو! آؤ میں تمہیں کھانا کھلا دوں۔“ اس کے دوست کی بیڑوں اندر آتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری امی مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی لہذا میں تمہیں کھانا کھلا دوں مگر میں بھول گئی۔ اب یاد آیا تو دوڑی چلی آئی۔“

”مگر ماسی! کھانا تو ہم نے کھالیا۔“

”کہاں سے؟“

وہ دونوں اسے بتانے کے بجائے زور زور سے ہنسنے لگے۔ دوسری دفعہ اس کی کالج کے دوستوں سے شرط لگ گئی کہ اگر وہ ماگ کر کھانا کھائے تو دوست اسے باری باری قلم دکھائیں گے لہذا کالج سے واپسی پر وہ ایک گھر کے سامنے رک گئے۔ ”لو بھئی! اس گھر سے کھانا ماگ کر دکھاؤ۔“

”اچھا تم لوگ یہاں سے دور چلے جاؤ!“ اس نے دوستوں سے کہا اور جب وہ لوگ کافی دور چلے گئے تو اس نے دروازے پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔

”مجھے آپ کے گھر کھانا کھانا ہے۔“ وہ سیدھا مطلب پر آ گیا۔

”جی؟“ وہ لڑکی حیران ہو گئی۔

”جی ہاں! میں آپ کے ہاں کھانا کھانا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ لڑکی بولی۔ ”آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور ہمارے گھر کھانا کیوں کھانا چاہتے ہیں؟“

”کیا بات ہے؟ کون ہے دروازے پر؟“ پیچھے سے اس کی ماں نے پوچھا۔

”ای پتا نہیں کون ہے؟ کہتا ہے تمہارے گھر کھانا، کھانا ہے۔ پر فقروں جیسا لگتا تو نہیں۔“

”کیا بات ہے بھئی!“ اس کی ماں دروازے پر آ گئی۔

”بات یہ ہے خالہ!“ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولا۔ ”میں اپنے ماں باپ کا کھانا ہوں۔ مجھ سے پہلے بھائی بہن پیدا ہوئے ہی مر جاتے تھے۔ میرے پیدا ہونے سے میری ماں کو ایک فقیر نے کھانا اگر تو بیس سال تک اپنے بچے کی ہر سالگرہ پر ماگ کر کھانا کھلائے گی تو وہ بچ جائے گا لہذا آج میری سالگرہ ہے اور مجھے ماگ کر کھانا کھانا ضروری ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں اگلے سال بھی زندہ رہوں تو مجھے کھانا کھلا دیں۔“

”وہ رک کر اس عورت کا چہرہ دیکھنے لگا پھر اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ دن میرے لیے بڑی تکلیف کا ہوتا ہے لیکن خیرات بھی کسی انجان گھر سے مانگنا ضروری ہے۔ ہر دفعہ جی چاہتا ہے کہ بس مر جاؤں۔ ایسا نہ کروں مگر پھر اپنے ماں باپ کا خیال آ جاتا ہے۔“

”آ جا! آ جا! اندر آ جا بیٹا!“ اس کی ماں نے کہا۔ ”میں تجھے کھانا ضرور کھلاؤں گی۔“

”میں اندر نہیں آ سکتا۔“ وہ بولا۔ ”اس میں یہ شرط بھی ہے کہ میں کھانا یا ہریٹھ کر کھاؤں۔“ تاکہ دوستوں کو بھی نظر آ جائے۔ اس نے سوچا۔

سو اس نے گھر کے باہر کرسی پر بیٹھ کر بڑے مزے سے مزیدار کھانا تناول کیا اور شرط جیت گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنی والدہ کے ہمراہ خریداری کرنے بازار آیا ہوا تھا، جہاں اس عورت سے اس کی ماں کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت تو اس کی ماں نے اس کی عزت رکھ لی مگر بعد میں وہ دھتائی ہوئی کہ وہ کافی دن اپنی چوٹیں سہلاتا رہا۔

”اب ایسی ہی کوئی ترکیب ذہن میں کیوں نہیں آ رہی؟“ اس نے سوچا۔ ”شاید اس لیے وہ دور اور تھا۔ اس میں عزت، بے عزتی کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا۔ شرارتوں پر طبیعت خود بھی مائل رہا کرتی تھی مگر اب معمولی بات بھی بری لگتی ہے۔“

چلتے چلتے وہ ایک گلی میں مڑا اس میں شامیانہ لگا ہوا تھا۔ ”شاید کوئی تقریب ہے۔“ اس نے سوچا۔ وہ اس گلی سے واپس مڑ جانا چاہتا تھا، اسے لوگوں کی خوشیوں سے نفرت تھی۔ ”جب میں ہی خوش نہیں تو دنیا کو خوش رہنے کا کیا حق ہے؟“ اس نے سوچا اس کا جی چاہا کہ شامیانے میں آگ لگا دے مگر وہ ایسا کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی شرافت اس کی کمزوری تھی۔

”میں اتنا تو کر سکتا ہوں کہ دنیا کی خوشیوں سے دور رہوں۔ ان میں شامل نہ ہوں۔ ان کے بارے میں نہ سوچوں۔“ وہ بھی سوچ رہا تھا کیونکہ ان تقاریب کو دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آ جاتا تھا۔

☆.....☆

شادی پر اصرار تو اس کی ماں نے اس کی نوکری لکتے ہی شروع کر دیا تھا کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بھائیوں کی طرح اس کی بھی جلد شادی ہو جائے مگر وہ چاہتا تھا کہ کچھ رقم پس انداز کر لے تاکہ کچھ دن تو سکون سے گزر جائیں مگر ماں کے اصرار سے مجبور ہو کر اس نے شادی کے لیے ہاں کر دی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی ماں کے بعد بھی شادی میں دو تین سال تو لگ ہی جائیں گے کیونکہ اس کے دو بھائیوں اور ایک بہن کی شادی بھی اسی طرح ہوئی کہ رشتے دیکھے اور مسز ذکر دیئے پھر کہیں جا کر بڑی مشکل سے لڑکا لڑکی پسند آئے تو شادی ہوئی۔

اس نے سوچا تھا کہ پہلے تو ایک شخص کو لڑکی پسند کرنا ہوتی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ چار چار خواتین ہیں لہذا اتفاق رائے بڑی مشکل سے ہوگا اور اسے سنجیدگی سے لے لے دو تین سال مل جائیں گے مگر حیرت انگیز طور پر ان لوگوں کو پہلی ہی لڑکی اس قدر پسند آئی تھی کہ فوراً ہی منگنی کر ڈالی گئی اور منگنی ہوتے ہی لڑکی والوں کے ہزار اصرار پر انہیں جلد شادی کرنا پڑی تھی اور یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق چھ ماہ کے اندر ہی وہ شادی شدہ ہو گیا تھا۔

کیونکہ اس بات پر اسے شدت سے یقین تھا کہ جہاں نصیب ہو شادی وہیں ہوتی ہے لہذا نہ تو خود اس نے لڑکی کو دیکھا تھا بلکہ اگر گھر والوں نے نو فو وغیرہ کے ذریعے اسے دکھانے کی کوشش بھی کی تو انہیں منع کر دیا۔ وہ اس سسپنس کو سہاگ رات تک برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

سہاگ رات کو گھونگٹ اٹھاتے ہی اسے احساس ہوا اس کی بیوی اس کے گھر والوں کے بیان سے زیادہ حسین ہے۔ شادی کے دو تین ماہ میں ہی اس کے طور طریقوں، محبت اور گھڑاپے نے اس کے گھر والوں کو تو گرویدہ کیا ہی تھا مگر اسے تو جیسے دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ جیسے اس کی بیوی کی محبت میں بناوٹ ہے۔ خلوص میں کچھ کمی ہے مگر وہ اسے وہم سمجھ کر اس احساس کو جھٹک دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ حد سے زیادہ محبت بھی شکوک و شبہات کو ختم دیتی ہے شاید اسی لیے ایسا خیال اس کے ذہن میں آتا ہے۔

ساری خرابی تو اس دن سے شروع ہوئی تھی جس دن وہ کسی کام سے بازار جا رہا تھا۔ ایک لڑکے نے اس کا رستہ روک لیا۔ ”وتمہیں استاد نے بلایا ہے۔“ وہ بولا۔

”کون استاد؟“

”جیلے چلو! تمہیں خود ہی پتا لگ جائے گا۔“

”مجھے نہیں جانا۔“ وہ بولا۔ ”میرا کسی استاد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”جانا تو تمہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”ایسے نہیں تو ایسے سہی۔ اس نے قیص اٹھا کر شلوار میں اڑسا ہوار پوا اور دکھایا۔

”چلو!“ اس کو دیکھتے ہی وہ نرم پڑ گیا تھا۔

”سارے راستے وہ اپنے اس اچانک بلاوے کی وجہ سوچتا رہا مگر اسے دور دور تک اپنا کوئی تصور یا کسی اشارے سے اپنا تعلق یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت تو اسے بڑی حیرانی ہوئی جب وہ اسے اس کی سرسبز کے محلے کی طرف لے چلا۔

”شاید میرے سالوں کا کوئی مسئلہ ہو؟“ اس نے سوچا۔

”استاد بندہ آ گیا ہے۔“ اس کے ساتھ آنے والے نوجوان نے آواز لگائی۔

”آؤ مسٹر مراد خاں۔“

آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تو اسے تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ استاد کوئی ادیب، عمر خراٹ، سا شخص ہوگا مگر اس کے سامنے بچپن سے تیس سال کا خوش شکل آدمی موجود تھا۔ ”مجھے سودا چکری کہتے ہیں۔“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”اس طرح مجھے بلانے کا مقصد؟“ اس نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔

”میں تو چاہتا تھا۔ تم سے شریف آدمیوں کی طرح بات کروں۔“ وہ اپنے ہاتھ نظر انداز کرنے پر بخیر مذاق اٹھا۔ ”مگر تم ایسا چاہتے ہو تو ایسا ہی کیا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”بات دراصل یہ ہے۔“ وہ پھر بولا۔ ”کہ مراد خاں تمہاری مرادوں بھرے دن گزر گئے اور تم مرادی کے دن شروع ہو گئے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہو کر بولا۔

”مطلب یہ کہ میں چاہتا ہوں۔۔۔ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔“

”کیا؟“ وہ اس اچانک دھچکے کے لیے تیار نہ تھا۔

”مگر کیوں؟“ وہ اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولا۔

”اس لئے کہ یہ میں چاہتا ہوں۔“

”تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟“ اسے غصہ

آ رہا تھا۔

”ہا ہا ہا“ وہ ہنسا اور مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ ”بتاؤ اوئے اسے اب یہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اوئے وہی ہوتا ہے جو میں چاہتا ہوں اور کچھ نہیں ہوتا۔“

”مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔“ وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔
”یہ تو تمہیں پتا لگ جائے گا کہ کیا ہوگا؟“ وہ بولا۔ ”مگر میں تمہیں تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔ اس عرصے میں سوچ کر طلاق دے دو ورنہ۔“ وہ خاموش ہو گیا۔
”اور سنو!“ وہ وہاں سے چلنے لگا تو مودا بولا۔ ”یہ وقت صرف تمہیں فیصلہ کرنے کے لیے دے رہا ہوں، کوئی چکر چلانے کو نہیں ورنہ میرا نام بھی مودا چکری ہے اور بڑے بڑوں کو چکر دے دیتا ہوں۔ پر بتاؤ میرے ساتھ ہی چکر ہو گیا۔ واہ بھی واہ۔“ وہ آخر میں جیسے خود کلائی کرنے لگا۔

وہاں سے واپسی پر اس نے سارا معاملہ اپنے گھر والوں کے سامنے رکھا تو وہ بھی فکر مند ہو گئے اور انہوں نے اپنی واقعیت کے تار ہلانے تو علم ہوا کہ مودا چکری سیاست دانوں کا چہیتا بد معاش ہے لہذا اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی مشکل ہے۔ اس کے صرف دو ہی حل ہیں یا تو اسے مار دیا جائے یا خود بھاگ لیا جائے۔ اسے مارنا تو دیسے بھی جو حکم کا کام نظر آ رہا تھا اور بھاگنے کی کوشش بہت مشکل تھی کیونکہ ہر وقت دو آدمی ان کے گھر کی نگرانی پر مامور تھے۔

اس معاملے کی جب مزید کرید کی گئی تو انہیں علم ہوا کہ اس کی شادی سے پہلے ہی مودے کی اس کی بیوی پر نظر تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر جب اسے ایک نسل کے سلسلے میں روپوش ہونا پڑا تو اس کے سرال والوں نے موقع غنیمت جان کر لڑکی کی فوراً شادی کر دی اور یہاں جیسے ہی پھر حکومت بدلی اور نیا وزیر اعلیٰ آیا تو مودا چکری بڑی شان سے واپس آ گیا۔ ویسے اڑنی اڑنی یہ خبر بھی سننے میں آئی تھی کہ اس کی بیوی بھی خود مودے کی طرف ملتفت تھی مگر اس نے اسے انواہ سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ کیونکہ پچھلے تین ماہ میں اپنی بیوی کے ردیے سے وہ پوری طرح مطمئن تھا۔

ان تین دنوں میں گھر کا ماحول برا بیٹھ گیا تھا۔ اس کے گھر والے متشکر اور اُدھر رابطے کرتے رہے کسی طرح یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ اس کی بیوی شرمندہ خوفزدہ اور نظریں جھکائے پھرتی رہی۔ یہ نہیں تھا کہ ان کے درمیان اس مسئلے پر بات ہی نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ اس نے پہلے ہی دن اپنی بیوی سے پوچھا تھا۔

”یہ کیا چکر ہے؟“

”وہ مکینہ مجھے آتے جاتے روکتا تھا اور مجھ سے شادی کرنے کو کہتا تھا۔ میں تو کبھی گئی کہ اس سے میری جان چھوٹ گئی مگر!“ وہ رونے لگی۔

”تم فکر نہ کرو ابھی میں جو ہوں۔“

”آپ کیا کریں گے مجھے طلاق دے دیں گے۔“
”میں کسی قیمت پر تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ ہاں اگر تم خود چاہو تو۔“

”میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی۔“ اس کی بیوی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تو پھر ایسا ہرگز نہیں ہوگا چاہے وہ مجھے جان سے ہی کیوں نہ مار ڈالے۔“

”میرے لیے اپنی جان سے نہ جانا۔ تمہیں مجھ جیسی اور مل جائیں گی۔“

”مجھے بزدلی کا درس مت دو۔“ وہ اس کی بات پر چڑ گیا۔

پھر اس معاملے پر ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ تیسرے دن وہ گھر والوں کے روکنے کے باوجود گھر سے نکلا تھا اور گھر والوں کو کہیں اور کا کہہ کر سیدھے مودی چکرے کے اڈے پر جا پہنچا تھا۔

”آؤ بھئی نامراد خان!“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ”لگتا ہے تم نے فیصلہ کر لیا ہے جو اتنی جلدی آ گئے ہو ورنہ تمہارے پاس شام تک کی مہلت تھی۔“

”ہاں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں طلاق نہیں دوں گا۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا۔“

”اب آ ہی گئے ہو تو پھر واپس جانا بھول جاؤ۔“ وہ بولا۔ ”مودا چکری زیادہ وقت نہیں دیا کرتا۔“

”اوئے پاندھ لو اسے۔“ وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔

اس کے ساتھیوں نے اس کی مزاحمت کے باوجود اسے پاندھ لیا۔

”سنو!“ مودا بولا۔ ”میں تمہیں سیدھے سادے قتل بھی کر سکتا تھا بلکہ تمہیں ایسا عتاب کرتا کہ دنیا تمہیں ڈھونڈتی رہتی مگر میرے پاس سفارش آئی ہے تمہیں جان سے نہیں مارنا اس لیے تم زندہ ہو ورنہ تمہاری بیوہ سے شادی کرنا کیا مشکل ہوتا؟ چلو اب اچھے بچوں کی طرح بیوی کو طلاق دے دو اور گھر جاؤ۔“ وہ بولا۔

”تم جو مرضی کرو میں طلاق نہیں دوں گا۔“

”استاد!“ ان میں سے ایک بولا ”طلاق کی کیا ضرورت ہے ہم لڑکی کو بھی اٹھوا لیتے ہیں۔“

”لو کو پٹھا!“ مودے نے اسے پھینک دیا۔ ”میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آخر شرع بھی کوئی چیز ہے؟ چلو جلدی سے اس سے طلاق کے الفاظ نکلواؤ۔“

شام تک وہ اس پر تشدد کرتے کرتے تھک گئے۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ زخمی تھا۔ ناک سے نکسیر بہہ رہی تھی۔ سر پر لگنے والی ضربوں نے اس کے حواس کو ڈگمگا دیا تھا۔ پہلی میں شدید درد تھا۔ شاید ٹوٹ گئی تھی۔ ٹانگیں تو اس کی اپنی نہیں رہی تھیں مگر وہ پھر بھی طلاق دینے پر راضی نہ تھا۔ اس نے سوچا تھا ”مر جائے مگر طلاق نہیں دے گا۔“

شام کو مودا اس کے پاس آیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اے چھوڑ دو یہ طلاق نہیں دے گا۔ اس کی بہن کو اٹھا لاؤ اور جب تک یہ طلاق نہ دے تم موج کرو۔ طلاق دے دے تو اس کی بہن کو واپس کر دیتا۔“

”نہیں۔“ وہ چیخا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، کون ہے ہمیں روکنے والا۔“

مودا بولا اور اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔ ”تم لوگ ابھی تک یہیں کھڑے ہو، جاتے کیوں نہیں؟“

”فہمرو۔“ وہ بولا۔ ”میں اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔“ اور چکر اکر گر پڑا۔ بے ہوش ہوتے وقت اسے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ لوگ اس سے کسی کاغذ پر دستخط کر رہے ہوں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے سالوں بعد ہوش آیا ہو اور یہ صحیح تھا کیونکہ مار پیٹ اور طلاق کے صدمے نے اس کے ہوش کو اس جھین لپے تھے اور اس کے گھر والے دو سال تک اس کا علاج کرواتے رہے تھے۔ تب جا کر وہ صحیح الدماغ ہوا تھا۔

بالکل صحیح ہونے پر اسے تمام واقعات پتا چلتے تھے، مودے کے آدمی اسے طلاق نانے کی فوٹو کاپی کے ساتھ اس کے گھر چھوڑ گئے تھے اور اس کے واپس آنے کے دوسرے دن اس کی بیوی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ وہ خود چلی گئی تھی مگر وہ سمجھتا تھا کہ اس کے گھر والوں نے ہی نفرت سے اسے نکال دیا ہوگا۔

بہر حال عدت گزارنے کے بعد مودے نے اس سے شادی کر لی تھی۔ سال بھر وہ وہاں رہے مگر بعد میں مودے کی اس سیاسی پارٹی سے اختلافات ہو گئے اور مودا اپنی بیوی سمیت وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ غائب

ہونے سے پہلے مودے کے گھر پر فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا جس میں شاید مودا بھی زخمی ہو گیا تھا۔

”میں اس حرام زادے کو اس کے کیے کا بدلہ ضرور دوں گا۔“ اس نے سوچا۔ ”اور وہ قتل سے کم نہ ہوگا۔“

غصے اور نفرت کے جذبات کے نہ جانے کس لمحے میں اس نے اپنے عزم کا اظہار اپنے گھر والوں سے بھی کر دیا تھا۔ لہذا وہ لوگ محتاط ہو گئے تھے اور اس کی نگرانی کرنے لگے تھے مگر وہ بھی اپنے عزم کا پکا تھا اور اس نے مودے کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اس تلاش میں اسے علم ہوا کہ مودا کراچی میں نظر آیا ہے لہذا وہ اپنے گھر والوں کو جھانساندے کر کراچی آ گیا مگر یہاں آنے کے دوسرے دن ہی اس کی جیب کٹ گئی۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس نے ہوش کا ہفتے بھر کا کرایہ ایڈوانس دے دیا تھا ورنہ آج وہ بھوکا ہونے کے ساتھ ساتھ بے گھر بھی ہوتا حالانکہ اس کا بی چاہ رہا تھا کہ وہ گھر والوں سے پیسے منگا لے مگر وہ یہ جانتا تھا کہ انہیں جیسے ہی اس کے ٹھکانے کا علم ہوگا وہ اسے واپس لینے آ جائیں گے لہذا وہ خود ہی گزراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اپنے خیالات میں کم وہاں سے پلٹ جانا چاہتا تھا کہ آہ و بکا کی آوازیں اسے ہوش میں لے آئیں اور وہ پلٹ پر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے مرکز دیکھا کہ شامیانے سے چند افراد کندھوں پر جتناڑ اٹھائے نکل رہے ہیں۔

”کھانا۔“ اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ آیا۔ ”کھانا کھانے کا یہی باعزت ایک طریقہ ہے۔ اس نے سوچا۔ کہ وہ مرحوم کا دوست سامی یارشتے دار کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اور مرحوم کو دفنانے کے بعد کھانا تو ہوتا ہے لہذا اس کا حصہ بھی بن جائے گا۔ اس نے فوراً جنازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اسے چہرے پر سوگواری یا حزن و دہلی کی کیفیت طاری کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی کیونکہ شکل سے وہ فائدہ زدہ کم اور غم زدہ زیادہ نظر آ رہا تھا۔

جنازے میں بشکل چچیس افراد تھے۔ سوگواریوں کے قافلے میں وہ بھی شامل ہو گیا۔ ”لاؤ جنازے کو کندھا ہی دے دوں۔“ اس نے سوچا۔ ”کھانا کھانا ہے مردوری کر کے اسے حلال تو کروں۔“

وہ آگے بڑھا اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے جنازے کی چارپائی کا ایک پایا اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ یا تو مرحوم بہت بھاری تھا یا اسے کمزوری کی وجہ سے وزن زیادہ لگ

رہا تھا۔ ”خیر کوئی بات نہیں۔“ اس نے سوچا۔ ”ابھی کوئی اور کندھاٹا نے آجائے گا۔“ مگر جب کافی دیر ہو گئی اور کوئی اس کا بوجھ ہلکا کرنے نہیں آیا تو اسے کمزوری کی وجہ سے اس کا وزن اٹھانا مشکل تر ہوتا گیا۔ اس کا پیچھا کرنا اس جنازے کو پیچھے رکھوائے اور لوگوں سے پوچھے۔ ”کیا اس بکثرت کو میں نے مارا ہے۔“ مگر وہ حوصلہ کر کے قدم بڑھاتا گیا۔ قبل اس کے کہ اس کے قدم لڑکھڑاتے اور وہ گر پڑا ایک صاحب نے آگے بڑھ کر اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

”میری توبہ۔“ اس نے سوچا۔ ”جواب اسے دوبارہ کندھا دوں۔“

جنازے کے ساتھ مسجد میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھا وضو خانے چلا گیا۔ اس کی ہموک بڑھ گئی تھی چنانچہ وضو کے بعد اس نے اتنا پانی پیا جس سے ہموک کا احساس کافی کم ہو گیا۔

امام صاحب نے نماز عصر کے بعد نماز جنازہ پڑھائی مگر اس سے پہلے انہوں نے اعلان کیا نماز عصر کے بعد نماز جنازہ ہوگی اور ایک نکاح بھی پڑھایا جائے گا لہذا نمازیوں سے درخواست ہے دونوں میں شرکت کریں بلکہ جو لوگ نکاح کے لیے رکتنا چاہیں رک جائیں اور جو لوگ جنازے کے ساتھ جانا چاہیں وہ جائیں۔ دونوں ہی ثواب کے کام ہیں۔

”اللہ مغفرت کرے مرحوم بھی عجب فساد کی شخص تھا۔ مرنے کے بعد بھی لوگوں کی زندگی میں بدشگونی کرنے سے باز نہ رہا۔“ اس نے سوچا۔ ”اب جس کا نکاح پڑھایا جائے گا اس کی ازدواجی زندگی اگر خوشوار نہ گزری تو وہ یہ ضرور کہے گا کہ پہلے ہی بدشگونی ہو گئی تھی۔ ہم خوش کیسے رہتے ہو سکتے ہیں وہ اس کا الزام بھی بیوی پر رکھ دے اور کہے۔“ مجھے تو پہلے ہی دن اشارہ ملا تھا کہ میں یہ شادی نہ کروں۔ میں خوش نہیں رہوں گا مگر میں بھنسن ہی گیا۔“

”تو کیوں کر لی۔“ بیوی کہے گی۔ ”میرے تو اور بھی بہت رشتے آئے تھے۔ تم سے شادی کر کے تو میری قسمت ہی پھوٹ گئی۔“

امام صاحب کی بکجیریں کرا سے ہوش آیا۔ اور اس نے جلدی سے نیت کر کے بکجیر پڑھ کر ہاتھ باندھ لیے نماز پڑھنے میں اسے ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔ اس کے خیالات روٹی کے گرو پکراتے رہے اور وہ سوچتا رہا کہ امام صاحب خواہ خواہ نماز لمبی کرتے جا رہے ہیں۔ اسے اپنی زندگی کی یہ طویل

ترین نماز لگی۔ بلکہ نماز جنازہ کے بعد امام صاحب کی لمبی دعا بھی اسے ناگوار گزر رہی تھی کیونکہ ہموک کے ساتھ اسے اب پیشاب کی حاجت بھی ہو رہی تھی۔ اتنا پانی جو پیا تھا اس نے آخر کام تو دکھانا ہی تھا۔

دعا ختم ہوتے ہی لوگ مرحوم کا چہرہ دیکھنے اور جنازہ اٹھانے کو چلے اور وہ پیشاب سے فراغت حاصل کرنے بھاگا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر دیر ہوگی تو لوگ جنازہ لے کر چلے جائیں گے اور وہ رہ جائے گا لہذا فوراً ہی واپس آ گیا۔

قبرستان میں میت کو قبر میں اتارنے کے بعد جب لوگ مرحوم کا آخری دیدار کر رہے تھے تو اسے اس میں دلچسپی نہ تھی مگر پھر بھی اس نے سوچا۔ ”لاؤ میں بھی مرحوم کی شکل دیکھ لوں۔ آخر اس کی کمائی کتنا ہے۔“

وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ گورکن نے دتنازہ قبریں تیار کی ہیں اور وقت اور پیسا بچانے کی خاطر درمیان کی دیوار سبھی رکھی ہے۔

”یہ دوسری کس کی ہے؟“ اس نے قریب کھڑے ہوئے فرد سے پوچھا۔

”کسی خاتون کی ہے ان کا جنازہ بھی ابھی آئے گا۔“ وہ بولا۔

”واپ بڑی موج ہے۔ کیا بات ہے اللہ میاں تمہاری؟“ اس نے جی سے سوچا۔ ”اسے مرنے کے بعد بھی پڑون دے دی اور مجھ سے دی ہوئی بھی چھین لی۔“

اس کے آگے کھڑے ہوئے شخص نے سائیڈ میں ہو کر اسے بھی مرحوم کا آخری دیدار کرنے کا موقع دیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور جیسے ہی اس کی نظر مرحوم کے چہرے پر پڑی اسے جیسے شاک لگ گیا۔

”یہ تو وہی مودا چکری تھا۔ جاتے جاتے بھی چکر دے گیا!“ اسے جیسے اس کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ چکر کر بیٹھ گیا۔

”ممبر کرومہر کرو۔“ پیچھے سے آنے والے صاحب اسے تھامتے ہوئے بولے۔ ”اللہ ممبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

ایک اور صاحب نے اسے سہارا دے کر پیچھے ہٹا لیا۔ وہ وہاں سے ہٹ تو آیا مگر اس کا دل و دماغ وہاں ٹھہرنے کو نہیں چاہ رہا تھا وہ تو بس چاہ رہا تھا کہ فوراً ہی وقت ”پالیا..... پالیا“ کی گردان کرتا ہوا واپس اسی گلی میں جائے اور اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑے۔ اسے بتائے کہ اب رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مودا چکری اپنے

چکروں کا نتیجہ بھٹکتے اللہ میاں کے پاس چلا گیا ہے اور میں واپس آ گیا ہوں۔ اب ہمارے درمیان جدائیاں ڈالنے والا زبردستی طلاق دوانے والا کوئی نہیں ہے۔ تم اب بھی میری بیوی ہو کیونکہ زبردستی کی طلاق طلاق نہیں ہوتی اور اس کے بعد سیدھا اسے واپس اپنے گھر لے جائے۔

اسے لوگوں پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس شخص کو دفن کرنے میں اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں۔ جلدی جلدی مٹی ڈال کر گڑھا کیوں نہیں بھر دیتے۔ یہ شخص تھا ہی قابل۔

”وہ تو برہا تھا تو کیوں برا بن رہا ہے۔“ اس نے سوچا۔

قبرستان سے واپسی پر وہ سیدھے وہیں آئے تھے۔ وہ بھی لوگوں کے ہمراہ باہر بھیجی ہوئی در یوں پر بیٹھ گیا تھا۔

وہاں بیٹھ کر اس نے سوچا۔ ”حیرت کی بات ہے کہ نہ تو مجھے جنازے میں اور نہ یہاں اپنی بیوی کا کوئی رشتے دار یا میرا کوئی جاننے والا نظر آیا۔ کیا ان لوگوں کو اطلاع نہیں ہوئی ہوگی؟“

”تو بھی پاگل ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”یہ تو ویسے ہی حکومت بدلنے پر روپوش تھا۔ حکومت نے اس کے سر پر انعام مقرر کیا ہوا تھا تو پھر رشتے داروں کے آنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کا یہی انجام ہوتا ہے۔“

اس نے سراٹھا کر دیکھا۔ لوگ کھانے کا انتظام کرنے میں مشغول تھے۔ نیچے فرش پر دسترخوان لگا کر پلیٹیں لگا دی گئیں اور درمیان میں قابوں میں چنے کا پلاؤ رکھا جا رہا تھا۔

”اس کے پڑوسی بڑے اچھے ہیں۔“ اس نے سوچا۔ ویسے اسے اب حیرت ہو رہی تھی کہ کھانا دیکھ کر اشتہا بڑھنے کی بجائے ہموک کا احساس جیسے یکدم ختم ہو گیا تھا۔ لوگ باگ پلیٹوں میں کھانا نکالنا شروع ہو گئے تھے اور وہ یونہی بیٹھا ہوا تھا کیونکہ اب کھانے کی بجائے اس کی توجہ اندر کی جانب تھی۔ رونے اور بین کرنے کی آوازیں جو شاید وہ عام حالات میں سنتا بھی نہیں اب اس کے دل کو تکلیف پہنچا رہی تھیں کیونکہ ان میں نمایاں آواز ایک ہی تھی جسے وہ

شناخت کر رہا تھا اور جو سیدھی اس کے دل میں چھ رہی تھی۔ وہ روتے روتے کچھ کہہ بھی رہی تھی مگر دوری کی وجہ سے الفاظ اس کی سمجھ نہ آ رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر اندر چلا جائے۔ اس تسلی دے۔ اسے خاموش کرائے۔ اسے سمجھائے اور کہے کہ یہ رونے کا نہیں خوشی کا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ظالم سے نجات دلا دی

مگر وہ فی الحال ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

”ارے صاحب! بسم اللہ کریں، کھانا کھالیں۔“ ایک صاحب نے اسے یوں مغمم بیٹھے دیکھ کر کہا۔ ان صاحب کے بلانے پر اسے ہوش آیا۔ اور اس نے بڑی بے دلی سے چند نوالے اپنی پلیٹ میں ڈال لیے۔

ابھی وہ کھانا شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک صاحب اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے اور اس کا لقمہ اٹھانے سے پہلے ہی انہوں نے اس کی پلیٹ میں کھانا شروع کر دیا۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس نے پلیٹ ان کی طرف سرکا دی۔ اسے جھوٹن کھانے سے چڑھی۔ وہ اپنی پلیٹ میں کسی کو شریک کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ صاحب شرمندہ سے ہو گئے اور انہوں نے کہا۔ ”آپ ہی کھالیں میں اور لے لوں گا۔“

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”اب آپ لے لیں۔ میں جھوٹا نہیں کھاتا۔“

اس نے اپنے لیے ایک اور پلیٹ میں چاول نکال لیے ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھا یا تھا کہ اندر سے روٹی ہوئی تین کرتی ہوئی اس کی بیوی اچانک باہر نکل آئی اس کے پیچھے چند عورتیں بھی آ گئیں۔

”ہائے مجھے اکیلا کیوں چھوڑ گیا۔ لوگو مجھے اس کے ساتھ ہی دفتروں میں اکیلی رہ کر کیا کروں گی۔ کیا فائدہ اس زندگی کا۔ وہ بین کرتی ہوئی دیواروں سے سرکھار ہی تھی اور پیچھے سے آنے والی عورتیں اسے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کوشش میں ایک زوردار جھٹکا لگا تو وہ سیدھی ہونے کی کوشش میں بالکل اس کے نزدیک آ گئی۔

اس کے تودل کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اسے اٹھایا۔ اسے اٹھاتے وقت اس کی بیوی نے اسے دیکھا۔ جب دونوں کی نظریں ملیں تو وہ ایک لمحے کو ساکت سی ہو گئی۔ وہ یکدم پیچھے ہٹ گیا اور عورتیں اسے سنبھال کر اندر لے گئیں۔ وہی ایک لمحہ اس کے بھی ادرک کا تھا۔“

”تو یہ بات تھی۔“ اس نے سوچا یہ خود ہی مجھ سے طلاق لیتا چاہ رہی تھی۔

اب اس کی سمجھ میں آ گیا کہ کس کی خواہش پر مودے نے اسے زندہ رکھا تھا۔

”میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ جھوٹن کھانے جا رہا تھا۔“ اس نے سوچا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا لقمہ پلیٹ میں رکھ کر دھیمے قدموں سے واپس ہو گیا۔





سوناد بیل

جناب مدیر
السلام علیکم

پنجاب کے دیہی علاقوں میں نو سر بازوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ سرگزشت عذرا کی ہے۔ وہ کس طرح نو سر بازوں کے ہتھے چڑھی میں نے کھل کر بیان کیا ہے تاکہ کوئی دوسرا نو سر باز کسی اور کو بے وقوف نہ بنا دے۔

عاطر شاہین
(ملتان)

انعام ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے جاتا تھا اور اس کی واپسی شام چھ بجے ہوتی تھی۔ اس نے بیوی کو سختی سے ہدایت کی ہوتی تھی کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں سوائے اپنے گھر والوں کے اور کسی کو اندر نہ آنے دے۔ آج

انعام اور عذرا کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے۔ یہ ان کی پسند کی شادی تھی لیکن ابھی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ انعام کے والدین وفات پا چکے تھے۔ اس لیے عذرا دن میں اکیلی ہوتی تھی۔

کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی تھی۔ انعام ٹیکسٹری جانیے سے پہلے عذرا کو بھری وغیرہ خرید کر دے جاتا تھا۔

ایک دن عذرارات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے اور شام کے پانچ بج رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، وہ چونک اٹھی۔ اس نے سمجھا کہ انعام آ گیا ہے لہذا وہ کچن سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی۔

”کون ہے۔“ اس نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔

”بابی۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ کیا پانی مل سکتا ہے۔“ دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی تو عذرا چونک پڑی اور وہ سوچنے لگی کہ وہ کیا کرے کیونکہ انعام نے اسے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں کسی کو بھی گھر میں نہ آنے دے۔

”بابی۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ مہربانی کر کے پانی پلا دیں۔ دعائیں دوں گی۔“ ایک بار پھر دروازے پر موجود لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ”تمہارا احسان ہو گا بابی۔“

”تم کسی اور گھر میں جا کر پانی پی لو۔“ عذرانے کہا۔ ”بابی۔ میں نے اور گھروں کے دروازے بھی کھٹکھٹائے ہیں لیکن کوئی دروازہ نہیں کھول رہا۔“ لڑکی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم اتنی سنگدل ہو کہ ایک گلاس پانی بھی نہیں پلا سکتیں۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے اور میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔“

عذرا کو اس پر ترس آ گیا کیونکہ وہ سادہ لوح لڑکی تھی۔ اس نے سوچا کہ پانی پلانے میں کیا حرج ہے چنانچہ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے ایک نوجوان اور حسین لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور سفید رنگ کی چادر اوڑھے ہوئی تھی۔ اس کی عمر بائیس تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ڈھانپا ہوا نہیں تھا۔

”آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔“ عذرانے اس لڑکی سے کہا تو وہ اندر داخل ہو گئی۔ عذرانے دروازہ بند کیا اور اسے لیے ہوئے صحن میں آ گئی۔

”بیٹھو۔ میں تمہارے لیے پانی لے آتی ہوں۔“ عذرا نے لڑکی سے کہا تو لڑکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی جبکہ عذرا کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے فریج کھول کر ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل نکالی اور گلاس اٹھا کر وہ صحن میں آ گئی۔ اس نے گلاس بھر

کر لڑکی کو دیا تو لڑکی پانی غٹا غٹ پی گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے پیاسی ہو۔

”بابی۔ ایک گلاس اور دے دو۔“ لڑکی نے کہا تو عذرا نے گلاس میں مزید پانی بھر دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔

”بہت بہت شکریہ بابی۔ اللہ تمہیں اس نیکی کی جزا دے گا۔“ لڑکی نے گلاس فریج میز پر رکھتے ہوئے ممنون لہجے میں کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے اور کہاں رہتی ہو؟“ عذرانے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بابی۔ میرا نام کرن ہے اور میں حیدر کالونی میں رہتی ہوں۔ میں اپنے بچے کے کپڑے خریدنے نے بازار گئی تھی اور اب میں گھر جا رہی تھی کہ مجھے شدید پیاس لگ گئی۔“ لڑکی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے چند گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن مجال ہے کسی نے دروازہ کھولا ہو۔ تم بہت اچھی ہو بابی کہ تم نے مجھے پانی پلا دیا ہے۔“

”آج کل حالات خراب ہیں اس لیے کوئی بھی اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولتا۔“ عذرانے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بابی۔“ کرن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ ”ماشاء اللہ تمہارا گھر تو بہت خوبصورت ہے بابی۔ تمہارے میاں کیا کام کرتے ہیں۔“

”میرے میاں ایک ٹیکسٹری میں ملازمت کرتے ہیں۔“ عذرانے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہارے میاں کیا کرتے ہیں۔“

”میرا میاں کچھ بھی نہیں کرتا۔“ عذرانے جواب دیا۔ ”وہ سارا دن گھر پر پڑا چار پائی توڑتا رہتا ہے۔ بابی، تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“

”دو سال ہو گئے ہیں۔“ عذرانے بتایا۔

”بابی۔ کیا تمہارے پاس سونا بھی ہے؟“ کرن نے کہا تو عذرا بے اختیار چونک پڑی اور اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔

”ہاں ہے۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ عذرانے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بابی۔ پریشان نہ ہوں۔ میں نہ جھگی ہوں اور نہ ہی چور اچکی۔“ کرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دراصل میرے پاس ایسا فن ہے کہ میں سونا ڈبل کر سکتی ہوں۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بسٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

اسرائیل، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت مالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیئے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شریعہ عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹینس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

اگست 2017ء

عذرا حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
”کیا مطلب۔ تم سونا ڈبل کیسے کر سکتی ہو۔ کیا تمہیں
جادو آتا ہے؟“ عذرا نے اس بار دلچسپی سے پوچھا۔ اب اس
کے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا۔

”نہیں۔ میں جادوگر نہیں ہوں۔“ کرن نے ہنستے
ہوئے کہا۔ ”مگر میرے پاس ایسا فن ہے کہ میں سونا ڈبل کر
سکتی ہوں۔ مثلاً اگر تمہارے پاس پانچ ٹولے سونا ہے تو میں
اسے دس ٹولے کر سکتی ہوں۔“

عذرا حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی
تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کا سونا ڈبل ہو جائے تو اس
کے دواے نیارے ہو جائیں گے۔ وہ ضعیف الاعتقاد لڑکی تھی
اور ایسی باتوں پر یقین رکھتی تھی۔ وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ جب
وہ انعام کو بتائے گی تو وہ بھی خوش ہو جائے گا۔

”کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟“ عذرا نے یقین نہ آنے والے
لہجے میں کہا۔ ”کہیں میرے ساتھ فراڈ تو نہیں کر رہی؟“
”باجی۔ اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو بے شک سونا نہ
لاؤ۔“ کرن نے اس بار ناراض لہجے میں کہا۔ ”اچھا، میں اب
چلتی ہوں۔“

”ارے ارے ٹھہرو۔“ عذرا نے اسے اٹھتے دیکھ کر
جلدی سے کہا۔ ”میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ تم تو ناراض ہی
ہو گئی۔“

”باجی۔ میں اب تک کئی لوگوں کے سونے ڈبل کر چکی
ہوں۔“ کرن نے کہا۔ ”اگر یقین نہ آئے تو تم میرے ساتھ
چلو، میں تمہیں کئی ایسے لوگوں سے ملواتی ہوں جو اس وقت کالا
مال ہو چکے ہیں۔ کئی تو ایسے ہیں جن کے پاس پچاس پچاس
ٹولے سونا تھا اور میں نے ڈبل کر کے سو، سو ٹولے کر دیا ہے۔
آج وہ بڑی بڑی کوشیوں، بینک بینکس اور کئی گاڑیوں کے
مالک ہیں۔“

کرن کی باتیں سن کر عذرا کے دل میں بھی لالچ بڑھتا جا
رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی۔ اس کی بھی
خواہش تھی کہ ان کے پاس ایک خوبصورت گاڑی ہو جس میں
بیٹھ کر وہ روز شام کو سیر پائے کرنے جائیں۔ انعام کے پاس
ایک موٹر سائیکل بھی وہ بھی پرانی۔

”اب کیا سوچ رہی ہو باجی۔“ اچانک عذرا کی سماعت
سے کرن کی آواز نکلائی تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
”کچھ نہیں۔“ عذرا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تم پر یقین
کر لیتی ہوں۔“

”بابی۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں سونا ڈبل کرنے کی فیس بھی لیتی ہوں۔“ کرن نے کہا۔
 ”کتنی فیس لیتی ہو؟“ عذرا نے پوچھا۔
 ”فی تولہ دس ہزار روپے۔“ کرن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”فی تولہ دس ہزار روپے۔“ عذرا نے کہا۔ ”لیکن میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں تو ایک تولے کا دو ہزار روپے دے سکتی ہوں۔“ عذرا نے کہا۔ ”میرے پاس صرف پانچ تولے سونا ہے۔ میں تمہیں دس ہزار روپے دے سکتی ہوں۔“

”بابی۔ دس ہزار تو تھوڑے ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔“ کرن نے کہا۔ ”چونکہ تم نے مجھے پانی پلایا ہے اس لیے میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔ تم سونا اور پیسے لے آؤ، میں اپنا کام کروں اور یہاں سے جاؤں۔“

”شکریہ۔“ عذرا نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر وہ اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک زیورات والا سرخ ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبہ کرن کے سامنے رکھ کر کھول دیا تو اس میں زیورات موجود تھیں۔

”یہ ہے میرا سونا۔“ عذرا نے کہا۔ ”اب تم اسے ڈبل کر دو۔ اور ہاں جلدی کرو۔ میرا شو بھی آنے ہی والا ہوگا۔“

”بابی۔ میرا اصول ہے کہ میں عمل کرنے سے پہلے پیسے لیتی ہوں۔“ کرن نے کہا۔ ”اس لیے تم پہلے پیسے دو۔“
 ”میں پیسے بھی لائی ہوں۔“ عذرا نے کہا اور پھر اس نے اپنی مٹھی میں دبے روپے اسے دے دیے۔ کرن نے عذرا سے پیسے لیے اور کرن کراپنے پرس میں رکھ لیے۔

”بابی۔ تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“ کرن نے کہا تو عذرا بے اختیار چونک پڑی۔

”کیا مطلب۔ میں اپنی آنکھیں کیوں بند کر لوں؟“ عذرا کے لہجے میں حیرت تھی اور ایک بار پھر وہ شاک کی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بابی۔ میں تمہارے سامنے یہ عمل نہیں کر سکتی۔ یہ اصول ہے۔“ کرن نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم سونے کو دیکھتی رہی تو سونا بھی ڈبل نہیں ہوگا۔“

”اوہ ٹھیک ہے۔ میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔“ عذرا نے کہا اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی اس

نے آنکھیں بند کیں تو کرن نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے پرس میں سے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس کا رخ عذرا کے چہرے کی طرف کر کے اسپرے کیا تو عذرا نے بے اختیار آنکھیں کھولیں مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا پھر تار کی چھانٹی۔ وہ لہرائی اور کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی گردن دائیں طرف ڈھلک گئی تھی۔ کرن نے بوتل واپس اپنے پرس میں رکھی اور پھر جلدی جلدی سے ڈبے سے سارا زہر نکال کراپنے پرس میں ڈالا اور اٹھ کر گھر سے باہر چلی گئی۔

شام چھ بجے انعام فیکٹری سے گھر آیا تو وہ بیرونی دروازہ کھلا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے موٹر سائیکل دروازے کے پاس کھڑکی کر کے لاک کی اور گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کی نظر جیسے ہی صحن میں کرسی پر بے ہوش پڑی عذرا اور میز پر رکھے زیورات والے ڈبے پر پڑی تو وہ بے اختیار چونک پڑا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور عذرا کو ہوش میں لانے لگا۔ جلد ہی عذرا ہوش میں آ گئی۔ اس نے انعام کو دیکھا تو وہ ہذیبائی انداز میں چیخنے لگی۔

”کیا ہو گیا ہے عذرا۔“ انعام نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

”میں لٹ گئی۔ میں لٹ گئی ہوں انعام۔“ عذرا نے روتے ہوئے کہا۔

”ہوا کیا۔ کچھ بتاؤ گی بھی۔“ انعام نے بھنجلا کر کہا تو عذرا نے ساری بات اسے بتا دی۔ انعام اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔

”عذرا۔ تم کس دنیا میں رہتی ہو۔ تم پڑھی لکھی ہو کر ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہو۔“ انعام نے کہا۔ ”کیا آج کے سائنسی دور میں ایسا ممکن ہے کہ سونا ڈبل کر دیا جائے۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ گھر میں اپنے گھر والوں کے سوا کسی کو مت آنے دینا۔ پورے ملک میں ایسے کئی گروہ متحرک ہیں جو سادہ لوح اور

ضعیف الاعتقاد و عورتوں کو بے وقوف بنا کر لوٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ پانی پینے کے بہانے گھروں میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی چھنی چھری باتوں سے یکین کو پھانسل لیتے ہیں۔ جو سمجھ دار ہوتے ہیں وہ ان کی باتوں میں نہیں آتے مگر تم جیسی لڑکیاں ان

باتوں پر یقین رکھتی ہیں وہ ان کے جھانے میں آ جاتی ہیں۔“

عذرا نے انعام کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو اپنے کیے پر نامد مٹھی اور اس لڑکی کو کوس رہی تھی جس نے اسے بے وقوف بنا کر لوٹ لیا تھا۔



ادھورارشتہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

ایک دکھی عورت کی خود بیتی ارسال خدمت ہے۔ ایک ایسی عورت کی روداد جو ایک ادھورے رشتے کو نبھا رہی ہے۔

وسیم بن اشرف

(ملتان)

”تم میری کہانی کب لکھو گے۔“ متعدد بار اس نے مجھ سے پوچھا تھا، لیکن میں ہر بار ٹال جاتا لیکن وہ بھی ٹالے نہ ملتی تھی۔ منہ بناتی اور بھی مانتے پر تیوریاں ڈال کر چلی جاتی پھر جب ملتی تو وہی شکوہ ہوتا کہ میں اس کی بات کو اہمیت نہیں دے رہا، ایک دن تو اس نے میرے خوب لتے لیے اور بولی۔ ”اگر لکھنی ہے تو لکھو میں بار بار نہیں کہوں گی۔ اس لیے کہ مجھے خبر ہے تم بہت جلد پاکستان جاؤ گے۔“

آج تو اس کے بیٹے کی ساگرہ تھی۔ جب میں اس کو

مبارک یا ددے رہا تھا تو اس نے بھری محفل میں پھر اپنا سوال دہرایا۔ ”میری کہانی کب لکھو گے۔“

مجھے کوئی جواب نہ سوجھا، میں نے لمحہ بھر سوچا اور کہا ”شاہین مجھے نہیں پتا کہ تم پر کیا بنتی ہے، میں سب کچھ نہیں جانتا، تمہاری کہانی کا آغاز تو کروں گا مگر ختم کہاں کروں گا؟ اور مجھے.....“

اس نے مجھے ٹوکا اور آنکھیں منکارتے ہوئے بولی ”دیکھ بھائی! مجھ جیسی عورتوں کی کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں، شروع ہوتی ہیں اور پھر چلتی رہتی ہیں، اس جیسی لاتعداد آپ بیتیاں ہوں گی، ایسی آپ بیتیوں کا کوئی اختتام ہوتا ہے نہ انجام۔“

اس نے مجھے غصے میں ڈال دیا، ”پھر بھی جب تک تمام حالات کا علم نہ ہو تو خدشہ رہتا ہے کہ قلم سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے، شاید تمہیں میری یہ بات بری لگے لیکن حقیقت یہی ہے“ میں نے جواب دیا۔

”اس میں برا لگنے والی کون سی بات ہے اور میں کون سی نیک پر دین ہوں، جو مجھ پر گزری، جو میں نے کیا وہی کچھ لکھ دو۔“

”لیکن مجھے تمہارا پورا راج نہیں پتا۔“

”اچھا تو آج تم نہ جاؤ۔ یہیں ڈک جاؤ، آج سب بتاؤں گی۔“ اس نے حکم صادر کیا اور پارٹی میں مصروف ہو گئی۔

”نصف شب تک خوب ہلا گھلا رہا، 12 بجے کے بعد وہ فارغ ہو کر صوفہ پر پھیل کر لیٹ گئی اور اپنے خوبصورت کالے لمبے بال کھول لیے، میں نے دیکھا لال رنگ کی قمیص اور شلوار اس کے سرخ گالوں کے ساتھ کتنی میچ کر رہی تھی، لگتا تھا اس کے کپڑوں کا رنگ اس کے سرخ گلابی چہرے پر اترا آیا ہے یا پھر چہرے کے رنگ نے اس کے کپڑے رنگ دیئے ہیں، گلے میں مصنوعی موتیوں کی مالا اس کی صراحی دار گردن سے لپٹی سچے موتیوں کی مالا لگ رہی تھی، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، لمبا قد، یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے کوئی اپسرا بیٹھی ہے، میں مہبوت رہ گیا، کتنی خوبصورت تھی وہ، پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر مجھے تاج محل یاد آ گیا، شاید وہ مجھے تاج محل جتنی ہی خوبصورت اور اداس لگی تھی۔“

”کہاں تم ہو گئے ہو۔“ اس نے میرے خیالات کی مالا توڑ دی۔

”تمہارے حسن کا جلوہ دیکھ رہا تھا، آفتاب ہو، مہتاب ہو، کسی شاعر کا خواب ہو، تم کتنی لاجواب ہو، جی چاہتا ہے

تمہیں دیکھتا رہوں، یہ حسن جہاں سوز، جی چاہتا ہے تمہیں نکلتا رہوں۔“ میرا جواب سن کر وہ ہلکھلا اٹھی ہنسی تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔

”میری کہانی بھی سنو گے یا مجھے دیکھتے رہو گے۔“ وہ مسکرائی۔

”ہاں شروع کرو۔“

”معلوم نہیں کہ مجھ پر جو بنتی اس کا آغاز کہاں سے کروں، نہ ہی زندگی کا پہلا باب یاد ہے اور نہ ہی آغاز کا انا پتا، یاں اتنا یاد ہے کہ میں ایک ٹوٹے ہوئے گھر میں پیدا ہوئی تھی۔“

”ٹوٹے ہوئے گھر میں؟ میں نے استفسار کیا۔

اس نے نیم کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ”ہاں!! ای اور ابو کی آپس میں بنتی نہیں تھی، شاید میری عمر اس وقت 10 برس ہو گی جب ہم اسلام آباد سے انگلینڈ چلے گئے، میں نے کچھ سال تو اسلام آباد کے ایک اچھے نجی سکول میں پڑھا تھا اور پھر گورڈون کے دیس میں جا کر تعلیم مکمل کی، میں آج تک نہ جان پائی کہ کون سا اسکول انگلینڈ جانے کی کیا سوجھی تھی! پاپا اور ماما دونوں ملازمت کرتے تھے، پاپا فیکٹری سے جو بھی کماتا کرتے تھے وہ شراب اور گوریوں پر اڑا دیتے، مئی ڈیڑھ کی گالیاں بھی کھاتی اور گھر کا خرچہ بھی چلاتیں، بہانے بہانے سے ڈیڑھ ما کو روز ہی بیٹھتے، اس کے باوجود ماما ڈیڑھ کی کو کسی طور پر بھی چھوڑنے پر تیار نہ تھیں جب کہ وہاں کا قانون بھی ان کا مدد کرتا تھا۔“

”میں نے کئی بار ضد کی، چلو ماما! پاکستان چلتے ہیں، لیکن ڈیڑھ اور ماما کو اب پاؤنڈز سے زیادہ شاید کوئی چیز پیاری نہیں تھی، پاکستان جانا تو دور کی بات وہ تو پاکستان کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے، ہے نہ اچنبھے کی بات، لیکن یہ بھی کھرا سچ ہے کہ میں اپنے وطن کو ایک دن بھی نہیں بھولی تھی، میں اپنی سہیلیوں، رشتہ داروں، اپنے پنجاب اپنے اسلام آباد کو ہر رات خواب میں دیکھتی، ایسی شاید ہی کوئی رات گزری ہو جب مجھے ایسے خواب نہ آئے ہوں، گھر کا ماحول ہی ایسا تھا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ کالج کی پڑھائی کے دوران ہی ایئر پورٹ پر جا بٹل گئی۔

مجھے لگا جیسے میں اس ٹھنک زدہ گھر سے نکل کر رنگ برنگے میلے میں آ گئی ہوں، روزانہ ہزاروں مسافر جہازوں پر چڑھتے اور اترتے، گویا روز نئے پتھری آتے اور اڑاری مار جاتے، میں طرح طرح کے لوگوں کو آتے جاتے دیکھتی، انہیں گلے ملتے دیکھتی تو میرے اندر تو پھر پوزی شروع ہو جاتی، لوگ

لیکن میں نے کوشش کی کہ اسے میرے اندر کی توڑ پھوڑ کا رتی بھر بھی احساس نہ ہو۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“

”پاکستان، ملتان کے قریب ہمارا گاؤں ہے، گھربار ہے، والدین ہیں، زمین جایداد ہے، سارا گاؤں ہی ہمارا ہے، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ سال میں چار چکر وطن کے لگا لیتا ہوں۔“

وہ ملتان کا بتا رہا تھا، وہ شہر جو اولیاء اللہ کی سر زمین کہلاتی ہے، جہاں حضرت بہاء الدین زکریا، حضرت شاہ رکن عالم، بی بی پاک دامن، حضرت شاہ محسن تیریز اور بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں کے مزار ہیں، دربار ہیں، خانقاہیں ہیں۔

”تم نے ملتان دیکھا ہے۔“

”نہیں! میں 10 سال کی تھی جب ہم گوروں کے دیس کے باسی بن گئے، نام سنا ہے، جان پہچان والوں سے سنا ہے۔ ملتان بزرگان دین کا شہر ہے، بڑا جی چاہتا ہے کہ وہاں جاؤں، اللہ کے نیک بندوں کے درباروں پر حاضری دوں۔“

میں اداس سے لہجہ میں بولی۔

”چلو آج ہی لے چلتا ہوں۔“ اس نے مذاق میں کہا اور میں شرما کر رہ گئی۔

”میرا نام سکندر ہے، 7 تاریخ کو واپس آؤں گا، ملوگی مجھے یہیں ایئر پورٹ پر۔“ وہ ایک ماہ کے لیے جا رہا تھا۔

”پتا نہیں۔“ میں وہاں سے اٹھ گئی، سکندر چلا گیا

اور میرے لیے ایک ماہ جیسے ایک صدی بن گیا، ایسی ویسی کوئی بات بھی نہیں تھی لیکن لگ رہا تھا کہ وقت جیسے ٹھم گیا ہے، گھڑی کی سوئیاں جیسے کھومنا بھول گئی ہیں، وہ مجھے اپنے حجر میں جکڑ کر

چلا گیا۔ جب بھی پاکستان کی فلائٹ آتی میں دائیں بائیں

نظریں گھماتی کہ شاید وہ پہلے نہ آ جائے اور گزر نہ جائے، پھر

میں خود کو سرزنش کرتی کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ من اداس، ملے

میں دیرانی، جگ سنسان لگنے لگا ہے، دن کو چین نہ رات کو

سکون، سوتی تو خوابوں میں گھس آتا، جاگتی تو بے گل ہو جاتی،

دھیرے دھیرے تین ہفتے گزر گئے اور پھر 7 تاریخ آ گئی،

میں جان بوجھ کر ایک شاپ میں جا کر بیٹھ گئی کہ دیکھوں تو وہ

مجھے تلاش بھی کرتا ہے یا صرف بائیں ہی کرتا ہے، سارے

مسافر گزر گئے، سکندر آخر میں آیا۔

وہ دائیں بائیں آنکھیں گھماتا مجھے ہی تلاش کر رہا تھا،

پندرہ منٹ تک وہ مجھے ڈھونڈتا رہا۔ میرے دل میں پھول کھل

رہے تھے، میں اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی، پھر

کتنے خوش ہیں، ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں، جب کوئی میاں بیوی الگ ہوتے تو ایک دوسرے کی ہانہوں میں سما جاتے، بیوی روتی تو شوہر اسے سینے سے لگا لیتا اور اس کی آنکھیں بھی نم ہو جاتیں، مجھے اچھی خواہ ملتی تھی لیکن جس روز تنخواہ ملنا ہوتی تھی میں اداس ہو جاتی، سوچوں کے جال میں جکڑ جاتی کہ پیسے ماکو دوں گی تو ڈیڈ شراب کے لیے پیسے مانگیں گے، ممانہیں گی بچی کے پیسے شراب پر نہ بہا، دونوں میں جھگڑا ہو گا یا ایسے ہی تھا کہ جیسے پیسا ہمارے گھر کی لڑائی کی آگ میں پھول کا کام دے رہا ہو، تم دھیان سے سن رہے ہو نا؟“ وہ بات کرتے کرتے پل بھر کے لیے رُکی۔

”زکوٰۃ“ بولتی رہو، داستان کو برکیں نہ لگاؤ، میں سب سن رہا ہوں، میری مکمل توجہ تمہاری باتوں پر ہے۔“ میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا۔

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ کائناتوں بھری زندگی کے تین برس گزر گئے، جن من میں جو جہنم تھی وہ دور نہ ہو سکی، ایک روز پاکستان جانے والی فلائٹ تاخیر کا شکار ہو گئی، سارا ایشاف مسافروں کی خدمت میں لگا ہوا تھا، انہی مسافروں میں مجھے سکندر ملا۔ میں تھکی ہاری ایک کرسی پر تھوڑی دیر آرام کے لیے بیٹھی تھی کہ وہ میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھا، میں نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر نظر نہ ہٹائی، دل میں اٹھل پھٹل ہی ہونے لگی، ایسے لگا جیسے اس نے مجھے پتا بنا کر کر دیا ہو، میں جیسے نظر جھپکنا بھول چکی تھی، ایئر پورٹ پر خوبصورت لوگ تو میں روز دیکھتی تھی، لیکن سکندر کے لیے جیسے خوبصورت جیسا لفظ بھی چھوٹا تھا، گورا چٹانرنگ، گھٹکر یا لے پال، ہونٹ گلابی اور درویشوں جیسی آنکھیں، مجھے اپنا وجود کھلتا محسوس ہوا، میں اس کی آنکھوں میں کھو گئی، وہ مسکرایا تو مجھے اپنا خیال آیا اور تھوڑا سا سنبھلی کہ اٹھ کر چلی جاؤں لیکن میرے تو پاؤں میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔

”کیا نام ہے آپ کا؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ چہرے مہرے کی طرح اس کی آواز بھی خوبصورت تھی۔

”شاہن۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت پیارا نام ہے لیکن اتنا نہیں جتنی پیاری تم خود ہو،

تمہارا نام تو تصور ہونا چاہیے تھا یا تصویر، جان بہار۔ کسی مصور کا

شاہکار دھکتی ہو۔“ وہ لپکا ایک آپ سے تم پر آ گیا۔

وہ بات کر رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا اس کی آنکھوں کا

حجر مجھے دھیرے دھیرے جکڑ رہا ہے، اس سرود کے منہ سے

اپنی تعریف سن کر یوں لگا جیسے دل و دماغ پر غمار سا چھا رہا ہو،

اس نے اپنے کوٹ کی جب سے رومال نکالا، شاید پریشانی سے اسے پسینا آ گیا تھا، اس نے پیشانی کو رومال سے صاف کیا اور بلا خرکی ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح اس نے بیک اٹھایا اور سر جھکائے چل پڑا، میں شاپ سے نکلی اور اسے عقب سے آواز دی۔ ”سکندر!“
وہ رک گیا۔

ایسے لگ رہا تھا جیسے بیک وقت ہزاروں گلاب اس کے چہرے پر کھل اٹھے ہیں۔

”مجھے پتا تھا تم ضرور آؤ گی۔“ اس نے مجھ سے معافہ کیا، زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کسی مرد نے مجھے اپنی ہانہوں میں لیا تھا، اس کے جسم سے مجھے عجیب طرح کی پیش سی نکلتی محسوس ہوئی، مجھے لگا اس پیش سے میں پھسل رہی ہوں، گرم صم، بے خبری اور بے خودی کا سا عالم تھا، میں نے بھی اس کی بازوؤں کی گرفت سے نہ ٹکنا چاہا۔ اس لیے بھی کہ یہ انگلستان کے ماحول کے موافق بات تھی۔

”چلو وہاں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ رستوران کی طرف قدم بڑھانے لگا، مجھے لگا کہ میں گوگلی بہری ہو گئی ہوں، کیفیت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، اپنے اندر کی کیفیت سے ٹھسٹ کھا کر میں اس کی باتوں کا۔ ”ہوں، ہاں! اچھا“ جیسے الفاظ سے جواب دے رہی تھی، وہ میرے لیے پاکستان سے سونے کی ایک خوبصورت چین لے کر آیا تھا، اس نے اپنے ہاتھوں سے اسے میری گردن میں ڈالی، وہاں، ہم کئی دیر بیٹھے رہے، گزرتے وقت کا پتا ہی نہ چلا، بادل نخواستہ ہمیں اٹھنا ہی پڑا۔ اس نے دیک ایڈر پر ملاقات کا وعدہ کیا اور بائے بائے کرتا چلا گیا۔

میری بیابان دنیا میں جیسے جاہ جارنگ پھول اگ آئے تھے، بے مزہ زندگی میں بہار آگئی تھی۔ سردی کی لہریں میرے انگ انگ میں سرایت کر رہی تھیں۔ میں بے خود ہوئی جا رہی تھی، میں محسوس کر رہی تھی جیسے عام دنیا سے نکل کر کسی اور ہی دنیا میں رہنے لگی ہوں، سکندر کا خیال ایک نشے کی طرح مجھے محسوس رکھتا، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے وہی لگا ہوں میں رہتا، گھر میں مہاپایا کی چیچ چنگھاڑ، تو تو میں میں، کام کا دباؤ، جیسے سب بھول گئی، ہفتے کے روز میں نے اپنا سب سے خوبصورت سوٹ نکالا، زیب تن کیا، آئینہ میں خود کو دیکھا اور پھر سکندر سے ملنے چل دی۔

وہ جیسے پہلے سے میرا منتظر تھا، اس کی نگاہیں مجھ سے چار ہوئیں تو جیسے چراغ جل اٹھے۔ سفید رنگ کی مرسلین میں

بڑے کروفر سے بیٹھا وہ کوئی راجکار لگ رہا تھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا، ہم نے باتیں شروع کیں تو پھر بات سے بات نکلتی گئی اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا، ہم بہت کم وقت میں ایک دوسرے کے بارے میں بہت زیادہ جان لینا چاہتے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ گھر بار ہوتے ہوئے بھی میں کس قدر تنہا ہوں، میرے مئی، پچا کیسے ایک دوسرے کی ضد اور دشمنی ہیں۔

”شاہین! بات دشمنی کی نہیں ہوتی، دراصل ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھوتہ کرنے کی بات ہوتی ہے، لیکن اگر میاں بیوی کا میل ہی ٹھیک نہ ہو تو پھر زندگی کی گاڑی کو زبردستی نہیں چھینچا جاسکتا، اندر کی دوریوں کے پتھر زندگی کی گاڑی کو رواں رکھنے میں بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں، میل کا نئے جیسے بھی ہیں اور سوراخ بھی کر دیتے ہیں، زندگی کے ایسے گھاؤ بھرنے سے بھی نہیں بھرتے، بے مزہ زندگی کا نٹوں کی سیج بن کر رہ جاتی ہے جس میں زخموں سے چور انسان کراہتے رہتے ہیں، بے جوڑ شادیوں کی سزا بچے بھگتے ہیں۔“

اس کی باتوں سے مجھے لگا جیسے وہ کہیں ہو گیا ہے۔
”کیوں سکندر! کیا تمہارے والدین بھی؟“ میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔

”نہیں! نہیں۔“ وہ جیسے خیالوں کے سمندر سے نکل آیا ہو۔ میرے ای، اب تو شاہوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں، وہ پرانے دور کے ہیں جب شادی ایک لائری کی طرح ہوا کرتی تھی اور ان کی لائری لگ گئی تھی، وہ بہت خوش و خرم زندگی جی رہے ہیں۔“ اس نے سو ف ڈرنک کا کین ٹیبل پر رکھا اور خاموش ہو گیا۔

”تو تم اس قدر اس کیوں ہو گئے ہو؟“

”میں دراصل اپنی پھتار رہا تھا۔ میری اور میری وائف کی کبھی نہیں بنی، ہر وقت ان بن رہتی ہے، وہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی ہے لیکن سو فیصد انگریز ہے نہ میاں بیوی کے رشتے کے تقدس کو سمجھتی ہے نہ شرقی روایات کو، بھال ہے جو اس کی اجازت کے بغیر گھر میں پتا بھی مل جائے، اسی لیے وہ میرے دل میں گھر نہیں کر سکی، نہ جانے کیوں؟ میں نے بھی دل کی گھرائیوں سے اسے نہیں چاہا، صرف بچوں کی وجہ سے جئے جا رہے ہیں۔“ وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

”سکندر آپ کے بچے بھی ہیں، دیکھنے میں تو بالکل کنوارے لگتے ہو۔“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”نہیں شاہین! میرا بڑا بیٹا 15 سال کا ہے اور بیٹی 11

سال کی۔ میری شادی رشتہ داروں میں ہوئی تھی، شادی کر کے انگلینڈ آیا تھا، میں نے سوچا تھا کہ حد بقیہ پڑھی لکھی ہے، میری اور میرے گھر والوں کی قدر کرے گی، لیکن اس نے مجھے ہمیشہ گھر کے سامان کی طرح سمجھا، جیسے میں اس کا نوکر ہوں، جب میں اپنے گھر تھا تو شہزادوں کی طرح زندگی کو بسر کیا لیکن یہاں آ کر مجھے کسی کی کمین بن گیا ہوں، ڈارلنگ، ڈارلنگ، پلیز، پلیز کہتے منہ دکنے لگا جاتا ہے۔ وہ یہی جھگڑتی ہے جیسے میں اس کا غلام ہوں، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس کی نکلے جتنی بھی قدر نہیں کرتا، لوگ تو جانوروں کو بھی پیار سے اپنا بنا لیتے ہیں، اپنے بس میں کر لیتے ہیں، وہ بھی کیا بیوی ہوئی جو مرد کو نہ جیت سکے۔ زندگی میں اتنا بڑا خلا ہے کہ یہی لگتا ہے کہ میں زندگی کو نہیں بلکہ زندگی مجھے بسر کر رہی ہے، بڑی خشک اور صحرا کی طرح ویران زندگی جی رہا ہوں۔“ یہ بتا کر اس نے چپ سا دھلی۔

خاموشی طویل ہو گئی تو میں نے اسے متوجہ کیا۔
 ”آگے بھی تو کچھ بتائیں۔“
 ”وہ الگ کمرے میں ہوتی ہے اور میں الگ کمرے میں، جب دل ہی نہ ملے ہوں تو جسمانی ملن کیا معنی رکھتا ہے؟“ وہ مجھے اپنے دکھڑے سنا رہا۔ پھر مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔ ”کیا بات ہے میری شادی کا سن کر تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔“
 ”میرا موڈ خراب نہیں ہوا، میں تو سوچ رہی تھی کہ ہر دوسرے گھر کا حال ایسا ہی ہے، یہاں لوگ ادھوری زندگی جی رہے ہیں۔“ مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔
 ”ہاں یہی سمجھ لو، نامممل زندگی! پانی بھی برے اور بندہ بھیکے بھی نہ، یہ ادھوری زندگی پوری بھی ہو سکتی ہے اگر کوئی اچھا جیون ساکھی مل جائے تو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں اداسی کی پر جھانک دیکھی۔
 ”کیا مطلب آپ کا؟“

”مطلب یہ کہ بچوں کی وجہ سے میں بیوی سے علیحدگی اختیار نہیں کر سکتا، میری وجہ سے ان معصوموں کی زندگی کیوں خارزار بن جائے، ٹوٹے بکھرے گھروں کے بچے کس طرح کے ہوتے ہیں تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے! پر ہاں! ان سب تلخ حقائق کے باوجود مجھے کوئی اپنے پیار کی گھٹی چھاؤں میں رہنے کی بھیک دے دے تو میں آخری سانسوں تک اس کا ساتھ بھانے کو تیار ہوں۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”زندگی بھر ساتھ بھانے کا وعدہ، وہ کیسے؟ آپ شادی شدہ ہو، کیا آپ کی بیوی آپ سے علیحدگی اختیار کر لے گی؟ شادی کے بغیر زندگی بھر کا ساتھ کیسے بھایا جاسکتا ہے؟“ یہ بات میرے گلے سے اتر نہیں رہی تھی۔

”پیار تو ایک لافانی جذبہ ہے شاہین! اس کا شادی سے کوئی تعلق نہیں، شادی سے پیار نہیں خرید جاسکتا ہے۔“ وہ اپنے فلسفے سے مجھے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ مجھے لپٹی مجنوں، ہیرا رنجا، سیف الملوک اور نہ جانے کون کون سی عشق و محبت کی لوک کہانیاں سنا کر میرے دل میں اترنے کی کج جو کر رہا تھا۔

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی اور شش و پنج میں تھی کہ اسے کہوں تو کیا کہوں؟ میں تو خود اس پر عاشق ہو گئی تھی لیکن ہم دونوں کے ایک ہونے کا کوئی درمیانی راستہ بچھائی نہ دے رہا تھا۔

”نہ جانے کیوں تمہیں دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ ہماری جوڑی کتنی فٹ رہے گی، کتنی پیاری ہوتی، تمہیں دیکھ کر تو کسی کا بھی ایمان ڈاؤن ڈول ہو سکتا ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب یہ کہا تو مجھے لگا وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ مجھے پھانسنے کے لیے مکھن لگا رہا ہے، مجھے راہ چلتے دیکھ کر کئی بندے میرے حسن میں کھو جاتے تھے، یہ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا، میں اپنی خوبصورتی کے قصیدے نہیں پڑھ رہی، مجھے رب نے بنایا ہی خوبصورت تھا۔

”میری محبوبہ بنو گی۔“ وہ جیسے میرے ترے کر رہا ہو۔
 ”پتا نہیں۔“

یہ کہہ کر میں گھر چلی آئی اور پھر کئی روز میں سکندر سے نہ ملی لیکن اس کو بھول بھی نہ سکی، بے چین سی کیفیت تھی۔ میرا دل کہیں بھی نہ لگ رہا تھا، اس کی یاد کسی کل آرام نہ لینے دیتی تھی، جو اس نے کہا تھا وہ قابل قبول نہ تھا، لیکن دل اس کی طرف ہی ہنچا چلا جاتا تھا، میری زندگی جیسے کسی طوفان میں گھر چکی تھی۔

کبھی میں نقش دیوار ہو جاتی تو کبھی دل میں پیار کی ہلکی ہلکی ٹیس محسوس کرنے لگتی۔ مجھے رہ رہ کر اس کی نگاہ ناز سچو کے سے لگاتی تھی، نہ پائے رفتن نہ جانے مامدن والا معاملہ تھا رات بھر میں سکندر کے بارے میں سوچتی رہی، اس کو بھولنا شاید میرے لیے مشکل ہو گیا تھا، مجھے دنیا کے کئی بڑے افراد یاد آئے جنہوں نے دو شادیاں کی تھیں، اور کئی شادی شدہ آدمی ذہن میں آئے جن پر کنواری لڑکیاں مرنی تھیں۔

دماغ دل کا ساتھ نہیں دے رہا تھا، کیا غلط ہے، کیا صحیح ہے کے چکر میں ایک ہفتہ گزر گیا، ایک روز میں ڈیوٹی ختم کر کے ایئر پورٹ سے نکلی تو سامنے سکندر کار میں موجود تھا، شیو بڑی ہوئی تھی، سر کے بال الجھے الجھے اور اس کی درویشوں جیسی آنکھوں میں برسوں کی اداسی تھی، اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں خوشی کی لہری ابھری لیکن میں نے اس پر غماز نہ ہونے دیا۔ ”تمہیں ایک بار بھی یاد نہیں آیا میں، کتنی بے مروت ہو تم۔“ اس نے نم آنکھوں سے شکوہ کیا۔

میں سمجھ نہ پائی اس کی چشم زد دیکھ کر میرا دل اداسی سے بھر گیا، لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی جاگزیں ہوا کہ سکندر مجھے کتنا چاہتا ہے۔

”مجھے بھولے نہیں آپ۔“ میں اس کے من میں جھانکتا جا رہی تھی۔

”تم کوئی بھولنے والی چیز ہو؟“ اس نے سوال داغ دیا۔

پھر وہ رات ہم نے اکٹھے گزاری، وہ مجھے چھوٹا تو میرے رگ و پے میں سرور کی لہریں اٹھنے لگیں، انکوں، ترنوں کا علاطم برپا ہو جاتا، جب میں اس کے کاندھے پر سر رکھتی تو بے حد سکون محسوس ہوتا، میں اس کی محبت کی حوالات میں قید ہو چکی تھی۔

لیکن میرے اندر کی پاکستانی عورت زندہ تھی۔ اب میں نے شور مچانا شروع کر دیا کی کم سے کم نکاح تو کر لیتے ہی نکاح رجسٹر نہ کراؤ۔ اس نے میرے شور شرابے سے تنگ آ کر ایک بنگالی مولوی کو پکڑ لایا۔ اس نے نکاح پڑھا دیا۔ اب پتا نہیں وہ حقیقت میں مولوی تھا بھی یا نہیں۔ لیکن میں مطمئن ہوئی۔

پھر تو جیسے یہ معمول بن گیا، وہ بزنس کے بھانے اور میں کام کے بھانے اکثر راتیں ہم باہر گزارنے لگے، صبح جب لحوہ جدائی آتا تو لگتا جسم سے روح جدا ہو رہی ہے۔

”آپ اپنا فلیٹ لے لو“ ایک روز سکندر نے میرے دل کی بات کہہ دی، پے منٹ میں کروں گا، اپنی پسند کا گھر تم تلاش کرو گی۔“

میں نے سنگل بیڈروم کا چھوٹا سا فلیٹ پسند کر لیا، سکندر اور میں نے مل کر خرچ کیا، مہینہ بھر میں میں لینڈ لیڈی بن چکی تھی۔ سکندر نے گھر کو سامان سے بھر دیا، گھر میں عیش و آرام کی ہر وہ چیز موجود تھی جس کا میں ارمان کر سکتی تھی، ممایا کو جب پتا چلا تو انہوں نے آسمان پر اٹھالیا، دونوں مجھ سے جھگڑ بیٹھے۔

”آپ دونوں کی جھگ جھگ سے چھٹکارا پانے کے

لیے ہی میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔“ مجھ سے رہا نہ گیا۔ یہ ہر وقت کی ٹرٹرنے میرا سکون برباد کر دیا ہے، میری اپنی بھی کوئی لائف ہے، گھر چھوڑ رہی ہوں دنیا نہیں، آتی جاتی رہوں گی اگر آپ کو پسند ہو تو.....“ یہ میرے آخری الفاظ تھے اس کے بعد میں نے وہ چار دیواری چھوڑ دی جہاں میں نے زندگی کی بہاریں کم اور خزاں جیسا عرصہ زیادہ بتایا تھا۔

سکندر کے پیار نے مجھے دنیا کے ہر شے سے جیسے بے نیاز کر دیا تھا، میں اس کی محبت میں ایسی غم ہوئی کہ سارے غم جیسے دفن ہو کر رہ گئے ہوں۔

وہ روزانہ شام کو گھر جانے سے قبل تین چار گھنٹے میرے ساتھ گزارتا، میں اس کے لیے کھانا بناتی، اس کے کپڑے دھوئی، استری کرتی، پوری عورت بن کر میں اس کی خدمت کرتی، اس کی سیوا میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھی، میں نہیں چاہتی تھی جو کی اس نے بیوی میں محسوس کی تھی وہ کی مجھ میں بھی ہو، میں اس کے جذبات و احساس کی قدر کرتی، اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی، جب نصف شب کو وہ مجھے چھوڑ کر جاتا تھا تو میں اکثر رو پڑتی۔ ”اپنی کہانی روک کر سوال کیا تو میں ایسے چونک گیا۔“

”سن رہے ہوں۔“ اس نے اچانک اپنی کہانی روک کر سوال کیا تو میں ایسے چونک گیا جیسے بم چھوڑ دیا ہو مجھے زبردست جھٹکا لگا۔

ہوں، ہاں، ہاں..... میں تو اس کی کہانی میں ایسا کھویا تھا کہ اس کی آواز پر چونکا تھا۔ ”روک مت، جاری رکھو، میں بہ تن گوش ہوں۔“ میرے کہتے ہی اس نے سلسلہ وہیں سے جوڑا۔ ”روٹی کیوں ہو؟ جتنا پیار ہے، سارا تو تمہارا ہے، تمہیں دے کر جا رہا ہوں، اس کے لیے کیا بچا ہے؟“ وہ مجھے تسلی دیتا۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم صرف میرے بن کے رہو، کب آئے گا وہ وقت۔“ میں شکوہ کرتی۔

”میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اپنی وائف کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ جب وہ میری گود میں سر رکھ کر یہ کہتا تو میں برف کی طرح سرد پڑ جاتی۔

”میرا ایک دوست کہتا ہے، مانگی ہوئی سگریٹ، اخبار اور مانگی ہوئی بیوی کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے، میں نے کبھی اخبار اور سگریٹ تو مانگا نہیں پر بیوی.....“ جب وہ شرارت سے ایسا کہتا تو میں اس کا کان پکڑ کر مروڑ دیتی۔

”تو پھر مانگی ہوئی چیز کتنے دن چلتی ہے؟ آخر تمہاری مالکن تمہیں مجھ سے چھین کر لے جائے گی۔“ ایک ڈر میرے

اندر سے اٹھتا۔

”وہ میری مجبوری ہے شاہن، اور تم میرا عشق ہو، مجبوری کبھی بھی عشق سے جیت نہیں سکتی۔“ وہ میرا دل رکھنے کے لیے کہتا تو میں مجبوری اور عشق کی اس منطق میں سب کچھ بھول جاتی، یاد رہتا تھا تو صرف سکندر کا پیار اور ساتھ، جس کے لیے میں ہر قربانی دینے کو تیار تھی، وہ پھر دیر تک میرے لیے بالوں سے کھیلتا رہتا، یا پھر میرے پاؤں اپنی گود میں رکھ کے بیٹھ جاتا، عورت کا چاہنے والا اس کے قدموں میں بیٹھا ہو تو وہ اپنے آپ کو نور جہاں سمجھنے لگتی ہے، اس حکومت کا نشہ بھی تخت طاؤس سے کم نہیں ہوتا، اس نشے میں، میں گناہ اور ثواب سب بھلا بیٹھی تھی۔

گرمیوں کی چغیاں تھیں، سکندر دو ہفتے کے لیے کاروباری دورے پر گیا ہوا تھا، اچانک ایک صبح میرا دل گھبراہٹ، مجھے لگا میں ماں بننے والی ہوں۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، حواس باختہ سی ہو گئی، سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ خوشی سے جھوموں یا اداسی کی کالی چادر اڑھوں، ہنسوں یا ردوں، میں اندھروں، اجالوں میں گم قسم سی کھو گئی، پھر جھٹ پٹ میں نے سکندر کے دفتر فون کیا، لیکن پتا چلا وہ ابھی واپس نہیں آیا، کئی روز گزر گئے، کچھ ایسا احساس تھا جو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ صرف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ سکندر کو پتا چلے گا تو خوشی سے پاگل ہو جائے گا، میں فوراً اس کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی، مجھے اس لمحے کا بے چینی سے انتظار تھا لیکن اس کا کچھ معلوم نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے، جب بھی فون کرتی تو جواب ملتا ضروری کام سے باہر گئے ہوئے ہیں، موبائل پر نمبر ملائی تو نمبر بند ملتا تھا۔ اچانک ایک روز اس کا فون آیا، وہ ایئر پورٹ سے ہی بول رہا تھا، میں نے آن کی آن میں اسے خوشخبری سنا دی، کچھ لمحوں کے لیے اس نے چپ سا دھلی۔

”آج ڈاکٹر کے پاس چلی جانا، وہ سب ٹھیک کر دے گا۔“ اس کے الفاظ تھوڑے کی طرح میرے دماغ پر لگے۔

”کیا ٹھیک کر دے گا۔“ میں کچھ کچھ ہنستے ہوئے بے چینی سے بولی۔

”اس ہفتے جا کر ایورٹن کراؤ، پہلے ہی دیر ہو چکی ہے،

مزید دیر مناسب نہیں۔“ اس نے جیسے حکم دیا ہو۔

”ابا رہن! برکیوں“ میں بوکھلا گئی۔

”کیوں کا کیا مطلب؟“ میں فارسی بول رہا ہوں جو

تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔“ وہ پہلی بار مجھ سے تلخ اور اونچے لہجے میں مخاطب ہوا تھا۔

”لیکن میں اس بچے کو جنم دینا چاہتی ہوں، یہ تو

ہمارے پیار کی نشانی ہے، بچے پیار کی نشانی۔“ میں نے اپنی وکالت خود ہی کرنا چاہی۔

”اُدھ، شٹ اپ! میں پہلے ہی دیکھی ہوں، ڈونٹ گوئی دس ٹکل شٹ، ایک عورت نے پہلے زندگی جہنم بھاری ہے، اب دوسری آگئی ہے۔“ وہ آہے سے باہر ہو گیا۔

”پر سکندر“ میں بولنے لگی تو اس نے دھاڑنے کے انداز میں مجھے ٹوکا اور بولا ”فضول باتیں سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں، میں اور بہت سے کاروباری معاملات میں الجھا ہوا ہوں، چپ چاپ ڈاکٹر کے پاس جاؤ، خرچا میں برداشت کروں گا۔“ اس نے یوں مشورہ دیا کہ جیسے میرے سر میں درد ہے اور جا کر گولی لے آؤں۔

”بات سنو سکندر، میں ماں بننا چاہتی ہوں، آپ کے بچے کی ماں، جب آپ میرے پاس نہیں ہوں گے تو آپ کی نشانی مجھے آپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی، بلاوجہ غصہ نہ کرو۔“

”الو کی ہنسی، ماں بننا چاہتی ہے، ہزاروں عورتیں روز ماں بنتی ہیں، یہ کوئی نیا کام ہے؟ تیرے ماں بننے سے کون سے سرخاب کے پر لگ جائیں گے، بے وقوفی چھوڑ، عقل سے کام لے، مجھے تمہارا سہارا چاہیے، جب میں تمہارے پاس آتا ہوں تو غم بھاگ جاتے ہیں، دکھ بھول جاتا ہوں، میرے لیے دردِ دوسرہ نہ ہو، اور پھر تم کنواری ہو، ناچائز بچے کو معاشرہ بھی قبول نہیں کرتا، سبھی اسے حرام کا کہیں گے، تم کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہو گی۔“ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا، مجھے لگ رہا تھا میرے سر میں کوئی کیل ٹھوک رہا ہے۔

”حرام کا کیوں، تم باپ ہو اس بچے کے، ہماری شادی نہیں ہوئی تو کیا ہوا، رب تو جانتا ہے کہ میں تمہارے بچے کی ماں ہوں۔“ میں نے بڑے یقین سے کہا۔

قانون کے مطابق نہ تم میری بیوی ہونہ میں اس بچے کا باپ، مجھے جذباتی بلیک میلنگ پسند نہیں، اور نہ ہی میں کسی کورٹ پکچر میں جا کر کہنا ہے کہ میں تمہارے بچے کا باپ ہوں، تمہیں گھر لے دیا، سیٹل کر دیا، بس اس سے زیادہ مجھ سے کوئی اُمید نہ رکھنا، تمہارے ماں بننے کے شوق میں میں اپنا گھر اجاڑ لوں، لاکھوں کا بزنس ڈوب لوں، میرے بچوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا، کبھی سوچا تم نے۔“ وہ مزید بھڑک گیا۔

اپنے ارمانوں کا یوں بے زردی سے خون ہوتا دیکھ کر میں نے حوصلہ جمع کیا اور بھیک مانگنے کے سے انداز میں

بولی۔ ”پھر بھی آپ سوچ سمجھ کر بتاؤ، گرم ہونے کے بجائے نرم ہو کر احساس کرو کہ آپ کیا رہے ہو۔“
 ”فالتو باتیں سوچنے کا میرے پاس وقت نہیں، میں ان چھٹیوں میں بچوں کو لے کر امریکا جا رہا ہوں، مجھے فون نہ کرنا۔“ یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا، مجھے لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن بند ہوتے ہوئے رہ گئی ہو۔

وہ ہو گیا تھا جو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، میرے کبھی وہم و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے، میں ”صمم بکم“ کی عملی تصویر بن کر رہ گئی، بے حیائی کا جو برق میں نے منہ پر لے لیا تھا، اس نے یہی چند چڑھنا تھا، مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ سکندر مجھے یوں زندگی کے تصور میں چھوڑ کر چلا جائے گا، وہ ایسے پیٹھ دکھائے گا، میری آنکھوں سے بے بسی کے آنسو نکلے اور میرے گال بھگوئے ہوئے گردن میں جذب ہو گئے۔ مجھے خود پر ترس آیا، میں کیا کل کھلا بیٹھی تھی، گھر سے باغی بن کر نکل، پیار میں ایسی دیوانی ہوئی کہ سماج کی بھی پروا نہ کی اور اپنی سونے بھی جوانی سکندر کے مہر و کردی، وہ مجھے استعمال کرتا رہا، اور موقع آنے پر چوروں کی طرح منہ چھپا کر بھاگ گیا، ماپوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گری میں رو رہی تھی نہ بس رہی تھی، لیکن آنکھیں نم ہو رہی تھیں، فلیٹ میں تنہا بیٹھی تھی، اسی فلیٹ میں جس میں میرے سکندر کی تصاویر آویزاں تھیں، یہ فلیٹ مجھے کسی عبادت گاہ کی طرح لگتا تھا، آج اسی فلیٹ میں، میں خود کو کسی کوٹھے والی کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ میرے دل میں ٹیس سی اٹھی، میں اپنی ہی نظر میں گری جا رہی تھی، مجھے خود سے بدبو آتی لگی، نفرت محسوس ہونے لگی، دل چاہا کسی گاڑی کے نیچے جا کر سر دے دوں یا بلند نگ سے چھلانگ لگا کے اس نجاست والے جسم کو موت کے سپرد کروں اور ایک خط لکھ کر کہہ جاؤں کہ میری زندگی برباد کرنے والا سکندر ہے، میرا کلچر پھٹنے کو آیا تھا، لیکن مرنا اتنا آسان کہاں ہے۔ سوچوں میں گم میں قائلین پر ہی لیٹ گئی کہ کروں تو کیا؟ اچانک دماغ میں خیال آیا، سکندر بھاگ گیا تو کون سا طوفان آ گیا، کل ڈاکٹر کے پاس جا کر ساری کہانی ختم کر ڈالتی ہوں، جیسے میرے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو، میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا اب اس بے وفا کی شکل نہیں دیکھوں گی، اپنے مہما، پیا کے پاس واپس چلی جاؤں گی، دوسرے روز میں ڈاکٹر کے پاس گئی، ادھیڑ عمر لیڈی ڈاکٹر نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ٹھکر کی کوئی بات نہیں، 10 منٹ لگیں گے، میں اگلے

بہتے کا وقت لے کر گھر آ گئی، صرف ایک ہفتے کی مصیبت، پھر میں فری ہو جاؤں گی، فلیٹ چھوڑنے کے لیے میں نے وہ سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا جو میں گھر سے لائی تھی، الماری میں پڑا اٹیچی کیس اٹھانے کے لیے میں کرسی پر چڑھ گئی، اٹیچی کیس بھاری تھا، مجھے کافی زور صرف کرنا پڑ رہا تھا۔
 ”کہیں بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔“ جیسے میرے اندر سے آواز آئی۔

”پھر کیا ہے، تم نے کون سا ایسے جنم دینا ہے، اچھا ہے جان چھوٹے گی،“ یہ دماغ کی آواز تھی۔ دل سے آواز آئی ”نہیں وہ اور بات ہے لیکن اس طرح زور آزمائی سے بچے کو تکلیف پہنچے گی“ اندر کی اس کشمکش کے نتیجے میں، میں نے اٹیچی کیس برائعت کیجی، نہ جانے ایسا کیا تھا کہ جو مصیبت میرے پیٹ میں تھی مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی۔

کام سے میں نے دو ہفتے کی چھٹیاں لے لیں، دل بھر کر کھاتی کہ کہیں بچہ بھوکا نہ رہ جائے، خوب آرام کرتی کہ جتنی دیر وہ ماں کی کوکھ میں سے آرام سے تو رہے پھر تو..... میری آنکھوں سے آنسو پھم پھم برسنے لگے، میرے اندر جیسے کوئی کھلونا وجود میں آ رہا تھا، اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، سوتے ہر وقت تو جس کی طرف رہتی، کہیں کوئی عضون ٹوٹ جائے اس کھلونے کا، میں دھرتی کی طرح سرسبز و شاداب ہو گئی، آئینے میں اپنا ہی روپ نہ پہچان سکی، کتنی پیاری لگ رہی تھی میں خود کو۔

”تم ماں بننے والی ہوشیار ہیں، تمہیں دنیا کا سب سے بڑا رتبہ مل رہا ہے، تمہارے حسن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ شیشے میں سے میرے عکس نے کہا۔

”لیکن یہ بچہ ناجائز ہے، تم پاکستانی ہو اور پاکستانی معاشرہ کسی ناجائز بچے کو برداشت نہیں کرتا، یہاں انسان کی بنائی ہوئی روایات ہیں اور قانون کا پہرہ ہے۔“ میں نے عکس کو جواب دیا، عکس نے جیسے بحث شروع کر دی۔ ”رشتہ کوئی بھی ہو ناجائز نہیں ہوتا، مقصد یہ ہے کہ آپ کسی رشتے کا کتنا تقدس کرتے ہیں، کتنی ایمان داری سے اسے نبھاتے ہیں۔“

”پر..... پر میں اکیلے..... سماج..... بچہ..... ماں..... باپ..... رشتے..... نہیں نہیں، میں یہ بوجھ اکیلے کیسے برداشت کروں گی، بچے کے باپ کا ہونا بہت ضروری ہے، معاشرہ بچے کے باپ کا نام پوچھتا ہے، میرے تو بچے کے ماتھے پر لکھا ہوا گاس کا باپ چور ہے، نہیں میں اپنے سکون کے لیے اس بچے کو اتنی بڑی سزا کیوں دوں۔“ میں آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

آپ کیسے پڑھ لکھے؟ عقل مند انسان ہیں؟

آپ کو تو ہمارے خمیرہ مروارید غنبری صندل
بادام والا معتدل بارد کے فوائد کا علم ہی نہیں

ہمارا خمیرہ مروارید بچے موتی والا مقوی قلب اور
مقوی دماغ ہے۔ دل کی بندش ریا نہیں کھولتا ہے
دماغی میموری کی اصلاح کرتا ہے۔ جسمانی
نشو و نما گروتھ میں اضافہ کرتا ہے۔ فیملی کے تمام
افراد کے لئے یکساں مفید ہے۔ دل کی گھبراہٹ
دل کی تیز دھڑکن اور ہائی بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا
ہے۔ خون کی کمی پوری کرتا ہے۔ گھریلو تمام
پریشانیوں تفکرات سے نجات دلاتا ہے۔ تمام غم
بھلا کر دل کو راحت، جگر کو ٹھنڈک اور دماغ کو
سکون بخشتا ہے۔ انتہائی خوش ذائقہ، مسورکن، مہک
والا خمیرہ مروارید غنبری معتدل صندل والا آج ہی
فون کر کے بذریعہ ڈاک دی پی VP منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون اوقات

صبح 10 بجے سے شام 6 بجے تک

مجھے احساس ہوا ان لمحات میں کہ بچے کے باپ کا پاس
ہونا کتنا ضروری ہے، میں اکیلی عورت، مجھے رونا آ گیا، نہ
سکندر کا فون آیا نہ میں فیصلہ بدل سکی۔

ڈاکٹر کے پاس جانے سے ایک رات قبل میں مسلم
کیونٹی ہال، اس عالم کے پاس گئی جہاں وہ دین و دنیا کا درس
دیا کرتی تھی، دوسری خواتین کے ساتھ میں بھی چپکے سے دوپٹا
اوڑھ کر بیٹھ گئی، معلمہ کا درس جانے کب سے جاری تھا۔ میری
سماعت سے یہی جملے ٹکرائے ”اگر ہم زمین سے پودا بھی
اکھاڑیں تو مٹی جڑوں کے ساتھ نکل آتی ہے، جو حمل ضائع
کراتی ہیں وہ قہر کی مرکب ہوتی ہیں، جو روح اللہ اس دنیا میں
بھیجا جاتا ہے تم کون ہو کون ہو کون اس کو آنے سے روک سکو۔“
رب کے بعید رب ہی جانتا ہے، میں روتی روتی گھر آ گئی۔ گھر
پہنچ کر میں دوسرے روز ڈاکٹر کی طرف جانے کی تیاری
کرنے لگی۔

رات کا آخری پہر ہوگا کہ میں جیسے سوتی جاگتی کیفیت
میں تھی کہ میرے اندر سے آواز آئی۔ ”تمہاری کوکھ میں
”میں“ ہوں ماں!..... ماں..... جیسے میں یہ لفظ دوبارہ سنا، جیسے
میرے ننگے پیٹ سے کوئی چھوٹا سا بولنگڑہ چمٹا ہوا ہو، اس کے
چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں کی حرکت میں نے اپنے پیٹ پر
محسوس کی، خود بخود ہی میرا ہاتھ پیٹ پر چلا گیا، اپنے اندر میں
نے کوئی جیتی جاگتی چیز محسوس کی، جو حرکت کر رہی تھی،
اندھیرے میں، میں نے اپنے اندر جھانکا، مجھے لگا جیسے دو چھوٹی
چھوٹی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں، ان آنکھوں نے جیسے پکارا۔
”ماں“ مجھے جھرجھری سے آگئی، جسم میں سنسناہٹ سی محسوس
ہوئی، میں جیسے ٹھنڈے پسینے میں بھج گئی، پھر میں نے بے
خودی کے عالم میں اپنے ہی پیٹ کو زور سے ہتھی ڈالی۔

”میرے بچے..... میں تجھے جنم دوں گی، معاف کر دو،
میں تمہیں اپنی خود غرضی کی سمیٹ چڑھانے لگی تھی، تمہارا باپ
چور ہے، لیکن تمہاری ماں تمہاری ہے..... ہاں تمہاری ماں تو
تمہاری ہے، میرا تکیہ آنسوؤں سے بھج گیا۔ مجھے بہت ہی
سکون محسوس ہوا، ایک عجیب سی لذت میرے سر آپے میں
سراعت کر گئی، جیسے کسی نے میرے جسم میں کوئی جادوئی طاقت
داخل کر دی ہو۔ میں اسی وقت اٹھی، اپنا سامان سمیٹا، صبح ہی
ڈاکٹر کو فون کیا کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے، اس کے بعد کبھی
میں نے ماضی میں جھانکا، نہ پچھتائی اور نہ ہی زندگی سے کوئی
شکوہ کیا کہ کیا ہو رہا ہے۔

فلٹ چھوڑ کر میں نے کرائے پر ایک کمرالے لیا، کام پر

جانا شروع کر دیا، کچھ ہی روز گزرے ہوں گے کہ میرا راز افشا ہونا شروع ہو گیا۔ آخر تک میں چھپا سکتی تھی۔ ماما کو پتا چلا تو اپنا سر پیٹ کر رہ گئی، لیکن میرے کانوں نے میرے اندر سے ”ماں“ کا جو لفظ سنا تھا، اس کے بعد تو دنیا کی ہر آواز میرے لیے جھوٹی ہو کر رہ گئی تھی، میری برداشت بہت بڑھ گئی، میں ”ماں“ کا لفظ سرام سننا چاہتی تھی، گو کہ انگلیٹنڈ کا معاشرہ اور تھا، وہاں ایسی باتوں پر لوگ زندگی گزار نہیں کرتے پھر بھی کوئی دلی دہی کسی کے ساتھ میری طرف دیکھتیں۔ 9 مہینے میں نے لوگوں کے طعنے سن کر، طنزیہ نظریں سہہ کر نکالے، میں نے ان عورتوں کی کتابیں بھی پڑھیں جنہوں نے میری طرح اکیلے میں بچوں کو جنم دیا تھا..... پھر وہ دن آ گیا جب میرے وارث نے روتے ہوئے دنیا میں اپنی آمد کا اعلان کیا، مجھے لگا جیسے میری ساری محنت کا ثمر مجھے آج مل گیا ہے، نہ دنیا سے کوئی گلا شکوہ رہا اور نہ ہی سکندر کی بیوفائی یا درہی، وارث کو دیکھ کر جیسے میرے جسم میری روح کی ساری تھکاوٹ ختم ہو گئی تھی۔

عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اس کے لیے دنیا کے سارے رشتے چھوٹے ہو جاتے ہیں، سکندر بے شک مجھے پیٹھ دکھا کر چلا گیا تھا لیکن اس تک جیسے ہی بچے کی خبر پہنچی، ایک روز وہ بھی آ پہنچا۔

”تمہیں سمجھایا تھا اس مصیبت میں مت پڑو، اب کتنی مشکل میں ہو۔“ اس نے ہمدردی جتانے کی سعی ناکام کی، میں نے اس کے بات کا جواب دینا گوارا نہ کیا۔

”چلو جو ہونا تھا وہ ہو گیا، فلیٹ میں واپس چلو، میرا بچہ کرائے کے گھروں میں پہلے بڑھے مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا، ہم زمیندار، جاگیر دار ہیں، راجوں مہاراجوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں، ایسی لائف تو ہمارے نوکر چاکر بھی نہیں گزارتے“ اس کے اندر کا باپ بول رہا تھا۔

”سکندر یہ بچہ وہی ہے جس کے پیدا ہونے کی خبر سن کر تم نے فون کرنا اور سننا بھی بند کر دیا تھا۔ وہ اکیلی ماں کا بچہ ہے..... مزدور ماں کا، میں نہیں چاہتی وہ کسی دھوکے میں رہے، میں اس کے من میں ان دیکھی ان چاہی خواہش پیدا نہیں ہونے دینا چاہتی، وہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا نہیں ہوا، اس لیے میں چاہتی ہوں وہ جس حال میں ہے اسی میں پہلے بڑھے، میں اسے جموٹے خواہوں کا اسیر نہیں بنانا چاہتی۔“ میری چھٹی باتیں سن کر سکندر چلا گیا۔

وارث پرورش پانے لگا، میں نے ایک ڈے کیئر سینٹر کا بندوبست کر لیا تھا، میری ڈیوٹی کے اوقات میں وہاں کی

گورنرس اس کو سنبھالتی، شام کو کام سے تھکی ہاری آتی تو وارث کو دیکھ کر جیسے میرے تن بدن میں نئی جان پڑ جاتی، کچھ ایسے ادھار لے کر میں نے چھوٹا سے اپنا گھر خرید لیا۔ سکندر نے بھی جان نہ چھوڑی اور پھر میرا کھون لگا لیا اور آ کر ایک دن میرے پاؤں پکڑ لیے، ”نہیں رب کا واسطہ میرے گناہ کی سزا میرے بچے کو تو نہ دو، اسے باپ کے پیار کی ضرورت ہے۔“

وہ کبھی کبھی وارث سے ملنے آ جاتا تھا، میں نے نوٹ کیا کہ جب کبھی سکندر نہیں آتا تھا تو وارث آنے بہانے رونے لگتا، اسے بخار ہو جاتا، میں نے بچے کے لیے یہ سب برداشت کیا تھا، اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی، سکندر کی اداسی مجھ سے کبھی نہ گئی تو میں نے اسے گھر آنے جانے کی اجازت دے دی، گھر میں آنا جانا شروع ہوا تو ایک روز سکندر نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ پہلے کی طرح اپنے قریب آنے کو کہا۔

”تمیز رہو اگر میں نے وارث کی وجہ سے تمہیں گھر آنے جانے کی اجازت دی ہے تو گھر والا بننے کی کوشش نہ کرو، تم کیا سمجھتے ہو میں ماضی کو دہراؤں گی، یہ مت سمجھا میں کمزور پڑ گئی ہوں اور مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے، میں اپنے بچے کو اداس نہیں دیکھ سکتی، اور تمہارا اس کے ساتھ خون کا رشتہ ہے، تمہارے بغیر وہ روتا ہے تو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔“ میرے لہجے کی تپش نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

”میری غلطی معاف کر دو“ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”فصلوں ڈسٹر ب نہ کرو، مجھے بخبری سمجھ رکھا ہے؟ میں

کسی عشرت کدے میں بھی بساط کا مہرہ نہیں ہوں کہ جہاں چاہا اٹھا کر رکھ دیا، اس عذر خواہی سے بہتر ہے کہ کہیں سے عشق کے عرفان کا درس حاصل کرو، محبت تجارت نہیں، نہ ہی کاروبار ہے۔ لگتا ہے اپنے سرور کے لیے اس طرح کی سرمایہ کاری کرنا تم جیسوں کی سرشت ہے۔“ میرے طنز کے تیروں، اندر کے غبار سے اٹے اور زہر میں بیچھے الفاظ نے اس کے اوسان خطا کر دیئے۔ ”جب نبھائی نہیں تھی تو لگائی کیوں تھی، آج کے بعد مجھے چھوٹا بھی تو ہاتھ توڑ کے رکھ دو گی۔“ بچے سے ملو اور جاؤ۔“ میرا غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ”ورنہ میں پوکیس بلا لوں گی۔“ میں نے اسے باہر کا رستہ دکھایا، اس نے چپ سا دل، بچہ اس کی کمزوری تھی پھر وہ چپ چاپ آتا وارث سے کھیلتا اور چلا جاتا۔

بالا خرابات سکندر کی بیوی تک پہنچ ہی گئی، وہ غصے میں جلی جی میرے گھر آ پہنچی۔ گھر میں تھکتے ہی اس نے کہا۔ ”بذات تمہیں میرا ہی گھر ملا تھا جاؤ نے کو، تھوڑی دینا ہے،

کسی اور کے گھر ڈاکا ڈال لیتی، ایک یہ پیدا کر لیا ہے، حصہ مانگنے کے لیے۔“ وہ وارث کی طرف بڑھی۔
 ”بہن جی!“ میں بھاگ کر بچ میں آگئی، مجھے جو مرضی کہہ لیں۔“ میں آپ کی چور ہوں، پر بچہ.....“
 ”چپ کر کلمہ ہی، زیادہ اچھا بننے کی کوشش نہ کر میرے سامنے، میں تم جیسی عورتوں کو اچھی طرح سے جانتی ہوں، دوسروں کے خاندانے بس میں کر لینا تو تمہاری جیسی عورتوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن میں بھی کسی گئے گزرے خاندان سے نہیں ہوں، بڑی ڈاڈھی عورت ہوں میں، تم جیسی کئی آئیں اور انکس پر سکندر کو مجھ سے نہیں چھین سکیں، میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو پریشان ہو کر دوسرے دن ہی خلع کا کس کر دیتی ہیں یا طلاق مانگ لیتی ہیں۔ میں یہی سمجھتی ہوں کہ میرا آدمی دو گھنٹے بھری کے کوٹھے پر جاتا ہے، پر رات کو میرے پاس میرے گھر ہی آتا ہے، تمہارے جیسی دس بھی آ جائیں تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، پرانی آگ پر کتنے روز خود کو سینک لوگی، آخر آدمی تو میرا ہی رہے گا۔“ وہ انگارے برساتی، دل پر چر کے لگاتی چلی گئی۔

مجھے اس پر ترس آیا، دھوکا تو اس کے ساتھ بھی ہوا تھا، میرے من میں تھا کہ حدیقہ بد صورت سی ہوگی لیکن وہ تو من موہنی صورت، پتلے پتلے نین نقش اور بھرے بھرے جسم والی خوبصورت خاتون تھی، میں خود کو کون سے لگی، انجانے میں ایک شادی شدہ مرد سے پیار کر کے میں نے کتنی بھانک غلطی کی تھی، شاید میں حالات کے دھارے میں بہہ گئی تھی، لیکن میرا قصور کیا تھا، سکندر نے ہی حدیقہ کا ایسا غلط نقشہ میرے سامنے کھینچا تھا، میں اس غلط فہمی کے راستے پر ایسے چلی کہ ہر ریکور سے بلا سوچے سمجھے گزرتی چلی گئی۔

حدیقہ نے پوری کیونٹی میں ڈھنڈرا پیٹ دیا کہ میں اس کے شوہر کو لوٹ کر کھار رہی ہوں، ایک روز سکندر ہمیں باہر گیا ہوا تھا کہ اس کا لڑکا آ گیا، میں نے روزانہ کھولا ”آئی میرے ڈیڈ آج باہر گئے ہوئے ہیں، اگر تمہارا گزرا نہیں ہوتا تو آج کی رات میں آ جاؤں آپ کے پاس۔“ وہ طنز یہ ہنسی بنا، اس نے مجھے اتنی بڑی دلی دھکی کہ میرے ہوش اڑ گئے، لیکن میں اسے کیا کہتی، پر اس دن سے مجھے حدیقہ سے بھی شدید نفرت ہو گئی۔ جس نے انتقام کے لیے ایک معصوم بچے کا سہارا لیا تھا۔

میرے نزدیک تو پیسے کی پہلے ہی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن اب پیسے والے بری طرح میرے سامنے ننگے ہو گئے

تھے، مجھے لگا ضروری نہیں اچھے پیرہن کے پیچھے شخصیت بھی اچھی ہو۔ امیروں سے میرا جی کھٹا ہو گیا اور میں نے پہلے سے بھی زیادہ محنت شروع کر دی، اور نایم لگانا شروع کر دیا۔ میں وارث کو بہت اچھی تعلیم دلوانا چاہتی تھی، میرے دل کی خواہش تھی کہ وہ بہترین اسکول میں پڑھے اور ایک شاندار، سبھی ہوئی شخصیت کا مالک بنے۔

”مجھ سے ہر ایک نے نفرت کی ہر آدمی نے مجھے ہی غلط سمجھا، شاید میرا بیٹا بھی بڑا ہو کر مجھے ہی قصور وار سمجھے، لیکن اپنے خون پسینے سے اسے پال پوس رہی ہوں، اس میں ساری عادتیں اپنے باپ والی ہیں، وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، وہی مسکان، جب یہ میرے ساتھ کھیلتا ہے میرے پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے سکندر میرے سامنے بیٹھا ہے، سکندر کو تو معاف نہیں کر سکتی، معاف بھی کیا کروں میں کون سا اس سے نفرت کرتی ہوں، نفرت بھی تو اس سے کی جانی ہے جس کی آپ کی نظروں میں کوئی اہمیت ہو، جو بندہ نظروں سے گر جائے وہ نفرت کے قابل بھی نہیں رہتا، کسی نے سچ ہی کہا کہ انسان پہاڑ سے گر کر تو شاید اٹھ جائے لیکن کسی کی نظروں سے گر جائے تو پھر زندگی کا آخر سمجھے، اب میں اور میرا بیٹا، بس یہی میری زندگی ہے..... اگر یہ نہ ہوتا تو ہوتا نہیں میں آج کہاں ہوتی۔“ شاہین نے اپنی کہانی کا اختتام کیا۔

”شاہین تمہارا بچہ بہت کیوٹ ہے کیا تجھے کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ ایک وینڈر شخص بنے اپنے رب کو اور اس کے دین کو سمجھے۔“ میں نے کہا۔

”ایک دفعہ جب دارث 6 سال کا تھا اسکول سے آیا، رات کو اسے سنانے کے لیے میں جب اسے کہانی سنانے لگی تو اس نے کہا ”مم ٹیل می سم تھنک اباؤٹ اسلام اینڈ ہاؤس آف گاڈ“ آئی وائنٹ تو سی دی ہاؤس آف گاڈ وین دی گوڈ ویز۔“ جب اس نے میری گردن کو اپنی چھوٹی چھوٹی ہاتھوں میں لپیٹا تو مجھے تب لگا کہ جیسے میرا بھی کوئی من میرے بیٹے میں ہے، مجھے اس پر بے تحاشہ پیار آیا۔ میں چاہتی تھی کہ اسے اللہ کا گھر (خانہ نعبہ) بھی دکھاؤں۔ میں پہلے پاکستان لے جا کر اسے وہاں کا ماحول، جگہ جگہ موجود اللہ کے گھر (مساجد) دکھانا چاہتی تھی، وارث کی پرورش کے ساتھ ساتھ میں نے باقاعدگی سے دین کی تعلیم بھی لینا شروع کر دی تھی، میرے اندر ایمان کا دیار روشن ہو چکا تھا، ایک روز عالمہ بیان کر رہی تھی ”بے پردہ عورتیں جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکیں گی۔“

1792ء میں لندن میں ایک عورت تھی جس کا نام میری دول سٹون کراں تھا۔ اس نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ عورت کو آزاد کیا جائے، اس سے نکل یورپ کی عورت بھی آزاد نہ تھی۔ اس عورت کے مطالبے پر یہاں عورتیں آزاد ہو گئیں یہ آزادی انہیں کہاں لے گئی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے لندن میں 1998ء میں ایک سروے ہوا جس میں عورتوں سے پوچھا گیا کہ وہ گھریلو زندگی جینا چاہتی ہیں یا مادر پدر آزادی کی ہی خواہاں ہیں، تو 98 فیصد خواتین نے جواب دیا تھا ہم گھر لوٹنا چاہتی ہیں، لیکن ہمیں خاوند کوئی نہیں ملتا، بوائے فرینڈ ملتے ہیں، جو استعمال کرتے ہیں پھر نشو و نما کی طرح پھینک دیتے ہیں۔“

میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا، لیکن میں نے تو یہ کامن پکڑ لیا، دن میں کئی بار اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں، اب میرے دل میں ایمان کی شمع جل اٹھی ہے، اندر کی دیرانیوں میں بہا رہی ہے تو ساتھ قرار بھی آ رہا ہے۔ ہر کیف! میں نے اپنے وارث کو پاکستان لے جانے کے لیے چند روز بعد کے کنکٹ بک کرا لیے، سکندر کو معلوم ہوا تو اول نول بکتا رہا۔“ بچے کو لے کر کہاں جاؤ گی، اس گرمی میں! بیمار ہو جائے گا۔“ لیکن میری ضد کے آگے اس کی ایک نہ چلی، وہ بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔

وہ مجھے اپنے گاؤں لے گیا، میرے اندر جیسے کوئی دیا روشن ہو گیا ہو، شاید وہ مجھے اپنے والدین کے گھر لے جائے گا، شاید وہاں جا کر ہی وہ اس رشتے کو کوئی نام دے دے، میرا مان سامان رکھ لے، لیکن وہ مجھے ایک کھوہ والی حویلی میں لے گیا، کھیتوں میں کھوہ کے قریب ایک کچا کپکا گھر تھا، وہیں شاید خاص مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے گیسٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔ مجھے پھر اپنی اوقات یاد آ گئی، دل میں روشن ہونے والا دیا نفرت کے جھوٹے بھانپا، نہ تو اس کے گھر والوں سے کوئی مجھے ملے آیا اور نہ ہی وہ مجھے گھر لے کر گیا، شاید لوگ کہتے ہوں گے انگلینڈ سے کوئی گرل فرینڈ آئی ہوگی۔

ہم نے سارا پنجاب دیکھا، ملتان میں اولیاء اللہ کے مزاروں پر گئے، لاہور میں بادشاہی مسجد دیکھی، داتا دربار جا کر دعا مانگی، اسلام آباد میں فیصل مسجد دیکھی، وارث یہ سب دیکھ کر مہبوت سا تھا۔ واپسی سے ایک روز نکل میں وارث کو لے کر ایک ولی اللہ کے دربار پر حاضری کے لیے گئی کہ اللہ سے دعا آئوں میری کوتاہیاں معاف کر دے، میرے ساتھ ایک ماہ کے لیے رکھی گئی ماسی بھی تھی، وہ ہر جگہ وارث کو گود میں اٹھائے

میرے ساتھ ہوتی تھی، میں قریب ہی ایک ایسی مسجد میں گئی جہاں خواتین کے جمعہ کی ادائیگی کا بھی انتظام تھا، مسجد کا اوپر والا حصہ خواتین کے لیے مخصوص تھا، وہ بھی جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی ادائیگی کے بعد مغلہ نے پوچھا ”یہ بچہ کون ہے؟“

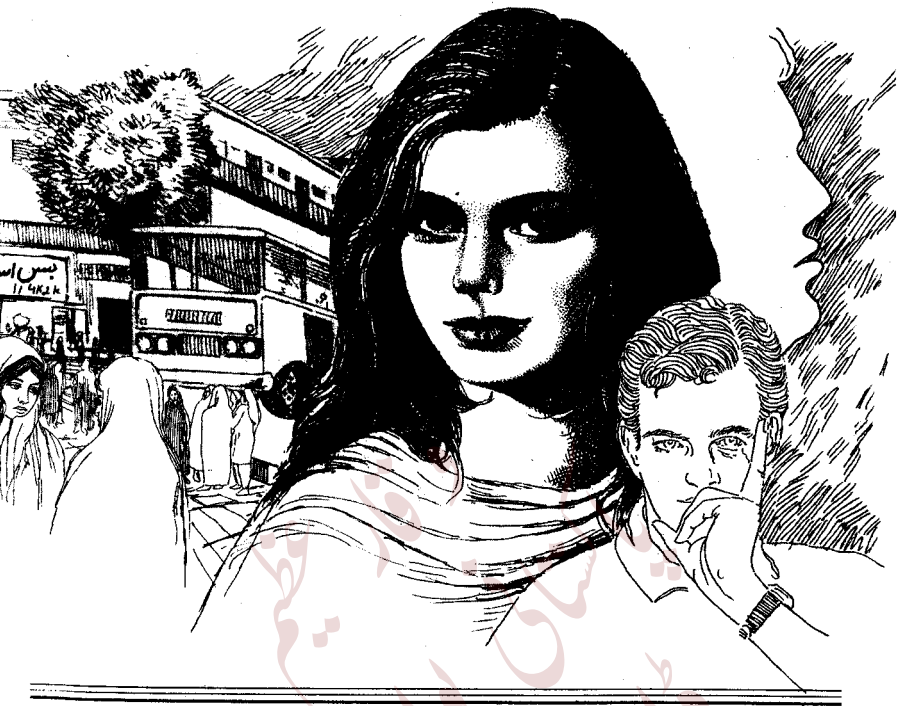
”ذلت سے چھوٹی چودھرائی جی آئی ہیں، بی بی جی اپنے سکندر بابو کی گھر والی ہیں، یہ بچہ انہی کا ہے۔“ مغلہ نے وارث کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھیرا، ماسی اور مجھے بھی دعائیں دیں، مسجد کے صحن میں آ کر میرے دل کی جو حالت ہوئی وہ میں ہی جانتی تھی، ماسی نے مجھے وہ رتبہ دے دیا تھا جو کوئی بھی دینے کو تیار نہ تھا، میرے اندر پھر دیئے روشن ہو گئے۔ میں ماسی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی، اور جی بھر کر روئی، وارث کی پیدائش کے بعد آج میں پہلی بار روئی تھی، ماسی نے مجھے آنکھوں پر جگہ دی تھی۔

”آفرین ہے ماسی تم پر، تم نے ماں کا منصب تو جانا۔“ میرے منہ پر شوق پڑی تھی لیکن آنسو رکے کا نام نہ لے رہے تھے۔

”بس کرو چودھرائی جی، ہمیں کیا نہیں پتا، سب جانتے ہیں! پر کہہ نہیں سکتے، منہ کو قفل لگے ہوئے ہیں، بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، ہم تو کی کمین ہیں لیکن پتا ہر بات کا ہے، بھلا دادی سے پیٹ بھی کبھی چھپا ہے، میں کیوں جھوٹ بولوں، رب کے گھر میں کھڑی ہوں۔“ پتا نہیں وہ کیا کیا بولے جا رہی تھی، لیکن میرے کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

سکندر کے گھر والی..... سکندر..... کے..... گھر..... والی..... چھوٹی چودھرائی..... چودھرائی..... سکندر کا کا..... سکندر کا کا..... سکندر..... چودھرائی..... کا..... ماسی کے مقدس الفاظ نے جیسے میرے سارے دکھ، درد، غم، گلے، شکوے جڑ سے ختم کر دیئے تھے، سچی میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اسے ”وارث“ کو اس رب کا نیک بندہ بناؤں گی جس رب کے گھر میں پہلی بار کسی نے مجھے پہچانا تھا، عزت و توقیر کی چادر سے میرا گناہ گار سر ڈھانپا تھا، ماسی کا چہرہ مجھے بڑا ہی مقدس لگا، میں نے غم آنکھوں سے ماسی کو دیکھا اور بے خودی کے عالم میں آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور میں نے لوٹ کر انگلینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا، خواب کی طرح ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر بچے کو لیا اور نہایت خاموشی سے یہاں امریکا آ گئی کیونکہ یہاں مجھے بھرپور قانونی تحفظ ہے۔ اگر سکندر ڈھونڈ بھی لے گا تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔





شریک سفر

جناب من

مؤدبانہ سلام

ارسال کردہ سچ بیانی میرے ایک دوست کی ہے جس نے اپنے باپ کی دی ہوئی زبان کا پاس رکھتے ہوئے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی جو مکمل طور پر بھٹک گئی تھی مگر وہ اسے راہ راست پر لے آیا۔ سبق حاصل کرنے کے لیے اس تحریر کو ضرور شامل اشاعت کریں۔

غلام رضا جعفری

(کراچی)

نہ تھا۔ بیک فورس کے مخالف سمت میں اترنے کے لیے چہرہ آگے کرنا ضروری تھا پھر بھی میں لڑکھرائیا گیا مگر فوراً ہی میں نے خود کو سنبھال تو لیا پھر بھی اسٹاپ پر کھڑی ایک لڑکی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ہماری ٹکر ہو جاتی اگر وہ لڑکی خود ہی

گرم زمین پر پیر رکھتے ہی مجھے ایسا لگا کہ جیسے زمین پر انگارے پھیلا دیئے ہوں۔ تپش بہت ہی شدید تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں ننگے پاؤں آگیا ہوں۔
بائیں ہاتھ میں بھاری کارٹن پکڑ کر اترنا آسان بھی تو

ایک طرف کو نہ ہو جاتی۔
 ”سوری.....“ میں نے اس لڑکی سے معذرت کی اور

اشاپ پر کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان ٹھہر کر سستانے لگا۔ پینتا تھا کہ پرنا لے کی طرح جسم سے اہل رہا تھا۔ دھاریں کیڑے کموڑوں کی طرح پینہ پر رہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وزنی کارٹن ایک طرف رکھا اور پینٹ کی جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے کو صاف کرنے لگا تھا کہ وہ لڑکی میرے قریب آگئی۔
 ”آپ دیکھ نہیں سکتے؟“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ تلخ تھا۔ مجھے بہت برا لگا۔ میں نے کہا۔ ”کیوں نہیں دیکھ سکتا۔“
 ”اگر مجھ سے ٹکرا جاتے تو پھر.....؟“ اس نے کہا۔
 ”مگر میں آپ سے ٹکرایا تو نہیں ناں..... پھر آپ سے معذرت بھی کر لی ہے۔“

”ارے واہ بہت اچھا ڈھونگ ہے۔ اتنے لوگوں میں سے ایک میری طرف ہی آتا تھا۔“
 ”تھمر! ہم کوئی ٹکرائے تو نہیں ناں؟“ میں نے جیسے لہجے میں جواب دیا مگر وہ کچھ سننے پر تیار نہیں تھی۔ اونچی آواز میں بولے جا رہی تھی۔ لوگوں کی نظریں ہم پر جم گئی تھیں۔

”یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اگر مجھ سے ٹکرا جاتے تو پھر کیا ہوتا؟“

”تو پھر جو کچھ ہوتا وہ تو ٹکرانے کے بعد ہی ہوتا۔“
 میں نے اس بار ڈرا بلند آواز میں جواب دیا۔
 ”اگر ٹکرا جاتے ناں تو اس کا بہت برا نتیجہ نکلتا۔“ اس نے بھی بلند آواز میں کہا۔

”ارے واہ آپ خواجواہ آتیل مجھے مار والی بات کر رہی ہیں۔“ میں نے بھی تلخ لہجہ اپنا لیا تھا۔ اسی نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔

اسی دوران بس آگئی۔ اس نے ایک نوجوان اترا۔ وہ لڑکھایا اور اسی لڑکی سے ٹکرایا۔ وہ لڑکی اس کی طرف گھوم گئی۔
 ”تمہیں شرم نہیں آتی۔ دکھائی نہیں دیتا۔“ اس نے نوجوان کو جھڑکا۔

”تو ایک طرف ہو جاؤ ناں..... بیچ میں کھڑی ہو کر کیا کر رہی ہو۔ کوئی شکار نہیں ملا کیا۔“ اس نوجوان نے اس سے بھی تیز آواز میں جواب دیا۔ اس لڑکی نے جو اس

نوجوان کے بدلے ہوئے تیر دیکھے تو ذرا آگے جا کر کھڑی ہو گئی۔

”چلو اچھا ہوا۔ میرے سر سے ہلاٹلی۔“ میں نے سوچا۔

وہ نوجوان بھی کوئی سر بھرا تھا۔ اس نے پہلی بار ہی میں ایسا منہ توڑ جواب دیا تھا کہ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ یوں بھی اس نوجوان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اس لڑکی سے ٹکرا گیا تھا لیکن بس سے اترنے والے ہر ایک کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور کارٹن کو کندھے پر اٹھا لیا۔

یہ ٹھمر کا لونگی کا علاقہ تھا اور مجھے اپنا یہ بھاری کارٹن لے کر ریلوے پٹری کے اس پار جانا تھا۔ ریلوے پٹری کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے بھینسوں کے بازوؤں کو عبور کرنا ایک کٹھن مرحلہ تھا کیونکہ بازوے میں سوکھے اور تازہ گوبر میں سے گزر کر جانا بہت دشوار تھا۔

ان دنوں میں ایک لوکل جوس کمپنی میں آرڈر بکر کے طور پر کام کر رہا تھا اور چھوٹے موٹے آرڈرز کی سپلائی بھی میں خود ہی کر دیتا تھا۔ آج بھی چند ایک دکانوں پر سپلائی دینا تھی۔ اس لڑکی کی تکرار سے میرا وقت برباد ہوا تھا جو میرے لیے ٹینشن کا باعث تھا۔

میرے پاس بائیک نہ تھی اس وجہ سے مجھے بسوں پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ کمپنی والوں نے مجھے موٹر بائیک کے بغیر جاب پر رکھنے سے منع کر دیا تھا مگر میرے ایک دوست عامر جو اسی کمپنی میں کام کرتا تھا اس کی سفارش نے یہ مشکل آسان کر دی اور کمپنی والے مان گئے۔ مختلف علاقوں سے آرڈر بک کر کے کمپنی میں نوٹ کر داتا تو کمپنی سپلائی دے دیتی لیکن چھوٹے آرڈر میں اپنے طور پر ہی سپلائی دے دیتا جس کا مجھے اضافی کمیشن ملتا تھا۔

اس دن کی سپلائی نہیں ہو سکی تھی۔ دو تین دکانوں کے آرڈرز ملے تھے اور اتفاق سے وہ دکانیں بند تھیں۔ موبائل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تو بھی ناکامی ہوئی۔ مجبوراً مجھے کارٹن ایک بار پھر کندھے پر اٹھا کر اسی راستے سے واپس بس اشاپ تک آنا پڑا۔

بس اشاپ پر وہ لڑکی ابھی تک کھڑی تھی۔ جب کہ میں تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اتفاق سے وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی مگر میں نے توجہ نہ دی اور قریب کھڑے لیمو پانی والے ٹھیلے کی طرف بڑھ گیا۔

وغیرہ دیکھ کر ٹائم پاس کرلو۔ شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے اور پھر وقت کے ساتھ سب کچھ نارمل ہو جاتا ہے۔“
عامر نے حسب عادت چیخڑ خان کی۔
”نہیں یار..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر کیا بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔ پھر اٹھ کر ٹیبل تک گیا اور نمکو کا پیکٹ میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔
”کھاؤ داغ کو فریش کرو۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تو دوستوں سے شیئر کر لیا کرو۔“

”کیوں؟“ ایک دم میرے منہ سے نکلا۔ ”اس لیے کہ مسائل کو شیئر کرنے سے نہ صرف مسئلے کا حل نکلتا ہے بلکہ ذہن کا بوجھ ڈپریشن بھی نہیں بنتا۔“ اس نے کسی پروفیسر کی طرح لیکچر دیتے ہوئے کہا تو میں نے اسے صبح ہونے والے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔

”بس اتنی سی بات اور اتنا ٹینشن۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”آئی ہوگی گھر سے لڑ جھگڑ کر۔ شوہر کی ڈانٹ ڈپٹ کا غصہ تمہارے اوپر نکالا ہوگا بے چاری نے۔“ عامر نے کہا اور ٹی وی بند کیا۔ لائٹ آف کی اور مجھے بھی سو جانے کی ہدایت کر کے سو گیا۔

اگلے دو روز بعد میرا کسی کام سے صدر جانا ہوا تو بس اسٹاپ پر کچھ لوگ دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ کسی مرد اور عورت کے لڑنے کی اونچی اونچی آوازیں آرہی تھیں۔ میں بھی معاملے کی نوعیت کو سمجھنے کی غرض سے اس جانب گیا اور وہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہی لڑکی آج پھر ایک نوجوان سے الجھ رہی تھی۔ اس کا لہجہ اسی طرح سچ اور آواز بلند تھی۔ جواب میں وہ نوجوان لڑکا بھی اس کے ساتھ تکرار کر رہا تھا۔ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”وہ تو میں نے خود اپنے آپ کو بچا لیا تھا ورنہ تم تو گھوڑے کی طرح دوڑے چلے آ رہے تھے۔“

”تو اچھا ہونا! آپ نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ خود کو کسی حادثے سے بچانا کوئی بری بات نہیں ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”میں بکواس سننے کی عادی نہیں ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔

”مستزہ شاید آپ گھر سے لڑ کر آئی یا پھر مجھ سے خواہ مخواہ لڑنے کے موڈ میں ہیں۔“
”میرا جی چاہا کہ میں معاملے کو رفع دفع کرادوں اور

میں نے ابھی لیٹوں پانی کا گلاس اپنے منہ سے لگایا ہی تھا کہ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

”ایک گلاس مجھے بھی دینا۔“ اس نے کہا اور ٹیبل پر سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر پینے لگی۔ وہ بالکل میرے قریب کھڑی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر تھیں اور نہ جانے کیوں میں اس لڑکی سے نظریں چرا رہا تھا۔

اس نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھا اور واپس مڑی تو ٹیبل والے نے اس سے کہا۔ ”پیو تو دے کر جاؤ۔“

”ان سے لے لو۔“ اس لڑکی نے میری طرف اشارہ کر کے کہا تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔

”واہ بھئی واہ، مان نہ مان میں تیرا مہمان۔“ میں نے یہ کہا نہیں صرف سوچا تھا اگر میں کچھ کہتا تو وہ ضرور بحث کرنے لگتی اس لیے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ دیکھنے میں تو وہ ٹھیک ٹھاک لگتی تھی مگر میرے خیال میں وہ نفسیاتی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ ضرور پیش آیا ہوگا جس نے اسے اکڑ مزاج بنا دیا تھا۔

”یہ اسی علاقے کی ہے؟“ میں نے شربت والے سے پوچھا۔

”میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں۔“ ٹیبل والے نے ہنس کر کہا۔

”نہیں نہیں..... رہنے دیں۔“ میں نے اسے منع کر دیا۔

”کیا بات ہے؟ پہلی ہی نظر میں لٹو ہو گئے۔“ شربت والے نے شوخ انداز میں کہا۔

میں نے اسے دو گلاس شربت کے پیسے دیئے اور بس کی طرف بڑھا تبھی شربت والے نے بلند آواز میں کہا۔
”ذرا سنبھل کر رہنا پیارے یہ پھر کرائے گی۔“

میں نے اس کی بات کو سنی ان سنی کردی اور بس میں سوار ہو گیا۔

اس لڑکی کی اس حرکت نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ سارے راستے میرے دماغ میں اسی کا خیال آتا رہا۔ دفتر پہنچا تو بھی الجھن گھیرے ہوئے تھی۔ جلدی جلدی آرڈر نوٹ کر لیا اور مال واپس کر کے گھر لوٹ آیا۔

گھر آکر میں نے اپنے جسم کو بیڈ پر گرادیا۔ اس وقت بھی میں ایسی سوچ میں مبتلا تھا۔ برابر والے بیڈ پر عامر لیٹا تھا۔ اس کی نظریں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا ابھی کس کے سپنے جگا رہے ہیں۔ نیند نہیں آرہی تو سووی

اس لڑکے کو سمجھا دوں کہ یہ لڑکی ایسی ہی ہے۔ مت کرو اس کے ساتھ بحث، میں اس کو بھگت چکا ہوں۔“ مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔

”ارے چھوڑو تیار..... کیوں لڑکی سے منہ لگ رہے ہو۔“ ایک صاحب نے اس لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا۔

”کیا کہا؟ میں اس کے منہ لگ رہی ہوں۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ وہ لڑکی اس آدمی سے الجھ پڑی۔ وہ کوئی حراج کا اچھا آدمی تھا جب ہی تو ہنسنے لگا۔ ہجوم کے لوگ بھی ہنسنے ہوئے ادھر ادھر ہو گئے لیکن میرے لیے غور طلب بات یہ تھی کہ یہ لڑکی ہر ایک سے ایسا کیوں کرتی ہے۔ بہر حال یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے مجھے اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس خیال سے میں آگے بڑھ گیا۔ چند ایک جنرل اسٹورز پر میں نے اپنی کمپنی کی پروڈکٹ متعارف کرائی مگر کوئی آرڈر نہیں ملا۔

گھر پہنچ کر لیٹا ہی تھا کہ پیٹنٹ کی جیب میں رکھے موبائل نے واہریشن شروع کر دی۔ میں نے جیب سے موبائل نکالا اور کال ریسیو کی۔

”السلام علیکم!“ میں نے سلام کیا۔ کال ایوکی تھی۔ ”شہزاد خان کے ہاں چلے جانا۔“ رسی گفتگو کے بعد انہوں نے کہا۔ ”شہزاد خان میرے دوست ہیں اس کی بیٹی سے میں نے تمہارا رشتہ پرکھا کر دیا ہے۔“ ابو نے بتایا۔

”ا..... اچھا.....“ میں نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا۔

”شہزاد خان کی طبیعت بھی خراب ہے۔ ان کی طبیعت پوچھ لیٹا۔ میں نے فون پر تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔“ ابو نے کہا اور پھر انہوں نے شہزاد صاحب کا ایڈریس لکھوا دیا۔

یہ خبر میرے لیے خوب صورت تحفے سے کم نہ تھی۔ ایسا حسین تحفہ جو جیٹھا ہر ایک کی زندگی میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو زندگی کی ایک نئی راہ پر چلنے کا دعوت نامہ ہوتا ہے جس میں ایک تنہا مسافر کے ساتھ ایک نیا شریک سفر شامل ہوتا ہے اور پھر زندگی کے اس سفر میں دونوں ہم سفر زندگی کے ہر دکھ سکھ کو شئیر کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔ دل میں ہونے والی خوشی آپ ہی آپ لیوں پر آئی تو چہرہ مکمل اٹھا۔ دل کے کسی نہاں خانے میں چھپی ہوئی وہ خوشی جو بھی محسوس ہی نہ کی تھی۔ آج اپنی تمام تر ازاداریوں کو یکدم عیاں کر رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا

کہ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر فوراً ہی اپنے سسرال پہنچ جاؤں اور دیکھوں تو سہی کہ وہ کون ہے جو میرے مقدر کو چمکانے آرہی ہے۔

”کیا ہوا بھی خیریت تو ہے ناں..... خود بخود مسکرائے جا رہے ہو، اب تھوڑی دیر میں رونا شروع مت کر دیتا۔ یہ نفسیاتی مریضوں کی خاص علامت ہے۔“

عامر کی بات سن کر یکدم میری ہنسی کا فوراً ہو گئی اور میں نے عامر کو ایوکی فراہم کردہ اطلاع کے بارے میں بتایا۔

”یعنی عنقریب میرے دوست کو عمر قید ہونے والی ہے۔“ عامر نے ہنس کر کہا۔

جگاتی آنکھوں میں تصورات لہرائے لگے اور خوب صورت شاداب چہرے اپنے حسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آنے لگے تھے۔ ان تصورات میں آنے والی حسناؤں میں سے کون میری شریک سفر ہونے والی تھی۔ اس بارے میں مجھے خود بھی معلوم نہ تھا۔ کیوں کہ اپنی مقدر کی لکھی ہوئی اس شریک سفر حسینہ کو ابھی تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تو ایک خوب صورت تصویر تھا جونت نئے روپ میں میرے سامنے آ رہا تھا۔

”واپس آ جاؤ۔“ اپنے اس کباڑ جیسے مکان میں۔“ عامر نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تو میں سچ ہی تصورات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔

”کھانے پینے کا بھی کچھ کرو۔ بھوک لگ رہی ہے۔“

اس نے کسی تھانیدار کی طرح رعب دار آواز میں کہا۔ ”میں کچھ لے کر آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ مارکیٹ سے دو عدد برگر لیے اور چائے کا سامان لے کر آ گیا۔ چائے تیار کی اور برگر کھا کر شکر خدا کیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے چار پائی پر لیٹ گیا۔ ابھی دن پوری طرح ڈھلا نہیں تھا لیکن سائے طویل ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں میچ کر لیٹا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بے قراری بڑھ رہی تھی۔ دل تھا کہ بار بار سسرال کی چوکھٹ پر جانے کے لیے اسکار ہاتھا۔ ابو نے جو پتا لکھوا یا تھا جیب سے وہ کاغذ کا پرزہ نکالا اور پڑھا اور پھر ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار اس پرزے پر نظریں جمائیں اور ہٹائیں۔ میں نے اس ایڈریس کو بار بار پڑھا۔

”شہزاد اٹکل کے ہاں جانا ہے۔ میرا وزٹ بھی اسی طرف کا ہے۔“ میں نے عامر سے کہا۔

مارکیٹنگ کے کام سے فارغ ہونے کے بعد حسب

عادت میں منصور سمو سے پکڑے والے کے پاس جا پہنچا۔ یہاں میں اکثر آیا کرتا تھا۔ میرے یہاں پہنچتے ہی وہ ایک پلیٹ میں کچھ پکڑے ایک سمو سر رکھ کر میرے سامنے رکھتا اور خود ہی سامنے والے ہوٹل پر چائے کا آرڈر بھی دے آیا کرتا تھا۔ وہ اخلاق کا بہت اچھا تھا۔

میں نے سمو سے کی پلیٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”یار تم نے اب تک بتایا نہیں کہ تمہارے کتنے بچے ہیں۔“

میرا سوال سنتے ہوئے اس نے کہا۔ ”میری دو بیٹیاں ہیں لیکن اس کی بیوی بیٹیوں کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔“

”کہاں؟ میرے منہ سے یہ سوال بے اختیار نکل گیا تھا۔“

”اپنے گھر..... مجھ سے طلاق لے کر.....“ اس نے کہا۔

”طلاق..... مگر کیوں؟“

”میں نے اپنی مرضی سے طلاق توڑ دی ہی دی تھی، اس نے خودی بھی زبردستی۔ کچھری جانے کی دھمکیاں دینے لگی تھی۔ اسے نی وی میں آنے کا شوق ہو گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی میرے ساتھ۔ مگر ایک شخص کی باتوں میں آ کر اس نے یہ قدم اٹھایا۔“

”دکس کے کہتے ہیں؟“

”وہ بہت مالدار شخص تھا۔ نی وی کے اشتہاروں کے لیے ادا کاروں کو بک کرتا تھا۔ خاص طور پر نئی لڑکیوں کو۔ شروع میں اس نے مجھ سے مشورہ لیا تو میں اس پر بھڑک اٹھا، جواب میں اس نے میرے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ وہ صاف صاف بولی۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ پکڑوں و کوڑوں کا کام۔ میں تو نی وی کے لیے کمرشل کروں گی جو عورت گھر کے کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے دودو دن بالوں میں کنگھا نہیں کرتی تھی۔ اسے پکڑوں پر توجہ نہ دیتی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی، بچپوں کی پڑھائی پر توجہ، پکڑوں، سموں کی تیاری ہر کام کرتی تھی وہ۔ لیکن جب اس کی سوچ بدلی تو پکڑوں کو اداس تک نہ لگنے دیتی۔ بناؤ ستھکار ایسا کرتی کہ جیسے کسی قلم کی ہیروئن ہو۔ اس طرح لڑتے جھگڑتے سال گزر گئے۔ پھر کسی نے اسے شادی کا آسرا دے دیا تو وہ مجھ سے باقاعدہ طلاق کا مطالبہ کرنے لگی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا۔ اس کے ماں باپ کو بتایا۔ انہوں نے بھی اس کو کون طعن کی مگر وہ تھی کہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ پھر جب اس نے کورٹ کچھری کی دھمکی دی تو میں

نے اسے طلاق دے دی۔ میں اسے چھوڑنا تو نہیں چاہتا تھا مگر یہ اس کی ضد تھی۔ اس کی مرضی تھی۔ اس کو دولت کی خواہش تھی۔ میڈیا میں شہرت کا شوق تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔“

”اب وہ کہاں رہتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے باپ کے گھر، سنا ہے اسے بہکانے والے نے بھی اس سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ شاید اسی لیے وہ سکی ہو گئی ہے۔“

”سکی ہو گئی ہے؟“

”ہاں وہ بالکل پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگی ہے۔“

”طلاق کے بعد تم نے اس سے رابطہ کیا؟“

”اس کے والدین برابر والی گلی میں رہتے ہیں اس لیے اکثر نظر آ جاتی ہے۔“ پھر اس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ جارہی ہے۔ نامراد۔“

میں نے اس کی انگلی کے اشارے کی طرف دیکھا تو یکدم ہی چونک گیا۔

”یہ تو وہی لڑکی تھی جو مجھے کئی جگہوں پر دکھائی دی تھی۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“ میں نے پوچھا۔

”تحریم۔“ اس نے بتایا۔ اس کے ساتھ ایک دوسری عورت بھی تھی جو اس سے کچھ بڑی عمر کی تھی۔

”یہ جو اس کے ساتھ دوسری عورت ہے ناں۔“ منصور نے کہا۔ ”اسی نے میری بیوی کو اکسایا تھا۔“ منصور نے کہا۔

وہ لڑکی اور اس کے ساتھ والی عورت کسی بات پر ہنستی ہوئی جارہی تھیں۔ اس لڑکی نے ٹائٹ لباس پہنا ہوا تھا۔

اس کے ساتھ والی خاتون نے بھی اپنے آپ کو خوب سنوارا ہوا تھا مگر اس لڑکی کی طرح اس عورت نے بھڑکیلا لباس نہیں پہنا تھا۔

”یہ اس ناگن کا نیا روپ ہے۔ یہ پورے شہر میں گھومتی ہے۔ کسی سے بھی خواہ مخواہ الجھ پڑتی ہے۔ سنا ہے کہ نفسیاتی ہو گئی ہے۔“ منصور نے کہا۔

منصور اپنے نئے آنے والے گاہک کو ٹیل کرنے میں مصروف ہو گیا اور میں اٹھ گیا میں نے ایڈریس والی پرچی نکالی اور شہزاد صاحب کے گھر کی تلاش میں میں چلی پڑا۔ مجھے ان کا گھر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک دو گلیاں ہی پھرنی پڑیں تھیں۔

شہزاد صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک بڑے صاحب نے سر باہر نکال کر مجھے دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔ پھر پوچھا۔ ”شہزاد خان صاحب۔“ ”جی بولے۔“ انہوں نے کہا اور گھر سے باہر آ کر سوالیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

”میں مدثر ہوں۔ فرہاد صاحب کا بیٹا۔ انہوں نے آپ سے ملاقات کرنے کو کہا ہے۔“ میں نے اپنا تعارف کرایا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ فرط مسرت سے آگے بڑھے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ کچھ دیر تک انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹائے رکھا اور پھر الگ ہو کر کہا۔ ”ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... خوب جوان ہو گئے ہو۔“ انہوں نے میری تعریف کی۔

وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں فطرت انسانی کے تحت گھر کا جائزہ لینے لگا۔

”یہاں بیٹھو بلا تکلف۔“ انہوں نے چار پائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم دونوں چار پائی پر بیٹھ گئے لیکن کمروں کے داخلی دروازوں کی طرف ہماری کمر اور صدر دروازے کی طرف منہ تھا۔

”کون آیا ہے شہزاد؟“ کمرے سے نسوانی آواز سنائی دی۔

”آکر دیکھ لو۔ تمہارا بچھڑا ہوا بیٹا آیا ہے۔“ شہزاد صاحب نے کہا تو میں ادھر ہی دیکھنے لگا۔

ایک خاتون کمرے سے باہر نکلیں ان کی قمیص کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے انہوں نے غلت میں دوپٹا گلے میں لپیٹ لیا تھا۔ ان کی عمر شہزاد انکل سے کوئی دو یا تین سال کم یعنی پچاس سال کے قریب ہوگی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ چوما اور صدمہ داری جانے کے قصیدے پڑھے۔

”ابو نے آپ کی طبیعت کی ناسازی کا بتایا تھا تو میں نے سوچا آپ کی خیریت معلوم کر لوں۔“

”اچھا تو صرف ان کی خیریت پوچھنے آئے ہو۔ میرا خیال نہیں آیا میرے پتر کو۔“ بلقیس آنٹی نے شکایتی انداز میں کہا ان کے چہرے پر مسکراہٹ رکھنا تھی۔

”تم ایک دم سے جلنے لگ جایا کرو۔“ شہزاد انکل نے مصنوعی غصہ دکھایا۔ ”تم اس وقت بہت چھوٹے تھے جب تمہارے ابا نے کراچی چھوڑا تھا۔ وہاں جا کر ایسے وہ مصروف ہوا کہ ہمیں بھی بھول گیا۔ یہ تو اتفاق ہے کہ

ہمارے رابطے میں آگیا اب تو روز بنی فون پر باتیں ہوتی ہیں۔ آج صبح بھی ہوئی تھی۔“ شہزاد انکل نے کہا۔

”جی انکل۔“ میں نے ان کے جواب میں صرف اتنا ہی کہا تھا اور میرے پاس کہنے کو کوئی بات نہیں تھی۔

”آؤ آؤ۔“ شہزاد انکل نے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ایک لڑکی ٹرے اٹھائے ہمارے سامنے آگئی۔ ٹرے میں چائے کے گھرے ہوئے کپ اور ایک پلیٹ میں نمکونہ کھجی ہوئی تھی۔

اس نے ٹرے سامنے رکھی اور تیزی سے کمرے کے اندر لوٹ گئی۔ میں حیرت زدہ تھا۔۔۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کو میں نے ایک اور خاتون کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے جرسی کی فٹ شرٹ اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی یا ہمارے آنے کے بعد یا پھر یہ چائے ہمارے سامنے پیش کرنے سے پہلے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔ میک اپ دھو دیا تھا اور شرافت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے سوالیہ نظروں سے شہزاد انکل کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے میری نظروں میں چھپے سوالات کو پڑھ لیا تھا۔

”یہ تحریم ہے۔ میری بیٹی۔ ایک کمپنی میں سیلز کا کام کرتی ہے۔ کمپنی سے مال اٹھا کر اپنے طور پر سیل کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اس کو مختلف علاقوں میں جانا پڑتا ہے۔ معاوضہ کے طور پر کمیشن لیتی ہے۔“ انہوں نے خود ہی سب کچھ بتایا۔ ”چائے لوٹاں بیٹا! ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ بلقیس آنٹی نے چائے کا کپ اٹھا کر میری طرف بڑھایا تو میں نے چپ چاپ کپ پکڑ لیا۔

میرے دماغ میں ہتھوڑے برسنے لگے تھے۔ ایک طرف تو وہ تمام مناظر میری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے تھے۔ جب جب میں نے تحریم کو مختلف علاقوں میں لوگوں سے ٹکرا کر کرتے ہوئے دیکھا اور نہ تھا خود میرے ساتھ بھی اس کی جھڑپ ہو چکی تھی۔ منصور نے اس کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا..... کیا سوچ رہے ہو۔“ بلقیس آنٹی نے میرے کندھے کو پکڑ کر کہا تو میں سوچوں کے سمندر سے باہر نکل آیا۔ اس لڑکی کے کتنے روپ ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس سے شادی کرنا اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی منہ پر کالک لٹنے والی بات ہے۔ اس کو شریک سفر بنا کر میں تو منزل تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ کیسے نباہ ہوگا اس کے ساتھ۔ یہ

تو ساری عمر مجھے الجھائے رکھے گی۔ قدم قدم پر ایک نیا مسئلہ کھڑا کرتی رہے گی۔ میری تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لیکن ابو نے تو ہاں کر دی ہے۔ ابو تو کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ادھر میری بات بھی پکی کر دی ہے مگر ابو کو کیا پتا کہ یہ لڑکی کیسی بہروپنی ہے۔ وہ نہیں جانتے ہوں گے کہ اس کے بے شمار روپ ہیں۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ شہزاد اٹکل نے مجھے چونکا دیا تھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ میں نے مری مری سی آواز میں کہا۔
 ”تحریم کی شادی تو..... اس پکڑے والے منصور کے ساتھ...“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھر وہاں ہی چھوڑ دیا۔
 میری بات پر ایک بار پھر ان دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور شہزاد اٹکل بولے۔ ”ہاں بیٹا! اس کی دو بیچیاں بھی ہیں۔ مگر ان کی آپس میں بن نہ سکی۔“
 ”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

منصور نے تو بہت کچھ بتا دیا تھا لیکن میں ان کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ کیوں کہ ایک فریق کا کہا تو حرف آخر نہیں ہوتا۔
 ”بیٹا تم بھی ماشاء اللہ سے سمجھ دار ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ میاں بیوی میں ایسی کسی نہ کسی بات پر ان بن ہو ہی جاتی ہے۔“ بلقیس آئی نے کہا۔

”اب آپ اس کی دوسری شادی کرانا چاہتے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بیٹا! طلاق ہو گئی ناں۔ اب ساری عمر گھر بھی نہیں بٹھایا جا سکتا۔ اچھا ہے کہ اپنے گھر کی ہو جائے۔“ شہزاد اٹکل نے کہا۔ وہ بہت سنجیدہ تھے۔ ان کا انداز اور لہجہ منت کرنے کا سا تھا۔ وہ چہرے سے بہت مایوس اور بے بس لگ رہے تھے۔

”تم دونوں انشاء اللہ بہت خوش رہو گے۔“ آئی نے بلقیس نے کہا۔

ان کی باتیں سن کر تو میں پریشان ہونے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کو میں کیا جواب دوں۔

”سوری آئی۔“ میں ابھی اور پڑھنا چاہتا ہوں اور اپنا مستقبل بہتر بنانا چاہتا ہوں۔ اگر میں اس شادی وادی کے چکر میں پڑ گیا تو کچھ بھی نہ کر پاؤں گا اور میری یہ ملازمت بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ اپنا کاروبار کرنے کا ارادہ ہے، کاروبار شروع کرنے کے بعد ہی شادی کے بارے میں سوچوں گا۔ اس میں ممکن ہے کہ چھ سات سال بھی لگ جائیں۔“ میں نے کہا اور چار پائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے مزید کچھ کہنے اور مجھے روکنے کی کوشش نہ کی۔
 ”دراصل میں ایک گھریلو لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جو گھر کی ذمہ داریوں کو سمجھے۔ اپنے شریک سفر کے ساتھ شانہ بشانہ چلے۔ ایسے اقدامات نہ کرے کہ جس سے گھر آباد ہونے کی بجائے برباد ہو جائے۔ مجھے ماڈلنگ اور اداکاری اور ڈراما وغیرہ سے بہت نفرت ہے۔ وہ ایسی مذہبی لڑکی ہو جو نماز روزہ کی پابند ہو جو مادی ضروریات کی لالچ نہ رکھتی ہو جو تھوڑی آمدنی کو بھی زیادہ سمجھ کر گزارہ کرے۔ پھر میں نے ان کو اپنے ساتھ ہونے والی تحریم کی پہلی ملاقات جو کہ ایک ٹکراؤ سے شروع ہوئی تھی اور جب جب میں نے اس کو جہاں جہاں لوگوں سے ٹکرا کرتے ہوئے سنا اور جو کچھ منصور نے بتایا سب کچھ بتا دیا۔ میں نے ایک بار پھر ان سے معذرت کی اور باہر نکل گیا۔

اس دن گھر آ کر بھی میں بیزار ہی رہا۔ سب اللہ کی رضا سے ہوتا ہے اور اللہ... جو کچھ کرتا ہے وہ انسان کی بہتری کے لیے کرتا ہے کیوں کہ انسان کی سوچ کچھ اور اللہ کی مصلحت کچھ ہوتی ہے۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے حسب عادت کمرے کے ٹھنڈے فرش پر لیٹ گیا۔ کافی دیر تک ذہن ادھر ادھر منتشر رہا اور پھر نہ جانے کس وقت آگ لگ گئی۔

جب آگ لگ چلی تو ابو حیدر آباد سے آچکے تھے۔ رسی علیک سلیک ہوئی۔

”ابو فریش ہو جائیں۔ سفر کی تھکن ہو رہی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”سب کچھ ہو گیا ہے۔ فریش بھی ہو گیا ہوں اور چائے ناشتا بھی۔ اب تمہارا امبر ہے یہ سب کرنے کا۔“ ابو نے دوستانہ انداز میں کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں بھی فریش ہو کر کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ ابو اور عامر صحن میں ہی چار پائی پر بیٹھے تھے۔ دن تقریباً ڈھل چکا تھا۔ میں ان ہی کے پاس بیٹھ گیا۔

”ابو آپ بھی کراچی آ جائیں۔“ میں نے کہا۔
 ”آ جاؤں گا۔ ضرور آ جاؤں گا لیکن جب تم تحریم کو میری بہو بنا کر لاؤ گے۔“ ابو نے گویا شرط رکھ دی۔

”ابو! تحریم کے بارے میں آپ کو حقیقت کا پتا نہیں ہے۔ آپ سب سے گئے جو حیران رہ جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میں سب جانتا ہوں بیٹا۔ تحریم کے بارے میں اس کی پوری فیملی کے بارے میں۔ ایک ایک بات جانتا ہوں۔“

ابو نے کہا۔

”پھر اس کے باوجود بھی ابو.....“ میں نے کہا۔

”میرے پاس ان کے احسانوں کا بدلہ چکانے کا یہی ایک موقع ہے بیٹا۔“

”شادی اور احسان کا بدلہ۔“ عامر اور میں ایک دم چوٹے اور ایک ساتھ ہی بول پڑے۔

”ہاں بیٹا! آج میں تمہیں ان کے وہ احسانات بتاتا ہوں جو انہوں نے مجھ پر اور تم پر کیے تھے۔“ اور پھر ابو بتانے لگے۔

”اس وقت ہم یہاں کراچی میں شہزاد صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ جب تم پیدا ہونے والے تھے۔ ہم یہاں کرائے کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ تمہاری پیدائش کے وقت جب تمہاری ماں کی طبیعت بگڑ گئی تو میں کام پر گیا ہوا تھا۔ اس وقت تحریم کی پیدائش بھی قریب تھی۔ بلقیس بھابی نے اس حالت میں بھی تمہاری ماں کو قریبی سرکاری اسپتال میں پہنچایا۔ میں شام کو گھر آیا تو شہزاد نے بتایا کہ تمہاری ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے اور لچہ بہ لچہ بگڑتی جا رہی ہے۔ تمہاری پیدائش کے لیے آپریشن ضروری تھا اور تمہاری ماں کو خون کی اشد ضرورت تھی۔ میں جس ٹھیکے دار کے پاس کام کر رہا تھا۔ وہ روز کے روز صرف خرچ دیتا تھا اور باقی رقم مہینہ پورا کر کے ادا کرتا تھا۔ اس نے میرے چار ماہ کی رقم روکی ہوئی تھی۔ جو کم از کم بیس ہزار روپے بنتی تھی۔ میں نے ایک پڑوسی کو موٹر سائیکل دینے کو کہا تو اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو میرے ساتھ کر دیا جو مجھے ٹھیکے دار کے گھر لے گیا۔ میں نے ٹھیکیدار سے پیسوں کا مطالبہ کیا مگر اس نے پیسے دینے سے صاف صاف انکار کر دیا جب کہ وہ میرے ساتھ کے دوسرے مزدوروں کو ان کی تنخواہیں دے رہا تھا۔ اس وقت اس کے پاس چند پولیس والے بھی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں دو پولیس افسر بھی شامل تھے۔ شاید وہ کسی خاص لین دین کے لیے آئے تھے یا کوئی اور وجہ تھی۔ بہر حال میں نے اس کو تمہاری ماں کی حالت کے بارے میں سچ سچ بتایا تو اس خبیث نے مزاحیہ انداز میں ہنسنے ہوئے کہا⁷² اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ اپنی گھر والی کو کبوا بھی پیسوں کا انتظام نہیں ہوا ہے جب پیسے مل جائیں گے تو بچہ پیدا کر لیں۔“ اس کی اس بات پر اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے پولیس والوں سمیت سب ہی لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے غصے میں کہا۔

”اوئے شرم نہیں آتی تم کو۔“ میری اس بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے منہ پر مکارا مگر وہ ہٹ گیا تو اس کے پیچھے کھڑے ہوئے پولیس افسر کو لگ گیا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ پھر پولیس والے بھی مجھے مارنے لگے اور وہ مجھے پڑوسی کی اس موٹر سائیکل سمیت پولیس موہاں میں ڈال کر تھانے لے گئے۔ پڑوسی کا وہ لڑکا نہ جانے کس طرح گھر پہنچا اور اس نے اس واقعے کے بارے میں شہزاد کو بتایا۔ شہزاد محلے کے اثر رسوخ والے لوگوں کو لے کر تھانے آیا تھا مگر پولیس والوں نے میرا پرچہ کاٹ دیا تھا۔ پولیس والوں نے موٹر سائیکل بھی ضبط کر لی۔ اس کی قیمت بھی شہزاد کو ادا کرنی پڑی۔ شہزاد نے مجھے تھانے سے چھڑانے اور مکہ مکہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر انہوں نے مجھے جیل بھیج دیا۔ میرے خلاف دہشت گردی، ناجائز اسلحہ رکھنے اور ذہنی کے الزامات لگا دیئے تھے۔ دس پندرہ دن تک میری ملاقات کو کوئی نہیں آیا۔ میں جان گیا تھا کہ اس مصیبت کے وقت میرا کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ مجھے تمہاری ماں کی فکر کھائے جا رہی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اتنے دنوں بعد شہزاد اور بلقیس بھابی جیل میں آئے۔ انہوں نے تم کو ایک کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس وقت تم پندرہ دنوں کے ہو چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تم تو پیدا ہو گئے مگر تمہیں پیدا کرنے والی زندہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تمہاری پیدائش کے دو دن بعد تحریم کی پیدائش ہوئی تھی۔ تمہاری ماں کے کفن و دفن اور سوگم وغیرہ کے سارے معاملات شہزاد نے ہی بنائے۔“

”میرے بھائی، بہنیں اور دیگر رشتے دار شروع شروع میں میری ملاقات کو آئے تو میں ان کو کہتا کہ وہ تم کو اپنے پاس رکھ لیں اور تمہاری پرورش کریں۔ مگر کسی نے بھی ہامی نہ بھری۔ کسی نے کہا کہ تمہیں اسپتال میں ہی چھوڑ دوں۔ کسی نے کہا کہ تمہیں یتیم خانے بھیج دوں۔ کسی نے کہا کہ تمہیں کسی بھیک منگنے کے ہاتھوں فروخت کر دوں۔ ہر ایک نے اپنی رائے دی۔ مگر اس وقت شہزاد اور بلقیس بھابی نے اس اذیت ناک ذمے داری کو قبول کر لیا۔ بھائی بہنیں اور دیگر رشتہ دار پولیس کے لگائے ہوئے الزامات کو سچ سمجھ رہے تھے اور طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ شہزاد کی کوشش کے باوجود میری ضمانت نہیں ہو پا رہی تھی۔ شہزاد اور بلقیس بھابی جتنے میں دو بار ملاقات کو آئے اور ہر بار تمہیں اپنے ساتھ لے آتے۔ میں تمہیں اس وقت تک اپنی گود میں

کے گھر چلا گیا تھا۔ اسے سنبالا اور تحریم کو کافی دیر تک سمجھایا، کچھ باپ کے ٹوٹ جانے سے کچھ میرے سمجھانے سے اور کچھ پہلے کے کھائے ہوئے دھوکے سے اس کی عقل ٹھکانے آچکی ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ خود کو بدلے گی۔ اس سے وعدہ لے کر میں یہاں آیا ہوں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس گھرانے کو ٹوٹنے سے بچا لو یا مجھے ان کی نظروں میں احسان فراموش بنا دو۔

اس نے اپنی سوچ کو بدل لیا ہے۔ اب وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ اپنے راستے سے ہٹ چکی ہوئی وہ تحریم اب سیدھے راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ اب اسے زندگی کے اگلے سفر کے لیے اچھے شریک سفر کی ضرورت ہے۔ جوان سب باتوں کو جاننے کے بعد اسے قبول کرے اسے سدھرنے کا موقع دے بلکہ اس کا ساتھ دے کیوں کہ کسی بھی ڈوبے ہوئے کو کسی کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سہارا دینے والا اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ وہ خود بھی ڈوب جائے گا۔ میں نے ان ساری حقیقتوں کو جاننے کے باوجود بھی یہاں تمہاری بات اس لیے پکی کر دی تھی کہ تم اس کے لیے بہتر ہو گے۔ جب میں اور تم نے سہارا تھے، ہمیں انہوں نے سہارا دیا تھا اور اب ان کو۔ ان کی ہٹ چکی ہوئی تحریم کو سہارے کی ضرورت ہے اور ہم ان کا اس مشکل وقت میں سہارا بنیں گے اور یہ تمہیں قبول کرنا ہے۔“ ابو نے ساری بات بتانے کے بعد اپنا فیصلہ سنایا۔

اللہ جب بھیکے ہوئے لوگوں پر اپنی رحمت فرماتا ہے تو ان کو سیدی راہ بر آنے کا موقع دیتا ہے اور اس کا ذریعہ بھی وہ اپنے بندوں کو ہی بناتا ہے۔ مجھے بھی تو اپنی زندگی گزارنے کے لیے کسی ایسے سہارے کی ضرورت تھی کہ جو عمر بھر کے لیے ساتھ دے اور ادھر تحریم کو بھی میری ہی طرح سہارے کی ضرورت تھی۔

ابو کے کہنے پر میں شادی کے لیے رضامند ہو گیا اور پھر اسی بختے ہماری شادی ہو گئی۔

وہ میرے لیے ایک اچھی شریک سفر ثابت ہوئی ہے۔ وہ ٹھوکر پر ٹھوکر کھا چکی ہے۔ اس لیے اب ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتی ہے۔ خود اس نے اپنی زبان سے اقرار کیا ہے کہ وہ جو ہر ایک سے جھگڑتی تھی اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ دھوکے پر دھوکے نے اسے چڑھا بنا دیا تھا۔ اسے ہر مرد ایک جیسا ہوں کا پتلا نظر آتا تھا۔

لے رہتا جب تک ہماری ملاقات کا وقت ہوتا۔ وہ مجھے بہت تلی دیتے اور تمہاری طرف سے بے فکر رہنے کو کہتے۔ جب انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے ہاں تحریم پیدا ہوئی ہے تو میں خواب تو سہانے دیکھنے لگا تھا تم دونوں کی زندگی اور شادی کے بارے میں مگر میری اوقات مجھے گویائی سے محروم کر دیتی تھی اور میں خاموش ہو جاتا تھا۔ میری ضمانت ہوتے ہوئے چار سال گزر گئے۔ اس سے زیادہ کا عرصہ بھی گزر جاتا اگر شہزاد کو شش نہ کرتا۔“

”میری ضمانت ہونے اور جیل سے رہائی کے چند ہی دنوں بعد اپنے علاقے کی ایک مارکیٹ میں دیکھتی ہوئی تھی۔ اس کیس میں مجھے بھی اٹھوا لیا گیا۔ اس بار بھی شہزاد نے میری ضمانت کرائی مگر اس بار صرف ایک سال میں ہی میری رہائی ہو گئی اور پھر شہزاد اور لیلیس بھائی کے مشورے سے میرا بچا چھوڑ کر حیدر آباد چلا گیا تاکہ پولیس والوں سے جان چھوٹے۔ وہاں شہزاد کے ایک جاننے والے اسحاق صاحب تھے۔ جن کا بک بانڈنگ کا کاروبار تھا جہاں ابھی تک ہماری رہائش ہے۔ تم جب تھوڑے بڑے ہوئے تو میرے بھائی بہنوں اور دوسرے رشتے داروں نے تمہیں اپنے پاس رکھنے کی ذمہ داری لینے کی بات کی تو میں نے انکار کر دیا۔ کیوں کہ میں جان گیا تھا کہ اب وہ اپنے گھراور بچوں کے لیے کام کرنے کے لیے تمہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ان لوگوں کے غلام بن کر زندگی گزارو اور پھر جب میرے برے اور مشکل وقت میں ان لوگوں نے تمہیں ٹھکرا دیا تو اب اس وقت کے کل جانے کے بعد مجھے کیا مجبوری تھی۔ میں خود تمہاری پرورش کرنا چاہتا تھا اور مجھ سے اس غربت کی حالت میں جو کچھ ہوسکا میں نے تمہارے لیے کیا۔ اب تم دونوں ہی بتاؤ ان لوگوں کا ہمارے اوپر کتنا بڑا احسان ہے۔“ ابو کچھ دیر خاموش رہے اور پانی پینے کے بعد پھر گویا ہوئے۔

”مڈثرینا تحریم کے بارے میں تم نے جو دیکھا اور جو سنا۔ وہ سب سچ ہے۔ تحریم کی جب شادی ہوئی تو میں اس شادی میں شریک تھا اور جب وہ کسی کے بہکاوے میں آکر بھٹک گئی تو اس کی ہونے والی ہر غلطی کی شکایت بھی میرے علم میں آتی رہی۔ جب اسے طلاق ہوئی تو اس وقت بھی مجھے پتا چل گیا تھا۔ ہم منصور کو کیا سمجھاتے۔ اس میں ساری غلطی ہی تحریم کی تھی لیکن جب تم مجھے اور شہزاد کو طعنے دیئے تو اس نے خودی کی کوشش کی۔ اتفاق ہے کہ میں بس سے اتر کر شہزاد

نجات

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
سلام تہنیت

ایک ایسی سچ بیانی بھیج رہی ہوں جس کا چرچا اخبارات میں
خوب رہا۔ اس واقعے میں کچھ تبدیلی کے بعد کہانی بنا کر اس ل کیا
ہے۔ صرف اس لیے کہ لوگ سبق حاصل کریں۔

زویا اعجاز
(لاہور)



سنگ مرمر سے آراستہ اس پُر شکوہ عمارت کی ج ج
آج نرالی تھی۔

سادہ اور جاذبِ نظر تعمیر اعصابی فرحت اور نظروں
کے لیے بے حد تراوٹ کا باعث تھی۔ یہاں داخل ہونے
والا ہر فرد دستور اور قاعدہ کے مطابق اپنے جوتے بیرونی
جانب ایک خصوصی پائیدان پر رکھ دیتا۔ مرکزی دروازے
سے چند گز پہلے اسے ایک کاغذی ٹوکن مہیا کیا جاتا تھا جسے
انتہائی عقیدت سے ہاتھ میں تھامے وہ برہنہ پا اندر بڑھ

جاتا۔ سگی فرش کی ٹھنڈک پاؤں کی اڑیوں اور ٹکڑوں میں سرایت ہو کر جسم میں سرور بخش لہریں دوڑا دیتیں۔

اندرونی جانب ایک وسیع وعریض ہال نما کمر تھا جس کی دیواروں پر مختلف نعرے آویزاں تھے۔ ان نعروں میں لوح قرآنی، قرآنی آیات اور احادیث کندہ تھیں۔ اس عمارت سے ایک ہی چیز وابستہ تھی، تقدس و سکون..... یہاں آمد کے بعد کوئی بھی شخص بے سکون نہیں لوٹتا تھا۔

وہ ایک وسیع وعریض آستانہ تھا۔ پچھلے احاطہ میں درختوں کی چھاؤں میں سنگ مرمر ہی سے تعمیر شدہ دو قبریں موجود تھیں۔ احاطہ سے باہر ایک صحن تھا جہاں زائرین کے لیے خصوصی لنگر کا اہتمام کیا جاتا۔

ہر جمعرات کو یہاں محفل کا انعقاد ہوتا تھا۔ آستانہ کے کرتا دھرتا فضل الہی لوگوں کی فریاد سنتے اور بھرپور دلداری بھی کرتے۔

ویسے یہاں داخلہ بھی اب معمولی امر نہ رہا تھا۔ سینکڑوں زائرین کی آمد ایک معمول بن چکی تھی۔ اس لیے انتظامیہ نے مجبوراً چند قواعد و ضوابط لاگو کر دیے۔ موجودہ صورت حال کے تحت حاضری کے لیے کم از کم ایک روز قبل آنا لازم تھا۔ انتظامی دفتر میں یک ورقی فارم پُر کیا جاتا۔ اس فارم میں سائل کا نام، ولدیت، تعلیم، کاروبار، نوکری، رہائش اور ذاتی فون نمبر کا اندراج کیا جاتا تھا۔

پنجاب کے نواحی قصبہ شجاع آباد میں موجود یہ آستانہ عوام کی خدمت اور مشکل کشائی کا بہت بڑا وسیلہ تھا۔ مشکلات و مصائب میں گھرے افراد کے لیے یہاں بے حد سکون تھا۔ آستانہ میں موجود قبر اور مدفن ہستی کی کرامات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آتی تھیں لیکن حقیقت اب بھی ایک سربستہ راز تھی۔

☆☆☆

آج خصوصی بیچ شنبہ تھا۔

آستانہ کی روایات کے مطابق اس دن کا ظہور مدتوں بعد ہوتا ہے۔ عطار، ذہل اور مشتری ایک ہی مدار میں آجاتے ہیں اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب نخواست کی زد میں آئے انسانی قسمت کے ستارے تبدیل ہو جاتے ہیں، دعائیں کبھی روئیں ہوتیں اور کوششیں کبھی ناکام ثابت نہیں ہوتیں۔

خصوصی بیچ شنبہ سے مستفید ہونے کے لیے دور دراز سے زائرین کا جھوم اٹھ آیا تھا۔ امید و آس سے چمکتے چہرے

کبھی کسی لمحہ نا اُمیدی کی زد میں آکر مجھ سے جاتے لیکن انہیں یقین تھا کہ وہ ہمارا ہی لوٹیں گے۔

آستانہ کے جانشین فضل الہی نے نماز ظہر کے بعد کئی سائین کو نمٹا دیا تھا اور اب نماز عصر کے لیے اپنے حجرہ میں تشریف لے جا چکے تھے۔ ان کی شخصیت بہت محرکیز تھی۔ شاہانہ کردار سے مبرا، سادہ مزاج، متبسم چہرہ، مقابل کے اندر تک جھانکتی آنکھیں اور نرم و مخلص لب و لہجہ سائل کا دل موہ لیا کرتا اور اسے اپنا وجود کسی چھپر چھاؤں میں محسوس ہونے لگتا۔

ہال میں بیٹھے سائین کو آستانہ کی روایات کے مطابق قہوہ پیش کرنے کے بعد دو بار لیش الہکار شرقاً غرباً مستعد کھڑے ہو گئے۔ فضل الہی نماز سے فراغت کے بعد ایک بار پھر اپنے معتقدین سے ملنے کے لیے تیار تھے۔

سینٹھ نوید بخش اپنے بے چین دل پر قابو پاتا حجرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

سینٹھ نوید وسطی پنجاب کا ایک معروف بیویاری تھا۔ وہ پھلوں کی تجارت کرتا تھا۔ ٹھل ٹھل کرتا وجود، نیم شفاف سر، بھاری بھر کم چہرہ اس کی سخت گیر طبیعت کے عکاس تھے۔ آنکھوں تلے درم سے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ام الغناٹ سے کبھی مستفید ہوتا رہتا ہے۔

وہ اس وقت بے حد پریشانی میں مبتلا تھا۔ ”کیسے آتا ہوا نوید بخش؟“ فضل نے نرم لہجہ میں دریافت کیا۔

”حضرت جی! میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں..... میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ نوید نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”ہر پریشانی اپنے ساتھ حل لے کر آتی ہے میرے بچے! اس فانی دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو لایا نکل ہو۔“

”اسی لیے تو میں آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں حضرت جی! صرف آپ ہی میری واحد اُمید ہیں۔ آپ سے عظیم اور بلند میرے لیے کوئی بھی نہیں۔“ اس نے فضل الہی کے پاؤں تھام لیے۔

”سب میرے مولا کا کرم ہے..... تم بتاؤ کیا حاجت ہے تمہاری؟“

”میرے بینک اکاؤنٹ میں لاکھوں کا سرمایہ محفوظ رہتا ہے۔ میں ہر سال رمضان سے قبل یہ رقم نکھوا لیا۔“

کرتا ہوں۔ بینک انتظامیہ بلا وجہ زکوٰۃ کی کٹوتی کرتی ہے۔ وہ یہ رقم کسی بھی مستحقین تک نہیں پہنچاتے، میں اپنی نگرانی میں زکوٰۃ کا نصاب الگ کر کے اسے غریبوں کی ہستی میں پہنچاتا ہوں۔“ نوید نے پہلے سے تیار کردہ ایک ملاٹ شدہ کہانی سنائی۔

”انتہائی احسن حکمت عملی ہے۔“

”ہر سال میرا ایک بار اعتماد میجر بینک سے رقم لے آتا تھا۔ کبھی ایک روپے کی ہیرا پھیری نہیں ہوتی لیکن اس بار جانے کیا ہوا؟ وہ تمام پیسے سیٹ کرفرار ہو گیا ہے۔ میں تو بریادی کے دہانے پر پہنچ گیا ہوں حضرت جی! میرا زندگی بھر کا سرمایہ لٹ گیا ہے۔“ وہ رونے لگا۔

”فضل الہی نے چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں موندیں اور گہری سانس بھرتے مراٹھے میں گم ہو گئے۔

”کراچی، حیدر آباد، سکھر، تہار، منیجر اس دائرے میں مقید ہے..... اسے فوری تلاش کرو اور نہ وہ بیرون ملک اڑاں بھرنے کی تیاریوں میں ہے۔“

نوید بنگش کے اعصاب میں برقی لہر دوڑ گئی۔

”بہت شکریہ حضرت جی! میں یہ آخری موقع ضائع نہیں کروں گا۔“ وہ فضل الہی کے قدموں میں سر جھکائے بولا۔ پھر لرزتے وجود سے اٹھا اور عقبی سمت میں سر جھکائے ’نمائندہ خصوصی‘ مجید کو ہدیہ کی رقم تھا کرا لے پاؤں لوٹ گیا۔

☆☆☆

نوید بنگش کا چمکتا چہرہ اور خوشی سے لڑکھڑاتے قدم ہال میں بیٹھے اکرام خان کے لیے بہت مثبت تحریک ثابت ہوئے۔

اکرام خان ایک بار عرب شخصیت کا مالک تھا۔ سرخ و سفید رنگت، شرعی داڑھی، ٹخنوں سے اونچی شلوار اسے مزید با وقار بناتی۔ اس کے ہاتھ میں ہمہ وقت ایک تسبیح اور سر پر گول جالی دار ٹوپی نظر آتی تھی۔

اس کا کاروبار سود سے منسلک تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا مگر کچھ عرصہ سے جانے کس حاسد کی نظر بد نے آسیب کی طرح اس کا پیچھا لیا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی تلاطم کا شکار ہو گئی تھی۔ پہلے تو اکلوٹی بیٹی اپنے ایک ہم جماعت حنین سے شادی کرنے کے لیے اس سے بغاوت پر آمادہ ہوئی۔ اکرام کے بے حد سچے بھانے کے باوجود جب اس نے اپنی روش ترک نہ کی تو اس نے دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس کی خاندانی روایات کے مطابق بیٹیوں کی شادی کسی بھی صورت خاندان یا برادری سے باہر نہیں کی جانی تھی۔ موت کی موت کے بعد وہ بہت پرسکون تھا لیکن پھر ایک اور ’بغاوت‘ نے اس کے وجود کی بنیادیں ہلا دیں۔ وہ سر جھکائے حجرے میں داخل ہوا اور فضل الہی کی قدم بوسی کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

”خیریت کیسے آتا ہوا اکرام خان؟“ فضل نے دریافت کیا۔

”آپ کی روشن ضمیری سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں

قبل! آپ تو سب کچھ جان لیتے ہیں۔“

”بے شک..... بے شک..... لیکن ہم تمہاری زبانی

سننا چاہتے ہیں۔“

”میرا کیس سالہ بیٹا اپنی عمر سے کئی سال بڑی ایک

ماڈل گرل کو میزے گھری زینت بنانا چاہتا ہے قبلہ!“

”تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟ شادی پر یا بیٹے

کے انتخاب پر؟“

”مجھے صرف اس شادی پر تحفظات ہیں۔ وہ مرد بچہ

ہے۔ جہاں بھی منہ مارے میں نے کبھی کوئی روک ٹوک نہیں

کی ایسے تعلقات تو مرد کی شان ہوتے ہیں لیکن ایسی غلاطت

کو گھر میں لے آنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ وہ ایک بدنام

زمانہ ماڈل ہے۔ سوشل میڈیا پر اس کی فحش ویڈیوز ہزاروں

لوگ دیکھ چکے ہیں۔ میں ایسی حرافہ کو اپنی بہو کیسے بنا

لوں؟“ اکرام نے اپنی الجھن بیان کی۔ ”میں آپ کے

پاس بڑی اُمید لیے آیا ہوں، میرے احباب کا کہنا ہے کہ

آپ کے سوا میری یہ پریشانی کوئی بھی حل نہیں کر سکتا۔ میرا

بیٹا یونہی نا سمجھی میں مبتلا رہا تو کاروبار تباہ ہو جائے

گا..... میری مدد کیجیے قبلہ!“

فضل الہی چند لمحوں کے لیے آنکھیں موند کر مراٹھے

میں گئے اور پھر گھمبیر لہجہ میں کہا۔ ”اس عورت کو چند کاروباری

حاسدین نے تمہارے بیٹے کے پیچھے لگا دیا ہے۔ اس کے قلب

دروغ پر ناپاکی اور حصر کے اثرات ہیں لیکن تم فکر نہ کرو، بچے کو

اگلی بار ساتھ لے آنا، میں اپنی خاندانی بید کی چھڑی سے ان

اثرات کا مکمل خاتمہ کر دوں گا۔“

”بہت شکریہ قبلہ! بہت شکریہ!“

”یہ نقش لے جاؤ اور اسے کسی بھی طرح پلا دینا۔“

فضل الہی نے اپنے دائیں جانب موجود ایک منقش چوٹی

ذہب سے طے شدہ کاغذ نکال کر اسے تھمایا۔

اکرام نے اپنا سر اس کے قدموں میں جھکا یا اور مجید کو ہدیہ کی رقم دے کر سرشاری سے بڑے کمرے میں لوٹ گیا۔

☆☆☆

عالیہ اور ہارون موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ وہ کسی خطرناک طبی مسئلہ کا شکار تھے۔ درحقیقت ان دونوں کو ایک ایسا مرض لاحق ہو گیا تھا جسے بظاہر طبی دنیا میں کوئی سنجیدہ مقام حاصل نہیں تھا لیکن یہ مرض انسانی زندگی کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔

وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ خاصاً بے ریا اور شدید محبت..... ان کے تئیں سانسوں کی ڈور باہم وابستہ تھی۔ سم ظریفی تو یہ تھی کہ ان کے انمول جذبات ابلحانہ کے نزدیک قطعی بے مول ثابت ہوئے تھے۔

میل ملاقات میں بے احتیاطی اور جوانی کے جوش نے چند ایک بار قدم بھی بہکائے لیکن ان کی 'سچی محبت' میں شدت کی گنا بڑھ گئی۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہو چکے تھے۔ کچھ ماہ بعد جب قوتوں کا نتیجہ ظاہر ہوا تو ہارون نے انتہائی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے والدین کو عالیہ کے گھر بھیج دیا۔ اسے کامل یقین تھا کہ وہ اس رشتہ کو برسرِ واپس قبول کریں گے۔

ان دونوں کے اس یقین اور اعتماد کا فلک بوس محل عالیہ کے والد نے ایک ہی جھٹکے سے سہا کر دیا۔ "آپ کی آمد کا بہت شکریہ لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ کا بیٹا ماہانہ کتنا کم لیتا ہے؟"

"وہ ابھی یونیورسٹی میں آخری سال کا طالب علم ہے..... ڈگری ملنے ہی نوکری بھی مل جائے گی۔" ہارون کی والدہ نے کہا۔

"نوکری ملنے تک وہ بیوی کے اخراجات کیسے پورے کرے گا؟ کسی دربار سے مانگ کر لائے گا یا ڈاکا ڈالے گا؟ اور اگر اپنے والد کی کمائی سے ہی بیوی بچوں کی ذمہ داری اٹھائے گا تو عالیہ میرے گھر میں مجھ پر بھاری نہیں، بہتر ہے کہ اپنے ہم پل لوگوں میں رشتہ دیکھ لیں۔ ہم اپنی برادری سے باہر رشتہ طے نہیں کرتے۔"

ہارون کے والدین کی روائی کے بعد غلام رسول نے اپنی بیوی سے کہا۔ "جس گھر میں میری ہو وہاں پھر ضرور آتے ہیں لیکن بزرگ یہ بھی کہتے ہیں کہ گھر کا بھیدی ہی لٹکا ڈھایا کرتا ہے۔ اس رشتہ میں کہیں نہ کہیں عالیہ کی رضامندی بھی شامل ہے۔ اسے کل سے یونیورسٹی بھیجنے کی کوئی

ضرورت نہیں میری بہن کئی بار اس کا ہاتھ مانگ چکی ہے۔ میں اگلے ماہ شادی کی تاریخ طے کر دوں گا۔"

عالیہ کی ماں نے سر تسلیم خم کر دیا اور بیٹی کو بھی اس کی تقدیر کے فیصلہ سے آگاہ کرنے میں تاخیر نہ کی۔ عالیہ نے اپنی کئی سہیلیوں سے آستانہ کی کرامات کے متعلق سنا تھا۔ اس نے خصوصی شیخ شنبہ سے مستفید ہونے کے لیے ہارون کو ایک رات قبل ہی یہاں آمد کے لیے راضی کیا اور اب خود بھی اس کے ساتھ اپنی قسمت کی چال کو ٹھکست دینے کے لیے آخری داؤ کھیلنے چلی آئی تھی۔

وہ دونوں فضل الہی کی جہانم دیدہ نظروں کی زد میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"والدین اولاد کے لیے کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتے لیکن اولاد کو اپنی پسند سمجھ اور عقل پر بہت مان ہوتا ہے۔ یہی مان اضطراب بن کر ان کی زندگیوں کو اپنی پلیٹ میں لے لیتا ہے۔" وہ فضل کی اس ذومعنی بات کا مطلب بخوبی سمجھ گئے۔ "آپ ہماری آخری امید ہیں سرکار! آپ نے بھی ہاتھ نہ تھا تو میری زندگی ایک گالی بن کر رہ جائے گی۔" عالیہ رونے لگی۔

"شادی ایک مقدس بندھن کا نام ہے، دو نامحرم وجود اپنے خالق کو حاضر ناظر جان کر ایک دوسرے کے لیے 'حلال' قرار پاتے ہیں، قبل از وقت خوشیاں کشید کرنے سے انسان اپنی آئندہ راہیں کھوٹی کر لیتا ہے۔" نرم لہجہ انہیں مزید تڑپ میں مبتلا کر رہا تھا۔

"آپ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا سرکار! ہمیں اپنی سب کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ ڈاکٹر ز ابارشن کا خطرہ مول نہیں لے سکتے اور عالیہ کے والد کے روابط کے باعث ہم کورٹ میرج بھی نہیں کر سکتے، بس اب آپ ہی ہمارا سہارا ہیں۔" ہارون نے عداوت سے سر جھکا لیا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تم لوگوں کو چار جہراتیں یہاں آکر ایک خصوصی چلہ کاٹنا پڑے گا، تمہارے ستاروں کی نخوت خود بخود ختم ہو جائے گی۔"

"ہم ضرور آئیں گے سرکار! ہر کھٹائی سے گزریں گے۔" وہ اس کے قدم چھو کر بولے۔

"میں اس لڑکی کو اپنے حصار میں لے لیتا ہوں۔ یہ خصوصی حصار اسے دوسروں کی پسندیدگی کی نظر سے بچائے گا اور اس کا کہیں بھی رشتہ طے نہیں ہو سکے گا۔"

”جیسا آپ مناسب سمجھیں سرکار!“ ہارون خوش سے دیوانہ ہونے لگا۔

فضل الہی نے عالیہ کو قالین پر لیٹنے کا اشارہ کیا اور سپاٹ چہرے سے اس کے بدن پر دائیں ہاتھ کی انگلی سے چند لکیریں کھینچتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں بعد وہ مجید کو بدیہ ادا کرنے کے بعد نہایت مطمئن ہوئے کمرے میں لوٹ گئے۔ ان کی یہ سرشاری اور اطمینان اپنا نوکن اضطراب سے ہاتھوں میں مستحکم آئینہ کے وجود میں ایک نئی توانائی پیدا کر گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر آمنہ ایک کامیاب گانا کو لوٹ چکی تھی۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ خوش شکل اور جاذب نظر نقوش کی مالک تھی۔ اس کا تعلق نچلے طبقہ سے تھا جہاں وسائل کم اور ذہانت کے انبار ہوتے ہیں۔ اپنی اسی ذہانت کے بل بوتے پر وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

ڈگری ملتے ہی اس کے حراج میں فرعونیت بھی در آئی۔ تعلیمی مراحل میں درپیش محرومیاں لاشعور میں کسی ناگ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھ گئیں اور اس نے اخلاقیات کے سارے درس فراموش کر دیئے۔

سرکاری اسپتال میں روزانہ اپنی حاضری کا اندراج کرنے کے بعد وہ اپنے پرائیویٹ کلینک میں روانہ ہو جاتی۔ سخت مقابلہ کا دور تھا۔ اپنی خصوصی شناخت بنانے کے لیے ہر ڈاکٹر مختلف ترانے کا استعمال کرتا۔ آمنہ نے بھی اپنے کلینک کی بقاء اور ذاتی شہرت کے لیے ایک منفرد رستہ اختیار کر لیا۔

اس نے مریضوں کے لیے غیر قانونی اپارشن کی سہولت فراہم کر دی۔

شہر بھر سے بے راہ روز لڑکیاں منہ مانگے معاوضہ پر اس کے پاس اپنے گناہوں کی نشانی ختم کروانے آتیں۔ ڈاکٹر آمنہ کی زندگی بے حد خوش و خرم گزرنے لگی۔ دولت اس کی باندی بن گئی۔ لیکن پھر ایک واقعہ نے اس کی زندگی ابھرنے لگی۔

ایک روز اس کے کلینک پر درمیانے طبقہ کی عورت آئی۔ وہ اپنی الزا ساؤنڈر پورٹ سے بچہ کی جنس جاننے کی خواہشمند تھی۔ آمنہ نے بلاتامل اس کی یہ خواہش پوری کر دی۔

”مبارک ہو خاتون! اس رپورٹ کے مطابق آپ کی بیٹی بہت صحت مند ہے۔“ اس نے پیشہ وارانہ انداز میں کہا۔

عورت کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ ”مجھے یہ اولاد نہیں چاہیے ڈاکٹر! اگر اسے جنم دیا تو میرا شوہر مجھے طلاق دینے میں ایک پل کی تاخیر نہیں کرے گا۔ میری پہلے بھی پانچ بیٹیاں ہیں۔ اس بیٹی کو بچانے کے لیے میں باقی ماندہ زندگیاں داؤ پر نہیں لگا سکتی۔“

آمنہ نے اس کے فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے اپارشن کر دیا۔ کلینک کے اوقات ختم ہونے سے پہلے وہ اپنی میز پر موجود اشیاء سمیٹنے لگی تو اس کی نظر ایک بار پھر اسی رپورٹ پر پڑی۔ بچی کے ہیولہ نے اسے ایک عجیب اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ اسے دو نھے سنے ہاتھ اپنی گردن کی جانب پکھٹے محسوس ہونے لگے۔

وہ بے اختیار گردن مستحکم واپس روانہ ہو گئی مگر اس بچی کے تصور سے کبھی بھی واسن نہ جھڑوا سکی۔ اسے اپنا وجود کسی شکوکہ میں جکڑا محسوس ہوتا۔ وہ اپنا ذہنی سکون کھو چکی تھی۔ سینکڑوں سکون بخش ادویات کے استعمال پر بھی جب کوئی افادہ نہ ہوا تو وہ آستانہ پر چلی آئی۔

فضل الہی کے سامنے دو زانو بیٹھی وہ بلک بلک کر ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ ”مجھے سکون درکار ہے بابا جی! مجھے بس سکون درکار ہے۔ میں اپنی صلاحیتیں اور علم بھولتی جا رہی ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے چین میسر نہیں آتا۔۔۔۔۔ میری گردن کے گرد بڑھتے دباؤ سے سانس رکنے لگتا ہے اور روح کے ریٹھ ادھڑتے محسوس ہوتے ہیں۔“

”یہ سب نظر بد کے اثرات ہیں، فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مجھے آپ کے آستانہ شریف پر آمد سے جو سکون ملا ہے“ ناقابل بیان ہے بس یہی سکون میری باقی زندگی پر حاوی ہو جائے تو میں آپ کی غلام بن جاؤں گی۔“

فضل الہی نے اسے بھی عالیہ کی طرح حصار میں لا اور غری سے استفسار کیا۔ ”روح کی پاکیزگی کے لیے ہمیں کچھ عرصہ آستانہ پر گزارنا ہو گا۔ یہاں مریضوں کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ کیا یہ سب کر سکتی ہیں؟“

”میں ذہنی و روحانی سکون حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ آمنہ نے کہا۔

”تمہارا عروج اب دور نہیں۔ ایک نئی بلندی او

شہرت تمھاری منتظر ہے۔“ فضل الہی کی مسکراتی آواز اسے فرحت دینے لگی۔ اس کی قدم بوسی کرنے اور ہدیہ کی ادائیگی کے بعد وہ بھی بڑے کمرے میں لوٹ آئی۔

☆☆☆

بیالیس سالہ بھر پور مرد تھا۔

جنوبی پنجاب کا متمول زمیندار اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بااثر شخصیت، اس کی زندگی خوشیوں کے ہنڈولے میں گزری تھی۔ وہ اپنے علاقہ میں مقارن رکھتا مگر گذشتہ ایک سال سے وہ ناقابل بیان اذیت سے دوچار تھا۔

اس کی مخصوص طاقت دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی اور اب یہ صورت حال تھی کہ وہ اپنی چاروں بیویوں کے ساتھ وقت گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ملک گیر شہرت کے حامل ڈاکٹر سے علاج کے بعد اس نے بین الاقوامی سطح پر بھی اپنا معائنہ اور علاج کروایا لیکن نتیجہ اب بھی صفر بنا صفر ہی تھا۔

شرمندگی اذیت بے بسی اور لا چاری اس کے وجود اور آنکھوں میں گویا بیت ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر طرف سے مایوسی کے بعد وہ فضل الہی کے پاس اپنی پتا لے آیا تھا۔

”تمھاری حالیہ شادی یکطرفہ پسندیدگی کا نتیجہ تھی؟“ فضل نے استفسار کیا۔

”جی حضرت! مونا میرے مینیجر کی چھوٹی بہن تھی۔ اس کی متغنی بچپن ہی سے خالد زاد سے ملے تھے لیکن فیہم نے میرے رشتہ کو ترجیح دی۔“ وہ الجھ کر بولا۔ ”لیکن اس معاملہ کا مجھے درپیش مسئلہ ہے کیا تعلق ہے؟“

”تعلق ہے بہت گہرا تعلق ہے، تمھاری بیوی اور اس کے سابقہ منگیتر نے طبی و روحانی ماہرین کا سہارا لے کر تمھیں کھوکھلا شجر بنا دیا ہے تاکہ بوقت ضرورت عدالت میں تمھاری نااہلی ثابت کر کے علیحدگی حاصل کی جاسکے۔“

عبدالکریم اس انکشاف پر لرز گیا۔

”اگر ایسا ہو تو میرے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔“

”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میری خاندانی اور کرشماتی چھتری تمھیں بھلا چنگا کر دے گی، ہاں! بس تمھیں تھوڑی اذیت برداشت کرنی ہوگی۔“

”میں اپنے علاج کے لیے ہر اذیت سہنے کے لیے تیار ہوں حضرت!“ وہ اس کے قدموں میں گر گیا۔

فضل الہی نے اسے برہنہ حالت میں قایلین پر لیٹنے کا

حکم دیا اور اپنی منتقل چھڑی تھامے تخت سے نیچے اترا آیا۔ وہ ایک مخصوص انداز میں بید کی وہ چھڑی عبدالکریم پر رسید کرنے لگا۔ ہر ضرب کے بعد وہ بے اختیار سسک اٹھتا لیکن ضبط کا دامن تھا ہے وہ اپنی ’روحانی پاکیزگی‘ کے عمل سے گذرنا رہا۔

پندرہ منٹ کے اس صبر آزمایہ علاج کے بعد وہ ہدیہ ادا کر کے اپنے قدموں کی لڑکھاٹھ پر قابو پاتے حجرہ سے لوٹ گیا۔

☆☆☆

مغرب کی اذان کا وقت ہو چلا تھا۔

فضل الہی نے تھکے تھکے انداز میں گاؤں کی پراپتی پشت لٹائی اور عقب میں کھڑے ملازم سے پوچھا۔ ”مزید کتنے افراد باقی ہیں مجید؟“

”دس سے پندرہ افراد ہیں جناب! لیکن ان کے مسائل معمولی نوعیت کے ہیں۔ کچھ خواتین ہیں جنہیں اپنے شوہر حضرات کی دوسری عورتوں میں دلچسپی کا خاتمہ درکار ہے اور چند افراد اپنی اولاد کے رشتوں کی بندش کے خاتمہ کے لیے آئے ہیں۔“

”ہنہ! ان سے بھی مل لیتے ہیں ابھی۔“

مواہل فون کی گھنٹی نے فضل کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سبز بن دبا یا اور بشارت سے کہا۔ ”کیسے ہو سائیں؟ آج خادم کی یاد کیسے آگئی؟“

”اللہ کا کرم ہے۔۔۔۔۔ تم سناؤ؟ دھندا کیسا چل رہا ہے؟“

”دھندا ایک دم زوروں پر ہے، ابھی آج ہی کی بات۔۔۔۔۔“

”فضل الہی! اس وقت تمھارے سر پر بہت بڑی مصیبت منڈلا رہی ہے۔“ مخاطب نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”انٹیلی جنس کا فی عرصہ سے تمھارے نیٹ ورک پر کام کر رہی تھی لیکن انہیں کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔“

”ثبوت تو اب بھی نہیں مل سکتا سائیں! میں نے کبھی گولیاں نہیں کھیلیں۔“

”مجھے مستند اطلاع ملی ہے کہ آج آستانہ میں ایک خفیہ افسر بھی بھیس بدلے موجود ہے۔ زائرین کو پلایا جانے والا قبوہ اور کھانے کا نمونہ وہ ساتھ لے جائے گا اور ان اشیاء

میں نشہ آور اجزاء کی ملاوٹ لیبارٹری ٹیسٹ سے باآسانی عیاں ہو جائے گی۔“

”آج تو ویسے بھی خصوصی شیخ شہید کی وجہ سے معمول سے کئی گنا زیادہ افراد آئے ہیں۔ میں اسے کس طرح تلاش کروں؟“ فضل بوکھلا گیا۔

”تلاش کا وقت نہیں رہا، مجھے بھی بہت تاخیر سے اطلاع ملی، وقت بہت کم ہے کسی بھی طرح مال وغیرہ بچانے کی کوشش کرو اور سب کچھ سمیٹ کر فوراً وہاں سے نکلو۔“

”اتنی دقت سے یہ سیٹ اپ بنا تھا، اب پھر نیا آغاز کرنا پڑے گا۔“

”ان فضول دکھڑوں میں وقت ضائع نہ کرو! حقیق انسان! موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے۔“ مقابل نے طیش میں ایک گالی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔

فضل کی رگوں میں خون سنسنار ہا تھا۔ اٹھلی جھنک کا نام سن کر مجید بھی حواس باختہ تھا۔ ”کیا ہو گیا فضلو؟ کہاں چوک ہو گئی ہم سے؟“

”بہت غلط ہوا ہے مجید! لیکن اب وقت بہت کم ہے۔ سہیل کے ساتھ مل کر احاطہ کی قبر سے سادرا مال نکالو۔ میں اندرونی کمرے سے سب سیٹیاں ہوں۔“

”اور یہ جو باہر بیٹھے ہیں ان کا کیا کرنا ہے؟“ مجید نے پوچھا۔

”انہیں کچھ بھی کہنے سننے کی ضرورت نہیں..... ہم تینوں تہہ خانہ کی سرنگ سے نکل چلتے ہیں۔“

”نھی میں کوئی خفیہ پولیس اہلکار موجود ہے۔ کیا اسے سزا نہیں دو گے؟ ہم پر یہ عتاب لانے والے کو اتنی آسان رہائی مل جائیگی؟“ مجید نے کینہ تو نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہرگز نہیں! ان سب کا شافی علاج کر کے ہی جائیں گے۔ تہہ خانہ والی سرنگ میں میرا انتظار کرو، میرے گناہ گار کو سزا بہر صورت ملے گی۔“ فضل نے تنفر سے سر جھکا اور تیزی سے حجرہ کے بظنی دروازہ سے گذرنا ایک کراہیں بڑھ گیا۔

اپنی خفیہ بخوری سے چند ضروری کاغذات اور رقم سینٹنے کے بعد اس نے پلاسٹک کی ایک شفاف تھیلی تھامی اور احاطہ میں موجود یادورچی خانہ کی طرف بڑھ گیا۔

”سرکار! آپ یہاں کیسے؟ مجھے طلب کر لیا ہوتا۔“ بخشو نامی یادورچی اسے اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے بے حال ہونے لگا۔

”میں بڑے سرکار کے حکم پر یہاں آیا ہوں

بخشو!، فضل نے باوقار انداز میں کہا تو بخشو اس کے قدموں میں جھک گیا۔

فضل نے بڑی سرعت سے ہاتھ میں تھاما سفوف کھانے کے جہازی سائز ٹیلے میں چھڑک دیا۔

”آج ہمیں خواب میں بڑے سرکار کی بشارت ہوئی تھی۔ وہ آستانہ کے لیے تمہاری خدمات سے بہت خوش ہیں۔ انہوں نے تمہیں مکہ مدینہ کی زیارت کی نوید دی ہے۔“

بخشو یہ سن کر مزید فدیہ دینا نہ انداز میں اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

”سب آپ کی دین سے سرکار! آپ ہی کی نظر کرم ہے۔ یہ زندگی، نعمتیں آپ کے فضل سے ہیں۔“ بخشو فرط مسرت سے لرزے لگا۔

”جیتے رہو! تمہارے لیے بڑے سرکار نے ایک خصوصی ذمہ داری تفویض کی ہے، آج تم نے آستانہ پر موجود سبھی زائرین اور ملازموں کو کھانا کھلانا ہے۔ حضرت جی کے در سے آج کوئی بھوکا نہیں جائے گا۔“

”ہو جائے گا سرکار..... میں یہ حکم ضرور پورا کروں گا۔“ وہ اس کے قدموں پر اپنی پیشانی اور رخسار رگڑنے لگا۔

☆☆☆

سہیل اور مجید نے قبر کی دیواروں اور فرش میں تختوں تلے پوشیدہ منشیات اور اسلحہ کے ذخائر سمیٹ لیے تھے۔ مجید اپنے چہرے پر مخصوص تاثرات طاری کیے ہال کمر میں آیا اور وہاں موجود افراد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”سرکار مبارک نے نماز کے بعد آپ سب کی نجات اور پریشانیوں کے حل کے لیے وظیفہ کا آغاز کیا ہے۔ یہ وظیفہ اور چلہ دو گھنٹوں تک جاری رہے گا۔ آپ آستانہ کا ممبرک کھانا تناول کیجیے، سرکار جلد ہی اپنے دیدار سے فیض یاب کریں گے۔“

بڑے کمرے میں موجود افراد اب قدرے پرسکون ہو چکے تھے۔ فضل الہی اپنے دونوں کارندوں کے ساتھ تہہ خانہ کی سرنگ اتر گیا۔

فضلو اندرون سندھ کارہائشی تھا۔ ایک سیاسی جماعت سے وابستگی کے بعد وہ اپنے حلقہ میں دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ ملک میں سیاسی تبدیلیوں کے بعد اس کی جماعت کے اقتدار کا خاتمہ ہوا تو وہ قانونی عتاب کا شکار ہونے والوں میں سر فہرست تھا۔ اس کی ذات سے بے شمار قتل بھتا خوری اغواء برائے تادان کے واقعات وابستہ تھے۔

جیل کی زندگی بہت سخت تھی۔ اس کے سیاسی آقا قید

انسولین ایک ہارمون ہے جو بلبلہ سے تیار ہوتا ہے یہ جسم میں شوگر کو کنٹرول میں رکھتا ہے اور ذیابیطس سے بچاؤ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پروفیسر ڈیلانے کہا ہے کہ مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ذیابیطس کے مریضوں کو اتنی دیر تک ورزش کرنی ہوگی جب تک جسم سے پینا خارج ہونے لگے لیکن اگر پانچ روز تک ورزش نہ کی جائے تو اس کا فائدہ زائل ہونے لگتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ذیابیطس کے بیشتر مریض اپنی غذا پر تو بے حد دھیان دیتے ہیں مگر جسمانی ورزش کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مرسلہ: ڈاکٹر عفت۔ کراچی

ٹھکانہ اور کاروبار میسر آجائے گا۔ میں کچھ ایجنٹس سے واقف ہوں جو یہاں نشیات اور اسلحہ کی کھپ ذخیرہ کرنے کے بعد صوبہ بھر میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکیوں کی سپلائی ایک اور بونس پوائنٹ ہے، منافع میں ہم تینوں کا برابر حصہ ہوگا۔ آستانہ پر ملنے والے ہدیہ کی شرح الگ ہوگی۔“

”مجھے منظور ہے!“ فضلونے ہامی بھر لی۔

”مجھے بھی منظور ہے بھائیو!“ مجید مسکرایا۔

سہیل انہیں اندرونی رستوں سے سجادہ نشین کے حجرے میں لے گیا۔ فضلونے اپنے بھاری بھر کم ہاتھوں سے سجادہ نشین کا گلا کھنٹ دیا۔ سہیل اور مجید اس دوران ان کی ٹانگیں اور بازو دوپچے کھڑے رہے۔

منصوبے کے مطابق پانچویں روز ان کی موت کا اعلان کرنے کے بعد فضل الہی کو جانشین مقرر کر دیا گیا۔ سینکڑوں مریدوں کی موجودگی میں انہیں احاطہ میں ہی دفن کیا گیا تاہم اسی رات ان تینوں نے میت خاموشی سے قصبہ کے باہر قبرستان میں منتقل کر دی۔

نشیات اور اسلحہ کے لیے ایک محفوظ ترین آڈیو میسر آتے ہی آستانہ میں کئی ایک تعمیری تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ فضل الہی نے سابقہ غلطیوں سے بچاؤ کے پیش نظر چند اعلیٰ پولیس افسران کے لیے باقاعدہ حصہ مقرر کر دیا۔ اسی احتیاط نے آج انہیں ایک یقینی گرفتاری و موت سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا۔

اپنی خصوصی جیب میں سوار وہ تینوں اب ہائی وے کی جانب عازم سفر تھے۔ اپنی شناخت اور حلیہ میں تبدیلی کرنے کے بعد ان کے اسلحہ ڈیلرز نے ایک نئے صوبہ و علاقہ میں

کے بعد اس سے مکمل بے نیاز ہو چکے تھے۔ مجید سے اس کی شناسائی وہیں ہوئی۔ وہ پستہ قامت، گھٹے ہوئے جسم اور کھر درے نقوش کا حامل تھا اور ٹارگٹ کلنگ میں اپنی مثال آپ تھا لیکن بد قسمتی سے ایک پولیس افسر کو قتل کرنے کے بعد وہ اپنی موٹر سائیکل خراب ہو جانے کے باعث فرار نہ ہو پایا۔

ان دونوں نے ایک طویل منصوبہ بندی کے تحت جیل سے اپنا فرار یقینی بنایا اور چھپتے چھپاتے پنجاب چلے آئے۔ سہیل سے ان کی ملاقات ایک آستانہ میں ہوئی تھی۔ وہ بھوک پیاس سے نبرد آزما کسی محفوظ ٹھکانہ کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ ایک روز آستانہ پر ننگر کے کھانے سے پیٹ بھر کر اسی احاطہ میں سو گئے۔ رات کے آخری پہر سہیل ان کے پاس چلا آیا۔ وہ ان کے منتشر حلیہ اور اضطراب کی بدولت کسی گڑبوکا اندازہ لگا چکا تھا۔

”کہاں سے فرار ہوئے ہو؟“ اس نے ٹوٹتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سندھ جیل سے۔“ فضلونے اطمینان سے کہا۔

”اوہ تاہا ڈی خیر..... کس جرم میں قید تھے؟“ وہ بے

ساختگی سے بولا۔

”کوئی ایک ہوتا تائیں، بس یوں سمجھ لو کہ جرم کی دنیا کے پروفیسر ہیں ہم۔“ مجید نے بے نیازی سے کہا۔

”پھر تو قدرت نے تمہیں بد وقت بہترین مقام پر بھیجا ہے، مجھے بھی جی دار ساتھیوں کی ضرورت تھی۔“ سہیل نے ان کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ دھرا۔

”دیکھا کروانا چاہتے ہو؟“ فضلوی آنکھوں میں چمک

آگئی۔

”آستانہ کے گدی نشین کا قتل۔ اس کی موجودگی میں

یہاں میرا کاروبار نہیں چنپ سکتا۔“

”ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟“ مجید نے سر کھاتے ہوئے

پوچھا۔

”تم ابھی اسے قتل کر دو۔ صبح ہوتے ہی میں یہاں مشہور

کردوں گا کہ فضلوان کا خصوصی مرید اور قرابت دار ہے۔ اس

کے نقوش میں بھی پنجابی جھلک موجود ہے۔ اس لیے کوئی بھی

مشکوک نہیں ہوگا۔ دو چار روز صرف فضلوی ہی ان کے حجرہ میں

جایا کرے گا۔ پھر موقع دیکھ کر ان کی موت اور فضلوی کی جانشینی کا

اعلان کر دیں گے۔“ سہیل نے اپنا منصوبہ سنبھالیا۔

”ہمیں کیا فائدہ ہوگا اس سے؟“ فضلونے دریافت کیا۔

”فائدے ہی فائدے ہیں بادشاہو! ایک محفوظ

اس کاروبار کے از سر نو آغاز کی یقین دہانی کروائی تھی۔
وہ بے فکر اور پرسکون تھے۔

☆☆☆

آستانہ میں ایک قیامت برپا تھی۔

زائرین جمید کی ہدایات کے مطابق انتہائی صبر و سکون سے اپنی دلی مراد کی برآوری اور پریشانیوں سے نجات کے منتظر تھے۔ بخشو نے ایک ملازم کی مدد سے بہت محبت اور خلوص سے انہیں لنگر کا کھانا کھلایا۔

اگلے نصف گھنٹے میں ہال کا کمر مختلف کراہوں، اُنکائیوں اور آدھو بکاسے گونج رہا تھا۔ لذیذ کھانے میں موجود سربل الاثر زہر اور شکر سیری نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ وہ سب اپنی اپنی غلاظت میں افسوس تھے۔ کئی افراد کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ پل بھر میں ہی چھ افراد زندگی کی بازی ہار گئے۔ بخشو کی حالت بھی غیر مری۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟“ عالیہ نے روتے ہوئے کہا۔

”ہمیں زہر دیا گیا ہے، اس کھانے میں زہر تھا، ہمارا وقت اب ختم ہونے والا ہے۔“ ڈاکٹر آمنہ نے بے تحاشا کھانتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہمارا قصور کیا تھا؟ سرکار مبارک کہاں ہیں، ان کے زیر سایہ ہمارے ساتھ یہ سب کیونکر ہو سکتا ہے؟“ ہارون چلائی۔

یہی سوالات وہاں موجود ہر فرد کے ذہنوں میں چل رہے تھے لیکن جواب کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

فضاء میں عشاء کی اذان کے کلمات گونجنے لگے اور پھر انہیں ایک بھر پور جواب مل گیا۔

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....“ (اللہ سب سے بڑا ہے۔)
”آپ سے عظیم اور بلند میرے لیے کوئی بھی نہیں
حضرت جی!“ سیٹھ نوید بخشش کی سماعت میں اپنے ہی کبے الفاظ گونجنے۔ وہ ساکت رہ گیا۔

”لا الہ الا اللہ.....“ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں)
”آپ کی روشن ضمیری سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں
قبلہ! آپ تو سب کچھ جان لیتے ہیں۔“ اکرام خان کے

ذہن میں گونجتا یہ فقرہ اس کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوا۔

”اشھد ان لا الہ الا اللہ..... اشھد ان محمد الرسول اللہ.....“ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود

نہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)
”آپ ہی ہماری آخری اُمید اور سہارا ہیں
سرکار!“ عالیہ گواہی ہی کلمات کی بازگشت سنا کر دی تو وہ
ہارون کی طرف دیکھتے اذیت سے سر پٹختے لگی۔

”حی علی الفلاح.....“ (آؤ فلاح اور کامیابی کی طرف)
”میں یہاں سکون حاصل کرنے آئی ہوں بابا
جی۔ مجھے بس سکون درکار ہے۔“ ڈاکٹر آمنہ نے موت کی
چکیوں سے بل اصل سکون اور فلاح کا ماخذ جاننا تو اپنی
مٹھیاں پیچھے دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

”حی علی الصلوٰۃ..... اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....“ (آؤ
نماز کی طرف، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ عظیم ترین ہے)
”یہ زندگی اور موتیں آپ ہی کا فضل ہیں
سرکار!“ بخشو کو قصور میں اپنا وجود فضل الہی کے قدموں میں
سجدہ ریز نظر آیا اسے اپنے وجود سے کراہیت کا احساس
ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

آستانہ میں ہر سولہاں بکھری تھیں۔

افسران کے بھاری بوٹوں کی دھمک سے خاموش
درو دیوار گرج رہے تھے۔ وہ سب کے چہرے بغور دیکھتے
ایک شخص کے پاس رُک گئے۔

بید کی چھتری سے گہری سرخی مائل نشان لیے عبدالکریم
کا وجود بھی اپنی آخری سانسیں لے چکا تھا۔ موت نے اسے
صرف اتنی ہی مہلت دی تھی کہ وہ اپنے افسران کو کچھ ویڈیوز
اور تصویری ثبوت بھیج سکے۔

افسران نے عبدالکریم کی نعش کو سیلوٹ کیا اور غم
آنکھوں سے سر جھکائے باقی افراد کی مٹھیں ایسی بولیں میں
منتقل کرنے لگے۔

شمارہ جولائی 2017ء کی منتخب بیانیان

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: قیت..... سیما صفدر..... (کراچی)

☆ دوم: انتقام..... مریم..... (اسلام آباد)

☆ سوم: دیر آید..... کبیر عباسی..... (مری)

پہلے دو سے اوتھرے انعام کے لیے آپ جی منتخب کیجئے
ہم آپ کی رائے کا سراغ لگائیں گے